دفاعِ سُنت پر علامہ امرتسری رحمہ اللہ کے گراں قدر رسائل کا مجموعہ

مقالات و مضامین

بر

حُجیتِ حدیث

تالیف

شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ

تحقیق و تعلیق

عبدالاحد احسن جمیل آل عبدالرحمن

صوبائی جمعیت اہل حدیث، ممبئی

دفاع سُنت پر علامہ امرتسری رحمہ اللہ کے گراں قدر رسائل کا مجموعہ

مقالات ومضامین

بر

حُجیتِ حدیث

تالیف

شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ

تحقیق و تعلیق

عبدالأحد أحسن جمیل آل عبدالرحمٰن

صوبائی جمعیت اہل حدیث، ممبئی

نام کتاب : مقالات ومضامین برحجیت حدیث

مؤلف : شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ

تحقیق وتعلیق : عبدالأحدأحسن جمیل آل عبدالرحمن

صفحات : 544

ایڈیشن : اول

اشاعت : شعبان ۱۴۴۳ھ مطابق مارچ ۲۰۲۲ء

تعداد : ایک ہزار

قیمت :

ناشر : صوبائی جمعیت اہل حدیث ممبئی

ملنے کے پتے:

- **دفتر صوبائی جمعیت اہل حدیث، ممبئی:**

15-14 ، چونا والا کمپاؤنڈ، مقابل کرلا بس ڈپو، ایل بی ایس مارگ، کرلا (ویسٹ) ممبئی-400070۔

- **مرکز الدعوۃ الاسلامیہ والخیریہ:**

بیت السلام کمپلیکس، نزد المدینۃ انگلش اسکول، مہاڈ ناکہ کھیڈ، ضلع: رتنا گری-415709، فون:02356-264455

- جمعیت اہل حدیث ٹرسٹ، 549/غوری پاڑہ پہلا منزلہ نزد رئیس ہائی اسکول، بھیونڈی-421302۔فون نمبر: 226526 / 225071 (02522)

فہرست موضوعات

عرض ناشر

الحمد لله رب العالمین، والعاقبة للمتقین، ولا عدوان إلا علی الظالمین، والصلاة والسلام علی خیر خلقه نبینا محمد وعلی آله و صحبه أجمعین، وبعد:

حق وباطل کے درمیان ستیزہ کاری ہمیشہ سے رہی ہے، اہل حق واہل باطل کے مابین تصادم ازلی ہے، یہ ایک دراز سلسلہ ہے' انبیاء علیہم السلام اوران کے متبعین سے باطل پرستوں کے ٹکراؤ کی تاریخ اس پر شاہد عدل ہے، یہ معاملہ سلسلۂ نبوت کے اختتام کے بعد بھی جاری ہے اور تا وقت مشیت الٰہی جاری رہے گا۔

امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا کی آخری امت ہے' محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد نبوت کا دعوتی واصلاحی مشن امت کے مخلص علماء کے ذمہ ہے، دعوت واصلاح کے ضمن میں احقاق حق وابطال باطل کا مجاہدانہ مشن علماء امت کی بنیادی ذمہ داری ہے جس کی انجام دہی کے بغیر اس امت کے علماء بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔

یہی وجہ ہے امت کے سلف صالحین اور تا قیامت ان کے نقش قدم پر چلنے والے سچے اہل سنت وجماعت، اہل الحدیث ہمیشہ سے دفاع عن الحق کے اس عظیم الشان مشن پر گامزن رہے ہیں، کیونکہ یہ مشن اور ذمہ داری نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشین گوئی کا حصہ ہے، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

" مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللهُ فِي أُمَّةٍ قَبْلِي إِلَّا كَانَ لَهُ مِنْ أُمَّتِهِ حَوَارِيُّونَ، وَأَصْحَابٌ يَأْخُذُونَ بِسُنَّتِهِ وَيَقْتَدُونَ بِأَمْرِهِ، ثُمَّ

إِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوفٌ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ، وَيَفْعَلُونَ مَا لَا يُؤْمَرُونَ، فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَيْسَ وَرَاءَ ذَلِكَ مِنَ الْإِيمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ"

(صحیح مسلم، 1/ 69، حدیث: ۵۰)۔

''مجھ سے پہلے جس نبی کو بھی اللہ نے کسی امت میں بھیجا اس کی امت میں اس کے کچھ حواری اور ساتھی ہوتے تھے، جو اس کی سنت پر عمل پیرا ہوتے تھے اور اس کے حکم کی اقتدا کرتے تھے۔ پھر ان کے بعد ایسے بُرے لوگ پیدا ہوئے جو ایسی باتیں کہتے تھے جو کرتے نہیں تھے اور ایسے کام کرتے تھے جن کا انھیں حکم نہیں دیا جاتا تھا۔ لہٰذا جو شخص ان سے اپنے ہاتھ کے ذریعہ جہاد کرے وہ مومن ہے، جو ان سے اپنے دل کے ذریعہ جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو ان سے اپنی زبان کے ذریعہ جہاد کرے وہ مومن ہے، اور اس کے علاوہ رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں''۔

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشہور حدیث میں فرمایا:

" يَحْمِلُ هَذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُولُهُ يَنْفُونَ عَنْهُ تَحْرِيفَ الْغَالِينَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِينَ وَتَأْوِيلَ الْجَاهِلِينَ"

[رَوَاهُ الْبَيْهقِي، مشكاة المصابيح (82/1)(صحیح)]

اس علم (علم کتاب وسنت) کی امانت بعد میں آنے والی نسل کے معتبر لوگ اپنے کندھوں پر اٹھائیں گے اور اس سے غلو کرنے والوں کی تحریف اور باطل پرستوں کی

کاٹ چھانٹ اور جاہلوں کی تاویلات دور کریں گے۔

یہی وجہ ہے کہ سلف امت اور علماء حق سنت کے دفاع اور اہل بدعت کی تردید کو جہاد بلکہ جہاد سے بھی افضل قرار دیتے تھے، چنانچہ امام یحیٰی بن یحیٰی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"الذَّبُّ عَنْ السُّنَّةِ أَفْضَلُ مِنْ الْجِهَادِ"[(مجموع الفتاوی (4/13)، والإخنائية أو الرد على الإخنائي (ص:5)]

''سنت کا دفاع کرنا جہاد سے افضل ہے''۔

اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کہتے تھے:

"أحاديث حماد بن سلمة هي الشجا في حلوق المبتدعة" (سیر أعلام النبلاء، للذہبی 7/450- نیز دیکھئے: الرد علی من قال بفناء الجنۃ والنار ص:55)۔

''حماد بن سلمہ کی حدیثیں بدعتیوں کے حلق کے کانٹے ہیں''۔

اسی طرح امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے پوچھا گیا: آدمی روزہ رکھے، نماز پڑھے اور اعتکاف کرے، یہ آپ کو زیادہ محبوب ہے یا بدعتیوں کے بارے میں کلام کرے؟ فرمایا:

"إذا صام وصلّى واعتكف فإنّما هو لنفسه، وإذا تكلّم في أهل البدع فإنّما هو للمسلمين، هذا أفضل"[مجموع الفتاوی (28/231). والإخنائية أو الرد على الإخنائي (ص:5)]

''اگر روزہ رکھے گا، نماز پڑھے گا اور اعتکاف کرے گا تو اُس کی اپنی ذات کے لئے ہوگا، اور اگر بدعتیوں پر کلام کرے گا تو مسلمانوں کے لئے ہوگا،

یہی افضل ہے''۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا:

''تَطْهِيرُ سَبِيلِ اللَّهِ وَدِينِهِ وَمِنْهَاجِهِ وَشِرْعَتِهِ وَدَفْعِ بَغْيِ هَؤُلَاءِ وَعُدْوَانِهِمْ عَلَى ذَلِكَ وَاجِبٌ عَلَى الْكِفَايَةِ بِاتِّفَاقِ الْمُسْلِمِينَ، وَلَوْلَا مَنْ يُقِيمُهُ اللَّهُ لِدَفْعِ ضَرَرِ هَؤُلَاءِ لَفَسَدَ الدِّينُ وَكَانَ فَسَادُهُ أَعْظَمَ مِنْ فَسَادِ اسْتِيلَاءِ الْعَدُوِّ مِنْ أَهْلِ الْحَرْبِ؛ فَإِنَّ هَؤُلَاءِ إِذَا اسْتَوْلَوْا لَمْ يُفْسِدُوا الْقُلُوبَ وَمَا فِيهَا مِنْ الدِّينِ إِلَّا تَبَعًا وَأَمَّا أُولَئِكَ فَهُمْ يُفْسِدُونَ الْقُلُوبَ ابْتِدَاءً.'' (مجموع الفتاوی(28/232)۔

''اللہ کی راہ، اس کے دین، اس کے منہج، اس کی شریعت کو پاک کرنا اور اس سلسلہ میں ان لوگوں کی ظلم و زیادتی کا خاتمہ کرنا باتفاق مسلمین فرض کفایہ ہے، اگر اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ضرر و فساد کے خاتمہ کے لئے کچھ لوگوں کو کھڑا نہ کیا ہوتا تو دین تہ و بالا ہو جاتا، اور دین کا فساد جنگجو دشمن کے غلبہ و تسلط کے فساد سے زیادہ خطرناک ہے؛ کیونکہ اگر یہ لوگ مسلط ہوں گے تو دلوں اور ان میں موجود دین کو دیگر چیزوں کے بعد بگاڑیں گے، مگر وہ لوگ سب سے پہلے دلوں کو ہی بگاڑیں گے''۔

تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا جائے تو دفاع حق اور رد باطل کے افق پر کتاب و سنت کے متوالے اور منہج اہلحدیث کے ایک عظیم سپوت رئیس المناظرین علامہ ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کا روشن نام سرفہرست دکھائی دے گا، علامہ امرتسری رحمہ اللہ کی پوری زندگی

احقاق حق اور ابطال باطل سے عبارت ہے،آپ نے اپنی زبان ،قلم، ردود اور مناظرات کے ذریعہ کتاب وسنت ،توحید الٰہ ، اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور منہج اہل حدیث کی ،مخلصانہ ومجاہدانہ ترجمانی کی اور ہر اپنے پرائے مخالف کو اپنی علمی گیرائی اور خداداد وہبی صلاحیت کے ذریعہ حق وصوابدید کی رہنمائی کی ،آپ کی ہمہ جہت دینی، علمی، منہجی ،دعوتی ،دفاعی ،مناظراتی خدمات پر کچھ کہنا یا لکھنا ہما شما کے بس کی بات نہیں، مولانا رحمۃ اللہ کے مقام ومرتبہ اور آپ کے بے مثال کارناموں کو سرسری طور پر سمجھنے کے لئے جماعت اہل حدیث کے چند کبار علماء واساطین کے رشحات ملاحظہ فرمائیں۔

- مولانا حافظ ابراہیم سیالکوٹی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر رات کو کوئی فرقہ اسلام کے خلاف پیدا ہو جائے تو مولانا ثناء اللہ صبح اس کا جواب دے سکتے ہیں'' (سیرت ثنائی،ص:۳)۔

- خطیب الاسلام مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

''اگر پوری دنیائے اسلام کے اکابر علماء کسی ایک مجلس علمی میں جمع ہوں اور بیک وقت عیسائیوں، آریوں، سناتن دھرموں،ملحدوں،قادیانیوں،شیعوں، منکرین حدیث، چکڑالویوں، بریلویوں، دیوبندیوں...غرض ہر فرقے سے ایک ایک گھنٹہ مسلسل نو گھنٹے بحث و مذاکرہ کی نوبت آئے تو عالم اسلام کی طرف سے کون کون ہستیاں ہوں گی مجھے معلوم نہیں۔لیکن پاکستان و ہندوستان، برما اور لنکا، جزیرہ جاوا اور سماٹرا کی طرف سے صرف ایک ہستی پیش ہوسکتی ہے،اور وہ ہستی حضرت شیخ الاسلام مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری رحمہ اللہ کی تھی۔آج ان کی رحلت کے بعد ہندستان اور پاکستان کی

یہ سربلندی شاید باقی نہیں رہی ان کے جاتے ہی بازارِ علمی کی یہ صدر نشینی بھی شاید اب ختم ہوگئی ہے۔ اِنا اللہ و اِنا اِلیہ راجعون۔'' (حیات ثنائی۔ص۲۰۶، دیکھئے: ماہنامہ ندائے مدینہ کان پور ''شیخ الاسلام'' نمبر)۔

● مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف جس نے بھی زبان کھولی اور قلم اٹھایا ان کے حملے کو رد کرنے کے لیے ان کا قلم شمشیر بے نیام ہوتا تھا اور اسی مجاہدانہ خدمت میں انہوں نے عمر بسر کر دی۔ مرحوم اسلام کے بڑے مجاہد تھے زبان وقلم سے جس نے بھی حملہ کیا اس کی مدافعت میں جو سپاہی سب سے پہلے آگے بڑھتا وہ آپ ہی ہوتے۔ (یادرفتگاں، ص:۴۱۸)۔ رحمه الله رحمةً واسعةً وكثر من أمثاله۔

زیر نظر علمی دستاویز علامہ امرتسری رحمہ اللہ کے دفاع سنت اور رد باطل کے سلسلہ میں تحریر کردہ درج ذیل آٹھ رسالوں پر مشتمل ہے، جو دراصل مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ وار مضامین تھے:

۱۔حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق:

(ان مضامین میں سید محب الحق صاحب بانکی پوری کی کتاب ''شرعۃ الحق'' کا جواب دیا گیا ہے۔)

۲۔دفاع عن الحدیث:

(ان مضامین میں ''ایڈیٹر نگار'' کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔)

۳۔تفسیر بالروایت:

(ان مضامین میں احادیث نبویہ پر ''مولانا اسلم جیراجپوری'' کے اعتراضات کا

جواب دیا گیا ہے۔)

۴۔ بلاغ کا باطل گو نامہ نگار:

(ان مضامین میں ''حق گو'' نامی شخص کی کتاب ''بلاغ الحق'' کا جواب دیا گیا ہے۔)

۵۔ تصدیق الحدیث: بیان الحق بجواب بلاغ الحق:

(ان مضامین میں حافظ محب الحق صاحب کی کتاب ''بلاغ الحق'' کا جواب دیا گیا ہے)

۶۔ تصدیق الحدیث: حقیقت پسندی بجواب شخصیت پسندی:

(ان مضامین میں ''چوہدری غلام احمد صاحب پرویز'' کے مضمون مطبوعہ ''ترجمان القرآن'' کا جواب دیا گیا ہے۔)

۷۔ تصدیق الحدیث: محدث اور فقیہ:

(ان مضامین میں ''ایڈیٹر'' رسالہ ''ترجمان القرآن'' کے مقولہ کا جواب دیا گیا ہے)

۸۔ صلاۃ المؤمنین بجواب صلاۃ المرسلین:

(ان مضامین میں ''میاں محمد مسلم حنیف اہل الذکر والقرآن'' کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔)

ان مضامین کی جمع وترتیب اور تخریج وتحقیق کا کارنامہ برادر محترم فضیلۃ الشیخ عبد الاحد احسن جمیل مدنی سلمہ اللہ نے انجام دیا ہے جو اپنی زبانی وقلمی علمی کوششوں سے معروف ہیں' یقیناً یہ ایک حد درجہ محنت طلب، عرق ریزی وجاں سوزی کا کام ہے جس کا بیڑہ برادر محترم نے اُٹھایا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کا حامی وناصر ہو، آپ کے علم، عمر اور وقت میں برکت عطا فرمائے، اس عظیم دستاویز کی خدمت کے تئیں آپ کی گرانقدر کوششوں کو شرف قبولیت بخشے، آمین۔

کتاب پر مربی گرامی، منہج سلف کے کھرے اور بے باک ترجمان فضیلۃ الشیخ ظفر الحسن مدنی سمیت جماعت کے کبار علماء وفضلاء کی تقریظات اور مقدمات نے علامہ امرتسری رحمہ اللہ کی سیرت وسوانح اور دیگر گوشوں کی تکمیل کے ذریعہ کتاب کا حسن دوبالا کر دیا ہے فجزاہم اللہ خیراً، اللہ تعالیٰ جماعت کے کبار علماء واساطین کا سایہ امت وملت پر تادیر قائم رکھے، آمین۔

یہ کتاب صوبائی جمعیت اہل حدیث ممبئی کے شعبۂ نشر واشاعت سے شائع ہو رہی ہے، صوبائی جمعیت ممبئی کی گوناگوں علمی ودعوتی سرگرمیاں اللہ ذوالکرم کی توفیق ارزانی کے بعد امیر محترم فضیلۃ الشیخ عبدالسلام سلفی حفظہ اللہ کی منہجی غیرت وحمیت اور اس کی نشر واشاعت کے تئیں حد درجہ فکرمندی، تڑپ اور لگن کی مرہون منت ہیں، اس عظیم کتاب کی اشاعت کا موافقہ بھی اسی جذبۂ خالص کا آئینہ دار ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ امیر محترم حفظہ اللہ کو اپنے حفظ وامان میں رکھے اور اپنی مخلصانہ کوششوں کو مزید وثوق اور حوصلہ کے ساتھ جاری رکھنے کی توفیق بخشے، اور آپ کی تمام تر کوششوں کو قبول فرمائے۔ اخیر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے مولف، محقق، مقدمین، مقرظین، ناشر اور تمام معاونین کی کوششیں قبول فرمائے اور دنیا وآخرت میں اس کا نیک صلہ عطا فرمائے، آمین۔

ممبئی ۲۵/ اکتوبر ۲۰۲۱ء

اخوکم فی اللہ

ابو عبداللہ عنایت اللہ سنابلی مدنی

(شعبۂ نشر واشاعت صوبائی جمعیت اہل حدیث ممبئی)

تقدیم

الحَمْدُ لِلَّهِ والصَّلاةُ والسَّلامُ عَلى سَيِّدِ الأنْبِياء والمُرْسلِينَ نَبينا مُحَمَّد وعَلى آله وصَحبه أجْمعين، وَمَن تبِعهُم بإحسانِ إلى يومِ الدينِ، أما بعد:

سنت کا دفاع، اس کی نصرت وتائید دراصل اسلام کا دفاع اور اس کی نصرت ہے، کیونکہ سنت اور اسلام دونوں ایک ہیں، ''**السُّنَّةُ هِيَ الاسْلَامُ والاسْلامُ هُوَ السُّنَّةُ**''۔

اسی لئے جو اسلام کا سپاہی ہے وہ سنت کا سپاہی ہے، شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ جہاں اسلام پر ہونے والے ہر حملے کا دفع اور جواب کے لئے ہر آن کمر بستہ رہے بلکہ اِس میدان میں امام رہے، اسی طرح سنت کے خلاف تشکیک، عدم حجیت، اور اس پر عقل ورائے کو مقدم کرنے والوں کی فتنہ انگیزوں کا بھی قلع قمع کرتے رہے، اس میراث میں بھی آپ کی خدمات بے مثال اور لازوال ہیں۔

یہ مجموعہ دراصل دفاعِ سنت پر علامہ امرتسری رحمہ اللہ کے گراں قدر رسائل وجرائد پر مشتمل ہے۔ جسے عزیزم شیخ عبدالأحد بن احسن جمیل مدنی نے بڑی عرق ریزی سے یکجا کردیا ہے۔ فجزاہ اللہ خیرا

آج جب ایک بار پھر شدت کے ساتھ سنت بیزاری عام ہے اور سنت کے خلاف بہت سارے محاذ کام کررہے ہیں، بلکہ انکارِ حدیث کا چلن ہوتا جارہا ہے، محبانِ رسول اور علمبردارِ سنت اور سنت کے سپاہیوں کے لئے اس مجموعہ رسائل ''مقالات ومضامین

بر حجیت حدیث'' کو عام کرنا وقت کا تقاضا تھا۔

ان رسائل کی افادیت واہمیت اور امرتسری رحمہ اللہ کی مجاہدانہ خدمات پر غیور سنت وسلفیت شیخ ظفر الحسن مدنی حفظہ اللہ کا اس مجموعہ کے لئے گراں قدر مقدمہ ہے، آپ اسے بھی ضرور پڑھیں، فجزاہ اللہ خیراً و بارک اللہ فی جھودہ الجبارۃ.

اسی طرح اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے عزیز مکرم شیخ عبد الأحد سلمہ اللہ کو جنہوں نے دفاعِ سنت پر امرتسری رحمہ اللہ کے رسائل کو جمع کر کے اس پر تحقیق وتعلیق کا علمی کام کیا، اس کے بعد صوبائی جمعیت اہل حدیث ممبئی کو اشاعت کے لئے دیا۔ اس سعادت کے حصول پر صوبائی جمعیت کے اراکین اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں، اور تمام اہل علم ومعاونین کے لئے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے علم وعمل میں برکت دے ساتھ ہی اس مجموعہ رسائل سے خواص کو بالخصوص استفادہ کی توفیق دے۔

وصلی اللہ علی نبینا محمد وآلہ وصحبہ وسلم

خادم جماعت وجمعیت

عبدالسلام سلفی

(ممبئی)

۲/شعبان ۱۴۴۳ھ مطابق ۵/مارچ ۲۰۲۲ء

پیش لفظ

(از: فضیلۃ الشیخ اُحسن جمیل مدنی حفظہ اللہ)

نَحْمَدُهُ ونُصَلِّي على رَسُوله الكَرِيم، أما بعد:

علماء سلف کا اس بات پر اتفاق ہے کہ شریعت اسلامیہ کے دو بنیادی مصادر ہیں، ایک قرآن مجید، دوسرا احادیث رسول یا سنت نبوی علی صاحبہا اُفضل الصلاۃ والتسلیم، نیز یہ دونوں منزل من اللہ وحی ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ ایک وحی متلو ہے اور دوسرا وحی غیر متلو، لیکن مصدر ہونے میں دونوں برابر ہیں، اسی لئے اللہ تعالی نے دونوں کی حفاظت اپنے ذمہ لی اور اس کی حفاظت کا ایک عظیم فطری نظام بھی بنا دیا، اللہ تعالی نے خود اپنے نبی سے یہ کہہ دیا کہ جس طرح اس قرآن کو جمع کرنا اور پڑھانا میرے ذمہ ہے اسی طرح اس کا بیان وتفسیر بھی میرے ذمہ ہے: ﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ﴿١٧﴾ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ﴿١٨﴾ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ [القیامہ: ۱۷-۱۹] قرآن مجید میں اس معنی ومفہوم کی بہت ساری آیتیں ہیں جن سے اس بات کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے کہ اللہ تعالی نے قرآن مجید اور اس کا بیان وتفسیر دونوں اپنے نبی پر نازل فرمایا جس کی نشاندہی خود نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اس حدیث میں فرمادی: **"ألا إنّي أُوتِيتُ القُرْآنَ ومِثْلَهُ مَعَهُ"** (مسند احمد: ۱۷۱۷۴)، علماء سلف کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس حدیث میں قرآن کے مثل سے مراد حدیث نبوی یا سنت رسول اللہ علیہ افضل الصلاۃ والتسلیم ہے، لہذا یہ دونوں وحی منزل ہیں اور شریعت کا مصدر ہونے میں دونوں برابر ہیں، اور اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام کو دونوں کی برابر سے تعلیم دی، جس کی دلیل عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان ہے کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرآن اس طرح

پڑھتے تھے کہ دس آیتیں پڑھتے اوراس کے معانی ومطالب کو جانتے نیز اس پر عمل کرنا سیکھتے ، اس کے بعد آگے کی دس آیتیں پڑھتے ، اس طرح ہم نے صرف قرآن کے الفاظ ہی کو نہیں پڑھا بلکہ اس کے مطالب ومعانی کو جانا اوراس پر عمل کرنا بھی سیکھا۔اور پھر اسی اہتمام کے ساتھ صحابہ نے اپنے شاگردوں کو بھی قرآن پڑھایا۔ (دیکھیے: عمدۃ التفسیر:۱/ ۴۳)۔

لہٰذا یہ بات صاف ہوگئی کہ شریعت کا مصدر ہونے میں حدیث نبوی کی وہی حیثیت ہے جو اللہ کی کتاب قرآن مجید کی ہے، پس یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جس طرح قرآن مجید عقائد واحکام میں مستقلاً حجت ہے اسی طرح حدیث نبوی بھی عقائد واحکام میں مستقلاً حجت ہے،جس کی طرف اللہ تعالی نے اپنے اس فرمان میں نشاندہی کردی ہے:
﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَطِيعُواْ ٱللَّهَ وَأَطِيعُواْ ٱلرَّسُولَ وَأُوْلِي ٱلۡأَمۡرِ مِنكُمۡ﴾ الآیۃ [النساء:۵۹]۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اس آیت کے ضمن میں فرماتے ہیں:

”اس آیت میں اللہ تعالی نے اپنی اطاعت اور رسول کی اطاعت دونوں کا حکم دیا اور رسول کے ساتھ فعل کو لوٹا کر (یعنی: ”وَأَطِيعُواْ ٱلرَّسُولَ“ کہہ کر) یہ بتادیا کہ رسول کی اطاعت مستقلاً بغیر آپ کے حکم کو کتاب اللہ پر لوٹائے واجب ہے، بلکہ جب رسول حکم دیں تو آپ کی اطاعت مطلقاً واجب ہوجاتی ہے خواہ وہ حکم کتاب اللہ میں موجود ہو یا موجود نہ ہو، کیوں کہ آپ کتاب اوراس کے ساتھ اسی کے مثل دیئے گئے،لیکن ”وَأُوْلِي ٱلۡأَمۡرِ“ کی مستقلاً اطاعت کرنے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ اس جگہ فعل حذف کر کے یہ بتادیا گیا کہ اولی الأمر کی اطاعت رسول کی اطاعت کے ضمن میں اور تابع ہے، اسی لئے علماء سلف کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جس طرح اللہ کی طرف لوٹانا اس کی کتاب

کی طرف لوٹانا ہے اسی طرح رسول کی طرف لوٹانا آپ کی حیات طیبہ میں آپ کی طرف لوٹانا اور آپ کی وفات کے بعد آپ کی سنت کی طرف لوٹانا ہے اوران دونوں کی حیثیت برابر کی ہے، نیز یہ ایمان کے شرائط میں سے ہے۔(اعلام الموقعین:۱/۵۹)

حدیث نبوی کی اسی شرعی حیثیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: ''**لَا أُلْفِيَنَّ أحَدَكُم مُتَّكِئًا على أرِيكَتِهِ يَأتِيْهِ الأمرُ مِن أمْرِي، مِمّا أَمَرْتُ به أو نَهَيْتُ عنه، فيقولُ: لا نَدْرِي، ما وجَدْنا في كتابِ اللهِ اتَّبَعْنَاه**''(سنن ابن ماجہ:۱۳)، اور مقدام بن معدیکرب کی مشہور حدیث میں یہ لفظ ہے:''**يقول : عَلَيْكُمْ بِهَذا القُرْآنِ، فَما وجَدْتُمْ فِيهِ مِن حَلالٍ فَأَحِلُّوهُ، وما وجَدْتُمْ فِيهِ مِن حَرامٍ فَحَرِّمُوهُ، وإنَّ مَا حَرَّمَ رَسُولُ الله كَمَا حَرَّمَ اللَّهُ**''(سنن ابوداود:۴۶۰۴)۔

پس پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان:''**وإن ما حرم رسول الله كما حرم الله**''میں مثلیت نے یہ بات صاف کردی کہ قرآن وحدیث کے درمیان شرعی مصدر کی حیثیت سے کوئی فرق نہیں ہے بلکہ رسول کے مامورات ومنہیات جوحدیث کی شکل میں ہیں خواہ وہ حدیث متواتر میں ہوں یا حدیث آحاد صحیحہ میں ہوں کی شرعی حیثیت وہی ہے جوقرآن میں اللہ کے بیان کئے ہوئے مامورات ومنہیات کی ہے، کیونکہ رسول کی زبانِ رسالت سے نکلے ہوئے شرعی فرامین وحی منزل ہوتے ہیں، رسول کا کام صرف ان کا بیان وتشریح اور تبلیغ ہوتا ہے، لہٰذا ان کے درمیان تفریق کرنے والا اور یہ دعوی کرنے والا کہ ہماری ہدایت کے لئے صرف قرآن کافی ہے گمراہ اور صراط مستقیم سے بھٹکا ہوا قرار پائے گا۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ حدیث نبوی کی شرعی حیثیت کو مجروح کرنے کی کوششیں

صحابہ کرام کے بعد سے مسلسل کی جاتی رہی ہیں، اور جماعتی وانفرادی ہر سطح پر ایسے مذموم دعوے کئے جاتے رہے ہیں جس سے لگے کہ حدیث نبوی کا اتنا بڑا مجموعہ عمومی طور پر قابل استدلال نہیں ہے، خصوصا اخبار آحاد جوظن کے دائرہ میں آتے ہیں۔ جبکہ اللہ تعالی نے اپنے فرمان: ﴿ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا ٱلذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُۥ لَحَٰفِظُونَ ﴾ (الحجر:۹) میں اس کی حفاظت کی اسی طرح ذمہ داری لی ہے جیسے قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے، لہٰذا حدیث نبوی بھی اسی طرح اللہ کی طرف سے محفوظ ہے جس طرح قرآن مجید۔

یہ بات ہمیں معلوم ہے کہ فی زمانناً بہت سارے ایسے تعقل پسند حضرات ہیں جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ اس آیت مبارکہ میں ذکر سے مراد صرف قرآن مجید ہے تا کہ احادیث نبویہ پر ہمارا اعتماد ہی مجروح ہوجائے، درحقیقت یہ دعوی کوئی نیا نہیں بلکہ سلفا عن خلف آیا ہے، یہی وجہ ہے کہ امام ابن حزم رحمہ اللہ نے اپنی شہرہ آفاق تالیف (الأحكام فی أصول الأحكام) (۱/ ۱۲۲) میں اس مسئلہ پر مفصل گفتگو کی ہے، چنانچہ آپ فرماتے ہیں: ''اگر کوئی آدمی یہ کہے کہ اس آیت میں اللہ تعالی نے صرف قرآن کو مراد لیا ہے تو ہم اس سے کہیں گے کہ تمہارا یہ دعوی جھوٹا اور دلیل سے خالی ہے بلکہ بلا دلیل اور باطل ہے، کیوں کہ ''ذکر'' کا لفظ ہر اس چیز پر بولا گیا ہے جسے اللہ نے اپنے نبی پر نازل فرمایا، خواہ وہ قرآن ہو یا وہ سنت جس کے ذریعہ قرآن کو بیان اور واضح کیا گیا، اسی لئے اللہ تعالی نے اپنے نبی کی ذمہ داری کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ وَأَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ ﴾ [النحل: ۴۴]۔ ہم نے آپ کی طرف ذکر کو نازل کیا تا کہ آپ لوگوں کے سامنے اس چیز کو بیان کر دیں جو ان کی طرف نازل کیا گیا۔

پس صاف ہو گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے سامنے قرآن کے بیان اور اس کی توضیح وتشریح کرنے پر مامور ہیں، اور ہمیں معلوم ہے کہ قرآن مجید میں بہت سارے ایسے مجمل احکام ہیں جیسے نماز، روزہ، حج، زکاۃ وغیرہ جن کے ادا کرنے کے مکمل طریقہ کو اللہ نے اپنے لفظ سے نہیں بیان کیا ہے بلکہ ان کی وضاحت رسول کے بیان کے ذریعہ کی گئی ہے، لہٰذا اس مجمل کے لیے رسول کا بیان غیر محفوظ ہو اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری نہ لی گئی ہو تو قرآن کے نص سے فائدہ اٹھانا باطل قرار پائے گا، اور جو شریعت ہمارے اوپر فرض کی گئی ہے وہ باطل قرار دی جائے گی، نیز ہم اللہ کے کلام کی صحیح مراد سمجھنے سے قاصر ہوں گے جس سے ہم غلطی کرنے والوں کی غلطی اور جھوٹ بولنے والوں کا جھوٹ جان سکیں، ومعاذ اللہ من ھذا''۔

قرآن کریم کی نسبت سے سنت نبوی علی صاحبہا أفضل الصلاۃ والتسلیم کی حیثیت کی وضاحت کرتے ہوئے امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''السُّنَّةُ إِمَّا أَنْ تَكُوْنَ مُقَرِّرَةً وَمُؤَكِّدَةً حُكْمًا جَاءَ فِي الْقُرْآنِ الْكَرِيمِ، أَوْ مُبَيِّنَةً وَشَارِحَةً لَهُ، أَوْ لِلْاِسْتِدْلَالِ بِهَا عَلَى النَّسْخِ، أَوْ مُنْشِئَةً حُكْمًا سَكَتَ عَنْهُ الْقُرْآنُ'' (الرسالۃ،ص:۶۴)۔

سنت نبوی یا تو اس حکم کو ثابت اور اس کی تاکید کرتی ہے جو قرآن میں بیان کیا گیا ہے یا اس کی شرح اور تفصیل کرتی ہے یا اس کے ذریعہ سے نسخ پر استدلال کیا جاتا ہے یا ایسے حکم کو بیان کرتی ہے جس سے قرآن خاموش ہے۔

درحقیقت امام شافعی نے حدیث یا سنت نبوی سے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے یہی جملہ علماء سلف کا متفقہ اصول ہے، ہم یہاں صحابہ کرام کے چند واقعات بہ اختصار ذکر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں جس سے یہ واضح ہو جائے کہ یہ حضرات جو دین کے اولین سپہ

سالار تھے حدیث نبوی کو بحیثیت مصدر کیا مقام دیتے تھے۔

۱۔ حافظ ابن عبد البر نے بسند صحیح صحابی جلیل عمران بن حصین سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی نے ان کے پاس آکر کوئی مسئلہ پوچھا تو انہوں نے اس کو حدیث کی روشنی میں بیان کر دیا، اس نے کہا: کتاب اللہ سے اسے بیان کرو، اس کے علاوہ کسی سے بیان نہ کرو، انہوں نے جواب دیا: تم احمق آدمی ہو، کیا تم کتاب اللہ میں پاتے ہو کہ ظہر کی نماز چار رکعت ہے اور اس میں قراءت جہری نہیں کی جائے گی، پھر اسے نماز اور زکاۃ وغیرہ کے کچھ مزید احکام گنائے اور کہا: کیا تم اس کی تفسیر کتاب اللہ میں پاتے ہو؟ درحقیقت کتاب اللہ میں اسے مبہم رکھا گیا ہے اور سنت اس کی تفسیر کرتی ہے۔

۲۔ حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ عمران بن حصین کے پاس بیٹھ کر حدیث نبوی کا درس لے رہے تھے کہ ایک آدمی نے کہا: اے ابونجید! ہم سے قرآن میں سے بیان کرو، عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: تم اور تمہارے ساتھی قرآن پڑھتے ہو، کیا تم صرف قرآن کے حوالہ سے نماز اور اس کے احکام وحدود بیان کر سکتے ہو؟ کیا تم صرف قرآن کے حوالے سے سونا، اونٹ گائے وغیرہ میں زکاۃ کے احکام بیان کر سکتے ہو؟ میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر رہا لیکن تم نہیں تھے، پھر فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمارے اوپر زکاۃ ایسے ایسے فرض کیا، اس آدمی نے کہا: ''آپ نے مجھ کو زندہ کر دیا اللہ تعالی آپ کو زندہ رکھے''، حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس آدمی کی جب وفات ہوئی تو وہ فقہاء مسلمین میں سے تھے''۔

۳۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے ایک شاگرد نے ان سے پوچھا کہ ہم حضری نماز اور نماز خوف کا ذکر قرآن میں پاتے ہیں، لیکن سفر کی نماز کا ذکر قرآن میں نہیں پاتے؟ تو انہوں نے کہا: ''اے بھتیجے! بیشک اللہ تعالی نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا جبکہ ہم کچھ

نہیں جانتے تھے، لہٰذا ہم ویسے ہی کرتے ہیں جیسے محمد ﷺ کو کرتے ہوئے دیکھا ہے"۔

۴۔ ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے کسی عورت نے سوال کیا: کیا وجہ ہے کہ حائضہ عورت روزہ کی قضا کرتی ہے لیکن نماز کی قضا نہیں کرتی؟ انہوں نے جواب دیا: "کیا تو حروریہ (یعنی خارجی) ہے، نبی ﷺ کے زمانہ میں ہم کو حیض آتا تھا تو ہمیں روزہ کی قضا کرنے کا حکم دیا جاتا اور نماز کی قضا کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا تھا"۔

یہ صحابہ کرام کے چند واقعات ہیں جو حدیث کی حجیت کے سلسلہ میں ان کے موقف کی وضاحت کرتے ہیں، یہاں اختصار کی غرض سے چند واقعات کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ورنہ کتب احادیث وسیر میں صحابہ کرام سے اس طرح کے بے شمار واقعات منقول ہیں۔

لیکن جب زمانہ گزرنے کے ساتھ یہ فتنہ بڑھنے لگا اور صرف قرآن کی روشنی میں جواب مانگنے کا رجحان زیادہ ہونے لگا تو تابعین عظام نے بھی اس کے سد باب کی کوشش کی، چنانچہ امام ایوب سختیانی فرماتے ہیں: "جب تم کسی سے حدیث بیان کرو اور وہ تم سے کہے کہ یہ چھوڑ دو اور ہم سے قرآن میں سے بیان کرو تو جان لو کہ وہ گمراہ اور گمراہ گر ہے"۔

درحقیقت یہ ایسا موضوع ہے جس پر دین اسلام کی پوری بنیاد قائم ہے، اور اگر اسے کھوکھلا کر دیا جائے تو پوری عمارت ڈھا جائے گی، اسی لیے سلفا عن خلف اس موضوع پر اہل سنت والجماعت کی طرف سے اتنا لکھا گیا کہ اس کا استقصاء اس جگہ ممکن نہیں ہے اور نہ ہی ہمارا یہ مقصد ہے، بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ اس موضوع پر جو لکھا گیا ہے اسے بار بار طبع کر کے مسلمانوں میں پھیلایا جائے تاکہ فتنوں کے اس دور میں مسلمان

اسلام کے ان دونوں بنیادی مصدروں کی اہمیت سمجھیں اوران کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کا سد باب کرنے کی کوشش کریں، اورنسلا بعدنسل حدیث نبوی کے عظیم ذخیرہ کو محفوظ کرنے کی ذمہ داری ادا کریں۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ جب خلیفۃ الرسول عثمان غنی ذی النورین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے عظیم سانحہ کے بعد فتنوں نے سر اٹھانا شروع کیا اور مختلف قسم کے فتنہ ظاہر ہوئے تو حدیث نبوی کے تعلق سے بھی مختلف قسم کے شکوک وشبہات پیدا کئے گئے جو آگے چل کر مکمل یا جزوی طور پر انکار حجیت حدیث کا سبب بنے، اور خوارج وروافض، معتزلہ وجہمیہ وغیرہ جیسے بدعی فرقوں کا ظہور ہوا اوران کے غیر اسلامی عقائد ونظریات کا جواب دینے کے لیے متکلمین کی طرف سے کچھ ایسے اصول بنایے گئے جن سے ان فتنوں کو مزید تقویت حاصل ہوگئی، درحقیقت یہاں انکار حجیت حدیث کی تاریخ بیان کرنا نہیں ہے بلکہ اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ یہ فتنہ کوئی نیا نہیں ہے بلکہ اس کی تاریخ بہت پرانی اور تہیں بہت گہری ہیں، اور چونکہ حدیث نبوی دین اسلام کے بنیادی مصادر میں سے ایک ہے، اوراس کی حقانیت کا انکار کردینے کے بعد دین اسلام پر سے ہمارا یقین وایمان ہی ختم ہوجا تا ہے، اس لئے اعداء اسلام نے ہمیشہ اس تعلق سے شکوک وشبہات کھڑے کئے اور نام نہاد اسلام دوست اس میں گھی ڈالتے رہے اوران سے متأثر ہوکر بہت سارے تعقل پسند یا ان کی فکر سے متأثر ایسے حضرات جن کو قوم نے دانشور یا اپنا قائد سمجھا تھا جانے ان جانے میں ان کے ہمنوا بن گئے اوران کی تحریروں نے عام مسلمانوں کے درمیان حدیث نبوی کی اہمیت کو کم کرنے کا کام کیا بلکہ اسلامی ناموں کے ساتھ ایسے اہل قرآن پیدا ہوئے جنہوں نے مکمل طور پر حجیت حدیث کا انکار کردیا۔

ہم جانتے ہیں کہ وطن عزیز میں انگریزی سامراج کی پشت پناہی میں اسلام مخالف متعدد تحریکیں چلائی گئیں اوران میں کچھ نام نہاد مسلمانوں نے بھی حصہ داری ادا کی، اسی دور میں انکار حجیت حدیث کے فتنہ نے بھی سر اٹھایا اور جانے ان جانے میں کچھ ایسے حضرات نے بھی شرکت فرمائی جن کوقوم دانشور، صاحب علم اور بعض معاملات میں قائدورہنما سمجھتی رہی بلکہ اب بھی سمجھ رہی ہے جبکہ ان کی تحریروں سے فتنہ انکار حجیت حدیث کو ہوا ملی اورفتنہ پروروں کواپنی دیوار کھڑی کرنے کا موقع ملا، ان میں صف اول میں سرسید احمد خان، چراغ علی، امیر علی، عبداللہ چکڑالوی، اسلم جیراجپوری، غلام احمد پرویز، خلیفہ عبدالحکیم وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔

لیکن اللہ تعالی کی یہ سنت رہی ہے کہ جب دین حنیف اوراس کے دونوں بنیادی مصادرقرآن وحدیث کی حفاظت کی ذمہ داری اس نے خود ہی اٹھالی ہے تواس کے لئے ایسے مخلص اورربانی علماء کو ہر دور میں پیدا کرتا رہا جو ہراٹھنے والے فتنہ کے سرکوکچل کر احقاق حق کی ذمہ داری ادا کرتے رہیں، چنانچہ اس دور میں بھی ایسے علماء ربانیین کی پوری ٹیم نظر آتی ہے جوان فتنوں کے خلاف مکمل طور پر سینہ سپر ہوگئے، اورسیف وسنان کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا، اس سلسلہ کے شہہ سواروں کے سرخیل میں ہم جن علماء ربانیین کا ذکر کر سکتے ہیں، وہ ہیں:

امام مجدد نذیر حسین محدث دہلوی، امام علامہ عبدالعزیز رحیم آبادی، محدث شمس الحق عظیم آبادی، علامہ محمد بشیر شہسوانی، علامہ محمد حسین بٹالوی، علامہ محمد ابو القاسم سیف بنارسی، علامہ ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری وغیرھم أدخلھم اللہ فی فسیح جناتہ۔

خصوصا مناظر اسلام علامہ ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کی تو پوری زندگی گویا احقاق حق وابطال باطل اورحق کے خلاف اٹھنے والے ہرفتنہ کا جواب دینے کے لیے

وقف تھی، اسی لئے آپ کی تحریریں خواہ کتابی شکل میں ہوں یا اخبار ومجلّات میں شائع شدہ ہوں اس زمانہ میں اٹھنے والے ہر فتنہ اور دین حنیف کے صاف ستھرے چشمہ کو گدلا کرنے والی ہر تقریر وتحریر سب کے خلاف مل جاتی ہیں، فجزاہ اللہ عن الاسلام والمسلمین خیر الجزاء۔

مناظر اسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کا جب ذکر آتا ہے تو عام طور پر توجہ ہم قادیانیت، نیچریت اور پھر مختلف محاذ پر ان کے مناظرے کا ذکر کر کے رک جاتے ہیں، جبکہ اس زمانہ کے فتنوں میں انکار حجیت حدیث کے فتنہ پر ان کی تحریریں اور اس فتنہ کے سد باب کے لئے ان کی مساعی جمیلہ تاریخ کا ایسا حصہ ہیں جن کو بھلایا نہیں جا سکتا، خواہ ہم اسے اپنی لاپرواہی کی جیسی نظر لگا دیں۔

زیرِ نظر کتاب اس سلسلہ کی آپ کی ان تحریروں کا مجموعہ ہے جو آپ کے زیر ادارت شائع ہونے والے اخبار موسوم بہ ''اخبار اہل حدیث امرتسر'' میں چھپتی رہیں اور جن کو الگ سے چھاپنے کی مولانا کی خواہش تھی جس کا ذکر مولانا نے ان میں سے بعض تحریروں میں خود کیا بھی ہے لیکن بعض وجوہات سے نہ شائع ہو سکیں اور بعد میں کتب خانوں کی زینت بن گئیں اور ہماری لاپرواہی نے ان کی طرف توجہ ہی نہ ہونے دی، درحقیقت ہمارے اسلاف کی ایسی ہی نہ جانے کتنی تحریریں ہیں جو کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں، ان کو منصۂ شہود پر لانے کی سخت ضرورت ہے کیوں کہ یہ ہماری بہت بڑی بھول ہوگی اگر یہ سمجھ بیٹھیں کہ اس طرح کے خطرناک فتنہ آج کے دور میں ختم ہو گئے ہیں لیکن یہ کسی انفرادی شخصیت کا کام نہیں بلکہ اس کے لئے ایک ایسی مضبوط علمی اکیڈمی کی ضرورت ہے جو منظم طور پر اسلاف کے سرمایہ علم کو بہتر سے بہتر شکل میں منصۂ شہود پر لانے کا کام کرے۔ اس کام کے پھیلاؤ اور اس کی اہمیت کے پیش نظر جامعہ

سلفیہ کے پلان کے ساتھ ہی ایک علمی اکیڈمی اور اس کے چھاپہ خانے کا ذکر اسلاف کرام بانیان جامعہ سلفیہ نے کیا تھا، لیکن قدر اللہ ماشاء فعل، اس موقع پر مولانا عبدالمتین بنارسی رحمہ اللہ کے وہ الفاظ ضرور یاد آتے ہیں جو آپ نے جامعہ سلفیہ (مرکزی دار العلوم) کی تاسیس کے موقع پر اپنے تاریخی خطبہ میں فرمایا تھا:

''ہم محسوس کرتے تھے کہ کاش کوئی ایسا ادارہ بن جائے جہاں عربی زبان کی اعلی ترین تعلیم ہو، جہاں قرآن وحدیث کی تعلیم کا بہترین نظم ہو، جہاں کے طلبہ کی دینی تربیت ایسی ہو کہ وہ جب درس گاہ سے فارغ ہو کر نکلیں تو دنیا کے سامنے اسلام کا عملی نمونہ پیش کریں۔

یہ خیال، یہ تصور اور یہ منصوبہ تھا کہ کوئی ایسی درسگاہ ہو جہاں قرآن وحدیث کی اعلی ترین تعلیم کے ساتھ زبان عربی اور ادب عربی کی بھی اعلی ترین تعلیم ہو، جہاں تصنیف وتالیف کا بھی ایک شعبہ ہو، جہاں سے حدیثوں کی کتابوں کی نشر واشاعت اور اس کی طبع کا بھی انتظام ہو اور جس سے ملک کے مختلف مدارس اور مکاتب ایک رشتے میں جڑے ہوں، ایک لنک اور ایک نقطۂ اجتماع ہو، جہاں ملک کے دوسرے مدارس کے مہتممین جمع ہو کر تعلیم، نصاب تعلیم اور تعلیم کے نصب العین سے متعلق مشورہ کریں اور مشورہ کر کے ایک پروگرام اور نصاب عمل بنائیں جس کے ماتحت تمام مدارس میں تعلیم کی یکسانیت اور ہمواری پیدا ہو'' (پندرہ روزہ ترجمان کا تاسیس نمبر، یکم و ۱۵ جنوری ۱۹۶۴ء)۔

قارئین معاف فرمائیں یہاں کسی کی شکایت کرنا مقصود نہیں بلکہ خود سے یہ شکایت ہے کہ تمام تر احساسات ذمہ داری کے باوجود مشغولیات زندگی اس کی اجازت نہیں دیتیں کہ اپنے آپ کو اس عظیم کام کے لئے مکمل وقف کیا جا سکے، لیکن وما توفیقی الا باللہ کے تحت جو کچھ ہو جا رہا ہے اسے احسان خداوندی ہی سمجھتا ہوں۔

زیرِ نظر کتاب میں مناظرِ اسلام مولانا ابو الوفاء ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کی جن تحریروں کو شامل کیا گیا ہے ان کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

۱۔حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق:

ان مضامین میں کتاب ''شرعۃ الحق'' از سید محب الحق صاحب بانکی پوری کا جواب دیا گیا ہے۔

۲۔دفاع عن الحدیث:

ان مضامین میں ''ایڈیٹر نگار'' کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔

۳۔تفسیر بالروایت:

ان مضامین میں ''مولانا اسلم جیراجپوری'' کے احادیث نبویہ پر اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔

۴۔بلاغ کا باطل گو نامہ نگار:

ان مضامین میں ''حق گو'' نامی شخص کی کتاب ''بلاغ الحق'' کا جواب دیا گیا ہے۔

۵۔تصدیق الحدیث: بیان الحق بجواب بلاغ الحق:

ان مضامین میں حافظ محب الحق صاحب کی کتاب ''بلاغ الحق'' کا جواب دیا گیا ہے۔

۶۔تصدیق الحدیث: حقیقت پسندی بجواب شخصیت پسندی:

ان مضامین میں ''چوہدری غلام احمد صاحب پرویز'' کے مضمون مطبوعہ ''ترجمان القرآن'' کا جواب دیا گیا ہے۔

۷۔تصدیق الحدیث: محدث اور فقیہ:

ان مضامین میں ''ایڈیٹر'' رسالہ ''ترجمان القرآن'' کے مقولہ کا جواب دیا گیا ہے۔

۸۔صلاۃ المؤمنین بجواب صلاۃ المرسلین:

ان مضامین میں ''میاں محمد مسلم حنیف اہل الذکر والقرآن'' کے اعتراضات کا جواب دیا گیاہے۔

مناظر اسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کی ان قیمتی تحریروں کوفرزند ارجمند عبدالاحد سلمہ نے بمشورہ مولانا محمد مستقیم سلفی حفظہ اللہ مختلف لائبریریوں سے اکٹھا کیا جس کے لئے ہم مولانا محترم کے تہ دل سے شکرگزاراور دعا گوہیں۔آج کے اس علمی بےتوجہی کے دور میں ایسے تحقیقی کاموں کے لیے کتنی محنت کرنی پڑتی ہے اسے اس میدان میں کرنے والے ہی جانتے ہیں، بہرحال کتاب کا مسودہ تیار ہونے کے بعد پوری کتاب کوحرفاً حرفاً ہم دونوں نے پڑھ کر اطمینان کیا نیز فرزند ارجمند نے اس پر جو تحقیقی کام کیا اور جو تخریج حدیث یا ضروری مقامات پر حدیث پر کلام کیا اس کوحتی الامکان اطمینان بخش بنانے کی کوشش کی، لیکن غلطی سے پاک صرف رب العالمین کی ذات ہے۔

اس موقع پر اللہ کے شکر کے بعد شکرگزاراور دعا گوہوں اپنے محب سبق کے ساتھی دوست داعی اسلام شیخ ظفر الحسن مدنی حفظہ اللہ کا جنہوں نے فرزند ارجمند کے حقیر مطالبہ پر ایک نہایت قیمتی اور گرانقدر مقدمہ لکھ کر کتاب کی افادیت میں چار چاند لگا دیا، اور موضوع کی اہمیت کومزید اجاگر کردیا، بلکہ اس فتنہ کی حقیقت، اس کی جڑیں اور برصغیر ہندوپاک میں اس کی مکمل تاریخ لکھ کر قارئین کے لئے کتاب کا سمجھنا آسان کردیا، فجزاہ اللہ عنا وعن المسلمین خیر الجزاء۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اس موقع پر ہم صوبائی جمعیت اہل حدیث ممبئی اور خصوصا اس کے امیر محترم فضیلۃ الشیخ مولانا عبدالسلام سلفی حفظہ اللہ کا شکریہ ادا نہ کریں جو ہمارے

اس علمی اور تحقیقی سفر میں برابر مصاحب ومعاون ہیں، اللہ تعالی آپ کو مزید حوصلہ عطا کرے اور کار خیر میں آگے بڑھنے کے لیے عمر دراز عطا کرے، اس قحط الرجال کے دور میں آپ ہی جیسے بلند حوصلہ حضرات کے تعاون سے خونِ جگر سے تیار کی ہوئی منتشر تحریریں قابل نشر واشاعت بن جاتی ہیں اور آگے کام کرنے کا حوصلہ بھی ملتا ہے۔ اس سے قبل مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی رحمۃ اللہ علیہ کی ردقادیانیت پر لکھی ہوئی تحریریں بعنوان ''ردقادیانیت'' آپ کے تعاون سے طبع ہوکر منظر عام پر آچکی ہے۔

اخیر میں اللہ تعالی سے دعا ہے کہ کتاب کو جملہ قارئین کے لیے مفید تر بنائے، اس کام میں جن لوگوں نے کسی طرح کا تعاون کیا ہے ان کو جزائے خیر سے نوازے، نیز ہمیں دین حنیف کی مخلصانہ اور مبنی بر حق خدمت کرنے کی توفیق ارزانی فرمائے، آمین۔

۱۲/رجب المرجب ۱۴۴۲ھ = ۲۴/فروری ۲۰۲۱ء

أحسن جمیل عبدالبصیر مدنی

أمیر ضلعی جمعیت اہل حدیث، بنارس

تقریظ

(از: فضیلۃ الشیخ عبداللہ ناصر الرحمانی حفظہ اللہ)

الحمد لله والصلاة والسلام على رسول الله، وبعد:

زیر مطالعہ علمی دستاویز درحقیقت ان گراں قدر رسائل ومکاتیب کا مجموعہ ہے، جسے وقتاً فوقتاً فاتح قادیان شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا، یہ رسائل طلبۃ العلم کے افادہ کے لئے اخبار اہل حدیث امرتسر کی مختلف جلدوں اور اشاعتوں میں طبع ہوتے رہے، جس سے تشنگانِ علم کو بھرپور استفادہ کا موقع میسر رہا، یہ تمام رسائل دفاع سنت کے عنوان سے معنون ہو سکتے ہیں، جنہیں شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے ان ملاحدہ کے رد میں تصنیف فرمایا جو شیطان کے بہکاوے میں آکر نیز بہت سے گمراہ کن سازشی عناصر کے آلۂ کار بنتے ہوئے انکارِ حدیث جیسے خطرناک مرض کا شکار ہو چکے تھے۔ **الْحَمْدُ لِلهِ الَّذِي عَافَانَا مِمَّا ابْتَلَاهُمْ بِهِ۔**

علماء اہل حدیث کے بہت سے خصائص اور تمیزات میں سے ایک انتہائی نمایاں خاصیت یہ ہے وہ دین اسلام کو اہل باطل کے دسائس وشبہات سے پاک صاف رکھنے کے لئے، ان کی سرکوبی کے لئے ہمیشہ مستعدر ہتے ہیں، تاکہ یہ دین متین اپنی اصلی شکل وصورت میں تا قیامِ قیامت محفوظ ومصون رہے۔

احقاق حق اور ابطالِ باطل کے فریضہ کی انجام دہی کے لئے علماء اہل حدیث ہی کو رسول اللہ ﷺ کی نیابت ووراثت حاصل ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان: ''**العُلَمَاءُ وَرَثَةُ الأَنْبِياءِ**'' اسی جماعت پر منطبق ہوتا ہے، انہی کی مسلسل جہود ومساعی کے نتیجہ میں حق (کتاب وسنت) آج تک محفوظ ہے اور اپنی اصلی شکل میں

موجود ہے، جونہی اہل باطل کا کوئی فتنہ حق پر یلغار کی سعی لاحاصل کی کوشش کرتا ہے، علماء اہل حدیث اس کی تردید وتفنید کے لئے تیار نظر آتے ہیں، گویا اس مشن کو انہوں نے ایک فریضہ کے طور پر اپنالیا ہے، فجزاھم اللہ عنا وعن المسلمین خیر الجزاء۔

سفیان ثوری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: ''**المَلاَئِكَةُ حُرّاسُ السَّماءِ، وأصْحابُ الحَدِيثِ حُرّاسُ الأرْضِ**'' (شرف اصحاب الحدیث للخطیب البغدادی) یعنی: فرشتے آسمان کے محافظ ہیں اور اہل الحدیث زمین کے۔

بصرہ کے عظیم محدث یزید بن زریع (المتوفی: ۱۸۲ھ) کا قول ہے: ''**لِكُلِّ دِينٍ فُرْسانٌ وفُرْسانُ هَذا الدِّينِ أصْحابُ الأسانِيدِ**'' (شرف اصحاب الحدیث) یعنی: ہر دین میں کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو گھوڑوں کی پشت پر سوار ہو کر باطل کی سرکوبی کا فریضہ انجام دیتے ہیں، اس دین کے شہسوار اہل اسناد یعنی محدثین ہیں۔

ہمارے ممدوح شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کو اس عظیم مشن میں ایک سرخیل کی حیثیت حاصل ہے، ان کے دور میں جس فرقہ الحاد نے سر اٹھانے کی کوشش کی، ان کے قلمِ سیال نے انتہائی مدلل انداز سے، شگفتگی سے بھرپور اسلوب کے ساتھ اس کی دھجیاں بکھیر دیں، اللہ تعالی کی خاص توفیق کے ساتھ ملحدین کی ہر سازش بری طرح ناکام ہوتی رہی، انہوں نے لسانی وقلمی دونوں طرح کے علمی جہاد کا علم ہمیشہ بلند رکھا اور کبھی باطل کو پنپنے کا موقع نہ دیا۔ ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشاءُ۔

شیخ الاسلام رحمہ اللہ کے زیر ادارت شائع ہونے والا اخبار موسوم بہ ''اخبار اہل حدیث امرتسر'' آپ کے افکار وردود کی اشاعت کا ایک انتہائی مضبوط ذریعہ تھا، جسے ان کے دور میں بڑی شہرت وپذیرائی حاصل تھی، یہ اخبار ہندوستان کے کونے کونے

میں پہنچتا اور تشنگانِ علم کی سیرابی کا ذریعہ بنتا۔

زیر نظر کتاب میں جن مقالات ورسائل کو شامل کیا گیا ہے، وہ ''اخبار اہل حدیث امرتسر'' ہی سے اٹھائے گئے ہیں، اور یہ قابل قدر کاوش ہمارے عزیز القدر فاضل بھائی مولانا عبدالاحد احسن جمیل آل عبدالرحمن حفظہ اللہ کے حصہ میں آئی، اللہ تعالی نے بتوفیقہ انہیں یہ سعادت ارزاں فرمائی کہ انہوں نے مذکورہ اخبار کی ورق گردانی کرتے ہوئے، شیخ الاسلام رحمہ اللہ کے دفاعِ حدیث سے متعلق مقالات ورسائل الگ کئے اور انہیں کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام کیا، جو ان کے علمی ذوق اور نفاستِ طبع کا مظہرِ اتم ہے۔

جرائد واخبارات ایک ہی بار شائع ہوکر گوشۂ گمنامی میں چلے جاتے ہیں اور ان کے اندر موجود مضامین خواہ کتنے ہی علمی ہوں، ساتھ ہی دفن ہوجاتے ہیں، اس صورتِ حال میں شیخ عبدالاحد حفظہ اللہ ہماری طرف سے تشکر کے جذبات سے بھرپور، ثناءِ جمیل کے مستحق ہیں جنہوں نے بڑی محنت کے ساتھ ان جرائد کے بطن سے ان علمی مضامین کا انتخاب کرکے انہیں کتابی شکل دی، **فَمَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ**۔

کتاب کی قیمت وفضیلت کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ یہ فاتح قادیان رحمہ اللہ کے علمی افادات کا مرقع ہے، لیکن ہمارے بھائی مولانا عبدالاحد حفظہ اللہ نے موقع بہ موقع علمی تعلیقات اور نصوص کی تخریج کے ساتھ اس کتاب کو چار چاند لگا دیئے، مزید براں اشاعت کے عصر حاضر کے جدید تقاضوں کو بھی مدنظر رکھا، جس سے کتاب کے حسن میں مزید نکھار پیدا ہوگیا۔

اس کتاب کی اشاعت عصر حاضر کی بہت بڑی ضرورت تھی، منکرین حدیث جیسی ملحد جماعت کا کوئی تسلسل تو نہیں ہے، مگر گاہے بگاہے ان کے بیکار انڈوں سے چوزے

پیدا ہوتے رہتے ہیں، جو اپنے پلید ذہنوں سے فضول قسم کے شبہات پیدا کر کے سادہ لوح عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، ان ملحد قسم کے لوگوں کی زیادہ یلغار پاکستان وہندوستان کے بعض علاقوں میں موجود ہے، ان کی تفنید کے لئے اور دین حق کو ان کے دسائس سے محفوظ رکھنے کے لئے کتاب ہذا کی اشاعت ایک زبردست کارنامہ ہے، جس پر وہ تمام احباب جو اس کی اشاعت میں شریک ہیں ہماری دعاؤں کے مستحق ہیں۔

کسی منکرِ حدیث کو دیکھ کر ساتھی غیظ وغضب کی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں، یہ ایک طبعی معاملہ ہے، کسی ملحد کو دیکھ کر طبیعت کا تکدر لازمی امر ہے، مگر مجھے یک گونہ خوشی حاصل ہوتی ہے؛ کیونکہ کسی منکرِ حدیث کو دیکھ کر میرا ایمان تازہ ہوجاتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی حقانیت مزید پختگی کے ساتھ ثابت ہوجاتی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس دور میں جب کہ آپ کے اصحابِ کرام کا ایک جم غفیر موجود تھا، جن کے دل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کی محبت سے لبریز تھے، جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لعابِ دہن تک کو زمین پر گرنے نہیں دیتے تھے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس مبارک دہن سے صادر ہونے والے فرامین کی کس قدر حفاظت کرتے ہوں گے اور کس قدر محبت کرنے والے ہوں گے۔

اس عظیم معاشرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کسی حدیث کا انکار کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث ارشاد فرمائی، آپ بھی سن لیجئے:

عَنِ المِقْدامِ بْنِ مَعْدِ يكَرِبَ الكِنْدِيِّ رضی اللہ عنہ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ حَرَّمَ أَشْياءَ يَوْمَ خَيْبَرَ الحِمارَ وغَيْرَهُ. ثُمَّ قالَ: "لَيُوشِكُ الرَّجلِ مُتَّكِئًا عَلى أرِيكَتِهِ، يُحَدَّثُ بِحَدِيثِي فَيَقُولُ: بَيْنَنا وبَيْنَكُمْ كِتابُ

اللَّهِ، ما وجَدْنا فِيهِ مِن حَلالٍ، اسْتَحْلَلْناهُ، وما وجَدْنا فِيهِ مِن حَرامٍ، حَرَّمْناهُ، ألا وإنَّ ما حَرَّمَ رَسُولُ اللَّهِ، فهُوَ مِثْلُ ما حَرَّمَ اللَّهُ تَعالى"۔ (سنن دارمی: ۱/ ۴۷۳)۔

یعنی: مقدام بن معدیکرب الکندی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوم خیبر کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا، پھر فرمایا: عنقریب ایک شخص ایسا آئے گا جو اپنی مسند پر ٹیک لگائے بیٹھا ہوگا، جسے میری کوئی حدیث بتائی جائے گی اور وہ (بڑی ڈھٹائی سے) کہے گا: ہمارے اور تمہارے درمیان قرآن کافی ہے، جو چیزیں ہم قرآن میں حلال پائیں اسے حلال مانیں گے اور جو چیزیں قرآن میں حرام پائیں اسے حرام مانیں گے، اور بلاشبہ جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی حدیث میں حرام کہہ دیں وہ ایسے ہی ہے جیسے اللہ تعالی نے حرام فرمایا ہو۔

صحابہ کرام کا معاشرہ جو محبتِ رسول اور محبتِ حدیث کا آئینہ دار تھا، اس میں ایسے عناصر کو یقینا عجیب وغریب سمجھا گیا ہوگا، بھلا کوئی کلمہ گو بدنصیب ایسا ہوسکتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کا انکار کرے، لیکن ہمارے معاشرے میں، ہماری نگاہوں کے سامنے ایسے نجس افراد موجود ہیں جو انکارِ حدیث کی جرأت وجسارت کرتے ہیں، جنہیں دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صدقِ نبوت پر ایمان مزید بڑھ جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہورہی ہے۔ فللہ الحمد والمنۃ۔

آخر میں اپنے دور کی وحید وفرید شخصیت، شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کے لئے اس خدمت جلیلہ کی انجام دہی پر ڈھیروں دعائیں، **قَدَّسَ اللهُ رُوْحَهُ وَتَغَمَّدَهُ بِلُطْفِهِ وَكَرَمِهِ وَرِضْوَانِه وَجَعَلَ الْفِرْدَوْسَ مَثْوَاهُ**۔

اللہ تعالی اس کتاب کے نفع کو عام فرمادے اور اسے اس بھکتی سسکتی انسانیت کے

لیے ذریعۂ ہدایت بنادے، اور وہ تمام احباب جو کسی نہ کسی طور اس کی اشاعت میں شامل ہیں اسے ان سب کے لیے میزان حسنات کا سرمایہ بنادے، آمین۔

خصوصی دعا برادرِ عزیز شیخ عبدالاحد حفظہ اللہ کے لیے جن کی کوشش سے یہ انتہائی علمی اور نفیس سرمایہ منظر عام پر آیا، ہم ان سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ یہ کام آخری نہ ہو بلکہ اسی نہج پر مسلک اہل حدیث کی خدمت کا سلسلہ جاری وساری رہے اور بالخصوص دفاعِ حدیث کا علم سربلند رکھیں کہ یہ ہمارا ہی کرنے کا کام ہے، اللہ تعالی ہم سب کو اپنے پیارے رسول ﷺ کا حقیقی جانشین بننے کی توفیق عطا فرمادے۔ وَمَا ذٰلِکَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيزٍ۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى نَبِيِّهِ مُحَمَّدٍ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ

كتبه:

عبداللہ ناصر الرحمانی

۱/رجب المرجب ۱۴۴۲ھ = ۱۳/فروری ۲۰۲۱ء

مقدمہ

انکارحدیث اوراس کے اسباب

(از: فضیلۃ الشیخ ظفرالحسن مدنی)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلاۃُ وَالسَّلامُ عَلَی أَشْرَفِ الأَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ وَعَلَی آلِہِ وَصَحْبِہِ أَجْمَعِیْنَ وَمَنْ تَبِعَھُمْ بِإِحْسَانٍ إِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ، أَمَّا بَعْدُ:

قال ربنا عزوجل: ﴿بِٱلۡبَيِّنَٰتِ وَٱلزُّبُرِۗ وَأَنزَلۡنَآ إِلَيۡكَ ٱلذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيۡهِمۡ وَلَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُونَ﴾[النحل:۴۴]۔

علامہ محمد فاخرزائرالہ آبادی متوفی (۱۱۶۴ھ=۱۷۵۱م) رحمہ اللہ کی دعوت وتبلیغ، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی متوفی (۱۱۷۶ھ مطابق ۱۷۶۳م) کی تدریسی وتصنیفی خدمات، اسی طرح علامہ مرزا مظہر جان جاناں شہید رحمہ اللہ متوفی (۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۱م) کے مکتوبات کے ذریعہ جب ہندوستان میں اتباع کتاب وسنت اور طرزِ سلف پر عمل کرنے کا لوگوں کے دلوں میں جذبہ پیدا ہوا اور صدیوں کا تقلیدی جمود ٹوٹنے لگا تو لوگوں میں ایک قسم کی ہلچل اور کھلبلی مچ گئی لیکن یہ کتاب وسنت کے داعی بڑی حکمت عملی سے کتاب وسنت کی دعوت دیتے رہے کسی بھی قسم کی ہنگامہ آرائی نہیں ہوئی مخالفتیں تو ہورہی تھیں مگران حضرات نے اپنا کام جاری رکھا بالآخراسی کے سبب علامہ مرزا مظہر جان جاناں رحمہ اللہ کو شیعوں کے ہاتھوں شہید کردیا گیا۔

ان حضرات کے بعدان کے تلامذہ نے اس دعوت کو بڑی حکمت وبصیرت کے ساتھ

آگے بڑھایا، علامہ معین الدین سندھی رحمہ اللہ متوفی (۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ م)، علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ متوفی (۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ م)، اسی طرح شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی متوفی (۱۲۳۹ھ مطابق ۱۸۲۴ م)، ان حضرات نے اپنے اپنے انداز میں کتاب وسنت کی دعوت کو آگے بڑھایا، **فجزاهم الله خيرا**۔

علامہ معین الدین نے اتباع سنت اور ردتقلید کے موضوع پر ایک ضخیم کتاب بنام (دراسات اللبیب) تالیف کی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ حنفی مذہب پر عمل کرنے کے باوجود اپنی تفسیر مظہری اور دیگر تصانیف میں تقلید جامد کی مخالفت کی اور اتباع سنت پر عمل کرنے کی تاکید کی ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کیوں کہ اپنے والد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خلیفہ وجانشین تھے اس لیے ان کی تدریس کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے تقلید ترک کر کے عمل بالکتاب والسنہ شروع کیا اور اعلانیہ طور پر مسلک سلف اور اہل حدیث کا منہج اختیار کیا، اپنی دعوت وتبلیغ اور تصانیف کے ذریعہ لوگوں کو تمسک بالکتاب والسنہ پر عمل اور ترک تقلید کی دعوت دینے لگے، جن میں ان کے دونوں بھتیجے شاہ اسماعیل شہید بن عبدالغنی اور شاہ مخصوص اللہ بن شاہ رفیع الدین متوفی (۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۷ م) (شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ سے تعلیم مکمل کی، اتباع سنت میں بڑے سخت تھے، ساری زندگی تعلیم وتعلم اور درس وتدریس میں مشغول تھے اس کے علاوہ کوئی اور مشغلہ اپنایا ہی نہیں، مسجد واقع قاضی والہ میں ان کی بزم علم وہدایت آراستہ تھی) آمین بالجہر اور رفع الیدین پر عامل تھے اور داعی بھی تھے جو علانیہ طور پر میدان میں آئے اور ﴿وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ﴾ [المائدۃ:۵۴] اور ﴿ٱلَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَٰلَٰتِ ٱللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُۥ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا ٱللَّهَ ۗ وَكَفَىٰ بِٱللَّهِ حَسِيبًا﴾ [الاحزاب:۳۹] کے

مصداق بنے، جس سے لوگوں میں بڑا انقلاب پیدا ہوا بہت سارے لوگ کھل کر کتاب وسنت پر عمل کرنے لگے اور تقلید کو زندگی بھر کے لیے ترک کردیا۔

شاہ مخصوص اللہ رحمہ اللہ تو کم عمری ہی میں وفات پاگیے اور شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ متوفی (۱۸۳۱ھ) بالاکوٹ میں شہید ہوگئے مگر ان کی زندگی ہی میں ان کے شاگردوں اور ان کی دعوت قبول کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد برصغیر کے تمام علاقوں، مشرق ومغرب اور شمال وجنوب میں دعوت وتبلیغ کی غرض سے پھیل چکے تھے اور دعوت واصلاح کا کام پورے زور شور سے چل رہا تھا، لوگ بڑی کثرت سے توحید وسنت اور صراط مستقیم قبول کرر ہے تھے، ان کے اخلاص واخلاق کی برکت سے شرک وبدعت کا خاتمہ ہورہا تھا، توحید خالص اور اتباع سنت کے شوق وذوق کا لوگوں میں یہ حال تھا کہ نواب صدیق حسن رحمہ اللہ اپنے والد اولاد حسن قنوجی رحمہ اللہ کے متعلق کہتے ہیں کہ میرے والد کی دعوت وتبلیغ کی برکت سے اہل اسلام میں سے کتنے لوگوں نے اپنے عقائد واعمال کی اصلاح کی اس کی تعداد معلوم کرنا ہمارے لیے ناممکن ہے، مگر اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی دعوت وتبلیغ سے (۱۰) دس ہزار کے قریب غیر مسلم ایمان لایے تھے۔

اسی طرح علمائے صادق پور، مولانا محمد علی رامپوری، ان کے بھائی حیدر علی رامپوری، مولانا خرم علی بلہوری رحمہم اللہ وغیرہم اس دعوت حقہ کی نشر واشاعت میں اخلاص کے ساتھ مشغول تھے۔

جب (۱۲۳۹ھ مطابق ۱۸۲۴م) میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کی وفات ہوگئی تو مسند ولی اللہ کی جانشینی اور شاہ عبدالعزیز کی خلافت شاہ محمد اسحاق رحمہ اللہ متوفی (۱۲۶۲ھ) کو ملی جو کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کے نواسے تھے

جنہوں نے شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین رحمہم اللہ وغیرھم سے تعلیم حاصل کی تھی، جن کے متعلق شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ میری تقریر اسماعیل شہید، تحریر رشید الدین، اور تقوی اسحاق نے لے لیا، شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنی زندگی ہی میں شاہ اسحاق کو امامت کے لیے مقرر کر رکھا تھا، شاہ محمد اسحق رحمہ اللہ اتباع سنت کے شوق اور ترویج کے ارادہ سے عمامہ کے بغیر صرف ٹوپی پہن کر نماز پڑھا دیتے تھے (جب کہ لوگ اس زمانہ میں عمامہ پہن کر نماز پڑھانا ضروری سمجھتے تھے) اس لیے بعض غالی قسم کے لوگوں نے شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ سے شکایت کیا کہ محمد اسحاق بغیر عمامہ کے نماز پڑھاتے ہیں تو ایک مرتبہ شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ نے غصہ میں آکر فرمایا کہ ابھی تو اسحاق ٹوپی رکھ کر نماز پڑھاتا ہے آئندہ میں اس کو حکم دے دوں گا کہ ننگے سر نماز پڑھائے اور دنیا کو اس کی اقتدا کرنی ہوگی۔ (الحیات بعد المات، ص:۳۸)۔

شیخ الکل میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ متوفی (۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۲م)

شاہ محمد اسحاق رحمہ اللہ جب ایک عرصہ دراز کے بعد ۱۲۵۸ھ میں ہجرت کر کے مکہ معظّمہ جانے لگے تو اپنا جانشیں اور مسند ولی اللہ کا وارث شیخ الکل میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ کو بنا دیا جس مسند پر بیٹھ کر میاں صاحب رحمہ اللہ نے ساٹھ سال تک مسلسل کتب ستہ (بخاری، مسلم، ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) اور دیگر کتب احادیث کا درس دیتے رہے۔

میاں صاحب کی اس تدریسی خدمات کی برکت سے پورا برصغیر حدیث کی ضیاء پاشیوں سے بقعہ نور بن گیا اور ہر طرف سے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دل آواز صدائیں آنے لگیں، صرف برصغیر ہی نہیں بلکہ عرب وعجم بخارا سمرقند دنیا کے چاروں طرف سے علم حدیث پڑھنے کے لیے میاں صاحب اور ان کے تلامذہ کے پاس تشنگانِ

علم پہنچنے لگے اور لوگوں کے دلوں میں کتاب وسنت پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا ہونے لگا اور عمل کے ساتھ حدیث کی نشر واشاعت اور اس پر عمل کرنے کی دعوت وتبلیغ بھی ہونے لگی، تحریک احیاءِ سنت اور اتباع سلف صالحین ہر چہار سو عام ہوگئی، ﴿وَمَا تَفَرَّقَ ٱلَّذِينَ أُوتُواْ ٱلۡكِتَٰبَ إِلَّا مِنۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ ٱلۡبَيِّنَةُ ۝٤ وَمَآ أُمِرُوٓاْ إِلَّا لِيَعۡبُدُواْ ٱللَّهَ مُخۡلِصِينَ لَهُ ٱلدِّينَ حُنَفَآءَ وَيُقِيمُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَيُؤۡتُواْ ٱلزَّكَوٰةَۚ وَذَٰلِكَ دِينُ ٱلۡقَيِّمَةِ﴾ [البینہ:۵-۴]۔

علماء اہل حدیث کی حدیثی خدمات وحمایت میں جدوجہد:

ان مبارک کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد علماء اہل حدیث نے باقاعدہ تحفظ سنت اور حدیث کی نشر واشاعت کی مخلصانہ کوششوں کے ذریعہ تاویلات باطلہ اور تحریفات فاسدہ سے امت مسلمہ کو بچایا، اور ان کا پردہ چاک کیا اور کتب ستہ اور دیگر کتب پر محدثانہ انداز پر حاشیہ لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔

۱۔ حافظ محمد لکھوی رحمہ اللہ نے جو کہ میاں صاحب رحمہ اللہ کے تلمیذ رشید تھے (۱۲۷۱ھ) میں سنن ابوداود پر نہایت علمی اور دقیق حاشیہ لکھا اور طبع کرایا۔

۲۔ علامہ محمد علوی حیدر آبادی رحمہ اللہ عون الودود نامی سنن ابوداود کی ایک مختصر شرح لکھی، (پاک وہند میں علماء اہل حدیث کی خدمات، ص:۱۲۷)۔

۳۔ علامہ عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ نے فیض الودود نامی حاشیہ لکھا مگر مکمل نہ ہوا۔

۴۔ علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ نے ''ھدایۃ اللوذعی بنکات الترمذی'' لکھی ہے۔

۵۔ علامہ شمس الحق عظیم آبادی نے تعلیقات علی سنن النسائی لکھی۔

٦۔ علامہ شیخ ابوعبدالرحمن پنجابی رحمہ اللہ جو کہ ہندو مذہب ترک کر کے مسلمان ہوئے تھے دیوبند سے فراغت حاصل کرنے کے بعد شیخ الکل میاں نذیر حسین محدث دہلوی سے حدیث پڑھی اور اہل حدیث ہو گئے، حافظ عبدالمنان سے بھی شرف تلمذ حاصل تھا، انہوں نے بھی سنن النسائی پر الحواشی الجدیدۃ کے نام سے بڑا قیمتی اور علمی حاشیہ لکھنا شروع کیا تھا اور دوتہائی حاشیہ لکھ بھی چکے تھے کہ اجل آ پہنچا اور مکمل نہ کر سکے آپ کے بعد میاں صاحب رحمہ اللہ کے ایک دوسرے شاگرد مولانا ابویحیی محمد بن کفایت اللہ شاہجہاں پوری رحمہ اللہ متوفی (١٩٢٠ م) حاشیہ کی تکمیل کی۔

٧۔ علامہ بھوجیانی رحمہ اللہ نے: حافظ جلال الدین سیوطی متوفی (٩١١ ھ) رحمہ اللہ کی زھر الربی علی المجتبی، علامہ ابوالحسن السندھی الکبیر متوفی (١١٣٨ ھ) کا حاشیہ جو کہ حاشیۃ السندی سے مشہور ہے، علامہ حسین بن محسن انصاری الیمنی رحمہ اللہ کی تعلیقات لطیفہ، علامہ ابوعبدالرحمن پنجابی رحمہ اللہ کی حواشی جدیدہ، ان چاروں حواشی کو مزید اضافوں کے ساتھ جمع کر کے التعلیقات السّلفیہ کے نام سے شائع کیا جس کو عرب وعجم کے سارے اہل علم نے پسند کیا۔

٨۔ علامہ الشیخ محمد بن عبداللہ العلوی پنجابی حیدر آبادی متوفی (١٣٠٠ ھ تقریباً) شاگرد العلامہ حسین بن محسن الانصاری نے سنن ابن ماجہ پر ایک مفصل علمی اور قیمتی حاشیہ لکھا جس کو شرح ابن ماجہ بھی کہا جا سکتا ہے، آج بھی وہ مطبوع اور متداول ہے۔

٩۔ حافظ محمد لکھوی جو میاں صاحب کے بڑے شاگردوں میں سے ہیں نے ''مشکاۃ المصابیح'' پر حاشیہ لکھ کر شائع کیا جس کو علماء اور طلاب علم نے بہت پسند کیا، اور غالبا یہ مشکاۃ المصابیح پر علماء اہل حدیث کا سب سے پہلا حاشیہ ہے۔

١٠۔ علامہ سید احمد حسن محدث دہلوی متوفی (١٩٢٠ م) تلمیذ رشید شیخ الکل میاں نذیر

حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ نے مشکاۃ المصابیح کی تخریج احادیث اور مختصر شرح اور احادیث کے معنی کی وضاحت کی جو طلبہ اور معلمین سب کے لیے یکساں فائدہ مند ہے جس کو اہل علم بہترین حاشیہ کہتے ہیں مولانا احمد حسن محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اس کتاب کو تالیف کر کے نصف اول کی دو جلدیں طبع کرائیں باقی نصف ثانی آخر کی دو جلدیں مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی رحمہ اللہ نے ان کی نگرانی میں مکمل کیں، جس کو مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ نے ۱۹۸۳م میں طبع کرایا، آج بحمد اللہ تعالی وفضلہ یہ علمی ذخیرہ تنقیح الرواۃ فی تخریج أحادیث المشکاۃ کے نام سے چار ضخیم جلدوں میں مطبوع موجود ہے۔

۱۱۔ حدیث کی سب سے پہلی کتاب جو مدارس میں پڑھائی جاتی ہے خصوصا اہل حدیث مدارس میں وہ بلوغ المرام ہے علامہ سید احمد حسن محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اس پر ایک جامع حاشیہ لکھا جو آج بھی اہل عرب وعجم میں حاشیۃ الدھلوی سے مشہور ہے۔

حدیث میں شکوک وشبہات پیدا کر کے حدیث سے اعتماد ختم کرنے کی سازش:

مولانا حمید الدین فراہی متوفی (۱۹۳۰ء) اپنے ابتدائی دور میں ایک عرصہ تک سرسید احمد خان کے قائم کردہ علی گڑھ کالج جو کہ بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کر گیا میں استاذ تھے فراہی صاحب وہیں سرسید احمد خان کے گمراہ کن افکار اور ضلالت وگمراہی سے خوب متاثر ہوئے اور حدیث سے اعراض کرنا اپنی زندگی کا مقصد بنالیا، بعد میں وہ علی گڑھ کالج چھوڑ کر واپس اپنے جائے پیدائش اعظم گڑھ آ گئے اور قصبہ سرائمیر اعظم گڑھ میں ایک مدرسہ قائم کیا جو مدرسہ الاصلاح کے نام سے آج بھی قائم ہے اور مدرسہ میں نظم قرآن کے نام پر انکار حدیث کے فتنہ کی داغ بیل ڈالی، فراہی صاحب کے بعد ان کے افکار باطلہ اور نظریات مضللہ کے وارث ان کے

شاگرد امین اُحسن اصلاحی بنے جنھوں نے اپنی تصنیف تدبر قرآن اور تدبر حدیث نیز اپنی دیگر تصانیف کے ذریعہ اس فتنہ کو پھیلایا جس سے منکرین حدیث اور ملحدین نے خوب فائدہ اٹھایا، احادیث کا انکار اور احادیث میں شکوک وشبہات کو پیدا کرنا دین کی سب سے بڑی خدمت قرار دیا، منکرین حدیث کی خوب حوصلہ افزائی ہوئی محدثین اور ان کی مؤلفات اور تمام کتب احادیث میں شکوک وشبہات پیدا کر کے ان کو نا قابل اعتبار قرار دیا، اور ابھی موجودہ دور میں مشہور ملحد اور ملحدانہ افکار ونظریہ کا پھیلانے والا جاوید احمد غامدی انہیں مولانا اصلاحی صاحب کا شاگرد ہے۔

ان افکار باطلہ اور ملحدانہ نظریات کے رد میں بہت سے علماء اہل حدیث اور غیر اہل حدیث نے اپنا قلم اٹھایا اور ان تمام فتنوں سے عوام وخواص کو آگاہ کیا۔

مولانا محمد اسماعیل صاحب شیخ الحدیث گوجرانوالہ امیر جمعیت اہل حدیث پاکستان رحمہ اللہ کی کتاب ''حجیت حدیث'' اور دیگر مقالات میں اس ملحدانہ افکار ونظریات کی قابل دید تردید کی گئی ہے اور اس فکر کی اچھی طرح نقاب کشائی کی گئی ہے۔

اسی طرح مولانا حافظ عبداللہ روپڑی رحمہ اللہ نے بھی علمی اور دقیق انداز میں اس باطل نظریہ پر تنقید کیا اور اس کا جائزہ لیا ہے جو مطبوع شکل میں آج بھی موجود ہے۔

نیز شیخ غازی عزیر حفظہ اللہ نے امین احسن اصلاحی کی کتاب ''تدبر حدیث'' کے رد میں ''**فتنہ انکار حدیث کا ایک نیا روپ**'' کے نام سے ایک جامع کتاب لکھی جس میں اس خطرناک نظریہ کی مکمل وضاحت کر کے اس کے اسلام مخالف ہونے کی وجہ بھی بیان کی، یہ کتاب بھی مطبوع، موجود ہے۔

آخر میں حافظ صلاح الدین یوسف رحمہ اللہ نے اس فراہی فکر جس کی ابتداء سر سید احمد خان نے کی ان سے گزرتی ہوئی مولانا حمید الدین فراہی اور ان سے مولانا امین

احسن اصلاحی پھر ان سے جاوید احمد غامدی ملحد تک پہنچی ہے اس کا تفصیلی جائزہ اور پورے گروہ کی ملحدانہ افکار ونظریات اور کوششوں کا پردہ فاش کرنے لے لیے دو ضخیم کتابیں لکھی ہیں:

ایک کتاب (فکر فراہی) ہے، اور دوسری (مولانا امین احسن اصلاحی اپنے حدیثی وتفسیری خدمات کی روشنی میں) ہے، یہ دونوں کتابیں مطبوع ہیں اور بڑی اہم معلومات کا ذخیرہ ہیں۔

ان حضرات کے علاوہ دوسری جماعتوں کے اہل قلم نے بھی ان کے رد میں لکھا ہے اس اعتبار سے ان کی خدمات بھی قابل تحسین ہیں۔

حافظ صلاح الدین یوسف رحمہ اللہ جنہوں نے اس گروہ کے عقائد اور افکار ونظریات کا خوب اچھی طرح مطالعہ کیا تھا، اس گروہ کے متعلق اپنا تجرباتی تجزیہ تحریر فرماتے ہیں:

''یہ گروہ اس لحاظ سے بہت خطرناک ہے کہ ظاہری طور پر یہ حدیث کی حجیت کو ماننے کا دعوے دار ہے مگر بباطن حدیث کی بنیادوں پر تیشہ چلا رہا ہے اور چور دروازوں سے حدیث کے آہنی حصار میں شب خون مارنے میں مصروف ہے اس لیے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ کھلے دشمنوں کی تردید کے ساتھ ساتھ آستین کے ان سانپوں کو بھی پوری قوت سے کچلنے کا اہتمام کیا جائے۔

افسوس ہے کہ بہت سے لوگوں کو اس فتنہ کی اصلیت وحقیقت سے واقفیت ہی حاصل نہیں اور جنہیں کچھ پتہ ہے وہ خاطر خواہ اس محاذ پر سرگرم نہیں ہیں دراں حالیکہ یہ گروہ اپنی باطنیت اپنے مذموم عزائم اور دسیسہ کاریوں کی وجہ سے زیادہ خطرناک ہے''۔ (عظمت حدیث، ص:۱۵)۔

علامۂ زماں شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل صاحب گوجرانوالہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:
جدید قیادتوں (مودودی اور اصلاحی فکر) کے طریق فکر اور اہل حدیث کے طریق فکر میں کھلا ہوا اختلاف ہے، قدم اٹھانے سے پہلے پوری طرح سوچنا چاہیے اور جدید نظریات کے احتساب سے گھبرانا نہیں چاہیے، مسائل چھان پھٹک اور بحث ونظر سے حاصل ہوتے ہیں زبان درازی سے نہیں، میری رائے میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے نظریات نہ صرف مسلک اہل حدیث کے خلاف ہیں بلکہ یہ نظریات تمام ائمہ حدیث کے بھی خلاف ہیں، ان میں آج جدید اعتزال وتجہم کے جراثیم مخفی ہیں''۔(حجیت حدیث، ص:۱۵۸)۔

درایت اور تفقہ راوی:

تمام امت کا اس بات پر اجماع اور اتفاق تھا کہ اگر راوی ثقہ (معتبر) ہے تو اس کی روایت (خبر واحد) قابل قبول اور قابل حجت ہے اہل سنت، خوارج، شیعہ، قدریہ سب کا یہی خیال تھا اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں تھا مگر پہلی صدی ہجری کے بعد معتزلہ متکلمین پیدا ہوئے انہوں نے پوری امت مسلمہ کی مخالفت کی اور کہا کہ خبر واحد گرچہ راوی ثقہ ہو وہ معتبر اور قابل حجت نہیں ہے اور اسی نظریہ کے تحت معتزلہ نے سیکڑوں احادیث کا انکار کردیا۔(إحکام الأحکام لابن حزم، الصواعق المرسلہ)۔

معتزلہ کا سنت پر یہ حملہ ایسا خطرناک اور عقل پرستوں کے لیے مفید تھا کہ معتزلہ کے اس خطرناک نظریہ سے صرف اہل حدیث اور حنابلہ محفوظ رہے، احناف، موالک، شوافع وغیرہ میں سے بعض لوگ اعتزال سے متاثر تھے اور اسے پسند کرتے تھے وہ مسائل فرعیہ میں احادیث کو مانتے تھے اور خبر احاد کو ظنی سمجھتے تھے۔

احناف میں سے بشر المریسی متوفی (۲۲۸ھ) تو بالکل کھلے معتزلی تھے، قاضی عیسی

بن اُبان متوفی (۲۲۱ھ) جو کہ امام محمد بن حسن شیبانی کے شاگرد ہیں وہ بھی معتزلی تھے اور خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے تو لکھا ہے کہ وہ خلق قرآن کے قائل تھے۔

انہوں نے یہ اصول گڑھا کہ عادل ضابط اور ثقہ راوی اگر فقیہ نہیں ہے تو اگر اس کی روایت کردہ حدیث ہمارے قیاس کے خلاف ہوں تو وہ قابل قبول نہیں: ''**وأمّا رِوايَةُ مَن لَمْ يُعْرَفْ بِالفِقْهِ ولَكِنَّهُ مَعْرُوفٌ بِالعَدالَةِ والضَّبْطِ مِثْلُ أبِي هُرَيْرَةَ وأنَسِ بْنِ مالِكٍ - رضي الله عنهما- فَإنْ وافَقَ القِياسَ عُمِلَ بِهِ، وإنْ خالَفَهُ لَمْ يُتْرَكْ إلّا بِالضَّرُورَةِ**'' (اصول بزدوی ، حجیت حدیث: ص: ۱۴۵)۔

کیوں کہ عیسی بن اُبان عقیدہ میں معتزلی تھے اور فروعات میں حنفی تھے اس لیے متاخرین احناف نے بھی اس کا اصول قبول کیا، فقہ اور اصول فقہ میں اسی کو بنیاد بنا کر بہت سے اصول وفروع تخریج کیے گئے اور بعض مقامات پر حدیث صحیح صریح میں باطل تاویل اور تحریف کی گئی۔

مشہور حدیث (**لَعَنَ اللهُ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهُ**) کیوں کہ یہ حدیث احناف کے یہاں مروجہ حلالہ کے خلاف پڑتی ہے اس لیے عینی حنفی حاشیہ کنز الدقائق میں اس کی یہ تاویل کی اور لکھا کہ (**لَعَلَّهُ أرَادَ بِاللَّعْنَةِ الرَّحْمَةُ**) (حجیت حدیث، ص: ۱۴۶)۔

ان چیزوں سے پتہ چلتا ہے کہ حنفی مذہب میں اعتزال اور معتزلہ کا کتنا دخل ہے۔

اصول فقہ کے بہت سے مصنفین معتزلہ ہیں گرچہ وہ فروعات میں حنفی ہوں اس طرح احناف خصوصا عقائد واعمال دونوں میں معتزلہ سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ (جس کی تفصیل کشف الظنون، حجۃ اللہ البالغہ، ابجد العلوم وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہے)۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور بہت سے اہل علم نے بالکل صراحت کردی ہے کہ فقہ رواۃ اور درایت کی شرط قبولیت حدیث اور حجیت میں صرف عیسی بن اُبان کا قول ہے اور بہت سے متأخرین فقہاء احناف اس مسئلہ میں ان کے ہمنوا بن گئے حالانکہ امام کرخی اس کے مخالف ہیں قدماء احناف میں سے کسی سے بھی یہ منقول نہیں۔ (حجۃ اللہ البالغۃ)

جب ہندوستان میں عمل بالحدیث رواج پانے لگا اور تقلیدی جمود ختم ہونے لگا تو علامہ شبلی نعمانی نے حنفیت کی حفاظت اور اہل الرائے (فقہاء کوفہ) اور ان کی فقہ کی فوقیت اور برتری ثابت کرنے کی غرض سے سیرۃ النعمان نامی ایک کتاب تالیف کی جس میں اسی معتزلی فکر فقہ اور درایت راوی کا اصول پیش کر کے تفقہ کے نام پر اس اصول کو اس قدر اہمیت دی کہ جس سے حدیث اور محدثین کے مسلک کو بالکل غیر معتبر اور ناقابل عمل قرار دے دیا، اہل الحدیث اور محدثین سے اس قدر نفرت لوگوں کے دلوں میں پھیلائی کہ لوگوں سے کہتے تھے کہ ایک مسلمان عیسائی تو ہوسکتا ہے مگر اہل حدیث نہیں ہوسکتا۔

کتب احادیث اور ان کے مؤلفین کو غیر فقیہ کہتے تھے اور کہتے کہ انہوں نے حدیث کی صحت وضعف کے لیے جو اصول مرتب کیے ہیں۔ جن پر لوگ خیر القرون سے عمل کرتے آرہے تھے، ان لوگوں نے صحت وضعف کے لیے جو اصول مقرر کیا ہے اس میں ان لوگوں نے درایت کو نظر انداز کردیا ہے صرف ہمارے فقہاء نے درایت کے مطابق تنقید کی ہے۔

اس لیے علماء اہل حدیث نے اپنی بھرپور کوششوں کے ذریعہ اس نظریہ کی علمی انداز سے تردید کی اور اس نظریہ کے نقصانات اور مضرات کو واضح کیا اور اس کے رد میں جن

علماء اہل حدیث نے سب سے پہلے میدان میں آ کر حدیث اور منہج سلف کی حمایت وحفاظت کی، ان میں شیخ الکل میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ کے تین بڑے شاگرد تھے، جن کو یہ شرف حاصل ہوا:

۱۔ امام المناظرین علامہ حافظ عبدالعزیز رحیم آبادی رحمہ اللہ متوفی (۱۹۱۹ھ) ہیں جنہوں نے شبلی نعمانی صاحب کی کتاب سیرۃ النعمان کے منظر عام پر آنے کے بعد ہی بہت جلد اس کے رد میں ''حسن البیان فی رد سیرۃ النعمان'' نامی کتاب لکھ کر شائع کر دیا اور علامہ شبلی نعمانی کی غلطیوں پر ایسی گرفت کی کہ بہت سی غلطیوں کی اصلاح شبلی نعمانی صاحب نے بعد کے ایڈیشن میں کی۔

۲۔ مولانا عبدالسلام مبارکپوری رحمہ اللہ نے سیرۃ البخاری لکھی جس میں شبلی نعمانی اور اس فکر کے تمام حاملین کے اعتراضات کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا اور سب کے جوابات دیئے۔

۳۔ مولانا ابو یحیی محمد شاہ جہاں پوری رحمہ اللہ ''الارشاد الی سبیل الرشاد'' نامی کتاب لکھی جو کہ اپنے باب میں بے مثال ہے جس میں سارے اعتراضات کی حقیقت واضح کر دی گئی ہے۔

جب حسن البیان دوبارہ شائع کی گئی تو اس پر مولانا اسماعیل سلفی صاحب شیخ الحدیث گوجرانوالہ سلفی رحمہ اللہ نے ایک بڑا علمی اور قیمتی مقدمہ لکھا جو مستقل ایک کتاب کی حیثیت رکھتا ہے مسئلہ درایت اور تفقہ راوی کے متعلق بڑی دلچسپ اور دل نشین گفتگو کی ہے، فقہاء اہل الرأی اور فقہاء اہل حدیث کے متعلق بڑی علمی وقیمتی معلومات جمع کر دی ہیں۔

مولانا حافظ عبداللہ محدث روپڑی رحمہ اللہ نے بھی اس پر ایک رسالہ لکھا ہے۔

احادیث کا اعلانیہ اور کھلا انکار:

برصغیر میں پانچویں صدی ہجری کے بعد سے گرچہ حدیث پر عمل کرنا عموماً ختم ہو چکا تھا مگر حدیث کی عظمت اور اہمیت اور اس کی حجیت ومحبت کا تصور لوگوں کے دلوں میں موجود تھا، انکار حدیث کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا تھا، حدیث کی بے حرمتی کو جرم عظیم سمجھا جاتا تھا۔

انکار حدیث کے بانی سرسید احمد خان:

جب ہندوستان پر انگریزوں کا مکمل تسلط قائم ہوگیا اور ملک کا تعلیمی نظام بدل گیا، دینی تعلیم اور عصری تعلیم الگ الگ کر دی گئی دونوں کے جدا جدا ادارے اور مدارس قائم ہو گئے، عصری تعلیم کے کالجوں اور اسکولوں کی تعلیم وتدریس اور طرز فکر دینی مدارس سے بالکل مختلف ہوگئی، اور اسی وقت عیسائی مبلغین اور داعیان نصرانیت پورے ملک میں بڑی تعداد میں پھیل گیے اور اپنی دعوت کا جال پھیلا دیا اور ان مبلغین وداعیان نصرانیت کو حکومت کی سرپرستی اور پورا تعاون بھی حاصل تھا، اس فتنہ سے علماء اور دینی مدارس کے طلباء تو بہت کم متأثر ہوئے مگر سرسید احمد خان اور ان کے ہم مشرب، اسی طرح دنیاوی تعلیم یافتہ یا اساتذہ سب سے زیادہ متأثر ہوئے۔

کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کے دلوں میں خلوص تھا وہ اسلام کا دفاع کرنا چاہتے تھے، عیسائیوں کے اعتراضات اور شبہات کا جواب دینے کے لیے اپنا قلم اور اپنی قوت وصلاحیت صرف کیا مگر چونکہ وہ علوم شرعیہ میں مہارت نہیں رکھتے تھے اس لیے وہ بڑی ٹھوکر کھائے اور ان کا قلم لڑکھڑا گیا ایسے لوگوں میں سب سے زیادہ ٹھوکریں کھانے والے سرسید احمد خان تھے جس کا اندازہ ان کی تصانیف سے ہو جاتا ہے: امہات المؤمنین، خطباتِ احمدیہ، تفسیر احمدی کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ سرسید احمد خان

کس قدر ضلالت وگمراہی میں جا چکے تھے جو حدیث ان کے مقاصد کے خلاف ملتی اس کو اڑا دیتے اور سرے سے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے، جب بھی کسی آیت کا مفہوم اور انبیاء علیہم السلام کا معجزہ ان کی نیچریت کے خلاف ہوتا اس کی تاویل وتحریف کر کے اس طرح اس کا حلیہ بگاڑتے کہ جس پر ملائکہ بھی حیران ہو جائیں، حکومت انگریز کو ان کی ان حرکات سے خوب فائدہ ہوا، اور نیچریت کو بھی عروج حاصل ہوا۔ (حجیت حدیث، ص:۱۵۱-۱۴۸)

سرسید احمد خان کی نیچریت اور ضلالت وگمراہی دیکھنا ہو تو تفسیر ثنائی کا ضرور مطالعہ کریں، سرسید احمد خان اپنا عقیدہ اور مذہب خود بیان کرتے ہیں کہ: ’’میں نے مذہب تقلید اور وراثت سے نہیں عقل کی روشنی میں پرکھا ہے‘‘۔

ایک جگہ اور لکھتے ہیں: ’’جس طرح قدیم علماء نے ایک علم کلام ایجاد کیا تھا اسی کی نظیر پر میں نے یہ نیا طریقہ صداقت کو ثابت کرنے کا ایجاد کیا ہے، ممکن ہے اس میں غلطی ہو مگر آئندہ علماء اس کی صحت کر دیں گے‘‘۔ (مجموعہ لیکچر سرسید صاحب، مرتب: سراج الدین لاہوری، ۱۸۹۰م، عظمت صحابہ، ص:۲۱)۔

مولوی چراغ علی میرٹھی جن کی موت ۱۸۹۵م میں بمبئی میں ہوئی یہ سرسید احمد خان کے ساتھ کام کرتے تھے انکار حدیث میں ان کا پورا ساتھ دیا اور اپنے مضامین میں انکار حدیث اور اس ملحدانہ نظریہ کی خوب نشر واشاعت کرتے رہے سرسید احمد خان کے اخبار تہذیب الاخلاق میں ان کے مقالات شائع ہوتے رہے۔ (عظمت حدیث، ص:۲۱)۔

عبداللہ چکڑالوی متوفی ۱۹۱۴م:

عبداللہ چکڑالوی پہلا شخص ہے جس نے بالکل کھلے طور پر حدیث کا انکار کیا اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دی اور بڑا خوشنماں نعرہ لگا کہ ’’**كَفَانَا هِدَايَةَ**

الْقُرْآنِ''، یعنی ہمارے لیے قرآن کافی ہے، انکار حدیث کی تحریک چلائی اور اپنی اس ضلالت وگمراہی کی نشر واشاعت کی غرض سے (اِشاعۃ القرآن) نامی ایک رسالہ شائع کرنا شروع کیا تاکہ زیادہ سے زیادہ دعوت عام کرے۔

چکڑالوی کی اس باطل تحریک کوتقویت دینے کے لیے اس کے ایک شاگرد محمد رمضان مستری نے (امت مسلمہ۔أھل الذکر والقرآن۔) کے نام سے اپنی جماعت بنائی مگر جلد ہی وہ ختم ہوگئی، اسی طرح ایک منکر حدیث احمد دین متوفی (۱۹۴۹م) نے امت مسلمہ اور بلاغ کے نام سے دو مجلّات شائع کیے اور کچھ کتابیں بھی شائع کیں۔

فتنہ چکڑالوی اور علماء اہل حدیث کی حمایت حدیث میں قربانیاں:

جب عبداللہ چکڑالوی کا فتنہ انکار حدیث ظاہر ہوا تو فوراً علماء اہل حدیث حمایت حدیث اوراس کے دفاع کے لیے میدان میں آگئے اوراپنے فریضۂ دفاع حدیث میں کوششیں شروع کردیں جن میں شیخ الکل میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ کے شاگردوں نے سب سے پہلے حصہ لیا، ان میں سے چند یہ ہیں:۔

۱۔مولانا عبدالجبار عمر پوری متوفی (۱۹۱۶م) ہیں جو کہ میاں صاحب کے شاگرد تھے جنھوں نے سب سے پہلے اس کی تردید شروع کی اور چکڑالوی کے رسالہ اشاعت القرآن کے جواب اور تردید کے لیے ایک ماہانہ رسالہ (ضیاء السنہ) کے نام سے نکالنا شروع کیا جس میں حدیث کے دفاع اور حمایت میں علمی مقالات ومضامین لکھتے اور چکڑالوی کے خودساختہ دلائل کا رد کرتے اور اس کے اعتراضات کے جواب دیتے۔ (عظمت حدیث،ص:۱۱۱و۱۱۳)۔

۲۔ علامہ ابوسعید محمد حسین بٹالوی متوفی (۱۹۲۱م) رحمہ اللہ ہیں جنھوں نے چکڑالوی سے مناظرے بھی کیے اور اپنے مشہور ماہانہ رسالہ (اشاعۃ السنہ) کے ذریعہ

مدلل طریقہ سے منکرین حدیث کی تردید بھی کرتے رہے، منکرین حدیث کے علاوہ بھی ہر باطل فرقے اور اسلام کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کا مقابلہ کرتے اور اپنے علمی بحث ومباحثے، حق کی حمایت وضاحت اپنے اسی ماہانہ رسالہ اشاعۃ السنہ کے ذریعہ کرتے تھے۔

۳۔ مولانا عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ متوفی (۱۳۳۱ھ): یہ بھی میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے شاگردوں میں سے تھے وہ بھی چکڑالوی کی تردید کرنے والوں کے صف اول میں شامل تھے جس کی صراحت مولانا عبدالجبار عمرپوری نے خود کی ہے۔ (عظمت حدیث، ص:۱۱۱)۔

۴۔ مولانا احمد اللہ امرتسری متوفی ۱۹۱۶م استاذ شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ۔

ان کا شمار بھی چکڑالوی فتنہ انکار حدیث کی تردید کرنے والوں کے صف اول میں ہوتا ہے۔ (عظمت حدیث، ص:۱۱۱)۔

ختامه مسک وفي ذلک فلیتنافس المتنافسون:

ان علماء اہل حدیث کے علاوہ فتنہ انکار حدیث کی بیخ کنی اور منکرین حدیث کے خود ساختہ دلائل کی تردید اوران کے تمام شکوک وشبہات کے جواب کے لیے اللہ تعالی نے شیخ الکل میاں نذیر حسین محدث دہلوی اور مولانا احمد اللہ صاحب امرتسری کے شاگرد شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کو منتخب کیا جنہوں نے بیک وقت سارے منکرین حدیث کا جواب دیا اور حدیث سے دفاع کیا، جس ملحد ومفسد نے حدیث اور حجیت حدیث کے خلاف قلم اٹھایا یا زبان کھولا تو اس کا رد لکھنے اور اس کا دندانِ شکن جواب دینے میں مولانا امرتسری رحمہ اللہ سب سے آگے رہتے۔

جب عبداللہ چکڑالوی نے ۱۹۰۴م میں قرآن مجید سے اپنی خودساختہ نماز ثابت کرنے کے لیے (برھان الفرقان علی صلاۃ القرآن) نامی ایک ضخیم ۴۰۶ صفحہ کی کتاب لکھی تو شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ نے اس کے رد میں ''دلیل الفرقان بجواب أھل القرآن'' نامی کتاب لکھی جس میں ایسے ٹھوس دلائل پیش کر کے عبداللہ چکڑالوی اور اس کے شاگرد حشمت العلی اور اس کے سارے ہم خیال ملحدین کو ایسالاجواب کیا کہ اس وقت ۱۹۰۵م سے لے کر آج تک کسی نے بھی جواب دینے کی جرأت نہیں کی جب کہ شیخ الاسلام کی یہ کتاب ۱۹۰۵م میں چھپ کر منظر عام پر آئی اس وقت سے لے کر آج تک برابر چھپ رہی ہے آخری طبع ۱۹۹۷م میں ہوئی ہے۔

مولانا امرتسری رحمہ اللہ کے زمانہ کے دو بڑے منکر حدیث:

فتنہ انکار حدیث کی نشر واشاعت اور اس فتنہ کو رواج دینے والوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو علوم شرعیہ کے ماہر اور عالم نہ تھے مگر دو آدمی ایسے تھے جن کا شمار پڑھے لکھے لوگوں میں ہوتا تھا اور وہ اپنے اخلاق وکردار کی وجہ سے لوگوں میں بہت مقبول تھے جن کی وجہ سے منکرین حدیث اور اس فتنہ کو کافی مدد ملی:

۱۔ایک تو مولانا اسلم جیراجپوری تھے جو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اسلامیات اور تاریخ کے پروفیسر تھے اپنے بہترین اسلوب تدریس اور دوسرے اخلاقی وعملی کمالات کی وجہ سے جامعہ ملیہ کے اساتذہ اور طلباء پر ان کے گہرے اثرات تھے مگر حدیث اور سنت کے متعلق بھٹک گئے اور اللہ تعالی کے فرمان: ﴿وَأَضَلَّهُ ٱللَّهُ عَلَىٰ عِلۡمٍ﴾ کے مصداق بن گئے تھے۔

مولانا امرتسری رحمہ اللہ ان کی تردید میں بھی پیش پیش تھے خود امرتسری رحمہ اللہ جیراجپوری کی تردید کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''گزشتہ ایام وسنین میں ہم مولوی عبداللہ چکڑالوی اور مولوی احمد دین امرتسری وغیرہ کی طرف توجہ مبذول رکھی تھی اور جوابات کے سلسلہ میں ہم نے تفسیر بالرائے کی کئی مثالیں بتائی تھیں، آج ہمارا روئے سخن ایک جدید اہل قرآن کی طرف ہے جن کا نام نامی ہے مولانا حافظ اسلم جیراجپوری پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دلی، تردید حدیث کے گزشتہ ٹھیکہ داروں کے بعد آج کل حافظ اسلم جیراجپوری نے یہ کام اپنے ذمہ لیا ہوا ہے''۔ (اہل حدیث امرتسر، ج:۳۱، شمارہ: ۲۳، ۱۳/اپریل ۱۹۳۴ء)۔

جب مولانا اسلم جیراجپوری صاحب نے حیات برزخی اور عذاب قبر کا انکار کیا تو ان کے طرز استدلال اور اسلوب تحریر سے مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ جیسے عالم بھی متاثر ہوگیے اور اس کے جواب سے عاجز رہے۔

مگر مولانا ابوعبداللہ محمد بن یوسف متوفی (۱۹۴۲م) سورتی رحمہ اللہ نے معارف اعظم گڑھ میں کئی قسطوں میں قرآن اور برزخ کے عنوان سے ایک علمی، تحقیقی اور نہایت مدلل مضمون اور مقالہ لکھا جس کو مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے شائع کیا اور اس کے آخر میں مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے اہل سنت اور اپنے موقف کو مضبوط و مدلل بنانے کے لیے شیخ الاسلام مولانا امرتسری رحمہ اللہ کا ایک مختصر اور جامع مضمون برزخ اور قرآن کے عنوان سے شائع کیا جس سے یہ خطرناک اور ملحدانہ فتنہ بڑی حد تک کمزور پڑ گیا۔

۲۔ دوسرے پڑھے لکھے شخص جنہوں نے انکار حدیث اور اس فتنہ کی نشر واشاعت کا بیڑا اٹھایا وہ حافظ سید محب الحق بہاری ہیں جو کہ عظیم آباد پٹنہ کے رہنے والے تھے۔

مولانا امرتسری رحمہ اللہ محب الحق اور اس کے فتنہ انکار حدیث کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

’’قرآن پر معترضین کی جماعت کے آخری سپہ سالار آریوں کے گرو سوامی دیانند ہیں اور حدیث پر حملہ آوری کے ہنر آزما افسر حافظ سید محب الحق صاحب مقیم عظیم آباد پٹنہ ہیں، سوامی جی کے اعتراضات سے عرصۂ ۳۲ سال ہوئے ہم فارغ ہو چکے ہیں اور بصورت کتاب حق پرکاش شائع کر چکے ہیں اور حافظ صاحب موصوف (محب الحق) کی کتاب کا جواب بھی کئی سال ہوئے دے چکے ہیں ان کے بعد جو منکرین اٹھے ہیں ان کا زوردار اور باقاعدہ حملہ نہیں ہوا بلکہ اوچھے ہتھیاروں سے ہوتا رہا، آج بھی جس حملہ کا ہم ذکر کریں گے حقیقت یہ ہے کہ شرعۃ الحق (منکر حدیث محب الحق نے تقریباً ۱۹۳۰م میں حدیث کی حجیت کے خلاف اپنے باطل اور ملحدانہ افکار و نظریات کو ثابت کرنے کی غرض سے تقریباً ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ’’شرعۃ الحق‘‘ نامی کتاب لکھی جس کا جواب مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے ’’حکمۃ الحق‘‘ کے عنوان سے اہل حدیث امرتسر کے کئی قسطوں میں لکھ کر سارے منکرین کو لاجواب کیا اس وقت سے لے کر آج تک مولانا کی تحریر کا کوئی مناسب جواب نہیں دیا جا سکا) کے مقابلے میں اس کو حملہ نہیں کہہ سکتے بلکہ محض منہ چڑھانا ہے۔

شیخ الاسلام مولانا امرتسری رحمہ اللہ کے نزدیک فتنہ انکار حدیث اور منکرین حدیث کا فتنہ تاریخ اسلام کا سب سے بڑا فتنہ ہے:

مولانا امرتسری رحمہ اللہ دلیل الفرقان بجواب اہل القرآن میں لکھتے ہیں: ’’پہلے مجھے دیکھئے! اگرچہ زمانہ کی رفتار مذہبی کیفیت میں ہمیشہ متغیر اور متنزل رہی ہے، مگر زمانہ حال نے جو تنزل اختیار کیا اس کی نظیر پہلے شاید نہ ملے، پچاس سال اس طرف ہندوستان میں عموماً مسلمان بدعات، ورسومات میں مبتلا تھے، قرآن وحدیث سے ان کو بجز ایک ایمانی اور ایقانی فعل قلبی کے کوئی واسطہ نہ تھا مگر تاہم وہ دل سے ان دونوں

(قرآن وحدیث) کی تعظیم کرتے تھے، افسوس کہ ہم نے اپنی زندگی میں زمانے کا تغیر یہ بھی دیکھنا تھا کہ ان دو میں سے ایک (حدیث نبوی) کوتو صاف لفظوں میں جواب دیا جاتا ہی رہا قرآن شریف وہ تو بقول حضرت علی کرم اللہ وجہہ صامت (خاموش) ہے، پس جدھر چاہا اپنے منصوبوں کے مطابق پھیرلیا، چنانچہ چند دنوں سے لاہور میں ایک صاحب (مولوی عبداللہ چکڑالوی) پیدا ہوئے ہیں، جنہوں نے حدیث سے انکار کیا اور قرآن شریف ہی تمام مسائل کے لیے کافی بنایا ہے، جس کے سننے سے ہر ایک مسلمان خوش ہونا چاہیے تھا، لیکن جب ان پر اعتراضوں کی بوچھاڑ ہوئی کہ قرآن شریف سے تو نماز کی تفصیل ثابت نہیں ہوتی، تو انہوں نے کوشش کر کے اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے ایک مجمل سا رسالہ نماز لکھا جب اس پر بھی اعتراضات ہوئے تو مفصل لکھنے کا وعدہ کیا'' (دلیل الفرقان، ص:۱)۔

انکار حدیث کا مقصد اور ملحدین کی دوراہیں:

علامہ محمد اسماعیل صاحب سلفی شیخ الحدیث گوجرانوالہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''پرانے اور نئے ملحدین نے قرآن عزیز کے الفاظ اور معانی کی حفاظت اور اس کے خلاف جو شبہات وارد ہو سکتے تھے اس کے متعلق دوراہیں اختیار کیں:

۱۔ روافض اور ان کے شاگردوں نے ان آحاد، ضعاف اور وضعی روایات کی بنا پر قرآن عزیز کو مشکوک ومشتبہ قرار دیا اور بزعم خود اپنی غلط کاریوں اور اسلام دشمنی کے لیے راستہ ہموار کیا۔

۲۔ دوسرے گروہ نے قرآن کے احترام اور حفاظت کی آڑ لے کر سنت کے پورے ذخیرے کو مشکوک اور غیر مستند قرار دینے کی کوشش کی، کبھی کتب حدیث کو لہو الحدیث اور مزخرف کہہ کر دل کی گرمی کو تسکین دیا، کسی نے منافقانہ طور پر احادیث نبویہ اور سنت

کو تاریخ کہہ کر پہلے اس کے مقام کو ہلکا کیا، پھر اس پر مختلف طریقوں سے حملہ آور ہوئے ، ائمہ حدیث اور فقہاء سنت کی تضحیک کی: ﴿وَلِلَّهِ ٱلْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِۦ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَٰكِنَّ ٱلْمُنَٰفِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾[المنافقون:۸]۔

یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ احادیث اور قرآن کی زندہ جاوید روایات اگر ان کی راہ سے ہٹ جائیں تو ان کی جہالت آمیز روایات کے لیے میدان صاف ہوجاتا ہے،قرآن میں من مانی تاویلات کے لیے راہ کھل جاتی ہیں،حرام کو حلال اور حلال کو حرام بنانا آسان ہوجاتا ہے، ہمارے زمانے کے منکرین حدیث کی تحریک نے تقریباً نصف صدی میں اسی نفاق آمیز پالیسی کے لیے مختلف روپ بدلے ہیں،آج کل ان ملحدانہ تصورات کے لیے دوعنوان قائم کیے گئے ہیں: ایک تو قرآنی معاشرہ اور دوسرا قرآنی نظام ربوبیت''۔(مقدمہ ترجمۃ القرآن شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ، ومقالات وفتاوی شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل صاحب گوجرانوالہ رحمہ اللہ،ص: ۴۰۶-۴۰۵)۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

شیخ الاسلام مولانا امرتسری رحمہ اللہ کی ذات بہت سے کمالات کی جامع شخصیت تھی بیک وقت اللہ تعالی نے ان کے اندر بہت سی خوبیاں جمع کردی تھیں اپنی زندگی میں وہ برصغیر کے امت مسلمہ میں ایک انجمن کی حیثیت رکھتے تھے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کہتے تھے کہ:

''اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف جس نے بھی زبان کھولی اور قلم اٹھایا ان کے حملے کو ردکرنے کے لیے ان کا قلم شمشیر بے نیام ہوتا تھا اور اسی مجاہدانہ خدمت میں انہوں

نے عمر بسر کردی۔

مرحوم اسلام کے بڑے مجاہد تھے زبان وقلم سے جس نے بھی حملہ کیا اس کی مدافعت میں جوسپاہی سب سے پہلے آگے بڑھتا وہ آپ ہی ہوتے۔(یادرفتگاں،ص:۴۱۸)۔

شیخ الاسلام امرتسری رحمہ اللہ جب سوجھ بوجھ والے ہوئے اور صحیح وغلط میں تمیز کرنا سیکھے اس وقت ہندوستان (پورا برصغیر) کے حالات دینی اعتبار سے انتہائی ناگفتہ بہ تھے انگریز استعمار نے عیسائیت اور تنصیر وتبشیر کے دروازے کھول دیئے تھے جس سے عیسائی مبلغین پورے ملک میں پھیل کر اسلام کے خلاف یلغار کرنے لگے، آریہ سماجی مسلمانوں کو اسلام سے بدگمان کرنے کے لیے طرح طرح کے شکوک وشبہات میں مبتلا کرنے کی کوشش کرنے لگے، اسلامی عقائد وتعلیمات کی مخالفت میں رنگیلا رسول، چترجیون اورستیارتھ پرکاش جیسی رسوائے زمانہ اور مسلمانوں کی دل آزاری کے لیے کتابیں لکھی گئیں، مسلمانوں کو وہ وقت دیکھنا پڑا جس سے نزول قرآن کے وقت ہی اللہ نے آگاہ کر دیا تھا کہ: ﴿لَتُبْلَوُنَّ فِىٓ أَمْوَٰلِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْكِتَٰبَ مِن قَبْلِكُمْ وَمِنَ ٱلَّذِينَ أَشْرَكُوٓا۟ أَذًى كَثِيرًا ۚ وَإِن تَصْبِرُوا۟ وَتَتَّقُوا۟ فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ ٱلْأُمُورِ﴾ [آل عمران:۱۸۶]۔

انہیں ناگفتہ بہ حالات میں جب کہ اسلام ومسلمین، قرآن اور رسول اللہ پر عیسائی اور آریا سماجی اسی طرح بت پرست یلغار کر رہے تھے عین اسی وقت مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعوی کر کے مسلمانوں کے درمیان ہلچل مچادی، مرزا کی طرح مسلمانوں ہی میں سے سرسید احمد خان اور ان کے ہم خیال وہمنوا لوگوں نے نیچریت کے ذریعہ الحاد ودہریت کا شعلہ بھڑکا کر لوگوں میں ایک نئی گمراہی کی آگ سلگائی۔

اسی پر فتن دور میں عنایت اللہ مشرقی (جس ملحد و مضل اور دشمن اسلام کو علامہ کا لقب دیا گیا تھا) خاکساری تحریک کا بانی اپنے ملحدانہ افکار و نظریات کو لوگوں میں عام کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا اور بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ ان تمام باطل اور اسلام دشمن تحریکوں اور جماعتوں کو استعمار حکومت کی طرف سے پورا تعاون اور ہر طرح کی پشت پناہی حاصل تھی، جس کی وجہ سے بلا خوف وخطر اسلام، قرآن وسنت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارکہ کا مذاق اڑایا جارہا تھا اسلامی تعلیمات اور اسلام کے مسلمات کا انکار کیا جاتا تھا، ارکان ایمان اور مسلمہ عقائد کی علانیہ طور پر تکذیب کی جاتی تھی۔

ایک سنت اللہ (وعدہ الٰہی جو قیامت تک باقی رہے گا):

اللہ تعالی نے کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احادیث میں یہ وعدہ کیا ہے کہ اسلام کے مخالفین اسلام کو مٹانے کی چاہے جتنی بھی کوشش کر ڈالیں اور مسلمانوں میں کتنے بھی باطل فرقے پیدا ہو کر صراط مستقیم کو ترک کر کے جتنا چاہیں شرک و بدعات اور الحاد و بے دینی کے راستے اختیار کر لیں یا مرتد ہو کر کفر و شرک کی راہ پر چلے جائیں مگر اللہ تعالی ہر وقت اپنے دین کو باقی رکھے گا اور اسلام اور شریعت وسنت پر چلنے والوں کو پیدا کرتے رہے گا جو خود کتاب وسنت پر قائم ہوں گے اور دوسروں کو اس کی دعوت دیتے رہیں گے۔

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مَن يَرۡتَدَّ مِنكُمۡ عَن دِينِهِۦ فَسَوۡفَ يَأۡتِي ٱللَّهُ بِقَوۡمٖ يُحِبُّهُمۡ وَيُحِبُّونَهُۥٓ أَذِلَّةٍ عَلَى ٱلۡمُؤۡمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى ٱلۡكَٰفِرِينَ يُجَٰهِدُونَ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوۡمَةَ لَآئِمٖ﴾ [المائدۃ: ۵۴]۔

﴿وَإِن تَتَوَلَّوۡاْ يَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ ثُمَّ لَا يَكُونُوٓاْ أَمۡثَٰلَكُم﴾ [محمد: ۳۸]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:'' **لَا يَزَالُ اللّٰهُ يَغْرِسُ فِي هَذَا الدِّينِ بِغَرْسٍ يَسْتَعْمِلُهُمْ فِي طَاعَتِهِ** ''(ابن ماجہ، المقدمہ، رقم:۸)

ہندوستان (پورے برصغیر) میں اسلام اور مسلمان چاروں طرف سے طرح طرح کے خارجی اور داخلی فتنوں میں گھر گئے اور ان کا اسلام و ایمان سب خطرے میں پڑ گیا تو بیک وقت ان تمام فتنوں کے سد باب اور ان سب کا قلع قمع کرنے کے لیے اللہ تعالی نے شیخ الاسلام مولانا امرتسری رحمہ اللہ جیسے لوگوں کو پیدا کیا، مولانا امرتسری رحمہ اللہ نے ایسے پر آشوب و پرفتن دور میں اعداء اسلام کو للکارا اور پھر کمر بستہ ہو کر باطل کے لیے مقابلہ کے میدان میں اتر گئے آریہ سماجی، عیسائیت، مرزائیت، ہندومت، شیعیت، منکرین حدیث، تقلیدی جمود وغیرہ سب کا بیک وقت مقابلہ کیا اور سب کا مدلل رد کیا اور اسلام و مسلمین سب کو ان فتنوں سے بچایا، اور سب کا دندانِ شکن جواب دیا، **جزاه الله خيراعن الاسلام والمسلمين جميعا۔**

آنچہ خوباں ہماں دارند تو تنہا داری:

مولانا امرتسری رحمہ اللہ کی شخصیت کی جامعیت کا اندازہ ان تبصروں اور تعزیتی پیغامات سے ہوتا ہے جو ان کی وفات کے بعد مختلف فکر کے اہل قلم نے لکھا تھا۔

بعض اہل علم وقلم نے لکھا تھا کہ'' اگر ہم پوری دنیائے اسلام کے اکابر علماء کسی ایک مجلس علمی میں جمع ہوں، اور بیک وقت عیسائیوں، آریوں، سناتن دھرمیوں، ملحدوں، نیچریوں، قادیانیوں، شیعوں، منکرین حدیث چکڑالویوں، بریلیوں اور دیوبندیوں سے غرض ہر فرقہ سے ایک ایک گھنٹہ مسلسل بحث و مذاکرہ کی نوبت پیش آئے، تو عالم اسلام کی طرف سے کون کون ہستیاں ہوں گی مجھے معلوم نہیں، لیکن پاکستان وہندوستان، برما اور سری لنکا، جزیرہ جاوا، سماترا کی طرف سے صرف ایک ہی ہستی پیش

ہوسکتی تھی اور وہ شیخ الاسلام ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کی تھی آج ان کی رحلت کے بعد ہندوستان و پاکستان کی یہ سربلندی شاید باقی نہیں رہی، ان کے جاتے ہی بازار علمی کی یہ صدنشینی بھی شاید اب ختم ہوگئی، إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(اخبار ندائے مدینہ) (سیرت ثنائی ص:۲۲-۲۱)۔

مولانا حافظ إبراہیم سیالکوٹی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:

''اگر رات کو کوئی فرقہ اسلام کے خلاف پیدا ہوجائے تو مولانا ثناء اللہ صبح اس کا جواب دے سکتے ہیں'' (سیرت ثنائی، ص:۳)۔

کسی نے بہت خوب کہا تھا:

وہ عالم تھا مجاہد تھا، محدث تھا زمانے کا　　وہ ہر میداں کا غازی، مجدد تھا زمانے کا

ایک دوسرے شاعر نے کہا:

تو مناظر، تو مفسر، تو محدث باکمال　　تاب تھی کس آنکھ میں ترا رعب وجلال

(سیرت ثنائی، ص:۵-۴)۔

شیخ الاسلام مولانا امرتسری رحمہ اللہ کی مجاہدانہ خدمات وقربانیوں اور دفاعی کارناموں کو صرف چند گوشوں قادیانیت، عیسائیت، آریا سماجیت وغیرہ ہی تک لوگ محدود ومحصور سمجھتے ہیں حالانکہ ان کی دفاعی خدمات اور قربانیاں بہت وسیع پیمانے پر تھیں، اسلام، کتاب اللہ، پیغمبر اسلام کی حمایت وحفاظت ، قادیانیت ، نیچریت، چکڑالویت، مودودیت ، مقلدیت، اہل قرآن، بریلویت ، شیعیت ورافضیت ، انکار حدیث، الحاد وبے دینی جیسے تمام فتنوں کی تردید وجواب اور شروفساد کے مدافعت

ومقابلے میں اپنی ساری زندگی صرف کردی، مولانا امرتسری کی مجاہدانہ کوششیں ان سب کومحیط ہیں۔

علماء اہل حدیث کی ذمہ داری تھی کہ مولانا امرتسری رحمہ اللہ کی حالات زندگی اوران کی ہمہ جہتی خدمات اورقربانیوں پرکوئی ایسی جامع کتاب لکھتے جس میں ان کی خدمات اورقربانیوں کو ہرہرپہلو پر تفصیلی گفتگو ہوتی مگرآج تک ایسا نہ ہوا، سیرت نگاروں نے زیادہ ترتوجہ مولانا کے مناظرات عیسائیوں اورغیرمسلموں کے مباحثات کے جمع کرنے پرکی ہے ردقادیانیت اورمرزائیت پرکافی موادمرتب کیاہے، فجزاھم اللہ خیرا، مگرتقلیدی جموداورفتنہ انکارحدیث وغیرہ کے رد میں مولانا کی خدمات اورقربانیوں پرکوئی تفصیلی گفتگونہیں کی گئی ہے، حالانکہ فتنہ انکارحدیث کے ابتداء سے لےکر زندگی کے آخری دم تک اس کی تردیدکرتے رہے، منکرین حدیث کے ہراعتراض اورحدیث کے متعلق ان کے پیدا کردہ سارے شکوک وشبہات کی تردیداورجواب دینے میں مولانا سب سے آگے آگے رہتے، سرسیداحمدخان جنہوں نے انکارحدیث کی ابتداء کی اورعبداللہ چکڑالوی جس نے کلی طورپرحدیث کے انکارکی بنیادڈالی اورمنظم انداز میں اس کی تحریک چلائی، حافظ اسلم جیراجپوری، محب الحق بہاری، وغیرہ جواساطین انکارحدیث تھے سب کی تردیداوردندان شکن جواب دینے میں مولانا امرتسری صف اول میں تھے، مولانا ابوالاعلی مودودی جنہوں نے جمہورامت اورسارے محدثین سارے سلف وخلف کی مخالفت کرکے قبولیت اورحجیت حدیث کے لیے اپنے بھونڈے اورنہایت مضحکہ خیز اصول درایت اورذوق کو بہانہ بناکرعقل پرستی کے ذریعہ انکارحدیث کا دروازہ کھولا اور ''مسلک اعتدال'' نامی رسالہ شائع کیا اورحق وباطل سب کوایک ہی درجہ میں رکھا جس سے منکرین حدیث نے خوب فائدہ اٹھایا اورمودودی کے اس مقالہ

کو منکرین حدیث نے اپنے ہی رسالہ میں شائع کیا تو اس کے رد میں سب سے پہلے مولانا امرتسری رحمہ اللہ ہی نے قلم اٹھایا اور ''خطاب بہ مودودی'' کے عنوان سے کئی قسطوں میں ''اخبار اہل حدیث امرتسر'' میں شائع کیا، جس کو بعد میں مستقل ایک کتاب کی شکل میں شائع کیا گیا جو آج بھی موجود ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ منکرین حدیث اپنا بھیس بدل کر جس لباس اور جس حلیہ میں بھی ظاہر ہوئے شیخ الاسلام اپنی دور بین نگاہوں اور اللہ تعالی کی دی ہوئی صلاحیتوں سے ان کو اچھی طرح سے پہچان لیتے اور پھر ان کی خوب خبر لیتے، اور مدلل تردید کرتے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدرت رامی شناسم

ہمارے اور برصغیر کی پوری جماعت اہل حدیث کے لیے بڑی ہی فرحت ومسرت کی بات ہے کہ ہمارے رفیق سفر اور ہم سبق محترم الشیخ احسن جمیل صاحب حفظہ اللہ کے خلف الرشید عزیزم عبدالاحد سلمہ اللہ تعالی نے شیخ الاسلام علامہ امرتسری کی خدمات اور مجاہدانہ قربانیوں کے اس (دفاع عن السنہ اور منکرین حدیث کی تردید) پہلو کو اجاگر کرنے کی جد وجہد شروع کیا ہے، شیخ الاسلام کے اس سلسلے کے بکھرے ہوئے مضامین جمع کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں اللہ تعالی سے ہم دعا گو ہیں کہ موصوف کی ان کوششوں کو شرف قبولیت بخشے، آمین۔

اللہ تعالی نے موصوف کو میراث اسلاف کی جمع وترتیب کا ذوق وشوق عطا فرمایا ہے اللہ تعالی اس میں مزید اضافہ کرے، اس سے پہلے بھی اس طرح کی کئی علمی خدمات انجام دے چکے ہیں جن سے آج اہل علم اور اہل ذوق فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

یہ جامعہ سلفیہ کے طالب علمی کے زمانہ سے ہی مجھ سے تعلق رکھتے ہیں ادب واحترام

اور الفت ومحبت سے ہمیشہ پیش آتے ہیں اوران کے والد محترم شیخ احسن جمیل ہمارے ہم سبق رہے ہیں جب بھی مجھ سے ملاتے اور ملاقات کراتے ہیں تو ان کا یہ انداز ہوتا کہ آپ کا بھتیجا آپ سے ملنے آیا ہے، ان کے والد محترم کا یہ مخلصانہ جملہ اپنائیت کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

موصوف مملکت سعودی عرب میں دکتوراہ کے طالب ہیں اللہ تعالی انہیں کامیاب کرے، والدین اساتذہ کرام کے لیے صدقۂ جاریہ، امت وملت کے لیے نافع، اور مسلک سلف کا ترجمان بنادے، آمین۔

الْحَمْدُ لِلهِ الَّذِي بِنِعْمَتِهِ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ ، وَصَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَى خَيْرِ خَلْقِهِ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ۔

ظفر الحسن أحمد اللہ مدنی

مقیم شارجہ متحدہ عرب امارات

۱۳/رجب ۱۴۴۲ھ = ۲۵/فروری ۲۰۲۱م

مقدمہ

(از: فضیلۃ الشیخ سید طیب الرحمن زیدی حفظہ اللہ)

الحَمْدُ للهِ ربِّ العَالمينَ والصَّلاةُ والسَّلامُ عَلى سَيِّدِ الأنبياءِ والمرسلينَ، أمَّا بَعْدُ:

شیخ الاسلام ابو الوفاء ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کسی تعارف کے محتاج نہیں، جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا دلائل و براہین کے انبار لگا دیئے، الحمد للہ۔

آپ نے قرآن مقدس کی تین تفسیریں لکھیں اور فرق باطلہ پر خوب رد کیا اور دین حق کی تائید میں بے شمار کتابیں اور رسائل تحریر فرمائے۔

قرآن مجید پر جب کسی نے اعتراضات کئے تو رحمہ اللہ نے کتاب وسنت کے دلائل سے اس کا خوب رد کیا، جیسا کہ آپ کی کتابیں ''اسلام اور مسیحیت'' ''جوابات نصاری'' ''تحریفات بائبل'' ''حق پرکاش'' ''ترک اسلام'' ''کتاب الرحمن'' ''مقدس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' جو آپ کے راسخ فی العلم ہونے کی بین دلیل ہے۔

اسی طرح جب جب دشمنان اسلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث مبارکہ کو نشانہ بنایا آپ رحمہ اللہ ان کے اعتراضات کے سامنے سیف بے نیام ثابت ہوئے اور کتاب وسنت کے دفاع میں بے شمار نقلی و عقلی دلائل سے خوب رد کیا، الحمد للہ۔

اسی طرح جب منکرین حدیث کی طرف سے خادم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انس رضی اللہ تعالی عنہ پر اعتراض ہوا تو شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے ''دفاع عن الحدیث'' کے نام سے رسالہ تحریر فرمایا، اور نقلی و عقلی دلائل کی روشنی میں مخالفین کا منہ توڑ جواب دیا، جب ایڈیٹر نگار

نے نماز نبوی کے بعض احکام پر اعتراض کیا تو آپ نے اس کے اعتراض پر بھی کافی شافی جواب تحریر فرمایا، جو اخبار اہل حدیث کی زینت بنا۔

اسی طرح ایک رسالہ ''تفسیر بالروایت'' کے نام سے مولانا اسلم جیراجپوری کے جواب میں تحریر فرمایا، اس رسالہ میں شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے ائمہ حدیث پر ''تفسیر بالروایت'' کے جواز کے اعتراضات کا جواب بھی خوب تحریر فرمایا ہے۔

آج کے دور میں کچھ جدید مفسر قرآن مقدس کی تفسیر رائے سے کرتے ہیں سلف صالحین سے یہ تفسیر ثابت نہیں، مگر جدیدیت اور ترقی کے نام پر پس پردہ سلفی علماء وعوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، اللہ کریم اس فتنہ سے ہم سب کو محفوظ رکھے۔

اسی طرح ''بلاغ الحق'' کے جواب میں ''تصدیق الحدیث'' نامی رسالہ تحریر فرمایا جو تین حصوں میں منقسم ہے، اور اس میں غلام احمد پرویزی کا قابل دید رد ہے، اللہ تعالی شیخ الاسلام کو اجر عظیم عطا فرمائے اور ان کی کاوشوں کو ذخیرہ آخرت بنائے۔

الحمد للہ ہماری جماعت کے فاضل فضیلۃ الاخ الشیخ عبدالاحد احسن جمیل آل عبدالرحمن حفظہ اللہ نے ان تمام رسائل پر تحقیق اور تعلیق لکھا، تعلیق کی وجہ سے رسالہ جات کو سمجھنا اور آسان ہوگیا اور اس کے ذریعہ سے آپ نے عام طالب علموں کو منکرین حدیث پر گرفت مضبوط کرنے کا موقع میسر کردیا، سماحۃ الشیخ عبدالاحد حفظہ اللہ کو اللہ کریم جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی کاوشوں کو ذخیرۂ آخرت بنائے اور شیخ عبدالاحد کے معاونین کو بھی اجر عظیم عطا فرمائے۔

بندۂ ناچیز کو اس علمی کام پر مقدمہ لکھنے کا حکم دیا گیا ''الأمر فوق الأدب'' کے تحت کچھ تحریر کیا ہے، اللہ کریم قبول فرمائے۔

میں ایک گزارش اپنے بھائی فاضل الاخ الکریم عبدالاحد حفظہ اللہ سے کروں گا کہ

ہمارے اسلاف کی بے شمار کتابیں جو آج تک لائبریریوں میں مخطوطہ کی شکل میں موجود ہیں ان کی طباعت کا بندوبست کیا جائے۔

ہر دور میں نئے نئے فتنے اور فتنہ پرداز لوگ نئی نئی شکلوں میں آتے رہتے ہیں جن کا رد لازمی ہے، اسی لئے علماء سلف کی خدمات کو منظر عام پر لانا از حد ضروری ہے۔ علماء سلف نے جو کام کئے، تحریریں لکھیں رسالوں کی صورت، کتابوں کی صورت میں ان پر اگر تحقیق کی صورت نظر آتی ہے تو ضرور تحقیق وتعلیق سے مزین کر کے کتاب کو منظر عام پر لایا جائے کیوں کہ پہلے صرف حدیث کا لکھ دینا کافی ہوتا تھا، مگر اب جس دور میں ہم زندگی گزار رہے ہیں یہ وہ دور ہے کہ کھرے وکھوٹے کو واضح انداز میں الگ الگ کر کے پیش کرنا ہی اقرب الی الصواب ہے، اگر تحقیق وتعلیق کا کام پوری امانت اور دیانت داری کے ساتھ کیا گیا اور کتابوں کے حوالہ جات، حدیثوں کے اصل مراجع کا ذکر حدیث نمبر اور صحت وضعف اور باطل کو علیحدہ علیحدہ کر کے عوام کی خدمت میں پیش کیا گیا تو بہت بڑا علمی کام ہونے کے ساتھ اللہ نے ہمارے کاندھوں پر جو ذمہ داری ڈالی ہے وہ بھی ان شاء اللہ ادا ہو جائے گی۔ اللہ کریم ہمارے اسلاف کی خدمات کو قبول فرمائے اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کی حفاظت کرے اور نوجوان فاضل علماء کو اخلاص نصیب فرمائے۔ آمین

هذا ما عندي

أخوكم في الله

سید طیب الرحمن زیدی

۵ر رجب ۱۴۴۲ھ = ۱۷ر فروری ۲۰۲۱ء

مقدمہ

(از: فضیلۃ الشیخ عبدالمتین مدنی حفظہ اللہ)

نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ ، وبَعْدُ:

اسلام کے اساسی مصادر قرآن کریم اور صحیح احادیث نبویہ ہیں چونکہ یہ اللہ کا قیامت تک باقی رہنے والا دین ہے اس لئے اللہ نے دین کے مصادر کے حفاظت کی ذمہ داری خود لی ہے تاکہ یہ قیامت تک اپنی صحیح شکل وصورت میں پہنچے اگرچہ خیر القرون سے لے کر آج تک ہر زمانہ میں دین کو مسخ کرنے کی سعی نامسعود کی گئی لیکن علماء ربانیین احقاق حق اور ابطال باطل کا فریضہ لومۃ لائم کی پرواہ کئے بغیر انجام دیتے رہے۔ **فجزاهم الله عن الاسلام والمسلمين خير الجزاء۔**

دفاع عن الاسلام کی سنہری تاریخ کا آغاز دور نبوت سے ہی ہوتا ہے اللہ کے رسول ﷺ اپنی زندگی کے دونوں دور میں اعداء اسلام مشرکین مکہ، یہود مدینہ اور منافقین کی دسیسہ کاریوں کا جواب دیتے رہے اور مجلی ومصفی رخ اسلام کو شکوک وشبہات سے داغ دار کرنے کی ہر حرکت کو ناکام کرتے رہے۔

الحمدللہ اس پیغمبرانہ مشن کو ہر دور میں داعیان اسلام نے بخیر وخوبی انجام دیا اور اندر اور باہر دونوں قسم کی سازشیں جو تشکیک وشبہات یا تردید وانکار کی صورت میں سامنے آئیں ان کو بے نقاب کر کے مخالفین کو دنداں شکن جواب دیا۔

برصغیر میں تقسیم ہند سے پہلے اور اس کے بعد بھی اسلام دشمنی کے کئی محاذ قائم تھے اور ان محاذوں پر ایسے علماء بھی تھے جن کو ان کے اپنے حلقے میں بڑی اہمیت اور مقام حاصل تھا درحقیقت یہ لوگ امت کے لئے زیادہ مضر تھے لیکن اللہ رب العزت نے

ان منکرین ومخالفین حق سے اپنے دین کی حفاظت فرمائی اور علامہ ثناء اللہ امرتسری، علامہ ابو القاسم سیف بنارسی، علامہ محمد ابراہیم سیالکوٹی رحمہم اللہ جیسے اجلہ نے دفاع اسلام اور دفاع سنت کے محاذ کو سنبھالا اور اپنی تقریر وتحریر سے اہل باطل کو مسکت جواب دیا۔

عزیزم شیخ عبدالاحد سلمہ اللہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے فراغت کے بعد جامعہ ملک خالد ابھا سعودی عرب سے اعلی تعلیم مکمل کر رہے ہیں، آپ تحقیق وتعلیق کا اچھا ذوق رکھتے ہیں کئی کتابوں کے مؤلف ومحقق ہیں، آپ نے ''**دفاع سنت**'' کے عنوان سے علامہ امرتسری رحمہ اللہ کے چند رسائل کو اپنی تحقیق کے ساتھ زیور طبع سے آراستہ کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اللہ کے فضل وکرم سے اس بابرکت عمل کو تکمیل کے مرحلہ تک پہنچایا، آپ شکریہ کے مستحق ہیں کہ عدیم الفرصتی کے اس دور میں تحقیق وتالیف کے بابرکت عمل کو انجام دے رہے ہیں۔

آپ نے اپنی تازہ کاوش پر تقدیم لکھنے کی مجھ سے گزارش کی، میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا، لیکن موصوف میرے عزیز شاگرد ہیں، خاندانی قرابت بھی ہے اور میرے شیخ مولانا احسن جمیل مدنی صاحب کے صاحبزادہ ہیں اس لئے مجھے اس ہمہ جہت نسبت کی لاج رکھنی پڑی اور انکار نہ کرسکا۔

موجودہ دور میں علم دین کی یہ ایک بڑی خدمت ہے کہ ہم اپنے اسلاف کے جواہر پاروں سے موجودہ اور آئندہ نسل کو روشناس کرائیں خصوصا وہ تحریریں جو اسلام کے دفاع میں لکھی گئیں ہیں، اس لئے کہ اہل باطل اور منکرین سنت پورے زور وشور کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہیں، میں امید کرتا ہوں یہ قیمتی سرمایہ میدانِ دعوت کے شہسواروں کے لئے ضرب کلیم ثابت ہوگا، ان شاء اللہ۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے دین کی خدمت اخلاص کے ساتھ انجام دینے کی توفیق دے، اس متواضع عمل کو قبول فرمائے اور اسے مؤلف وناشر کے لئے توشۂ آخرت بنادے۔

عبدالمتین مدنی بنارس

۷ رجب المرجب ۱۴۴۲ھ = ۱۹ر فروری ۲۰۲۰ء

مقدمۃ المحقق

إنّ الحمْدَ لِلَّهِ نَحْمَدُهُ ونَسْتَعِينُهُ ونستغفره، ونَعُوذُ باللهِ مِن شرور أنفُسِنا وسَيئاتِ أعْمالِنا، مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلا مُضِلَّ لَهُ ومَن يُضْلِلْ فَلا هادِيَ لَهُ.

وأشْهَدُأنْ لا إلَهَ إلّا اللَّهُ وحْدَهُ لا شَرِيكَ لَهُ، وأشْهَدُ أنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ ورَسُولُهُ.

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ﴾[آل عمران:۱۰۲]۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا﴾[النساء:۱]۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ﴿٧٠﴾ يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا﴾[الاحزاب:۷۰-۷۱] أمابعد:

فَإنَّ خَيْرَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللهِ. وَخَيْرَ الْهُدَي هُدَيُ مُحَمَّدٍﷺ. وَشَرَّ الأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا . وَكُلَّ مُحدَثَةٍ وكُلَّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ۔

اللہ رب العالمین کا اس روئے زمین پر بسنے والے انسانوں پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے ہماری ہدایت ورہنمائی کے لئے اپنے آخری رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث کر کے اپنا دین اسلام اور اپنی آخری کتاب قرآن نازل فرمایا، اور ساتھ ہی

اپنے نبی کو اپنی کتاب کا مبلغ ومفسر دونوں قرار دیا، اللہ رب العالمین کا ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ ٱللَّهُ عَلَى ٱلْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا۟ عَلَيْهِمْ ءَايَـٰتِهِۦ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ ٱلْكِتَـٰبَ وَٱلْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا۟ مِن قَبْلُ لَفِى ضَلَـٰلٍ مُّبِينٍ﴾ [آل عمران: ۱۶۴] اس آیت میں ''والحکمۃ'' سے حدیث نبوی مراد ہے، جیسا کہ جمہور مفسرین نے اپنی اپنی تفسیروں میں اس کی وضاحت کی ہے۔

اسی کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے جامع کلمات کے ذریعہ سے بھی واضح فرما دیا، چنانچہ ارشاد ہے: ''**أَلا إِنِّي أُوتِيتُ الكِتابَ ومِثْلَهُ مَعَهُ**''[1]، (میں قرآن اور اس کے ساتھ اس جیسی ایک اور چیز دیا گیا ہوں)۔

اس حدیث میں روشن دلیل موجود ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بطور وحی قرآن کے ساتھ سنت بھی عطا ہوئی۔ اور سنت کو قرآن سے الگ نہیں کیا جا سکتا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کو صحیح اور مکمل طور سے سمجھنے کے لئے دونوں وحی کو ساتھ ہی لے کر چلنا ہوگا، اگر کسی نے ایسا نہیں کیا تو وہ اسلام کو حقیقی معنی میں سمجھ نہیں سکتا۔

لیکن سلف کے زمانہ ہی سے کچھ ایسے لوگ ظاہر ہوئے جنہوں نے سنت کو قرآن سے الگ کیا جس کے نتیجہ میں فتنہ کا ظہور ہوا اور ایسی ایسی عقلی باتیں اسلام اور مسلمانوں کی طرف منسوب کی گئیں جن کا اسلام سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا، اور ایسا ہونا ہی تھا کیوں کہ اس کی طرف اشارہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مذکورہ بالا حدیث کے دوسرے جزء کے اندر ہی کر دیا تھا، آپ کا ارشاد ہے: ''**أَلَا يُوشِكُ رَجُلٌ شَبْعَانُ عَلَى أَرِيكَتِهِ، يَقُولُ عَلَيْكُمْ بِهَذَا الْقُرْآنِ، فَمَا وَجَدْتُمْ فِيهِ مِنْ حَلَالٍ**

① السنہ، از: مروزی: (ص: ۲۴۴)، حدیث: ۲۱۶، اس کی سند صحیح ہے۔

فَأَحِلُّوهُ، وَمَا وَجَدْتُمْ فِيهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوهُ''[1]۔

چنانچہ اس عمل کے نتیجہ میں سب سے پہلے خوارج پھر رافضہ اس کے بعد معتزلہ پھر واصلیہ اس کے بعد عمریہ اور ھذیلیہ پھر نظامیہ کا ظہور ہوا جسے آگے چل کر اصحاب الرائے کے ذریعہ تقویت ملی، اور حدیث کو متواتر اور آحاد میں تقسیم کیا گیا، اور راوی حدیث کے اندر فقیہ اور غیر فقیہ کی شرط لگائی گئی اور اس کے ذریعہ صحابہ تک کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا گیا اور فقیہ وغیر فقیہ میں صحابہ جیسی مقدس جماعت کو تقسیم کر کے انکار حدیث کا چور دروازہ کھولا گیا اور کہا گیا کہ اگر غیر فقیہ صحابی کی روایت قیاس کے مخالف ہو تو اسے ترک کرنا اولی ہوا، اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ گیا: ''كل آيةٍ أو حديثٍ يُخَالِفُ قَوْلَ الإمامِ فَهُوَ إمَّا مؤولٌ أو منسوخٌ''۔

لیکن اللہ رب العالمین نے ہر دور میں ایسے ربانی علماء بھیجے جنھوں نے دفاع کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کے ہر محاذ پر باطل کا منہ توڑ جواب دیا، امیر المؤمنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ذریعہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کو سونپی گئی کمان کو سنبھالنے کے لئے عکرمہ اور عطاء بن ابی رباح اور پھر زہری اور امام مالک کے طریق سے جو سلسلہ بنا تو اللہ تعالی نے اس کو وہ سورج بنا دیا جو رہتی دنیا تک غروب نہ تو ہو سکتا ہے اور نہ کیا جا سکتا ہے۔

دور حاضر میں جب اس فتنہ پر نظر ڈالی جاتی ہے تو جہاں ایک طرف محمد عبدہ اور ان کے پروردہ ایک جماعت جو مستشرقین کے آگے زانوئے تلمذ تہ کر کے نکلی تھی تو دوسری طرف انگریز حکومت کی تربیت یافتہ جماعت سر سید احمد خان جیسے لوگوں کی قیادت میں کام کر رہی تھی، جن کے افکار ونظریات کے نتیجہ میں اہل قرآن اور منکرین حدیث کی

---

[1] ایضا۔

جماعت وجود میں آئی۔ ①

الغرض باطل دین اسلام سے مسلمانوں کو دور کرنے اوراس دین کی پاک اورمنزہ تعلیمات کومسخ کرنے کے لئے ہرطرح کے اسلحہ سے لیس ہوکر میدان میں تھا، جہاں ان کا سامنا کرنے کے لئے اللہ والے سربکفن میدان میں اللہ پر اعتماد کر کے کھڑے تھے۔ برصغیر ہندو پاک کو جہاں ایک طرف انگریز حکومت سے آزاد کرانا تھا اسی طرح انگریز کے پروردہ اسلام کا چوغہ اوڑھے ان باطل افکار ونظریات کے حاملین اوران کے شاگردوں سے اس ملک کے باشندوں کوبھی آزاد کرانا تھا۔

اللہ رب العالمین کا جتنا بھی شکرادا کیا جائے کم ہے کہ جماعت اہل حدیث نے ان تمام فرقوں کی طوفان بدتمیزی کے آگے بند باندھ دیا، یہی وہ جماعت ہے جس کے تا قیامت موجود رہنے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیش گوئی فرمائی ہے تاکہ دفاع دین کا سلسلہ قیامت تک باقی رہے، یہ مقام تفصیل کا متحمل نہیں ہے ورنہ جماعت اہل حدیث کی زریں تاریخ سے سینکڑوں ایسی مثالیں پیش کرسکتی ہے جو دفاع اسلام اوراحقاق حق اورابطال باطل پر مشتمل ہیں۔

ماضی قریب میں بھی ایسی بہت سی شخصیات گزری ہیں جنہوں نے احقاق حق کی خاطر ایسی ایسی قربانیاں پیش کی ہیں کہ رہتی دنیا تک ان کی نظیر نہیں پیش کی جاسکتی، یوں تو ایسی بہت سی شخصیتیں ہیں جنہوں نے اس فریضہ کوانجام دیا،لیکن خاص طور سے جس شخص نے باطل کا ناطقہ بند کرنے کے لئے اپنے آپ کو وقف کیا وہ فاتح قادیان شیخ الاسلام مناظرِ اسلام علامہ ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ ہیں جنہوں نے باطل کی طرف سے اٹھنے والے ہرفتنہ کا بھرپور جواب دیا، چاہے وہ اسلام کا چوغہ اوڑھے دجال

① دیکھیں: (زوابع فی وجہ السنہ) از: شیخ صلاح الدین مقبول: ص: ۵۵، اوراس کے بعد۔

کا وارث متنبی غلام احمد قادیانی ہو، یا آریا سماجی، یا عیسائی یا کسی بھی رنگ روپ اور شکل وصورت میں، الغرض آپ رحمہ اللہ نے سب کا ناطقہ بند کر دیا۔

پھر جب فتنہ انکار حدیث نے سر اٹھانا شروع کیا اور مسلمانوں کے بیچ سے ہی ایسے لوگوں کا ظہور ہوا جنہوں نے اسلام کے ستون اعظم سنت نبوی کو ڈھانے کی کوشش کی چاہے وہ امرتسری ہوں، یا لاہوری، یا پنجابی، یا گجراتی یا چکڑالوی یا کوئی اور جماعت آپ رحمہ اللہ نے سب کی بخوبی خبر لی اور زبان وقلم ہر طرح سے ان کے آگے ڈھال بن کر کھڑے ہو گئے۔

پھر وہ چاہے سید محب الحق بانکی پوری ہوں، یا عبداللہ چکڑالوی ہوں، یا اسلم جیراجپوری ہوں یا ایڈیٹر نگار یا حق گو (باطل پسند) ہوں یا چوہدری غلام احمد صاحب پرویز ہوں یا ایڈیٹر ترجمان القرآن یا کوئی اور، سب کو ایسی خاک چٹائی کہ دوبارہ سر اٹھانے کی ہمت نہ کر سکے۔

زیر نظر رسالہ جو کہ مناظر اسلام فاتح قادیان کے منکرین حدیث کے جوابات پر مشتمل بعض رسائل کا مجموعہ ہے جو کہ ''اخبار اہل حدیث'' امرتسر کی زینت تھے، استاذ محترم مولانا محمد مستقیم سلفی حفظہ اللہ کی ہدایت پر اور ان رسائل کی اہمیت کی وجہ سے ان کو جمع وترتیب اور تعلیق وحواشی کے ذریعہ مزین کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کا ارادہ ہوا، اور الحمد للہ اب یہ کام پایہ تکمیل کو بفضل اللہ تعالی پہنچ کر قارئین کے ہاتھوں میں جانے کے لئے تیار ہے۔

اس مجموعہ کے اندر مندرجہ ذیل رسائل ہیں:

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق:

ان مضامین میں کتاب (شرعۃ الحق) از (سید محب الحق صاحب بانکی پوری) کے

احادیث نبویہ پراعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، جوقابل دید ہے۔

دفاع عن الحدیث:

یہ رسالہ ''اڈیٹرنگار'' کے جواب میں ترتیب دیا گیا۔

''اڈیٹرنگار'' نے سب سے پہلے حدیث ''اسراء'' پر اعتراض کیا ہے اس کے اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ راوی حدیث حضرت انس ہیں، انس مدینہ میں حاضر خدمت ہوئے تھے، اس وقت عمران کی ۷، ۸ سال کی تھی، اور اسراء کا واقعہ مکہ کا ہے، پھر انس نے کس سے سنا، کسی اور شخص سے سنا تو اس کا نام کیوں نہیں بتایا، لہذا یہ حدیث قابل حجت نہیں۔

پھر قتل مرتد والی حدیث پر بڑی سختی سے اعتراض کیا ہے۔

اس کے بعد مسئلہ غلامی پر اعتراض کیا ہے، اس کے اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ ''قرآن مجید نے مسلمان کو غلام رکھنے کی اجازت نہیں دی، مگر حدیثوں میں اس کی اجازت ملتی ہے، اس لیے یہ حدیثیں قابل سند نہیں''۔

اگلی تنقید کے ماتحت نماز کے متعلق احادیث پر اعتراض ہوا، آپ کو اعتراض ہے کہ بعض افعال مروجہ نماز میں ایسے داخل کئے گئے ہیں جن کا قرآن مجید میں ثبوت نہیں ملتا۔

پھر اوقات نماز پر سوال اٹھایا ہے۔

آگے بڑھتے ہیں تو ایام صیام پر بحث کرتے ہیں، ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ صیام کے متعلق ایام معدودات آئے ہیں، ایام ۳ سے ۹ تک ہوتا ہے، لہٰذا کم سے کم تین روزے فرض ہیں، تیس تمہاری فقہ اور حدیث نے تم پر لگائے ہیں۔

تفسیر بالروایت:

یہ رسالہ مولانا اسلم جیراجپوری کے جواب میں ترتیب دیا گیا۔

وہ کہتے ہیں: ''ائمہ حدیث نے حدیثوں کی رو سے تفسیر بالرائے کو تو حرام قرار دیا ہے لیکن تفسیر بالروایت کے طریق کو محفوظ خیال کیا ہے، حالانکہ روایت سوائے متواتر کے خواہ کسی درجہ کی ہو ظن سے آگے نہیں بڑھتی ۔ علاوہ بریں تفسیر میں جو روایتیں ہیں ان کے متعلق خود ائمہ حدیث کی شہادت ہے کہ وہ بالعموم ضعیف بلکہ موضوع ہیں ۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جو امیر المؤمنین فی الحدیث کہے جاتے ہیں ان کا قول ہے کہ ''تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں: ملاحم، مغازی اور تفسیر، عام خیال یہ ہے کہ ''صحاح ستہ'' میں جو روایات ابواب التفسیر میں آئی ہیں وہ صحیح ہیں ۔ مگر ان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ بھی امام موصوف کے اس قول سے مستثنیٰ نہیں ہیں، چنانچہ میں صحاح ستہ سے تفسیر بالروایت کی چند مثالیں نکال کر پیش کرتا ہوں ۔ جن میں سے کچھ تو خود قرآن کے مخالف ہیں کچھ دوسری حدیثوں سے متعارض، اور بعض علم اور عقل کے خلاف ۔ جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تفسیریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہرگز نہیں ہو سکتیں'' ۔ (بلاغ امرتسر (ص:۵۸) اپریل ۳۶ء) ۔

بلاغ کا باطل گو نامہ نگار:

یہ رسالہ ''حق گو'' صاحب کی کتاب ''بلاغ الحق'' کے جواب میں ترتیب دیا گیا ہے ۔

تصدیق الحدیث بیان الحق بجواب بلاغ الحق:

یہ رسالہ حافظ محب الحق (پنڈت) صاحب کی کتاب ''بلاغ الحق'' کے جواب میں ترتیب دیا گیا ۔

یہ کتاب ((بلاغ الحق)) دراصل کتاب ''شرعۃ الحق'' کا مجمل بیان ہے، ہاں اس میں زیادتی ہے تو یہ ہے کہ مصنف موصوف کا لب ولہجہ تیزی میں اتنا ترقی کر گیا جتنا کہ

حجاز کے سالن کی نسبت دہلی کی جامع مسجد کے کباب، بات بات پر علمائے حدیث کو کوستے ہیں، حدیث کے ماننے والوں پر بے طرح الزام لگاتے ہیں، جو بات ان کے خیالات میں نہیں بلکہ جس بات کو وہ کفر سمجھتے ہیں، حافظ صاحب اسے بھی ان پر چسپاں کرتے ہیں۔

تصدیق الحدیث (حصہ دوم) حقیقت پسندی بجواب شخصیت پرستی:

یہ رسالہ چوہدری غلام احمد صاحب پرویز کے ایک مضمون جو ''ترجمان القرآن'' مجریہ ماہ صفر ۱۳۵۶ھ میں شائع ہوا تھا کے جواب میں ترتیب دیا گیا ہے۔

تصدیق الحدیث (حصہ سوم) محدث اور فقیہ:

یہ رسالہ ایڈیٹر رسالہ ((ترجمان القرآن)) کے مقولہ کے جواب میں ترتیب دیا گیا۔

صلاۃ المؤمنین بجواب رسالہ صلاۃ المرسلین:

یہ رسالہ میاں محمد فاضل مسلم حنیف اہل الذکر والقرآن چکوال ضلع جہلم کے جواب میں ترتیب دیا گیا۔

ان رسائل کی ترتیب زمنی ہے، یعنی سنوی۔

ان رسائل کا اثر یہ ہوا کہ منکرین حدیث کے جو شبہات تھے ان سب کا ازالہ ہو گیا اور لوگوں کے ذہنوں میں انہوں نے جو شکوک وشبہات گھولے تھے ان سب کا رد ہو گیا اور ان کے ذہن صاف ہو گئے، اور ان کو سر اٹھانے کا دوبارہ موقعہ نہ ملا۔

منکرین حدیث کے جو بنیادی شکوک وشبہات اول روز سے ہیں اور جنہیں وہ آج تک موقع بموقع دہراتے رہتے ان کو چند نکات میں جمع کیا جا سکتا ہے:۔

ا۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احادیث کا لکھنا منع فرما دیا تھا۔

۲۔احادیث میں تحریف واقع ہوگئی تھی۔

۳۔صحابہ نے احادیث کے دفاتر کوجلوادیا تھا،اوروہ احادیث بیان کرنے والوں کو سزائے تازیانہ دیتے تھے۔

۴۔احادیث ڈھائی تین سوصدی کے بعد لکھی گئی ہیں،تواس وقت تک کوئی حدیث کس طرح تغیر وتبدل سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

۵۔قرآن ایک مکمل کتاب ہے،قرآن کے ہوتے ہوئے احادیث کی ضرورت نہیں۔

۶۔احادیث باہم متعارض ہونے کی وجہ سے ناقابل اعتماد ہیں۔

۷۔وہی احادیث قابل قبول ہیں جوقرآن کے موافق ہوں،اور جواحادیث نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بطور تشریح وتوضیح کے بیان کیا ہے وہ سب ناقابل قبول ہیں۔

ان سارے شکوک وشبہات کا اس مجموعہ کے اندر بخوبی طور سے جواب دیا گیا ہے جو اس باب میں حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

اب جب یہ فتنے پھر دھیرے دھیرے اپنا سر شکل وصورت اور نام تبدیل کر کے اٹھانے لگے تھے تو ضرورت تھی کہ علامہ رحمہ اللہ کے ان رسائل کو پھر سے نئ تحقیق وترتیب کے ساتھ مزین کر کے منظر عام پر لایا جائے،کیوں کہ اس سلسلہ میں مولانا رحمہ اللہ نے جتنا لکھ دیا ہے اس سے زیادہ لکھنے کی نا تو ضرورت ہے اور نہ ہی کوئی آج کے اس دور میں ان مخلصین کی طرح لکھ سکتا ہے الا ماشاءاللہ۔

اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ ان رسائل پر علمی طور پر کام کیا جائے اور اپنے علماء کی ان گراں قدر محنتوں سے لوگوں کوروشناس کرایا جائے۔اس لئے میں نے اس پر متعدد کام کئے جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ پوری کتاب کو اول تا آخر ٹائپ کروا کر مراجعہ اور نظر ثانی کیا۔

۲۔ قرآنی آیات میں سورہ اور آیت نمبر درج کیا۔

۳۔ حدیثوں کو اس کے اصل مصادر کی طرف تحویل کیا۔

۴۔ صحت وضعف کے اعتبار سے حدیثوں کا حکم علماء کے اقوال سے بیان کرنے کی اپنی استطاعت اور ناقص علم کی حد تک کوشش کی۔

۵۔ عموما حدیثوں کے حوالہ میں مؤلف رحمہ اللہ نے پرانی طبع اور تخریج یا اس طرح کی کتابوں کا ذکر کیا تھا جو اصل مصادر میں سے نہیں ہیں ہم نے ان کے اصل مصادر کا ذکر کیا۔

۶۔ جا بجا اقوال کے حوالہ جات کو ایک حد تک نقل کیا۔

۷۔ مصنف رحمہ اللہ نے جو حوالہ جات نقل کئے تھے جدید طرز کے مطابق ہم نے ان کو حاشیہ میں کیا اور جو کتابوں کی جدید طبعات موجود ہیں ان سے حوالہ جات نقل کیا، چونکہ مصنف رحمہ اللہ نے عموما قرآن کی آیتوں میں پارہ اور رکوع کا حوالہ درج کیا تھا جو اس دور کے حساب سے تھا افادہ عامہ کی غرض سے ہم نے ان کو جدید طرز کے مطابق سورہ کا نام اور آیت نمبر ذکر کیا، ایسے ہی صحیح بخاری اور فتح الباری وغیرہ میں مصنف رحمہ اللہ نے پارہ وغیرہ کا حوالہ نقل کیا تھا جو اب نہ تو دستیاب ہیں اور نہ ہی رائج ہیں، اسی لئے ان ساری جگہوں پر ہم نے جدید طرز کے حوالے نقل کئے ہیں، اور مؤلف نے جو حوالہ جات حاشیہ میں رکھے تھے ہم نے بھی ان کو حاشیہ ہی میں باقی رکھا ہے ہاں ان کو نقل کرنے کے بعد بریکٹ میں (مؤلف) لکھ دیا ہے، اور جہاں مزید حاشیہ لگانے کی حاجت پیش آئی حسب ضرورت حاشیہ لکھا تا کہ کسی طرح کے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔

۸۔تفسیر کی کتابوں میں مؤلف رحمہ اللہ نے عموماً صرف نام یا نسبت ذکر کرنے پر اکتفا کیا تھا ہم نے ان کے حوالہ جات کو درج کیا۔

۹۔ایسے ہی شروح حدیث میں بھی مؤلف رحمہ اللہ نے عموماً کتابوں کے ناموں کے ذکر پر اکتفا کیا ہے ہم نے ان کے حوالہ جات درج کئے۔

۱۰۔مفید تعلیقات وحواشی سے کتاب کو مزید مزین کرنے کی کوشش کی۔

اس موقع پر میں اللہ رب العالمین کا نہایت شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھ جیسے کم علم اور بے عمل انسان کو اتنی بڑی خدمت انجام دینے کی توفیق عطا کی اور ہر قدم پر اس وحدہ لاشریک نے میری مدد اور اعانت کی۔

پھر میں اپنے دادا رحمہ اللہ کے لئے دعا گو ہوں کہ اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ان کی قبر کو جنت کی کیاری بنا دے جن کی بے انتہا محبت اور پھر ان کی دعاؤں اور نصیحتوں کا ثمرہ ہے کہ آج میں اس لائق ہوا کہ اس دین حنیف کی خدمت میں کچھ حصہ لے سکوں۔

اس موقع پر میں اپنے والدین کا شکریہ ادا کرنا اور ان کے لئے دعائیں کرنا بھی اپنا لازمی فرض سمجھتا ہوں کہ جن کی تربیت اور جن کی پرورش نے دین کی خدمت کی ذمہ داری کا جذبہ میرے اندر پیدا کیا۔

اسی طرح میں شکر گزار ہوں استاذ محترم شیخ محمد مستقیم سلفی حفظہ اللہ کا جن کی خصوصی عنایت کی بدولت یہ رسائل حاصل ہوئے اور ان پر یہ کام تکمیل تک پہنچ سکا، اسی طرح شیخ عبداللہ ناصر رحمانی، شیخ ظفر الحسن مدنی، شیخ سید طیب الرحمن زیدی، شیخ عبدالمتین مدنی صاحبان کا شکریہ ادا کرنا بھی نہیں بھول سکتا کہ جنہوں نے ناچیز کی ادنی سی گزارش پر اپنا اپنا قیمتی وقت نکال کر مقدمہ اور تقریظ تحریر فرمانے کی زحمت برداشت کی۔

اگراس موقع پر میں شیخ عبدالسلام سلفی حفظہ اللہ امیر صوبائی جمعیت اہل حدیث ممبئی کا شکریہ ادا نہ کروں تو حق تلفی ہوگی کیوں کہ ''مَنْ لَا یَشْکُرِ النَّاسَ لَا یَشْکُرِ اللہَ''۔شیخ حفظہ اللہ نے بڑی وسعت قلبی کے ساتھ ناچیز کی حوصلہ افزائی کی اور کام مکمل ہونے پر جمعیت سے طبع کرانے کی بشارت بھی سنائی، اللہ تعالی شیخ کی اس وسیع ظرفی کو رفع درجات اورمحوسیئات کا سبب بنائے۔

اس موقع پر میں حافظ محفوظ الرحمن صاحب سلفیؔ لائبریرین جامعہ سلفیہ کا شکریہ ادا کرنا بھی نہیں بھول سکتا جنہوں نے ہر وقت کتابوں اور حوالہ جات کے حصول میں میری بے حد مدد کی، اور اخیر میں میں شکر گزار ہوں اپنے ان ساتھیوں کا بھی جنہوں نے اس عمل کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں میرے ساتھ کسی بھی طرح کا تعاون کیا، خصوصا صہیب زبیر سلفی حفظہ اللہ۔ اللہ ان سب کو اجر جزیل سے نوازے اور ان کی کوششوں کو اور ہر اس شخص کی کوشش کو قبول فرمائے جس نے میری کسی طرح بھی اس عمل میں مدد کی ہو۔

اللہ تعالی میرے اس عمل کو قبول کرے اور خالص اپنی رضا کے لئے بنائے اور میرے اور میرے والدین اور ہر اس شخص کے لئے جس نے اس میں دامے درمے سخنے حصہ لیا ہو جہنم سے نجات اور جنت الفردوس کے حصول کا سبب بنائے۔ آمین۔

عبدالأحد احسن جمیل آل عبدالرحمن

۱۳/ ۷/ ۱۴۴۲ھ = ۲۵/ فروری ۲۰۲۰ء

حکمۃ الحق

بجواب شرعۃ الحق

مؤلفہ

مناظرِ اسلام علامۂ عصر ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری

سلسلۂ مضامین اخبار اہل حدیث امرتسر، بتاریخ ۲۷/شوال المکرم ۱۳۴۸ھ (تا) ۵/شعبان ۱۳۴۹ھ = ۲۸/مارچ ۱۹۳۰ء (تا) ۲۶/دسمبر ۱۹۳۰ء، (جلد: ۲۷)

ان مضامین میں کتاب ((شرعۃ الحق)) از (سید محب الحق صاحب بانکی پوری) کے احادیث نبویہ پر اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، جو قابل دید ہے۔

تحقیق وتعلیق

عبدالاحد احسن جمیل آل عبدالرحمن

قسط:۱

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۲۷/شوال المکرم ۱۳۴۸ھ = ۲۸/ مارچ ۱۹۳۰ء)

کتاب ''شرعۃ الحق'' عرصہ ہوا ضلع پٹنہ سے شائع ہوئی تھی، اس میں مصنف (سید محب الحق صاحب بانکی پوری) نے حدیث نبوی کے خلاف مقدور بھر کوشش کی ہے، چوں کہ کتاب بہت طویل (۳۹۶ صفحات پر) ہے، اس لیے اس کے جواب پر آج تک توجہ نہ ہو سکی، یہ شک نہیں کہ اہلحدیث کانفرنس نے بعض علماء مدرسین دہلی کو اس طرف متوجہ کیا اور ایک رقم خاص اس کے خرچ کے لیے منظور بھی کی، مگر طوالت کار اور علمائے مدرسین کی عدم فرصت کی وجہ سے جواب نہ ہو سکا، مجھے اپنے مشاغل سے فرصت نہ تھی اس لیے جواب ملتوی رہا۔

اتنے میں امرتسری منکر حدیث پارٹی نے اپنے رسالہ ''بلاغ'' میں ڈینگ مارتے ہوئے یہ فقرات بھی لکھ مارے:

''اس کتاب (شرعۃ الحق) کو شائع ہوئے تو سال ہو چکے ہیں یہ حقیقت حدیث کے متعلق ایک مستند چیز ہے، اس کو دیکھ کر اہلحدیث جماعتوں میں بہت تشویش پیدا ہوئی، میں نے سنا کہ کسی شخص نے اس کی تردید کی جرأت نہ کی، آخر مجلس مرکزیہ اہلحدیث دہلی میں پیش کی گئی، وہاں سے مولانا ابراہیم سیالکوٹی کے نام قرعہ نکلا، لیکن جیسا کہ ظاہر ہے کہ انہوں نے بھی کچھ نہ کیا، جب مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ حج کو گئے تو مولانا سیالکوٹی کو اپنا قائم مقام بنا کر امرتسر چھوڑ گئے، میں نے موقع دیکھ کر ایک دوست کی معرفت آپ کی خدمت میں تحریر کی کہ اس مسئلہ کو صاف کریں، انہوں نے وعدہ بھی کیا

لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا، بہر حال یہ ایک لاجواب کتاب ہے'' (بلاغ امرتسر مارچ ۱۹۳۰ء، ص:۲)۔

حالاں کہ یہ بالکل غلط ہے، نہ مولوی ابراہیم کے سپرد یہ کام ہوا نہ میرے حج سفر کے ایام میں وہ امرتسر قیام پذیر ہوئے، یہ سب داستان ہی افسانہ ہے، چوں کہ یہ کتاب واقعی قابل جواب ہے اس لیے میرے عزیز حکیم یعقوب ہاشمی امرتسری نے مجھے توجہ دلائی کہ جس طرح اور جوابات کے لیے آپ کم وبیش وقت نکالتے ہیں اس کتاب کے لیے بھی نکالیے، اس پر میرے دل میں ڈالا گیا کہ سردست اس کا جواب اخبار اہلحدیث میں سلسلہ وار دیا جائے جو بعد اتمام کتاب بن سکتا ہے، سچ ہے ؎

بلائیں زلف جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے
بلا یہ کون لیتا جان پر لیتے تو ہم لیتے

مصنف کی لیاقت دیانت اور امانت:

کچھ شک نہیں کہ ہم کسی مصنف کو بددیانت نہیں کہا کرتے بلکہ یہ کہا کرتے ہیں کہ جو کچھ اس نے سمجھا ہے صحیح ہو یا غلط اس کو ازراہ دیانت ظاہر کرتا ہے، الا اس صورت میں کہ ہم کوئی قرینہ ایسا پائیں جو مصنف کی دیانت اور لیاقت کے منافی ہو۔

سید محب الحق صاحب مصنف ''شرعۃ الحق'' کی یہ کتاب جس پایہ کی ہے اس کا ذکر تو موقع بموقع ہوتا رہے گا آج ہم صرف ایک قرینہ پیش کرتے ہیں جس سے ہم نے یہ سمجھا ہے کہ مصنف کی نسبت اگر حسن ظن رکھیں تو کہنا پڑے گا کہ ''بے سمجھ'' ہیں اور اگر حسن ظن کی جگہ نہ پائیں تو کہنا پڑتا ہے کہ آپ بے دیانت ہیں، اس لیے ہم حیران ہیں کہ کون سی صورت اختیار کریں۔

سید صاحب نے اپنے اس دعوی پر کہ صحابہ کرام میں حدیثوں پر اعتبار نہ تھا، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق نے پانچ سو حدیثیں جلادی تھیں، چنانچہ مصنف موصوف کے الفاظ یہ ہیں:

’’حضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ کی روش یہ تھی۔

’’قالت عائِشَةَ - رضی اللہ عنہا-: جَمَعَ أبِي الحَدِيثَ عَنْ رَسُولِ اللهِ - ﷺ - وكانَ خَمْسَمِائَةِ حَدِيثٍ، فَباتَ لَيْلَةً يَتَقَلَّبُ كَثِيرًا فغَمَّنِي، فَقُلْتُ: أتَتَقَلَّبُ لِشَكْوٰى أوْ لِشَيءٍ بَلَغَکَ؟ فَلَمّا أصْبَحَ قالَ: أيْ بُنَيَّة، هَلُمِّي الأحادِيثَ التِي عِنْدَكِ، فَجِئْتُهُ بِها، فَدَعا بِنارٍ فَحَرَّقَها، فَقَالَ: خَشِيْتُ أَنْ أَمُوتَ وَهِيَ عِنْدِيْ فَيَكُونُ فِيْهَا أَحَادِيثٌ عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ فَقَدْ ائْتَمَنْتُهُ وَوَثِقْتُ وَلَمْ يَكُنْ كَمَا حَدَّثَنِي، فَأَكُونُ قَدْ تَقَلَّدْتُ ذٰلِکَ ۔ فَهٰذَا لَايَصِحُّ‘‘(تذکرۃ الحفاظ)(۱/۱۱)۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میرے باپ نے پانچ سو حدیثیں جمع کی تھیں ایک رات نہایت بے چینی سے کروٹیں بدلتے رہے جس سے مجھے تکلیف ہوئی، میں نے پوچھا کہ آپ کسی مرض سے بے چین ہیں یا کوئی اور بات ہے، صبح ہوتے ہی مجھ سے کہا کہ تیرے پاس جو حدیث کی کتاب ہے وہ لے آ، میں لے آئی، تو اسے آگ منگا کر جلا دیا، میں نے کہا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ تو فرمایا کہ میں اندیشہ مند ہوا کہ میں مرجاؤں اور یہ کتاب چھوڑ جاؤں، شاید اس میں ایسے آدمی کی بھی حدیث ہو جو میرے نزدیک معتبر ہے اور حقیقت میں وہ معتبر نہ ہو۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ میں ایسے بھی تھے جن پر اعتبار نہ کیا جاسکے یا شاید حضرت صدیق اکبر کو ’’أصحابی کالنجوم بأیھم اقتدیتم اهتدیتم‘‘[1] کی حدیث نہ پہنچی

[1] الابانة الکبری از ابن بطة:(۱/۳۰۹)، حدیث:۷۰۱، جامع بیان العلم وفضلہ از ابن عبدالبر:(۲/ ۹۲۵)، حدیث: ۱۷۶۰، اس حدیث کے بارے میں امام ابن عبدالبر کہتے ہیں ،هذا اسناد لاتقوم به حجة ،ایک صفحہ پہلے لکھتے ہیں:هذا الكلام لايصح عن النبی ﷺ، امام احمد، امام بیہقی اور ابن حزم بھی اس حدیث کی سندوں کو غیر صحیح گردانتے ہیں اور شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث پر موضوع اور باطل کا حکم لگایا ہے، دیکھیں:(سلسله الاحادیث الضعیفة) از شیخ البانی:(۱/ ۱۴۴)، حدیث:۵۸ (مشكاة المصابیح) از خطیب التبریزی مع تحقیق شیخ البانی:(۳/ ۱۶۹۶)، حدیث:(۶۰۱۸)۔

ہو‘‘(شرعۃ الحق ص:۱۴۵)۔

کچھ شک نہیں یہ عبارت (تذکرۃ الحفاظ) جلد اول (ص:۵) پر ہے جس میں اس روایت کو امام حاکم محدث کے نام سے بیان کیا گیا ہے، مگر غور طلب بات یہ ہے کہ عربی عبارت منقولہ میں یہ فقرہ ’’ فَهٰذَا لَایَصِحُّ‘‘‘ کس کا کلام ہے، مصنف موصوف کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس فقرہ کی بابت نہ اظہار رائے کیا نہ ترجمہ کیا بلکہ ایسا کھا گئے کہ اچھی طرح ہضم ہو جائے مگر حقیقت بین نگاہوں سے اصلیت چھپ نہیں سکتی کیوں کہ یہی فقرہ سارے مضمون کی جان ہے۔

ہم نے اس پر توجہ کی تو ثابت ہوا کہ یہ فقرہ علامہ ذہبی مصنف تذکرۃ کا ہے روایت منقولہ کا جزء نہیں، کیوں کہ یہ روایت (کنز العمال) میں بھی منقول ہے مگر یہ فقرہ اس جگہ نہیں ہے (ملاحظہ ہو: مختصر کنز العمال برحاشیہ مسند احمد، جلد ۴ ص:۵۹،۵۸)[1] پس جب یہ فقرہ علامہ ذہبی کا ہے تو معنی صاف ہوئے کہ ذہبی ہی کہتے ہیں کہ یہ روایت صحیح نہیں، اسی طرح مصنف کنز العمال بھی موقع مرقوم پر اس روایت کی تغلیط کرتے ہیں۔ (حوالہ مذکور)

مقام حیرت ہے:

کہ سید صاحب نے کتنا کمال کیا کہ فقرہ تو نقل کیا مگر اس کا ترجمہ کیا نہ تنقید روایت کیا، کیوں کہ ایسا کرنے سے ان کا وہ قلعہ جو اس خام بنیاد پر بنا کیا تھا، دھم سے گر جاتا ، بعد اس تحقیق کے ہم سید صاحب اور ان کے ہم نواؤں سے پوچھتے ہیں کہ ہم سید صاحب کی نسبت کیا گمان کریں۔ بے دیانت یا بے لیاقت آہ ؎

بروز حشر گر پر سند خسرو راچرا کشتی
چہ خواہی گفت قربانت شوم تامن ہماں گوئم

---

① دیکھیں: (کنز العمال)(۱۰/ ۲۸۵)، حدیث:۲۹۴۶۰۔

مولانا شبلی مرحوم:

کو خدا بخشے اس روایت کے متعلق ان سے بھی تغافل ہوگیا، انہوں نے بھی اس روایت پر بہت بڑا قلعہ تعمیر کیا، مگر تنقید نہ کی، ہاں ہمارے مخاطب سید محب الحق اور مولانا مرحوم میں یہ فرق ہے کہ مرحوم نے یہ فقرہ (فَهٰذَا لَایَصِحُّ) نقل ہی نہیں کیا (الفاروق جلد ۲ ص: ۱۵۳) مگر سید صاحب نے کمال دلیری یا نافہمی یا تصرف الٰہی سے فقرہ مذکور نقل کر کے ترجمہ اور تحقیق دونوں سے خاموشی اختیار کی۔ الی اللہ المشتکی۔

❁ ❁ ❁

قسط: ۲

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۴/ذی قعدہ ۱۳۴۸ھ = ۴/اپریل ۱۹۳۰ء)

گذشتہ پرچہ میں اس سلسلہ کی ابتدا ہو چکی ہے، آئندہ کے لیے اس کا صفحہ الگ کرنے کا خیال ہے، ان شاء اللہ۔

پہلے نمبر میں ہم مصنف شرعۃ الحق کی بابت بتا آئے ہیں کہ آپ نے جو روایت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے احادیث جلانے کی نقل کی ہے، وہ صحیح نہیں ہے، آپ نے اس کی عدم صحت کا عربی فقرہ خود نقل کیا مگر ترجمہ تک بھی نہ کر کے اپنے ناظرین کو غلطی میں ڈالا۔

آج ہم کتاب مذکور کی روح نکال کر اس پر مختصر سی بحث کرتے ہیں۔

کچھ شک نہیں کہ مصنف موصوف حجیت حدیث کے منکر ہیں اور حدیث کے منکر پر سب سے پہلے یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ نماز مفروضہ کی رکعات اور ترکیب قرآن مجید سے دکھاؤ، اس سوال کو اٹھانا ہر ایک اہل قرآن [1] (خواہ وہ بشکل چکڑالوی ہو، خواہ بصورت گجراتی، بصورت امت مسلمہ امرتسری یا گوجرانوالی وغیرہ ہواس) کا فرض ہے، اس لیے ہمارے مخاطب سید محب الحق صاحب نے بھی اس سوال پر توجہ فرمائی، چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

''صلاۃ کے پانچ وقت مقرر ہیں، صبح، ظہر، عصر، مغرب، عشاء، اور ہر نماز وضو رہتے ہوئے ہونی چاہیے، صبح کی ۲ رکعتیں، مغرب کی تین رکعتیں، اور ظہر وعصر اور عشاء کی چار چار رکعتیں ہیں، ہر رکعت میں قیام، رکوع، سجود علی الترتیب ہے اور ہر دوسری رکعت کے بعد قاعدہ، قیام میں الحمد اور

---

[1] مولوی عبداللہ چکڑالوی کے اتباع کے سوا باقی سب منکرین حدیث اپنے کو اہل قرآن کہلانے سے انکار کرتے ہیں۔ ہمارے مخاطب سید محب الحق صاحب بھی بڑی مخالفت کے ساتھ فرقہ اہل قرآن سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں، چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں: ''میں ہرگز اہل قرآن نہیں۔ کیوں کہ اہل قرآن کا فرقہ بمقابلہ اہل حدیث اور بمقابلہ آریہ سماج نکلا ہے۔ اس نے قرآن کو چیستان اور معمہ بنا کر اسے کھینچ تان کر اس کی ہڈیاں مروڑ کر اک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی ہے، الفاظ کے جوڑ توڑ سے ایسے معنی نکالتے ہیں کہ قرآن کو سو دفعہ پڑھ جاؤ مگر وہ معانی سمجھ میں نہیں آنے کو تیرہ سو برسوں کی نماز جو عمل متواتر سے ثابت ہے بدل دی گئی اور یہ اصول بلا بینۂ رب گڑھ لیا گیا کہ نماز میں قرآنی الفاظ ہوں، حالانکہ خدا کو لفظ مطلوب نہیں، مفہوم اور دلی خشوع مطلوب ہے، کیوں کہ نماز اس کی یاد کے لئے قائم ہوتی ہے، {اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ} (طہ: ۱۴)۔ (شرعۃ الحق، ص: ۶۱)۔

لاہوری اہل قرآن کے ممبرو! کیا کہتے ہو؟

باوجود اس کے ہمارا ان سب کو اہل قرآن لکھنا محض اس اصول پر ہے کہ ان سب جماعتوں میں باوجود اختلاف شدید کے اقرار بالقرآن مع انکار حجیت حدیث قدر مشترک ہے۔ ہماری اصطلاح میں ایسے لوگ محض اہل قرآن ہیں۔ ہمارے خیال میں ان لوگوں کو ہماری اس رواداری کا مشکور ہونا چاہئے کہ ہم ان کو ایک معزز لقب سے یاد کرتے ہیں۔ (اہل حدیث)

کلام الٰہی کی کچھ آیتیں پڑھنی چاہئیں اور رکوع وسجود میں تسبیح وتحمید اور قاعدے میں تحیات ودرود، یہ روز کی نماز ہوئی، جمعہ کے دن بجائے ظہر جمعہ کی دو رکعتیں'' (شرعۃ الحق ص: ۲۳۳)۔

نوٹ! دو نمازوں کے امرتسری قائلو! اور تین کہنے والے گوجرانوالئے ممبرو! کیا کہتے ہو؟

اہلحدیث:

چوں کہ ہمارا روئے سخن اس وقت محض مصنف شرعۃ الحق کی طرف ہے اس لیے ہمیں ضرورت نہیں کہ ہم کسی اور صنف اہل قرآن کا ذکر کریں ورنہ ہم بتاتے کہ یہ لوگ عمل بالحدیث سے انکار کر کے کیسی ضیق مخالفت میں مبتلا ہوتے ہیں جس پر فرمان خداوندی: ﴿إِنَّكُمْ لَفِي قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝٨ يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ أُفِكَ﴾ [الذاریات: ۸-۹] ''تم مختلف بولیاں بولتے ہو'' بالکل صادق ہے، پس ہم خاص اپنے مخاطب ہی کو متوجہ کرتے ہیں کہ آپ کا یہ دعویٰ پبلک میں آچکا ہے اور ہر اپنے بیگانے نے سن لیا ہے جس کو ہم اپنے لفظوں میں پھر دہرائے دیتے ہیں۔

صبح کی دو رکعتیں، ظہر، عصر، اور عشاء کی چار چار، مغرب کی تین، جمعہ کی بوقت ظہر دو رکعتیں فرض ہیں۔

بہت خوب یہی ہمارا عمل ہے، اس عمل میں تو ہم اور آپ متفق ہیں مگر دلیل میں مختلف، آپ کو معلوم ہے ہماری دلیل تو بس یہ ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی طرح نمازیں پڑھیں اور فرمایا ''صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي'' [1] جیسے تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے تو ایسی ہی پڑھا کرو۔

مگر آپ کی دلیل یہ حدیث نہیں ہو سکتی، اس لئے! یہاں جو کچھ بھی بحث ہوگی وہ

---

① صحیح بخاری: كتاب الأذان، باب الأذان للمسافر،...، حدیث: ۶۳۱۔

آپ کی دلیل پر ہوگی دعوی پر نہیں کیوں کہ دعوی میں آپ ہم سے متفق ہیں۔

دلیل آپ کی یہ ہے۔

''خوف دشمن کے وقت کہ دشمن مقابل ہو مقتدی کی ایک اور امام کی دو رکعتیں، ایسے خوف میں کہ نماز پڑھنی دشوار ہو تو سوار یا پیادہ جس طرح ہو سکے، سفر کی دو رکعتیں ہیں، سوائے مغرب کے، صلاۃ (اصطلاحاً اسی کا نام ہے اور یہ ازلی اور ابدی ہے)'' (شرعۃ الحق:ص:۲۳۲)۔

مولانا سید صاحب:

آپ اپنے دعوی کو سامنے رکھیے اور اس دلیل کو بھی بغور ملاحظہ فرمایئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ کے دعوی اور دلیل میں تقریب تام کیا ناقص بھی نہیں، اس دلیل سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہ کہ حضر میں دو دو رکعتیں فرض ہیں، خاص کر ظہر، عصر کی، کیوں کہ یہی دو وقت جنگ کے ہوتے ہیں جس میں ایک ایک رکعت مقتدی کی ثابت ہے جس کو حضر میں ڈبل کرنے سے دو رکعتیں ہوتی ہیں، چنانچہ ایک شیعہ اہل قرآن مولوی 'تصدق حسین' صاحب مصنف ''توضیح الآیات فی رکعات الصلاۃ'' کا بھی یہ قول ہے، مگر آپ کا دعوی تو اس سے الگ ہے، ظہر اور عصر کی چار اس تقسیم کے ساتھ کہ مغرب کی تین اور جمعہ کی دو یہ کہاں ثابت ہے۔

نوٹ! امرتسری اہل قرآن کے جدید مناظرے ''اتباع الرسول'' میں ہم نے یہ کہا تھا کہ بقول آپ کے رسول کے فعل پر بھی امت سوال کر سکتی ہے کہ کہاں سے کیا، تو آپ بتائیں کہ جمعہ بہیئت کذائی قرآن میں کہاں مذکور ہے، ثبوت دیجیے یا ترک کیجیے۔

کمال جرأت:

اس کے جواب میں بجائے ثبوت دینے کے لکھتے ہیں کہ مولوی صاحب پر افسوس ہے، بحث تو توحید میں اور سوال جمعہ کا۔

حیرانی ہے کہ سوال میں تنگ آکر مبحث سے گریز کرنے والوں، ناظرین کو مغالطہ دینے والوں کو بھی ان کے معتقد محقق مدقق، ماہر، کامل وغیرہ القاب سے یاد کرتے ہیں، جس پر بے ساختہ منہ سے نکلتا ہے ؎

ہم شیخ کی سنتے تھے مریدوں سے بزرگی
جاکر کے جو دیکھا تو عمامہ کے سوا ہیچ

سید صاحب!

آپ کا عمل بالحدیث مان کر حدیث سے انکار کرنا اس مصرعہ کا مصداق ہے۔

منکرے بودن و ہمرنگ مستاں زیستن

❁ ❁ ❁

قسط: ۳

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۱۱/ذی قعدہ ۱۳۴۸ھ = ۱۱/اپریل ۱۹۳۰ء)

کتاب ''شرعۃ الحق'' کا موضوع جیسا کہ پہلے نمبروں میں ظاہر کیا گیا، انکار حدیث ہے، چوں کہ کسی چیز کا انکار کرنے کے لیے اس کا صحیح تصور ہونا بھی ضروری ہے اس لیے فاضل مصنف نے علم حدیث کا مشرح الفاظ میں تصور کرایا ہے، جو درج ذیل ہے:

''سیدنا ونبینا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دربار پیغمبری میں جو اہل حضور تھے وہ خوش نصیب تھے، خوش زیست تھے، تذکروں کے محتاج نہ تھے، دل تڑپا اور پہنچے، آنکھیں بھی سینک لیں، دل بھی

ٹھنڈا کیا، بعد کے دور والے جو بچھڑے ہوئے تھے ان کے دل محبوب کے تذکروں ہی میں بستے تھے، کیوں کہ ان کے لئے پانے کی راہ، نہ دیکھنے کا راستہ، اس طرح آپ کے تذکرے اور آپ کی حدیثیں یہاں وہاں شائع ہوتی رہتی تھیں، تو جیسا تذکروں کا دستور ہے کہ جتنے منہ اتنی باتیں اس پر مبالغہ، جدت، رنگ آمیزیاں حسب دستور زمانہ لازم۔ یہ باعث ہوا موضوعی حدیثوں کے ذخیروں کا۔ محبت کی آنکھ رد و قدح کرتی ہی نہیں، کیوں کہ جوش محبت میں نہ روایت کی گنجائش ہوتی ہے، نہ ترازوئے تحقیق پر تولنے کی ضرورت، محبت کا متوالا ہر بات کے تسلیم کرنے کو تیار ہوتا ہے، یوں غلط روایتوں نے فتحیابی حاصل کی، مگر ہاں جو شراب محبت پیتے گئے اور بدمست نہ ہوئے جنہوں نے آفتاب نظارہ بازی کی مگر بجائے چکا چوند میں پڑنے کے ان کی آنکھیں اور بھی روشن ہوگئیں وہ حقیقت کی تجلیوں سے فیضیاب ہوئے، تذکروں کا زمانہ جب غبار آلود ہوا اور رطب و یابس کے انبار لگے تو حق بینوں کی آنکھیں کھلیں، پھر جو منظر سامنے آیا اس سے ان کا ایمان کانپ گیا اور دل لرز گیا کہ یا اللہ یہ تو بری بنی، وہ چھان بین میں لگے اور حدیث کے جانچنے کے شرائط مقرر کئے اور ان شرائط پر جانچنا شروع کیا، ان کی غرض یہ نہ تھی کہ نیا دین قائم کریں، قرآن مجید کی تفسیر لکھیں، دین میں قرآن مجید سے فاضل کسی کتاب کا اضافہ کریں یا اسلام میں فرقہ بندی قائم کریں بلکہ ان کی غرض خالص یہ تھی کہ حدیثوں میں تمیز پیدا ہو، موضوع حدیثیں جہاں تک امکان کے اندر ہے چھٹ جائیں اور آئندہ وضع حدیث کا دروازہ بند ہو۔

جو کوششیں اس کے متعلق انہوں نے کیں اس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی ان کی کوششیں تمام تر مشکور ہوئیں، اور وہ بوجہ خلوص نیت جس طرح عنداللہ ماجور ہوئے، عندالخلائق بھی ویسے ہی محمود، مقبول ہوئے'' (شرعۃ الحق ص: ۱۷، ۸۱، ۱۹)۔

اہلحدیث:

جو کچھ مؤلف شرعۃ الحق نے علم حدیث کی بابت ظاہر کیا ہے مولانا حالی مرحوم نے

بھی یہی کہا ہے، جن کے اشعار درج ذیل ہیں ؎

گروہ ایک جو یا تھا علم نبی کا ۔۔۔ لگایا پتہ جس نے ہر مفتری کا
نہ چھوڑا کوئی رخنہ کذب خفی کا ۔۔۔ کیا قافیہ تنگ ہر مدعی کا
کئے جرح وتعدیل کے وضع قانون ۔۔۔ نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسوں
کیا فاش راوی میں جو عیب پایا ۔۔۔ مناقب کو چھانا مثالب کو تایا
مشائخ میں جو قبح نکلا جتایا ۔۔۔ ائمہ میں جو داغ دیکھا بتایا
طلسمِ ورع ہر مقدس کا توڑا ۔۔۔ نہ ملا کو چھوڑا نہ صوفی کو چھوڑا

فاضل مصنف کے مذکورہ اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نفس حدیث کے منکر نہیں بلکہ ثبوت حدیث کے منکر ہیں۔

مثال:

اہل حدیث اور اہل قرآن میں نزاع اس بات میں ہے کہ ہم دونوں اگر دربار رسالت میں ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم کو کوئی حکم دیں جو قرآن مجید کے سوا ہو تو کیا اس کا ماننا اور تعمیل کرنا ہم پر فرض واجب ہے یا نہیں، اہلحدیث تو مثل قرآن کے فرمان رسالت کو واجب العمل کہتا ہے مگر اہل قرآن کا یہ عقیدہ نہیں، بلکہ وہ کہتا ہے کہ جو حکم کتاب اللہ میں ہوگا بس وہی واجب العمل ہے دوسرا کوئی نہیں۔

فاضل مصنف نے جو رائے ظاہر کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ عام اہل قرآن (لاہوری ہوں، یا امرتسری، گجراتی ہوں، یا گوجرانوالی وغیرہ) کی طرح نفس حدیث کے منکر نہیں بلکہ دربار رسالت میں اگر ہوتے تو خوش نصیب خوش زیست صحابہ کی طرح حدیث کو مانتے اور عمل کرتے۔

خیال ہوگا کہ پھر نزاع کیا؟ بے شک اصول سے نزاع نہ تھی، مگر مؤلف موصوف

نے آگے چل کر جو اپنا مذہب بتایا ہے اس سے نزاع پیدا ہوگئی، وہ یہ ہے کہ۔

''جو حدیثیں دین الٰہی کے متعلق ہیں اگر وہ قرآن مجید کی مخالف نہیں نہ حدود قرآنی کو کم وبیش کرنے والی بلکہ تمام تر مصدق ہیں تو بعبارت دیگر قرآن مجید ہیں، اگرچہ اسناد صحیح ہوں نہ ہوں کیوں کہ ان کی صداقت قرآن مجید سے ہوگئی، اور جو حدیثیں اصطلاح مذہبی کو واضح کرنے والی ہیں ان میں بھی کلام نہیں، ان کو حدیث کہو وہ معین دین ہیں جیسے لغات ومصطلحات کی کتابیں، مگر وہ دین میں داخل نہیں اور جو حدیثیں تفقہ اور رشد وارشاد کے متعلق ہیں وہ بھی دین نہیں ہیں، دین قرآن مجید میں کامل ہو چکا، ہاں اگر تعمیل احکام ربانی میں ان سے تائید ملتی ہے تو بلا شبہ وہ مؤید دین ہیں اگر اس کے اسناد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچتے ہوں اور صحیح ہوں اور جو حدیثیں نظم اولوا الامر کے متعلق ہیں وہ مجاز صورتیں ہیں کہ اقتضاء زمانہ کے مطابق جیسے چاہو کرو تو ان کی سند کی ضرورت نہیں، اور جو حدیثیں قرآن مجید کے مخالف ہوں یا حدود اللہ کو کم وبیش کر کے توڑنے والی تو ان کو حدیث نہ کہو اور حدیث سے خارج کردو، جو حدیثیں عقل کے خلاف ہوں اور قرآن سے باہر وہ بھی حدیث نہیں، جو حدیثیں نفل کے ثواب کو فرض سے بڑھائیں یا ترغیب وترہیب کی حدیثیں جن کی چھان بین بھی نہ ہوئی وہ بھی حدیث نہیں، کیوں کہ انذار بھی قرآن مجید ہی سے کرنے کا حکم ہے۔ فضائل کی حدیثیں تو دوستانہ محبت کے کلام ہیں ان کو دین سے کیا تعلق مگر لوگوں نے دین میں داخل کر کے فرقہ بندی کی ہے، یہ سخت نادانی ہے، ایسے محبت کے الفاظ جو جانثاران اسلام سے محبت کے طور پر بولے گئے بعض کی روایت ملی ہوگی بعض کی نہیں، ان پر دین کے شاخسانے کھڑے کرنا اور ممتحن بن کر اس کو درجہ دینا اور تفرقے پیدا کرنا جہالت ہے'' (شرعۃ الحق ص: ۱۲۶، ۱۲۷)۔

بس اب نزاع محقق اور منقح قائم ہوگئی کہ مؤلف شرعۃ الحق احکام شرعیہ کا ثبوت صرف قرآن مجید سے جانتے ہیں احادیث نبویہ کو مثبت حکم نہیں جانتے، اس دعوی پر جو دلائل آپ نے دی ہیں ان کی تنقید کرنا ہمارا حق ہے۔ ❁❁❁

قسط: ۴

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۱۸/ذی قعدہ ۱۳۴۸ھ = ۱۸/اپریل ۱۹۳۰ء)

گذشتہ پرچہ میں ''شرعۃ الحق'' کی عبارت نقل ہوچکی ہے جس میں مذکور ہے کہ قرآن کے سوا حدیث نبوی مثبت حکم نہیں ہے، بس یہ ہے تنقیح اور مبحث۔

مصنف ''شرعۃ الحق'' نے نماز کے متعلق مندرجہ ذیل بیان دیا ہے:

''صلاۃ کے پانچ وقت مقرر ہیں، صبح، ظہر، عصر، مغرب، عشاء، اور ہر نماز وضو رہتے ہوئے ہونی چاہیے، صبح کی دو رکعتیں مغرب کی تین، اور ظہر، عصر اور عشا کی چار چار رکعتیں ہیں، ہر رکعت میں قیام، رکوع، سجود علی الترتیب ہے، اور ہر دوسری رکعت کے بعد قاعدہ، قاعدہ میں تحیات درود۔

یہ روز کی نماز ہوئی، جمعہ کے دن بجائے ظہر جمعہ کی دو رکعتیں، خوف دشمن کے وقت کہ دشمن مقابل ہو مقتدی کی ایک اور امام کی دو رکعتیں، ایسے خوف میں نماز پڑھنی دشوار ہو تو سوار یا پیادہ جس طرح ہو سکے، سفر کی دو رکعتیں ہیں سوائے مغرب کے، صلاۃ اصطلاحاً اسی کا نام ہے اور یہ ازلی وابدی ہے'' (شرعۃ الحق ص: ۲۳۲)۔

اہلحدیث:

یہ عبارت اہلحدیث مورخہ ۴/ذی قعدہ (۴/اپریل) میں درج ہوکر اس پر مختصر سی بحث ہوچکی ہے، یہاں ہم سید صاحب کے اس دعوی کی دلیل انہی کے الفاظ میں دکھاتے ہیں جس سے معلوم ہوجائے گا کہ منکرین حدیث اپنے پر کتنا بوجھ اٹھا رہے ہیں، فرماتے ہیں:

’’رکعات کی نسبت سورہ نساء کے پندرہویں رکوع میں صلاۃ قصر کو دیکھو اس نے فرمایا کہ جنگ کے وقت ایک جماعت مسلح رہ کر امام کے پیچھے ایک رکعت پڑھ چکے تو وہ حفاظت کو کھڑی ہو اور دوسری جماعت آ کر ایک رکعت وہ پڑھ لے یہ صلاۃ قصر ہوئی اور قصر کے معنی نماز کو آدھی کر دینے کے ہیں، تو جب امام کی دو رکعتیں ہوئیں اور مقتدیوں کی ایک ایک اور یہ آدھی نماز ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ بلحاظ مقتدیوں کے قصر کے اصل نماز دو رکعت ہے، اور بلحاظ امام کے یہی دو رکعتیں چار رکعتیں ہیں یعنی نماز کی یہی دو چار رکعتیں ہیں اور تین چار میں داخل ہے، اس لیے نماز کی رکعتیں ۲۔ ۳۔ ۴ ہیں، صبح ۲۔ ۳ اور باقی وقتوں میں چار چار‘‘ (شرعۃ الحق ص: ۲۳۵)۔

ناظرین!

اس عبارت کو بغور ملاحظہ کیجیے کہ کتنی جرأت سے کام لیا گیا ہے اور بڑے مشکل سوالوں کو کس آسانی سے حل کیا گیا ہے کہ نماز کی یہ دو چار رکعتیں ہیں اور تین چار میں داخل ہے اس لیے نماز کی رکعتیں ۲۔ ۳۔ ۴ ہیں، الخ۔

کیا خوب عجلت ہے، مگر جناب یہ تو فرمائیے کہ یہ قرآن مجید کا حکم ہے یا ایجاد بندہ، سنیے بطرز آپ کے قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر نماز میں مقتدی دو پڑھے اور امام چار۔

چنانچہ آپ خود فرمارہے ہیں:

’’بلحاظ مقتدیوں کے اصل نماز دو رکعت اور بلحاظ امام کے اصل نماز چار رکعت‘‘۔

پھر یہ کیا گول مال ہے کہ کوئی نماز دو رکعت اور کوئی تین اور کوئی چار، کیا یہ قرآن مجید کی تصریح ہے یا آپ کی تشریح۔

جناب!

اگر قرآن مجید کے سوا کسی اور ہی کی سننے کی ضرورت ہے تو پھر آپ کی کیوں سنیں،

پیغمبر اسلام علیہ السلام کی کیوں نہ سنیں ؎

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

یہ تو ہے آپ کی تحریر اور الزامی جواب، اب ہمارا حقیقی جواب سنیے۔قرآن مجید میں صاف ارشاد ہے:﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥٓ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ ٱلْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾[الاحزاب:٣٦] کسی مسلمان مرد یا عورت کو جب خدا اور رسول حکم دیں تو ان کو ان کے دین کے متعلق کسی قسم کا اختیار نہیں رہتا۔

یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ جس طرح اللہ کے حکم پر ہم کو انکار کی گنجائش نہیں اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی بے فرمانی بھی جائز نہیں۔

سید صاحب:۔

انصاف کیجیے جس قوت استدلالیہ سے آپ نے ۲۔ ۳۔ ۴ رکعتوں کا ثبوت دیا ہے، ہماری دلیل اس سے قوی ہے یا نہیں؟ للہ انصاف کیجیے۔

قسط: ۵

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۲۴/ذی قعدہ ۱۳۴۸ھ = ۲۵/اپریل ۱۹۳۰ء)

''گذشتہ پرچہ میں ہم نے اپنے دعوے (اتباع حدیث رسول) پر آیت قرآنی ''ماکان لمومن ''۔الآیۃ لکھی ہے آج اس آیت کے متعلق مزید بحث کی جاتی ہے''۔(مدیر)

فاضل مصنف نے خود بھی یہ آیت: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ﴾ (صفحہ ۱۱۷) پر لکھی ہے بلکہ اس کے ساتھ دوسری آیات بھی لکھی ہیں جن میں اطاعت رسول کے لفظ ہیں: ﴿أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ﴾ [النساء:۵۹]۔ ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ﴾ [الحشر:۷]۔ ﴿إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي...﴾ [آل عمران: ۳۱] وغیرہ (ص:۱۱۷) مگر کمال یہ کیا کہ ان آیتوں کے متعلق بحث کرنے اور اطاعت کی تشریح کرنے میں آپ نے گیارہ صفحات خرچ کیے، لیکن ہماری پیش کردہ آیت کا جواب نہیں دیا۔ اگر آیت نہ لکھی ہوتی تو گمان ہوسکتا تھا کہ آپ کی نگاہ اس آیت پر نہیں پڑی ہوگی، حیرت تو یہ ہے کہ آپ نے آیت لکھی ہے تاہم جواب سے جواب ہی دیا اس لئے ہم اپنی وجہ استدلال آج مفصل عرض کرتے ہیں۔ سنئے!

آیت موصوفہ میں دو قضاء ہیں ایک قضاء اللہ دوم قضاء رسول اللہ۔ غور سے پڑھیے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾ [الاحزاب:۳۶]۔

غور طلب مقدم بات یہ ہے کہ اس آیت میں حرف عطف ''واؤ'' ہے جس کی بابت

کتب نحو میں لکھا ہے:

''هِيْ لِلْجَمْعِ مُطْلَقًا''[1]

حرف ''واوْ'' جمع کیلئے ہوتا ہے۔ یہاں بھی اگر جمع کے لئے ہے تو لازم آئے گا کہ صرف خدا کی قضاء (حکم) واجب العمل نہ ہو، جب تک رسول کی قضاء بھی اس کے ساتھ متصل نہ ہو۔ حالانکہ یہ کسی فریق کا بلکہ کسی مسلم شخص کا عقیدہ نہیں۔ پس اس آیت میں (واو) تنویع کے لئے یعنی اللہ کی قضاء (حکم) ہو یا رسول کا حکم ہر دو نوع واجب العمل ہیں، پس ثابت ہوا کہ جس طرح اللہ کا حکم واجب العمل ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم بھی واجب العمل ہے۔

ہاں اس حقیقت حقہ کے سامنے قابل مصنف نے بھی سر جھکا دیا مگر قضاء رسول اور اطاعت رسول میں فرق نہیں کیا، آپ نے اطاعت رسول کے معنی کئے ہیں پیغام رسالت کی فرمانبرداری اور پیغام رسالت ہے قرآن، چنانچہ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

''دیکھنا یہ ہے کہ اطاعت رسول کے معنی کیا ہیں، آیا اطاعت رسالت یعنی قرآن کے یا اطاعت حدیث کے، وہ کون سی اطاعت ہے جو خدا نے فرض کر دی ہے جس کے بغیر نجات ناممکن ہے، مثال سے بات ذرہ زیادہ واضح ہو جاتی ہے اور یہ قرآن مجید کی روش بھی ہے اس لیے اسے میں پہلے مثال میں واضح کروں تو نامناسب نہ ہوگا۔

مثلا بادشاہ جو والی یا خلیفہ مقرر کرتا ہے تو اس کا کام ہوتا ہے کہ بادشاہی قانون پہنچا دے اور کوشش کرے کہ قانون شاہی بہ احسن وجوہ جاری ہو، خود بھی اسکا معمل اور پابند ہوتا کہ کوئی قانون شکنی کی جرأت نہ کر سکے، نگراں ہو کہ رعایا قانون کی خلاف ورزی کر کے فساد نہ مچائے اور باغی نہ

[1] دیکھیں: (الکافیۃ) از ابن الحاجب: (ص: ۵۳) ((اوضح المسالک الی الفیة ابن مالک)): از جمال الدین ابن ھشام: (۳/ ۲۱۷)۔

ہو جائے ، نہ شاہی قانون کو توڑے ، نہ کسی اور کو اپنا بادشاہ تسلیم کرے اور رعایا کو چاہیے کہ اگر والی منصف اور ہمدرد ہے تو اس کی عظمت کرے اس سے محبت کرے اس کی اطاعت کرے جو اطاعت کا حق ہے، تاکہ وفادار رعایا میں داخل ہو کر انعام واکرام کا مستحق ہو، والی یا خلیفہ کی اطاعت عین بادشاہ کی اطاعت ہے اور اس کی بغاوت بادشاہ کی بغاوت ،مگر اس اطاعت کے معنی قانون واحکام شاہی میں اطاعت کے ہیں، نہ یہ کہ والی کی ہر حرکت رعایا کے لیے قانون ہو جائے کہ جو والی یا خلیفہ کھائے وہ یہ کھائے ، جیسے وہ کھائے ویسے یہ کھائے ، جو وہ پہنے وہ یہ پہنے ،جیسی اس کی ماند و بود ہو ویسی ہی اس کی بھی ، رسومات شادی و بیاہ ، رسومات ملکی وقومی جس طرح وہ ادا کرے یہ بھی ادا کرے، جو عادات یا رقوم آمد وخرچ اس کے ہوں وہی اس کے بھی ، جو مزاج یا خوش کلامیاں وہ اپنے گھروں میں اپنے اعزا واحباب سے کرے ان سب کو رعایا قانون شاہی سمجھ کے اطاعت کرے تو اطاعت کے یہ معنی ہرگز نہیں ہو سکتے‘‘ (شرعۃ الحق ،ص:۱۱۹)۔

اہلحدیث:

اگر چہ یہ جواب ہماری پیش کردہ آیت کا نہیں ، کیوں کہ ہماری پیش کردہ آیت میں قضاء الرسول واجب الاطاعت ہے جس سے پہلے قضاء اللہ کا ذکر موجود ہے چوں کہ قضاء اللہ سے مراد قطعاً قرآن شریف ہے اس لیے قضاء الرسول سے مراد قرآن شریف نہیں ہوسکتا بلکہ قضاء دیگر ہوگا۔

سید صاحب:

آیئے ہم آپ صلح کرلیں ،صلح کی صورت بھی بالکل آسان ہے،آپ اطاعت رسول سے مراد لیتے ہیں رسالت اللہ کی اطاعت ، ہم نے ثابت کر دیا کہ ہماری پیش کردہ آیت میں دو قضا ہیں، ایک قضاء اللہ جس سے مراد یقیناً قرآن ہے ، دوسری قضاء الرسول اس سے بھی ہم اور آپ دونوں پیغام رسالت مراد لیں ، آمنا وصدقنا ،مگر پیغام

رسالت غیر از قرآن، کیوں کہ قرآن مجید تو قضاء اللہ کا مصداق قطعی ہے پھر مکرر وہی مراد رکھنا غیر ضروری فعل ہے، پس ہماری اور آپ کی اس سورت پر صلح ہوگئی کہ (۱) قضاء الرسول واجب العمل ہے (۲) قضاء رسول سے مراد وہ حکم ہے جو علاوہ قرآن کے رسول بحیثیت رسالت امت کو فرمائیں۔

مولانا منظوری سے جلدی اطلاع دیجیے۔ آہ

جنگ کردی آشتی کن زانکہ نزد عاقلاں
ایں مثل مشہور اول جنگ آخر آشتی

❁ ❁ ❁

قسط: ۶

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۲/ذی الحجۃ ۱۳۴۸ھ = ۲/مئی ۱۹۳۰ء)

گذشتہ نمبر میں ہم نے بحوالہ آیت ﴿إِذَا قَضَى ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥٓ أَمْرًا﴾ ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ماننا بھی اسی طرح فرض واجب ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا، یہ ایسی نص صریح ہے کہ مصنف کے ساتھ دنیا بھر کے منکرین حدیث بھی مل جائیں تو اس کا جواب نہیں دے سکتے، مصنف موصوف نے تو دیا ہی نہیں، اس بحث کا تتمہ درج ذیل ہے۔

ہم کہہ آئے ہیں کہ فاضل مصنف نے ہماری پیش کردہ آیت: ﴿وَمَا كَانَ

﴿لِمُؤۡمِنٍ﴾ کا جواب نہیں دیا، باوجود اس نفی کے ہم اعتراف کرتے ہیں کہ آپ نے چلتے چلاتے ایک فقرہ چھوڑا ہے، جو یہ ہے:

''اگر اطاعت رسول کے یہ معنی ہوتے جو لوگ سمجھتے ہیں تو صحابہ اس سوال میں بے باک نہ ہوتے کہ یا رسول اللہ یہ حکم آپ کا ہے یا خدا کا اور ایسے حال میں حضرت زید رضی اللہ عنہ کبھی حضرت زینب کو طلاق نہ دیتے، درانحالیکہ نبی فرمارہے ہیں: ﴿أَمۡسِكۡ عَلَيۡكَ زَوۡجَكَ﴾ [الاحزاب:۳۷]۔ اپنی بیوی کو طلاق نہ دو'' (شرعۃ الحق، ص:۱۳۱)۔

اہلحدیث:

بے شک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زید کو فرمایا تھا: ﴿أَمۡسِكۡ عَلَيۡكَ زَوۡجَكَ وَٱتَّقِ ٱللَّهَ﴾ اپنی عورت زینب کو پاس رکھ اور اللہ سے ڈر۔

اس میں شک نہیں کہ اس نے اس پر عمل نہ کیا لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس کے عمل نہ کرنے ہی پر تو یہ آیت اتری کہ: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤۡمِنٖ وَلَا مُؤۡمِنَةٍ إِذَا قَضَى ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥٓ أَمۡرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ ٱلۡخِيَرَةُ مِنۡ أَمۡرِهِمۡ﴾ [الاحزاب:۳۶] جب اللہ یا رسول کوئی حکم دیں تو کوئی مرد مسلم یا عورت مسلمہ اس کے ترک کرنے کے مجاز نہیں، پس آپ زید کا فعل سند بنائیں گے یا خدائی فیصلہ حجت مانیں گے۔

نوٹ:

عام طور پر ہم نے اہل قرآن کو یہ آیت پیش کرتے ہوئے یہی سنا کہ دیکھو زید نے حکم رسول نہیں مانا، واجب ہوتا تو کیوں نہ مانتا، افسوس ہے کہ باوجود اہل قرآن ہونے کے قرآن نہیں سمجھتے۔ الی اللہ المشتکی۔

زید کی معذرت:

باوجود یہ کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ آیت موصوفہ زید کی بے فرمانی پر نازل ہوئی جس میں

زید کو ڈانٹ ڈپٹ کی گئی ہے تاہم ہمارا عقیدہ ہے کہ زید گنہگار نہیں، کیوں؟

اس کی طرف سے معذرت ہو سکتی ہے۔

قرآن مجید میں مرد کو عورت سے ناچاقی کے وقت اختیار دیا گیا ہے کہ اس کی تکلیف پر صبر کر کے رہنے دے یا چھوڑ دے، غور سے پڑھیں: ﴿فَإِمۡسَاكُۢ بِمَعۡرُوفٍ أَوۡ تَسۡرِيحُۢ بِإِحۡسَٰنٍ﴾ [البقرة:۲۲۹]۔

اس آیت سے زید نے سمجھا کہ مجھے رکھنے اور چھوڑنے کا اختیار قرآن شریف میں ہے، حضور مجھے پہلی صورت کا پابند رہنا فرماتے ہیں، مگر قضاء الٰہی کے ماتحت میں دوسری صورت اختیار کرنے میں مجرم نہیں ہوں گا۔

اس تاویل سے زید جرم اور جرم پر مواخذہ سے بچ سکتا ہے، لیکن یہ معذرت بس وہیں تک تھی جب تک ہماری پیش کردہ آیت: {وَمَا كَانَ لِمُؤۡمِنٍ} نازل نہیں ہوئی تھی، اس آیت کے نزول کے بعد اب کسی ایسے واقعہ میں تارک امر رسول معذور نہیں ہو سکتا، غور سے پڑھیے۔

﴿فَلۡيَحۡذَرِ ٱلَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنۡ أَمۡرِهِۦٓ أَن تُصِيبَهُمۡ فِتۡنَةٌ أَوۡ يُصِيبَهُمۡ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ [النور: ٦٣] ''جو لوگ نبی کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں وہ اس بات سے ڈریں کہ ان کو کوئی مصیبت یا دردناک عذاب پہنچے''۔

باوجود نصوص صریحہ کے فاضل مصنف کس شان سے لکھتے ہیں:

''جب تک شاخسانے نہ ملاؤ، نہ بات میں مزا آتا، نہ مسئلہ میں قابلیت کا رنگ چڑھتا ہے اس لیے قوم سمجھتی ہے کہ وحی دو قسم کی ہے وحی جلی اور وحی خفی، وحی جلی قرآن مجید ہے اور وحی خفی حدیث، یہ تقسیم علی بینہ رب نہیں ہے، ایسی کوئی تقسیم قرآن مجید میں نہیں ہے، یہ شاخسانے کھڑے کئے گئے ہیں اور احکام و ہدایات کو گھٹانے بڑھانے کا آلہ ایجاد کیا گیا ہے، یا تجاوز عن الحد کی راہیں نکالی گئی

ہیں، کہا جاتا ہے کہ قرآن وحی جلی ہے اور اس کو جبریل ہمیشہ وحی خفی کی صورت میں لائے، کہا جاتا ہے کہ حدیث وحی خفی ہے اور ثابت کیا جاتا ہے کہ اکثر حدیثوں ہی کا جلی طور پر آنا حضرت جبریل نے علی روس الاشھاد [1] نبی کی امامت کی، ہادی بنے، اور ان کی تعلیم کی ہوئی باتیں جو جلی تر بیان کی جاتی ہیں زانو سے زانو ملا کر، وہ قرآن مجید میں نہیں ہیں، حضرت جبریل کبھی اعرابی کی صورت میں آئے اور کبھی دحیہ کی صورت میں، اور اس جلی طور پر جو کچھ وہ تعلیم کر گئے وہ قرآن مجید میں نہیں ہے، قرآن مجید سے کہیں ان کے امام ہونے اور ہادی ہونے کا ثبوت نہیں ملتا، حضرت جبریل قاصد تھے مکتوب الیہ سے درجہ میں کمتر، وہ پیام رساں تھے مطلوب سے منزلت میں فروتر۔ وہ کچھ اختیار نہ رکھتے تھے، مختار کے برابر نہیں ہو سکتے، ان کی کرسی نبی کے مقابلہ میں نہیں بچھ سکتی، خلیفۃ اللہی کا تاج ان کے سر پر زیب نہیں دیتا، فرشتہ نبی کا امام ہو نہیں سکتا، خدا ہادی تھا، خدا قرآن مجید کا اپنے قرب سے نازل کرنے والا تھا: ﴿وَإِنَّكَ لَتُلَقَّى ٱلْقُرْءَانَ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ﴾ [النمل:٦] ''بے شک قرآن مجید تم کو القا کیا جاتا ہے خدائے حکیم و علیم کے قرب سے''۔ حضرت جبرئیل صرف نزول کے واسطے تھے، نہ امام تھے، نہ ہادی تھے، نہ مشیر تھے، نہ بھائی تھے، نہ خود کوئی حکم یا رائے دے سکتے تھے، نہ احکام خداوندی کو کم و بیش کر سکتے تھے'' (شرعۃ الحق، ص:٩٧)۔

[1] رؤس الاشھاد کے معنی ہیں سب کے سامنے، یہ غلط ہے، صرف اکیلے ہی پڑھائی تھی۔ (مشکاۃ ، باب المواقیت)(مؤلف)۔

مولف رحمہ اللہ نے یہاں صحیح اور سنن کی اس روایت کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں جبرئیل علیہ السلام کا نبی ﷺ کی امامت کرانا بغرض تعیین اوقات نماز مذکور ہے، دیکھیں: (صحیح بخاری) کتاب بدء الخلق ، باب ذکر الملائکۃ، حدیث:٣٢٢١، (صحیح مسلم): کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ ، باب اوقات الصلاۃ الخمس، حدیث:٦١٠۔

قسط: ۷

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۲۳/ذی الحجۃ ۱۳۴۸ھ = ۲۳/مئی ۱۹۳۰ء)

سلسلہ ہذا کا نمبر (۶) مندرجہ اہلحدیث مورخہ ۳/مئی میں شرعۃ الحق (ص: ۹۷) سے طویل عبارت نقل ہو چکی ہے، جس میں مصنف کتاب (مولوی حافظ سید محب الحق صاحب) نے (۱) حدیث کو وحی خفی ماننے والوں پر پھبتی اڑائی ہے۔(۲) جبریل کی بابت کہا ہے وہ قاصد تھے اس لیے مکتوب الیہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے رتبہ میں کم تھے، لہٰذا ان کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امامت کرانا صحیح نہیں، وغیرہ، آج اس کا جواب عرض ہے۔(مدیر)

ہم پہلے بھی کہہ آئے ہیں اور اب بھی کہتے ہیں کہ نزاع حقیقتاً اسی میں ہے کہ قرآن مجید کے سوا کوئی اور ذریعہ علم الٰہی بھی تھا جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا کی طرف سے اطلاع ملتی ہو، وہ ذریعہ اگر کچھ ہے تو اس کو باصطلاح اہل اسلام وحی خفی کہتے ہیں اور قرآن مجید کو وحی جلی، ہم خوش ہیں کہ حسب قانون اس تنقیح کا بارِ ثبوت ہم پر ڈالا جائے، اگر ہم اس میں کامیاب ہو جائیں تو ساری کتاب کے جواب سے فارغ سمجھے جائیں، ورق ورق چھانٹنے کی ضرورت نہیں، بس سنیے، سورہ تحریم میں مذکور ہے:

﴿وَإِذْ أَسَرَّ ٱلنَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَٰجِهِۦ حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِۦ وَأَظْهَرَهُ ٱللَّهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُۥ وَأَعْرَضَ عَنۢ بَعْضٍ ۖ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِۦ قَالَتْ مَنْ أَنۢبَأَكَ هَٰذَا ۖ قَالَ نَبَّأَنِيَ ٱلْعَلِيمُ ٱلْخَبِيرُ﴾ [التحریم: ۳]۔

نبی (محمد ﷺ) نے اپنی کسی بیوی کو کوئی بھید کی بات بتائی اس نے دوسرے کو بتا دی پھر جب نبی نے اس بیوی پر اس کا اظہار راز کرنا ظاہر کیا تو وہ بولی آپ کو کس نے یہ بتایا (کہ میں نے افشاءراز کردیا) آنحضرت نے فرمایا: مجھے خدائے علیم وخبیر نے بتایا ہے۔(مختصر)

اس آیت میں ذکر تو آنحضرت کے خانگی معاملہ کا ہے مگر ہمارا استدلال یوں ہے کہ اس میں مذکور ہے کہ بیوی کے فعل (افشاءراز) کی خبر خدا نے آنحضرت ﷺ کو کردی اور آنحضرت ﷺ نے بیوی کے پوچھنے پر اس اعلام کو خدا کی طرف منسوب کیا، حالاں کہ یہ اعلام قرآن مجید کے لفظوں میں نہیں۔

پس معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی وحی کے سوا اور بھی کوئی ذریعہ علم الٰہی حضور کو حاصل تھا جس کو باصطلاح اہل اسلام حدیث یا وحی کہتے ہیں، ہم لفظی بحث میں پڑنا نہیں چاہتے آپ کو اگر حدیث یا وحی خفی کی اصطلاح پر اعتراض ہے تو آپ بھی اس قسم کی وحی کا کوئی نام تجویز کریں ہم بھی وہی کہہ لیں گے۔

قرآن مجید سے کسی امر کا ثبوت سو آیات سے ہو یا ایک سے ایمانداری کے نزدیک دونوں برابر ہیں، اس لیے سردست ہم ایک ہی آیت پر کفایت کرتے ہیں۔

حافظ صاحب:

گفتگو آئین درویشی نبود
ورنہ باتو ماجرا ہا داشتیم

(۲) جبریل بے شک پیغام رساں ہے، پیغام کے مکتوب الیہ آنحضرت ﷺ ہیں، اسی طرح آنحضرت ﷺ بھی پیغام رساں ہیں، رسول کا لفظ ہی آپ کی پیغام رسانی کا منصب ہے، نیز آیت قرآنی: ﴿فَإِنَّمَا عَلَيْكَ ٱلْبَلَٰغُ﴾ [الرعد:۴۰]۔

صاف صاف حضور کو پیغام رساں قرار دیتی ہے۔

کچھ شک نہیں کہ حضور علیہ السلام جو پیغام لے کر آئے اس کے مکتوب الیہم ہم مسلمان ہیں، غور سے سنیے!﴿لَقَدْ أَنزَلْنَآ إِلَيْكُمْ كِتَـٰبًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ﴾ [الانبیاء:۱۰] ''ہم (خدا) نے تمہارے (مسلمانوں کی) طرف کتاب بھیجی ہے اس میں تمہاری نصیحت ہے''۔

پہلی آیت میں آنحضرت کو پیغام رساں (مبلغ) فرمایا۔ دوسری میں قرآن مجید کے مکتوب الیہم امت کو قرار دیا ہے۔

تو کیا آپ کی دلیل کا نتیجہ یہاں بھی پیدا ہوگا؟ کہ قاصد مکتوب الیہ سے کمتر ہوتا ہے۔

سید صاحب!

ذرہ غور کر کے اس نتیجہ کی تہ تک پہنچئے گا، کیوں کہ اس کا ادنی اثر یہ ہوگا کہ سادات کو امت پر کوئی فضیلت نہ رہے گی بلکہ سادات امت سے کم درجہ ہو جائے گی۔

پس جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باوجود مبلغ ہونے کے امت کے امام تھے اسی طرح جبریل نے باوجود قاصد ہونے کے امامت کرائی تو کیا اعتراض۔

نوٹ: کتاب ''شرعۃ الحق'' کی روح تو نکل چکی ہے باقی ورق ورق کا مسلسل جواب آئندہ۔ ان شاء اللہ۔

قسط:۸

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۱رمحرم ۱۳۴۹ھ = ۳۰رمئی ۱۹۳۰ء)

گذشتہ پرچہ میں ہم بتا چکے ہیں کہ ہمارے جواب سے کتاب ''شرعۃ الحق'' کی روح نکل چکی ہے اب اس کی صفحہ گردانی کرنے کا کام باقی ہے۔

کتاب مذکور کے (ص:۱ سے ص:۴) تک حمد ونعت ہے، (۴ سے ص:۱۷) تک قرآن مجید کی تعریف اورنزول، جمع قرآن کا تاریخی حال، (ص:۱۸ سے ص:۲۳) تک حدیث کا بیان اور محدثین کے طریق پر حدیث کی تقسیم ہے، صحیح، حسن، متصل، منقطع وغیرہ، اسی ضمن میں آپ نے محدثین کرام کے حق میں اپنی رائے کا اظہار فرمایا ہے، جو یہ ہے:

''چوں کہ حدیثیں زمانہ رسالت کے ڈیڑھ، دوسو برس کے بعد جمع کی گئیں اوراس وقت جمع کی گئیں ہیں جب ہزاروں موضوعی حدیثیں دودھ پانی کی طرح مل چکی تھیں، دودھ کو پانی سے جدا کرنے کی کوشش اوراس بارعظیم کے اٹھانے کی خدمتیں علماء متقدمین نے خالصا لوجہ اللہ کی تھیں اس لیے وہ مقبول ہوئیں اورقوم نے ان کی کوششوں کی ایسی قدر کی جس کی مثال ملنی دشوار ہے، خدا انہیں ان کی نیتوں کا اجر دے اوران کی خدمتوں کو قبول فرمائے'' (شرعۃ الحق، ص:۲۳)۔

یہ بعینہ وہی تعریف ہے جو مولانا حالی مرحوم نے محدثین کی کی ہے جو رہ رہ کر ہر ایک اہل علم کرنے پر مجبور ہے، حالی فرماتے ہیں:

گروہ ایک جو یا تھا علم نبی کا　　　لگایا پتہ جس نے ہر مفتری کا

نہ چھوڑا کوئی رخنہ کذب خفی کا　　کیا قافیہ تنگ ہر مدعی کا
کئے جرح وتعدیل کے وضع قانون　　نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسوں

بقیہ اشعار اہل حدیث ۱۱؍اپریل میں درج ہو چکے ہیں۔

(ص: ۲۳ سے ص: ۲۵) تک فقہ کا ذکر ہے، (ص: ۲۶ سے ص: ۲۹) تک عمل متواتر کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جو خاص قابل ذکر ہے، آپ نے اس (عمل متواتر) کو معتبر رکھا ہے اس لیے آپ کو ازخود ایک خدشہ برمحل پیدا ہوا جس کا ذکر خود ہی کر کے اس کا جواب بھی دیا ہے، وہ خدشہ مع جواب سننے کے قابل ہے، آپ (حافظ سید محب الحق مصنف شرعۃ الحق) فرماتے ہیں:

''یہاں ایک خدشہ ہوتا ہے جس کا رفع کر دینا ضروری ہے وہ یہ کہ عمل متواتر جسے کہا جاتا ہے یہ خود حدیث سے مستنبط ہے، اعمال قوم کی بنا حدیث ہے، اہل حدیث کا حدیث پر عمل ہے، اور اہل فقہ کا فقہ پر، مگر فقہ خود حدیث سے مستخرج ہے، اس لیے کل اہل اسلام چاہے کسی فرقے کے ہوں سب کا طرز عمل اپنی اپنی حدیث سے مستخرج ہے، اس لیے عمل متواتر باہمہ اختلاف جو پایا جاتا ہے یہ بہ اختلاف حدیث حدیث سے مستخرج ہے اس لیے عمل متواتر کوئی نئی چیز حدیث سے باہر نہ ہوئی اور اس لیے حدیث کے ہوتے اور کسی چیز کی سند نہیں'' (شرعۃ الحق ص: ۲۶)۔

یعنی سائل:

مصنف شرعۃ الحق کو کہتا ہے کہ آپ حدیث کی حجیت شرعیہ سے تو منکر ہیں مگر عمل متواتر کو خود مانتے ہیں، حالاں کہ عمل متواتر حدیث سے باہر نہیں، پھر انکار آپ کا اس مصرعہ کا مصداق نہیں۔ ع:

منکر مے بودن وہمرنگ مستاں زیستن

یہ وہ مضمون ہے جو سائل کی طرف سے مصنف نے بیان کیا ہے مگر ہم اس سوال کی

تشریح یوں کرتے ہیں کہ:

عمل متواتر کا ثبوت حدیث ہی سے ہوتا ہے یعنی احادیث ہی سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن فلاں زمانہ میں نازل ہوا، پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طبقہ اولی کے لوگوں کو یوں تعلیم فرمایا، اور ان لوگوں نے یوں عمل کیا، جب عمل متواتر حجت ہے تو پھر احادیث کیوں حجت نہیں؟

اس کا جواب حافظ محب الحق صاحب نے جو دیا ہے وہ یہ ہے:

''یہ خدشہ ایک دھوکا ہے، میرے نزدیک ایسا نہیں ہے کہ اعمال قوم حدیث سے مستخرج ہیں، گرچہ اعمال قوم کی سند میں وہ پیش بھی کی جائیں، کیوں کہ قوم کے اعمال دین اجتماع حدیث سے ڈیڑھ دوصدی پیشتر سے تھے حدیث ایک مدت کے بعد جمع ہوئی'' (ص:۲۷)۔

حقیقت میں:

یہ جواب غلط فہمی پر مبنی ہے، حدیث موجودہ کتب کی صورت میں بے شک چند سال بعد جمع ہوئی جس کی ابتداء خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہوئی تھی مگر احادیث بطور بیاضوں کے صحابہ کرام اور تابعین عظام کے پاس زمانہ رسالت ہی سے موجود تھیں، اس لیے یہ جواب خود غلطی پر مبنی ہے، کیوں کہ جمع احادیث بصورت بیاض اور بصورت کتب میں فرق نہیں کیا۔ عفی اللہ عنہ۔

قسط: ۹

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۸/محرم ۱۳۴۹؁ھ = ۶/جون ۱۹۳۰؁ء)

نوٹ: گذشتہ پرچہ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ کتاب شرعۃ الحق کی روح نکل چکی ہے اب اس کی ورق گردانی کی جاتی ہے، چنانچہ پہلے پرچہ میں (ص: ۲۸) تک شمار کیا گیا ہے آج اس سے آگے۔

(ص: ۲۹۔۳۰) پر آپ نے حکم پر بحث کی ہے کہ حکم صرف قرآن مجید ہی ہوسکتا ہے، دگر ہیچ، چنانچہ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

''اس فرقہ بندی کے وجوہات کچھ ہی ہوں فیصلہ طلب یہ ہے کہ اتنے اختلافات کا جھگڑا جس میں نفسانیت اور تعصب نے بھی پورا پورا حصہ لیا ہو کیوں کر چکا یا جائے اور اس کا استحقاق کس کو ہے کہ ان جھگڑوں میں حکم ہو۔

میں کچھ بھی تقریر کروں تو وہ یا تو کسی کے موافق ہوگی یا مخالف، وہ حق ہوگی یا ناحق، پھر حق و ناحق کا فیصلہ کون کرے؟ تو اس کا جواب یہی ہوسکتا ہے کہ قرآن مجید۔

ایسی صورت میں کہ قرآن مجید کی حقانیت اور قطعیت عقیدتاً اور عقلاً ثابت ہوچکی ہے، اور یہ سارے فرق اسلامیہ میں مسلم ہے ایسی صورت میں کہ وہ طالب حق جسے دعوت الحق میں اسلام کی دعوت دی گئی اور وہ ادیان مشہورہ میں سے اسلام کے آگے سر جھکا کر مسلمان ہو چکا ہے اور قرآن مجید پر وہ بھی ایمان لایا ہے، ایسی صورت میں کہ قرآن مجید کلام الٰہی ہے جس پر مسلمانوں کے ہر فرقہ کا ایمان ہے قرآن مجید کے سوا کوئی کتاب، کوئی قانون یہ حیثیت نہیں رکھتا کہ میری تقریر کے

لیے بلکہ اسلامی مذاہب کے جھگڑوں میں حکم ہو'' (شرعۃ الحق، ص:۲۹)۔

اہلحدیث:

قرآن مجید یقیناً حکم عدل بلکہ احکم ہے، اس لیے اسی قرآن سے ہم فیصلہ لیتے ہیں کہ پیغمبر علیہ السلام کو بھی بحیثیت رسالت فیصلہ کرنے میں کچھ دخل ہے؟ اس کے متعلق ہم پہلے بھی آیات پیش کر چکے ہیں اور آج بھی کرتے ہیں۔

اس بارے میں قرآن مجید کا معمولی بیان نہیں بلکہ حلفیہ بیان ہے، لہذا وہ قابل غور ہے، ارشاد ہے: ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾ [النساء:۶۵] ''یعنی تیرے رب کی قسم ہے یہ لوگ (اہل قرآن، واہلحدیث اور اہل فقہ وغیرہ) ہمارے نزدیک مومن نہ ہوں گے جب تک اپنے جھگڑوں میں تجھے (اے رسول) اپنا حکم (منصف) نہ بناویں گے''۔

یہ آیت اپنا مضمون جو بتا رہی ہے وہ کسی اہل علم اور اہل ایمان سے مخفی نہیں، کیوں کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بحیثیت رسالت مخاطب کر کے خدائے تعالیٰ نے خود حکم بنانے کا یقیناً حکم دیا بلکہ آپ کو حکم بنانا داخل ایمان قرار دیا بلکہ آپ کو حکم نہ ماننے والوں کو بے ایمان قرار دیا ہے۔

خدشہ:

ہماری اس تقریر پر کوئی صاحب یوں خدشہ کریں کہ آنحضرت بے شک حکم ہیں مگر قانون فیصلہ قرآن ہی ہے دیگر ہیچ، اس کا جواب بھی خود قرآن مجید ہی سے ملتا ہے جہاں ارشاد ہے: ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا﴾ [النساء:۶۱] یعنی جب ان منکروں کو کہا جاتا ہے کہ اللہ کی کتاب کی طرف اور رسول (علیہ السلام) کی

طرف آؤ تو منافقین تجھ سے (اے رسول) روگردانی کر جاتے ہیں۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ منافقوں کو دو امور کی طرف دعوت دی جاتی تھی (۱) کلام اللہ، قرآن شریف کی طرف (۲) دوسرے رسول علیہ السلام کی طرف بحیثیت رسالت، بس ہم بھی اس حکم کے ماتحت اپنے مخالفوں یا مخاطبوں کو دعوت دیتے ہیں ''تَعَالَوا إِلَى الْقُرْآنِ وَإِلَى الرَّسُولِ عَلَيْهِ السَّلَامُ''۔

(ص:۳۱ سے ۴۳) تک کتب الہامیہ کا تاریخی حال لکھا ہے جس سے ہمیں کوئی تعرض نہیں، (ص: ۴۳ سے ۴۸) تک تورات، انجیل کی حقیقت از روئے قرآن مجید لکھی ہے جس سے ہمیں بحث نہیں۔

(ص:۴۹ سے ۵۶) تک تاریخ مذہب لکھی ہے، (ص: ۵۶ سے ۵۸) تک مذاہب کے اختلاف کی وجہ بتا کر اسلامی فرقوں کی بابت یوں اظہار رائے کیا ہے:

''سارے پیغمبر تھے مسلمان، ہمارے رسول تھے مسلمان ان کا مذہب اسلام، مگر ان کی امت اب مسلمان کے لقب سے اپنے کو ملقب نہیں کرتی، تشخص کے جھپیٹ میں آکر ایک طرف اہل قرآن ہیں، پھر ان کی بھی ٹولیاں ہیں، ایک طرف اہل حدیث ہیں پھر ان کی بھی ٹولیاں ہیں، ایک اہل فقہ ہیں پھر ان کی بھی ٹولیاں ہیں، ایک طرف اہل تسنن ہیں مع اپنے کل فرقوں کے، ایک طرف اہل تشیع ہیں مع اپنے کل فرقوں کے، ایک اہل خوارج ہیں مع اپنے کل فرقوں کے، سب کے امام جدا، سب کی حدیثیں جدا، سب کی فقہ جدا، یہ اپنے اختلافات کی وجہ وہی ہے جو خدا نے فرمادی: ﴿بَغۡيًا بَيۡنَهُمۡ﴾ [البقرة: ۲۱۳] آپ کی عناد، دین تھا اصلاح ظاہر و باطن کے لیے، مگر یہ طبع آزمائیوں کی چوگان بازی کا میدان اور بازیچہ اطفال کی گل بازیوں کا تماشا گاہ بنایا گیا'' (شرعۃ الحق، ص: ۵۷)۔

اہلحدیث:

یہ غلط ہے کہ اب مسلمان، مسلمان لقب سے ملقب ہونا پسند نہیں کرتے اس غلطی کا

ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ سب کلمہ گومردم شماری میں مسلمان لکھاتے ہیں، بلکہ اگر کسی کلمہ گوکوخواہ وہ کسی مذہب کا ہوکوئی کہے کہ تو مسلمان نہیں تو وہ سخت خفا ہوتا ہے ہاں اس دینی نوعی لقب کے بعد صنفی نام بھی عرفی طور پر لوگوں نے مقرر کرر کھے ہیں، جن کو بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صنفی نام سنی ،شیعہ، اہلحدیث، حنفی وغیرہ ان اصحاب مذاہب کے نزدیک نوعی لقب (مسلمان) جتنی وقعت نہیں رکھتے ،یعنی ان کو دینی نام کے برابرنہیں جانتے بلکہ محض عرفی جانتے ہیں۔

اسی طرح دوسرا فقرہ بھی غلط ہے کہ یہ اختلاف ﴿بَغۡيَۢا بَيۡنَهُمۡ﴾ کی وجہ سے ہیں، یہ بدگمانی ہے، بلکہ بہت سے اختلافات غلط فہمی پر مبنی ہیں۔

تعجب ہے:

اہل قرآن (منکرین حدیث) تو ابھی کل پیدا ہوئے جن کی پیدائش کو جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں ان میں اتنا اختلاف ہے کہ قائلین حدیث میں نہ ہوگا، آپس میں خوب ہاتھا پائی ہوتی ہے (مثلا) ایک فریق پانچ نمازوں کا قائل ہے، دوسرا تین کا، تیسرا دو کا بلکہ محض دعاء، ایک فریق جماعت اورمنفرد کے لیے وضو کی ضرورت کا قائل ہےتو دوسرا منفرد کے لیے وضو کا منکر ہے، ایک فریق ہرنماز کی دو رکعتیں مانتا ہے ہر رکعت میں دوسجدے، دوسرا ہر رکعت میں ایک سجدہ کہتا ہے۔

غرض جتنے منہ اتنی باتیں یہاں تک کہ ہمارے فاضل مخاطب حافظ محب الحق صاحب کواہل قرآن کے لقب سے بھی نفرت ہوگئی۔ (ص:٦٩)

قسط: ۱۰

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۱۵/محرم ۱۳۴۹ھ = ۱۳/جون ۱۹۳۰ء)

گذشتہ پرچوں میں ہم نے کئی مرتبہ یہ امر ظاہر کر دیا ہے کہ کتاب ''شرعۃ الحق'' کے اصل مضمون کا جواب ہو چکا ہے اب اس کی ورق گردانی باقی ہے جو کی جارہی ہے۔

(ص: ۵۸ سے ص: ۶۰) تک مسلمانوں کے اختلافی مسائل میں فیصلہ کی صورت لکھی ہے کہ قرآن ہی سے فیصلہ ہوسکتا ہے، چنانچہ آپ کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

''مسلمانو! آؤ اور اس پر اتفاق کرو کہ قرآن مجید سے انکار نہ کرو گے، اور اس کو اپنے مرادی اور فرضی معنوں میں نہ جکڑو گے، اس کو اپنے مفروضہ اصول سے پابہ زنجیر نہ کرو گے، عربی زبان ہونے کی حیثیت سے صریح معنی جو واضح ہوں اس سے سرکشی نہ کرو گے'' (ص: ۵۹)۔

نہایت معقول:

واجب العمل نصیحت ہے مگر ہمیں سمجھ میں نہ آیا کہ یہ سب الفاظ کس فرقے کی جانب اشارہ ہیں ، اہلحدیث تو ایسا نہیں کرتے ،سوچتے سوچتے خیال میں آ گیا کہ فاضل مصنف کا یہ اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جن کی بابت وہ اسی کتاب میں ان الفاظ میں شاکی ہیں کہ:

''میں ہرگز اہل قرآن نہیں، کیوں کہ اہل قرآن نے قرآن کو چیستان اور معمہ بنا کر اسے کھینچ تان کر اس کی ہڈیاں مروڑ کر اک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی ہے، الفاظ کے جوڑ توڑ سے ایسے معنی نکالے ہیں کہ قرآن کو سو دفعہ پڑھ جاؤ مگر وہ معانی سمجھ میں نہیں آنے کے، تیرہ سو برسوں کی نماز جو

عمل متواتر سے ثابت ہے بدل دی گئی [1] ، اور یہ اصول بلا بینہ رب گھڑ لیا کہ نماز میں قرآنی الفاظ ہی چاہئیں، حالاں کہ خدا کو لفظ مطلوب نہیں، مفہوم اور دلی خشوع مطلوب ہے، کیوں کہ نماز اس کی یاد کے لیے قائم ہوتی ہے: ﴿وَأَقِمِ ٱلصَّلَوٰةَ لِذِكۡرِيٓ﴾[طٰہٰ:۱۴]فرقہ اہل قرآن کی تصنیف پر میری نظر نہیں گزری دو تین رسالے پڑھے ہیں جس سے ظاہر ہوا کہ وہ قرآن کی ہڈیاں مروڑنے، نئے احکام پیدا کرنے، نئی شریعت قائم کرنے اور اس دین میں جو تفرقہ مٹانے آیا تھا، تفرقہ ڈالنے کو کھڑا ہوا ہے اور میرا مقصود خدائی دین اسلام کو بیان کرنا ہے، جو خود تفرقہ شکن ہے، اس کے سوا بھی اہل قرآن کو قرآن مجید کی روحانیت سے سروکار نہیں، اس لیے وہ دوری میں پڑا ہے اور جو خدا سے دور، اس سے مَیں دور'' (ص:۶۰)۔

پس اگر آپ کی مراد پہلی عبارت سے یہی فرقہ ہے جو (بقول آپ کے) قرآن مجید کی ہڈیاں توڑتا ہے، تو ایسے لوگوں کو آپ کا خطاب کر کے یہ فرمانا کہ:

''قرآن کو اپنے مرادی اور فرضی معنوں میں نہ جکڑو اور اس سے سرکشی نہ کرو''۔

برمحل اور صحیح ہے۔ جزاک اللہ ومرحبا۔

کیا آپ اجازت دیں گے کہ ہم آپ بھی ایسا کرنے سے پرہیز کریں، آیئے ہم آپ معاہدہ کریں کہ قرآن مجید کے معانی وہی مراد لیں گے جو عربی زبان کے محاورہ سے ٹھیک ہوں، اپنے مرادی اور مفروضہ معنی پر قرآن کو نہ جکڑیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ گو آپ نے فرقہ اہل قرآن سے اپنی تبری اور علیحدگی کا اعلان

---

[1] لاہوری اہل قرآن (چکڑالوی) کی طرف اشارہ ہے مگر امرتسری اہل قرآن امت مسلمہ جدیدہ نے نماز میں لاہوریوں سے بھی زیادہ تصرف بیجا کیا ہے (۱) توجہ الی المسجد الحرام کی ضرورت نہیں (۲) منفرد نماز میں وضو کی ضرورت نہیں (۳) اکیلے نماز پڑھنے کی حالت میں جنبی کو غسل کرنے ضرورت نہیں وغیرہ، دیکھو ((تفسیر بیان للناس)) (ص:۴۰،۷۱ ۲)۔(مؤلف)۔

فرمایا اور آپ کی طرح امرتسری امت مسلمہ جدیدہ بھی اہل قرآن سے تبری کرتی ہے، مگر اس میں بھی ذرہ برابر شک نہیں کہ آپ تینوں بلکہ جملہ شاخہاء اہل قرآن میں قدر مشترک اتنا تو ضرور ہے کہ:

آپ، امرتسری، لاہوری، چکڑالوی، گجراتی اور گوجرانوالی وغیرہ لوگوں میں انکار حجیت حدیث نبوی بنیادی اصول ہیں۔

اس قدر مشترک کی وجہ سے ہم آپ سب کو اہل قرآن کہتے ہیں اور جانتے ہیں، باقی رہا باوجود انکار حدیث کے آپ لوگوں کا باہمی اختلاف، سو اس کی بابت یہی کہیں گے کہ:

تیلی بھی کیا اور روکھا کھایا۔

یعنی اختلافات سے بچنے کے لیے حدیث کو چھوڑا تھا، وہی اختلاف بلکہ اس سے بھی زیادہ آپ لوگوں میں پیدا ہوا، اس لیے حدیث نبوی آپ لوگوں کو مخاطب کر کے یوں گویا ہے:

میرے پہلو سے گیا پالا ستم گر سے پڑا
مل گئی اے دل تجھے کفران نعمت کی سزا

ہاں آپ کا ہمارا اصولی اختلاف صرف اتنا ہے کہ آپ حدیث نبوی کو مثبت حکم شرعی نہیں جانتے اور ہم جانتے ہیں۔

ہم اپنے دعویٰ پر آیات قرآنیہ جو پیش کرتے ہیں آپ کے مرقومہ قول کے ماتحت ان آیات کو نہ ہم مروڑیں، نہ آپ، پھر دیکھیے کہ (سوائے قرآن) حکم نبوی حجت شرعیہ (مثبت حکم) ہے یا نہیں، مفصل کے لیے پرچہ اہل حدیث مؤرخہ ۱۱، ۱۸ ذیقعدہ ملاحظہ ہوں۔

قسط: ۱۱

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۲۲/محرم ۱۳۴۹ھ = ۲۰/جون ۱۹۳۰ء)

گذشتہ پرچوں میں ''شرعۃ الحق'' کی ورق گردانی (صفحہ ۶۰) تک ہوئی ہے۔اس سے آگے (ص:۶۱۔ ۶۳) پر قانون فطرت اور قانون قدرت کا ذکر کیا ہے جس سے ہمیں سروکار نہیں (صفحہ ۶۳) سے (صفحہ ۶۷) تک کتاب کی غرض اور موضوع بیان کیا ہے جس میں قابل ذکر ایک دو فقرے ہیں، آپ فرماتے ہیں (۱) میں نے یہ دکھانا چاہا کہ قرآن مجید ایک کامل اور مفصل کتاب ہے۔(ص:۶۳)

''جو لوگ کسی پر ناحق بہتان لگا کر تکلیف دیتے ہیں وہ اپنی گردن پر بڑا بھاری بوجھ اٹھاتے ہیں''۔

کون مسلمان ہے جو قرآن مجید کو ان صفات سے تسلیم نہ کرے جو خود قرآن میں آئی ہیں، اوصاف مذکورہ میں یہ دونوں صفات (کامل اور مفصل) موجود ہیں: ﴿أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾ [المائدۃ:۳]، ﴿كِتَٰبٌ أُحْكِمَتْ ءَايَٰتُهُۥ ثُمَّ فُصِّلَتْ﴾ [ھود:۱] وغیرہ، اس لیے ہمارا تو ایمان ہے کہ قرآن کامل اور مفصل ہے ہر کہ شک آرد کافر گردد۔

منکرین حدیث کا قائلین پر صریح بہتان ہے، افتراء عظیم ہے کہ قائلین حدیث قرآن کو کامل اور مفصل نہیں مانتے اس لیے ایسے افترا کنندوں کو قرآن کی تنبیہ سے ڈرنا چاہیے:

﴿وَٱلَّذِينَ يُؤْذُونَ ٱلْمُؤْمِنِينَ وَٱلْمُؤْمِنَٰتِ بِغَيْرِ مَا ٱكْتَسَبُوا۟ فَقَدِ ٱحْتَمَلُوا۟ بُهْتَٰنًا وَإِثْمًا مُّبِينًا﴾ [الاحزاب:۵۸]۔

مگر ہاں جناب آپ سے تو ہمارا فیصلہ بالکل آسان ہے آپ نے باوجود قرآن کو کامل اور مفصل ماننے کے پنجگانہ نمازوں کی تقسیم یوں کی ہے۔

''صبح کی دو رکعتیں مغرب کی تین ظہر،عصر اور عشاء کی چار چار'' (ص:۲۳۲)

حالاں کہ قرآن میں یہ تفصیل نہیں، آپ کو ملی ہو تو ہمیں بھی مطلع فرمائیں۔

پھر یہ تشریح آپ نے کہاں سے اخذ کی یقیناً فعل نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پس ثابت ہوا کہ اتنی بڑی تشریح فعل یا قول نبی سے ہوجائے تو قرآن کے مفصل ہونے میں حارج نہیں۔نعم الوفاق۔(مفصل اہل حدیث مؤرخہ ۴/ اپریل میں ملاحظہ ہو)۔

(**نوٹ!**)امرتسری اہل قرآن پارٹی کے ساتھ جو گذشتہ ایام میں ''اطاعت الرسول'' پر مباحثہ تھا اس مباحثہ میں بھی ہماری طرف سے یہ سوال پیش ہوا تھا کہ آپ لوگ حدیث نبوی کو حجت شرعیہ نہیں مانتے تو۔

مروجہ طریق سے جمعہ پڑھنے کا حکم قرآن شریف سے بتائیں؟

یعنی بطریق مسنونہ خطبہ پڑھ کر دو رکعتیں فرض اور باقی سنن یا نوافل پڑھنا چاہیے۔

نہ اس کے جواب میں انہوں نے قرآن مجید سے ثبوت دیا، نہ آج تک جمعہ ترک کیا۔

ہمارا یقین ہے کہ سارے منکرین حدیث کی ساری پارٹیاں مل کر بھی اس سوال کا جواب نہیں دے سکتیں۔

﴿وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا﴾ [الاسراء:۸۸]۔

(۲) دوسرا فقرہ قابل ذکر آپ کا یہ ہے:

''میں جانتا ہوں کہ قوم حق بینی کی نگاہ نہ ڈالے گی، وہ تعصب کی عینک آنکھوں سے نہ اتارے گی، وہ قرآن مجید کی آیتوں کے مقابلہ میں بھی اپنی آبائی روش کے دلدادہ ہوکر ﴿مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ ءَابَاءَنَا﴾ [البقرۃ:۱۷۰] مجھے برا بھلا سخت وسست کہنے کو

کھڑی ہوجائے گی، الخ (ص:٦٧)۔

ممکن ہے کہ اس قسم کے لوگ کہیں پٹنہ کے اردگرد ہوں آپ تسلی رکھیں ہم قائلین حدیث (خصوصا اہل حدیث) کا یہ طریق نہیں۔

ہم آپ کے دعوی کی قدر کرتے ہیں کیوں کہ ہمارے بزرگ ہمیں یہی سکھا گئے ہیں، تصدیق کے لیے کتاب (تقویۃ الایمان)[1] وغیرہ ملاحظہ ہو، ہم راستی سے کہتے ہیں: اہل قرآن (منکرین حدیث) میں جتنا تعصب ہے کسی میں نہ ہوگا، مگر آپ اشارہ ہم پر لگاتے ہیں۔ جس کے جواب میں ہم اتنا ہی عرض کریں گے ؎

انہوں نے خوبرو شکلیں کبھی دیکھی نہیں شائد
وہ جب آئینہ دیکھیں گے تو ہم ان کو بتا دیں گے

صفحہ (٦٨ سے صفحہ ٧٢) تک آپ نے التماس لکھ کر اپنی نیت صالحہ کا اظہار کیا ہے کہ میری غرض یہ ہے لوگ ٹھیٹھ اسلام پر آجائیں وغیرہ۔

اس حوالہ میں ایک فقرہ آپ کا قابل ذکر ہے آپ لکھتے ہیں:

''میں قوم سے چاہتا ہوں کہ وہ اپنی خواہشوں، مذہبی توہمات اور خاندانی خیالات سے خالی ہوکر بحضور خداوند جل وعلا اس کتاب کو پڑھے''۔ (ص:۷۱)۔

ہم نے آپ کی اس نصیحت پر عمل کیا ہے، اب ہم آپ سے امید رکھنے کا حق رکھتے ہیں کہ:

آپ بھی ہمارے جواب کو تعصب سے خالی ہوکر پڑھیں، خدا آپ کا خاتمہ خیر کرے۔

① از شاہ اسماعیل رحمہ اللہ، اس کتاب کا عربی ترجمہ شیخ عبدالوحید رحمانی رحمہ اللہ سابق شیخ الجامعہ سلفیہ بنارس نے کیا ہے جو راقم کی تحقیق کے ساتھ دار العقیدہ ریاض سے طبع ہوئی ہے۔

قسط: ۱۲

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۲۹/محرم ۱۳۴۹ھ = ۲۷/جون ۱۹۳۰ء)

گذشتہ پرچوں میں بتایا گیا ہے کہ کتاب ''شرعۃ الحق'' جو انکار حدیث کے موضوع پر لکھی گئی ہے اس کے اصل مضمون کا جواب تو ہو چکا ہے اب اس کی ورق گردانی کی جاتی ہے، چنانچہ آج بھی اسی طریق سے مضمون درج ہے۔

(ص: ۴۳) پر آغاز کتاب کا عنوان لکھ کر دعا کی ہے (ص: ۴۷) کے اخیر سے مسائل حل طلب لکھے ہیں، پہلا مسئلہ حل طلب یہ ہے کہ خدا کے سب نبیوں کا دین ایک ہی تھا۔ (ص: ۴۷۔ ۸۰)

ہمیں اس سے تعرض نہیں (ص: ۸۱ سے ۹۲) تک یہ مسئلہ لکھا ہے کہ انبیاء سابقین کا دین منسوخ نہیں ہوا، بحیثیت بحث حدیث ہمیں اس سے بھی تعرض نہیں، لیکن مصنف نے باوجود طول کلامی کے مسئلہ قبلہ پر نظر نہیں کی۔

(۱) قرآن مجید میں قبلہ نماز بیت المقدس کے بجائے مسجد الحرام متعین ہوا ہے جس کی بابت آپ کو بھی اعتراف ہے۔

اے لوگو! غفلت بہت بڑا شیطان ہے اس سے پناہ مانگو، اور خدا کی یاد ہی نماز کی جان ہے اس سے غفلت نہ کرو، پہلے قبلہ رخ کھڑے ہو جاؤ کیوں کہ حکم ہے: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [البقرۃ: ۱۴۴] ''منہ مسجد حرام کی طرف کر لیا کرو''۔ (شرعۃ الحق، ص: ۲۳۶)

یہ مسئلہ بطور مثال ہم نے بتایا ہے ورنہ بہت سے ہیں۔

(ص: ۹۳ سے ۹۵) تک اتفاق کی تاکید اور تفرقہ سے منع پر بحث کی ہے جو قابل قبول ہے۔ (ص: ۹۵ سے ۹۸) تک وحی پر بحث کی ہے جو قابل انکار نہیں، ہاں اس میں وحی خفی کا جو انکار کیا ہے اس کا جواب اہل حدیث مورخہ ۲۳ر مئی میں ہو چکا ہے۔

(ص: ۹۹ سے ۱۱۱) تک ﴿مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ﴾ [البقرة: ۱۷۰] (خدا کا اتارا ہوا کلام) کیا ہے مقصود اس سے مصنف صاحب کا یہ ہے کہ ﴿مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ﴾ اصل تورات، انجیل اور قرآن ہیں اور ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ ٱلْهَوَىٰٓ﴾ [النجم: ۳] سے بھی مراد صرف قرآن شریف ہے اس کا جواب بھی سابقہ پرچہائے اہل حدیث مؤرخہ ۲۵ر اپریل ۰ ۳ء میں ہو چکا ہے۔

آپ نے اس ذکر میں دعا کی ہے جو بہت پیاری ہے ہم چاہتے ہیں کہ ہم اور ہمارے ناظرین بھی اس میں شریک ہوں مگر آپ نے اس دعا میں جس آیت کی طرف اشارہ کیا ہے ہم پہلے اسے سامنے رکھ لیتے ہیں تا کہ دعا بجمیع اجزاء پڑھی جائے اور قبول ہو، قرآن مجید میں ذکر ہے: ﴿وَيَوْمَ يَعَضُّ ٱلظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ يَقُولُ يَٰلَيْتَنِى ٱتَّخَذْتُ مَعَ ٱلرَّسُولِ سَبِيلًا ﴿٢٧﴾ يَٰوَيْلَتَىٰ لَيْتَنِى لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا ﴿٢٨﴾ لَّقَدْ أَضَلَّنِى عَنِ ٱلذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَآءَنِى ۗ وَكَانَ ٱلشَّيْطَٰنُ لِلْإِنسَٰنِ خَذُولًا ﴿٢٩﴾ وَقَالَ ٱلرَّسُولُ يَٰرَبِّ إِنَّ قَوْمِى ٱتَّخَذُوا۟ هَٰذَا ٱلْقُرْءَانَ مَهْجُورًا﴾ [الفرقان: ۲۷-۳۰]۔

یعنی قیامت کے روز ظالم اپنے ہاتھوں کو کاٹیں گے اور کہیں گے کاش ہم رسول کے اتباع میں خدا کی راہ اختیار کرتے، ہائے ہماری کم بختی کہ ہم نے فلاں کو دوست بنایا اس نے ہم کو ذکر (قرآن) سے غافل کر دیا، اور شیطان انسان کو بڑا رسوا کرنے والا ہے اور رسول کہے گا اے خدا میری قوم نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔

ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اور اتباع رسول کے ترک کرنے پر یہ عتاب ہوگا، پس ان ہر دو امور کو ملحوظ رکھ کر ہم آپ کی دعا میں شریک ہوتے ہیں:

''اے خدا اپنی خدائی کا صدقہ ایسا تو نہ کیجیو کہ باز پرس کے دن ہم کو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شرمانا پڑے اور آپ کی اس فریاد میں قوم نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا ہمارا نام بھی ہو، ورنہ ہم بے پناہ ہو جائیں گے، اے پناہ دینے والے اپنی کریمی ورحیمی کا صدقہ جب تو نے ہم کو اپنے کلام پاک میں پناہ دیا ہے تو بے پناہ نہ کر، اے دل کی لگی بجھانے والے اپنا نور تمام عالم میں پھیلا دے، اپنا وعدہ پورا کر، اپنی بشارتیں ظاہر کر، اسلام کا بول بالا کر، میری التجا سن لے، میری دعا قبول کر کہ پرسش اعمال کے دن جب تیرا سوال ہمارے ایمان سے ہو تو ہم تجھی کو دیکھیں، ہمارے ہادی اور امام سے ہو تو ہم نبی معصوم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہاتھ پکڑ لیں اور جب ہمارے اعمال سے ہو تو ہم تیرا کلام مقدس اپنے سینہ سے نکال کر پیش کر دیں، اور نامہ اعمال کی جگہ یہی تیرا قرآن ہمارے ہاتھ میں دیا جائے جس میں تیری شریعت ہے، جس میں تیری طریقت ہے جس میں تیری روحانیت ہے اور تیری حقیقت تک رسائی ہے، اے محیط ومنزہ! جب تو نے اپنے قرآن پاک کے نور میں ڈھانپا ہے تو اب ماسوائے کی تاریکی میں نہ بھیج'' (ص:۱۱۰)۔

(ص:۱۱۱ سے ص:۱۱۴) تک اس امر پر بحث کی ہے کہ سوائے حکم خدا کے کسی کا اتباع واجب نہیں، بہت ٹھیک ہم بھی جو اتباع رسول کو واجب کہتے ہیں تو بحکم خدا کہتے ہیں لہذا یہ ہمارے مخالف نہیں۔

(ص:۱۱۴ سے ص:۱۱۶) تک اس امر پر بحث کی ہے کہ حکم خدا کو ترک کرنا بہت گناہ ہے، (ص:۱۱۶ سے ص:۱۲۷) تک اطاعت قرآن اور اطاعت رسول پر بحث کی ہے جس میں بتایا ہے کہ اطاعت رسول سے مراد یہ ہے کہ اس کے لائے ہوئے قرآن کی اطاعت کی جائے اس کا جواب اہل حدیث ۲۵ را پریل میں ہو چکا ہے۔

(ص:۱۲۸ سے ص:۱۳۲) تک اس مضمون کا ذکر ہے کہ آنحضرت علیہ السلام کو بھی

یہی حکم تھا کہ خدا کی اتاری ہوئی کتاب کی پیروی کر، بالکل سچ ہے مگر ہمارے پیش کردہ دلائل کا جواب نہیں ہوسکتا کیوں کہ ہم ثابت کرآئے ہیں کہ وحی خفی بھی تھی، جس کا ذکر سورہ تحریم میں ہے: ﴿نَبَّأَنِيَ ٱلۡعَلِيمُ ٱلۡخَبِيرُ﴾ [التحریم: ۳]۔ (مفصل اہل حدیث ۲۵/اپریل وغیرہ میں)، (ص: ۱۳۳ سے ص: ۱۳۷) تک یہ ثابت کیا ہے کہ آنحضرت اور صحابہ قرآن ہی کی تبلیغ کرتے تھے، ٹھیک مگر اسی طرح کہ اپنی تفسیر اور تشریح کے ساتھ، اسی وجہ سے آپ بھی نماز پنجگانہ، جمعہ جماعت وغیرہ کے اسی طرح قائل ہیں جس طرح حدیثوں میں آئی ہیں۔

قسط: ۱۳

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۷/صفر ۱۳۴۹ھ = ۴/جولائی ۱۹۳۰ء)

گذشتہ پرچہ میں "شرعۃ الحق" کی نمبرشماری (ص: ۱۳۷) تک ہوچکی ہے (ص: ۱۳۷) کے اخیر میں مصنف نے ایک بات قابل جواب لکھی ہے جو واقعی قابل توجہ ہے۔

"اہل قرآن عموما کہا کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث لکھنے سے منع فرمایا تھا، بالکل صحیح ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ حدیث قابل عمل اور حجت شرعیہ نہیں غلط ہے کیوں کہ لکھنے سے منع اس لیے کیا تھا کہ پہلی قوموں کی طرح قرآن اور حدیث مسلمانوں میں بھی مخلوط نہ ہوجائے جیسے یہود ونصاری میں الہام موسی اور کلام موسی، الہام عیسی اور کلام عیسی علیہم السلام مخلوط ہو گئے ہیں، ورنہ

عمل کرنے کی تاکید برابر فرماتے تھے، دلیل ہمارے دعوی کی وہ حدیث ہے جو''صحیح مسلم''میں ملتی ہے جس میں کھجوروں کو پیوند لگانے کا ذکر اذکار ہے، اس میں فرمایا تھا''إنّما أنا بَشَرٌ، إذا أمَرْتُكمْ بَشيْءٍ مِن دِينِكمْ فَخُذُوا بِهِ، وإذا أمَرْتُكمْ مِن رَأْيِي فإنّما أنا بَشَرٌ'' (مشكاة، باب الاعتصام)[1] یعنی جب میں تم کو دین میں کوئی حکم دوں بذریعہ قرآن یا حدیث تو اس پر عمل کرو اور جب میں اپنی رائے سے کچھ کہوں تو مجھے اپنے جیسا بشر سمجھو''۔

اس روایت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ کتابت سے منع تھا عمل سے منع نہ تھا خیر یہ تو ان کے استدلال میں ضعف کا بیان ہے، اب سنیے مصنف کا سوال آپ لکھتے ہیں۔

''حضرت رسول معصوم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث جمع کرنے کا حکم دیا تھا یا منع فرمایا تھا، اگر حکم دیا تھا تو خود آپ کے زمانہ باسعادت میں اس کی تعمیل کیوں نہ کی گئی اور اگر منع فرمایا تھا تو یہ بدعت کس نے کھڑی کی اور کب کھڑی کی، اور حدیث کے ساتھ خلفاء راشدین اور صحابہ کا کیا سلوک رہا اور ان کی حقیقت کیا ہے''(ص:۱۳۷)۔

جواب:

اس کا یہ ہے کہ بے شک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری فرمان حدیث لکھوانے کا تھا، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے (صحیح) میں کتابت حدیث کا باب باندھا ہے اس میں دو حدیثیں لائے ہیں ایک حضرت علی کی روایت جس میں ذکر ہے کہ حضرت ممدوح کے پاس ایک حدیثی بیاض لکھا تھا جس میں چند احکام حدیثیہ لکھے تھے،[2] دوسری حدیث وہ نقل کی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کا ذکر ہے ایک صحابی ابو

---

① حدیث:۱۴۷، الفصل الاول، (صحیح مسلم): كتاب الفضائل ، باب وجوب امتثال ما قاله شرعادون ماذكر ه صلی اللہ علیہ وسلم معايش الدنيا على سبيل الراى، حدث:۲۳۶۲۔

② صحیح بخاری: كتاب العلم ، باب كتابة العلم ، حديث:۱۱۱۔

شاہ کی درخواست پر فرمایا کہ یہ میرا خطبہ ابو شاہ کو لکھ دو[1] حالانکہ وہ خطبہ قریباً سارا حدیثی کلام تھا۔

امام بخاری نے یہ باب اسی لیے مقرر کیا ہے کہ پچھلی نسل جان جائے کہ حدیث لکھنے کا رواج بلکہ حکم خود زمانہ رسالت میں بفرمان رسالت جاری تھا اس پر عمل کا ثبوت لینا چاہیں تو دیکھیے ابو ہریرہ کا شاگرد کہتا ہے۔

''أرَانَا أباهريرةَ كُتُبًا مِن أحَادِيثِ النَّبِيِّ ﷺ، وقالَ: هَذا هُوَ مَكْتُوب عِنْدِي'' (فتح الباری) پ ۱ (ص: ۱۰۵)[2]۔یعنی ابو ہریرہ نے ہم کو حدیث کی کتابیں دکھائیں اور کہا کہ یہ میرے پاس مکتوب موجود ہیں۔

غالبا یہ جواب پا کر منکرین حدیث آئندہ یہ سوال نہ کریں گے (بشرط انصاف)۔

اس کے بعد (ص:۱۳۸) پر جو مصنف نے جمع احادیث کا زمانہ ڈیڑھ دوصدی بتایا ہے اس کا ایک جواب تو پہلے اہل حدیث مورخہ ۳۰؍مئی ۳۰ء میں دیا گیا، دوسرا جواب بھی یہی ہے جو اوپر ذکر ہوا کہ احادیث رسول زمانہ رسالت میں جمع تھیں البتہ ابواب فقہی کی ترتیب اس سے پیچھے ہوئی، سو یہ اور بات ہے اس کو نفس حدیث اور عمل بالحدیث سے تعلق نہیں۔

(ص:۱۳۸،۱۳۹)، پر امام شعبہ کا قول نقل کیا ہے:۔

''كُلَّما تَقدَّمْتُمْ في الحَدِيثِ، تَأخَّرْتُمْ في القُرْآنِ'' (تذکرہ ذہبی)[3]۔

فاضل مصنف نے اس کا ترجمہ غلط کیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

''یاد رکھو کہ تم کو حدیث میں جتنا کمال ہوگا اسی قدر تم کو قرآن سے جہل ہوگا''۔

صحیح ترجمہ بپابندی قواعد عربیہ یہ ہے:

---

① ایضا، حدیث:۱۱۲۔ ② ۱/ ۳۶۲۔ ③ تذکرۃ الحفاظ:۱/ ۱۴۶۔

''جب کبھی تم حدیث میں بڑھے قرآن سے پیچھے ہٹے''۔

اس قول کے معنی سمجھنے سے پہلے حالات کا علم ہونا ضروری ہے۔

وقت تکلم شعبہ کے مخاطبین کی یہ حالت تھی کہ علم حدیث میں منہمک ہوکر قرآن دانی پر متوجہ نہ ہوتے تھے جیسے آج کل علم فقہ پڑھنے والے تفسیر و حدیث پر توجہ نہیں کرتے، ایسے طالب علموں کو یہ کہنا کہ جتنا تم نے حدیث میں شغل کر کے تبحر حاصل کیا اسی قدر تم قرآن سے ناواقف رہے، یہ بالکل ایک امر واقع ہے۔

اس سے یہ مقصد نہیں کہ شعبہ علم حدیث کو فضول جانتے تھے، فضول جانتے تو ساری عمر یہی شغل کیوں رکھتے۔

اسی طرح شعبہ کا دوسرا قول بھی کمال احتیاط اور خشیۃ اللہ پر مبنی ہے، جس کو ''شرعہ'' نے ناقص نقل کر کے غلط ترجمہ کیا ہے، وہ تمام قول یوں ہے:

''قالَ شعبةُ لِي: ما شَيْءٌ أخْوَفَ عِنْدِي مِن أنْ يُدْخِلَنِي النّارُ، مِنَ الحَدِيثِ. وقالَ عنه: ودِدْتُ أنّي وقّادُ حَمّامٍ، وأنّي لَمْ أعْرِفِ الحَدِيثَ''۔ (تذکرہ جلد ۱ص: ۱۷۷)[1] یعنی میرے نزدیک دوزخ میں ڈالنے والی چیزوں میں سے حدیث سے زیادہ خوفناک کوئی چیز نہیں، یہ بھی کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میں حمام گرم کرنے والا ہوتا اور حدیث کا عالم نہ ہوتا۔

اس قول میں امام شعبہ حدیث کی عظمت کا اظہار کرتے ہیں کیوں کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ: ''جو کوئی رسول اللہ پر جھوٹی حدیث لگادے وہ جہنمی ہے''[2]، امام

---

① ۱/ ۱۴۶۔

② صحیح بخاری: كتاب العلم ، باب إثم من كذب على النبى ﷺ، حدیث: ۱۰۷، صحیح مسلم: مقدمه، باب التحذير من الكذب على رسول الله ﷺ، حدیث: ۳۔

موصوف محض وجدان قلبی سے ڈرتے ہیں کہ کوئی حدیث یا تشریح حدیث غلط منہ سے نکل گئی ہو اس کی مثال بالکل وہ ہے جو خلیفہ ثانی کہا کرتے تھے کہ کاش میں خلافت کے معاملے میں برابر سرابر رہوں نہ اس کی جزا مجھ کو ملے نہ اس کی سزا۔

اس سے یہ مراد نہیں کہ خلافت کا کام فضول جانتے تھے بلکہ وہ اس کی عظمت شان کا اظہار کرتے تھے۔

قسط: ۱۴

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۱۴؍صفر ۱۳۴۹ھ = ۱۱؍جولائی ۱۹۳۰ء)

مصنف ''شرعۃ الحق'' نے چند اقوال ایسے نقل کیے ہیں جن کے قائلوں نے ازراہِ تواضع اپنی بابت کچھ کہا، ان کا جواب پہلے پرچہ میں ہو چکا ہے۔ اس سے آگے پڑھیے۔(مدیر)

لطیفہ:

ایک دفعہ ایک رئیس (شیعہ) کے پاس بیٹھا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول پر بحث چلی، جو حضرت موصوف نے حذیفہ صحابی سے سوال کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تم کو منافقوں کے نام بتائے ہوئے ہیں میرا نام تو ان میں نہیں، رئیس صاحب نے کہا کہ عمر رضی اللہ عنہ خود قائل ہیں کہ میں منافق ہوں۔ میں جواب دیتا رہا مگر رئیس صاحب

اپنے قول پر مصر رہے۔

خدا کی شان کرامت عمری کا ظہور ہونا تھا کہ رئیس صاحب نے کہا میں نماز پڑھ لوں، نماز پڑھ کر سب سے پہلے ان کے منہ سے یہ لفظ نکلا۔

مولانا ہم دنیاداروں کی نمازیں کیا ہیں ٹکریں ہیں۔

میرے منہ سے فی البدیہہ یہ نکلا۔

بڑے آدمی اسی طرح تواضع کیا کرتے ہیں، انہی معنی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا میں منافق تو نہیں۔

موصوف بہت چونکے کہ نہیں یہ اور بات ہے وہ اور بات ہے میں نے کہا وہ بھی اسی طرح ہے، یہی کیفیت امام شعبہ کے قول کی ہے وہ ذمہ داری کے لحاظ سے ڈرتے تھے نہ کہ حدیث کو فضول اور بے کار چیز جانتے تھے۔

اسی طرح (ص:۱۳۹) پر ہشام دستوائی کی بابت لکھا ہے:۔

''ہشام دستوائی رحمہ اللہ جن کا لقب ''الحافظ الحجۃ'' ہے وہ جب روایت حدیث کے فسادوں سے متنبہ ہوئے تو اس قدر روئے کہ ان کی آنکھ جاتی رہی اور یہی فرمایا کرتے کہ روایت حدیث کی باز پرس سے کاش میری نجات ہو، بَکی هِشَامٌ الدَّسْتُوائِيُّ حَتّٰى فَسَدَتْ عَيْنُهُ، وَيَقُولُ لَيْتَنَا نَجَوْنَا مِنَ الْحَدِيثِ''(تذکرہ ذہبی)[1]۔

ہشام کی مراد بھی وہی ہے جو شعبہ کی ہے، یعنی عظمت حدیث کا رعب، اسی لیے اس قول کے متصل ہی لکھا ہے۔

''قَالَ: عَجِبْتُ لِلْعَالِمِ كَيْفَ يَضْحَكُ؟!''(تذکرۃ ج۱ ص:۱۴۸)[2]۔

ہشام کہتے ہیں مجھے حدیث کے عالم سے تعجب ہے کہ وہ ہنستا کیسے ہے۔

---

① ۱/ ۱۶۴۔ ② ۱/ ۱۶۴۔

یعنی اسے تو عظمت حدیث سے ہنسی نہیں آنی چاہیے، عبداللہ بن داود کے قول کا آپ نے حوالہ نہیں دیا، اگر ہو بھی تو اس کا مطلب بھی یہی ہے جو ہم بتا آئے ہیں۔

اسی طرح حماد بن سلمہ کی بابت آپ نے لکھا ہے: ''جب روایت حدیث کے نقصانات سے متنبہ ہوئے تو ترک روایت کا مستحکم ارادہ کرلیا'' (ص: ۱۴۹) اس کا حوالہ آپ نے تذکرہ ذہبی کا دیا ہے، حماد موصوف کا ذکر (تذکرہ) (جلد اول ص: ۱۸۲، ۱۸۳) پر ہے مگر آپ کے منقولہ الفاظ اس میں نہیں ہیں، آپ نے کہیں سے سنے سنائے محض حسن ظن سے لکھ دیے ہوں گے۔

اسی صفحہ پر آپ نے اسحق کی بابت لکھا ہے وہ بھی قابل غور ہے، آپ فرماتے ہیں:

''اسحق بن اسمعیل الطالقانی ابوایوب روایت حدیث سے ایسے بیزار ہوئے کہ مرنے سے پانچ سال قبل یہ قسم کھالی تھی کہ آج سے روایت نہ کروں گا''۔ (تہذیب التہذیب) (ج ۱، ص: ۲۲۷)۔

اس قسم کے بہت سے حوالوں سے ہمیں یقین ہوگیا کہ آپ بوجہ معذوری بصر کے خود تو کتاب دیکھتے نہیں جو کوئی آپ کو سنا دیتا ہے تو اس پر یقین کر لیتے ہیں، سنیے اور بغور سنیے! اصل عبارت یوں ہے:۔

''حَسَدَهُ بَعْضُ النَّاسِ فَحَلَفَ أَلَا يُحَدِّثَ حَتَّى يَمُوتَ وَذٰلِكَ فِي أَوَّلِ سَنَةٍ: ۲۲۵ھ، وَمَاتَ فِي آخِرِہ''۔ ①

یعنی اسحق بن اسمعیل محدث تھے، بعض لوگوں نے ان سے حسد کیا تو انہوں نے قسم کھائی کہ اب ہم حدیث بیان نہ کریں گے۔

حافظ محب الحق صاحب:

آپ کے نام میں حق کی محبت داخل ہے مگر آپ کے کام میں حق سے نفرت معلوم

① تہذیب التہذیب: ۱/ ۲۲۷۔

ہوتی ہے، غور فرمایئے اس روایت میں نہ پانچ سال قبل موت کا ذکر ہے، نہ چھ سال، بلکہ صاف ذکر ہے کہ ۲۲۵ھ کے شروع میں انہوں نے بوجہ حسد بعض الناس حدیث بیان کرنا چھوڑا اور اسی سال کے آخر میں آپ کا انتقال ہوگیا، رحمہ اللہ۔ اس سے کیا ثابت ہوا؟ فقط یہ کہ اسحق اپنے معاصرین کے حسد سے مغضوب ہوکر تعلیم حدیث چھوڑ بیٹھے جیسے فرضا آپ اپنے مخالفوں سے تنگ آ کر اپنے مذہب کی اشاعت چھوڑ دیں، اس سے یہ ثابت نہیں ہوگا کہ آپ نے مذہب کو چھوڑا بلکہ اشاعت کو چھوڑا۔

(ص: ۱۴۰) پر آپ نے مسعر کا قول نقل کیا ہے کہ:

''مجھے پسند تھا کہ حدیثیں میرے سر پر آبگینہ ہوتیں جو میرے سر سے گر کر ٹوٹ جاتیں'' (تذکرہ)[1]۔

اس سے مراد یہ ہے کہ بوجہ عظمت علم حدیث کے کہتے ہیں، کہ کاش میں علم حدیث نہ پڑھا ہوتا تاکہ اس کی ذمہ داری سے بری ہوتا، یہ نہیں کہ وہ حدیث کو سند نہ مانتے تھے، ایسا ہوتا تو تعلیم حدیث چھوڑ کر آپ کی طرح تردید حدیث میں کتاب لکھتے۔

شعبی رضی اللہ عنہ کے قول کا جواب آئندہ آئے گا ان شاء اللہ۔

(ص: ۱۴۰) حضرت عمار صحابی کی حدیث کو حضرت عمر نے تیمم میں نہیں مانا،[2] حضرت عثمان نے حدیثیں سن کر کہہ دیا میں نہیں جانتا یہ کہاں ہیں، حضرت علی فرماتے تھے کہ میرے پاس جب کوئی حدیث بیان کرتا ہے تو میں اسے حلف دے لیتا ہوں (تذکرہ)[3]۔

ان میں سے کسی قول سے آپ کا مدعا ثابت نہیں ہوتا کہ یہ بزرگ حدیث کو دلیل شرعی نہیں مانتے تھے، ہاں حدیث کے ثبوت میں تیقن چاہتے تھے، جہاں کسی بیان کردہ حدیث سے انکار کرتے اس راوی کی وجہ سے کرتے تھے کہ شاید اس سے بھول چوک

---

① ازذھبی: ۱/۱۴۱۔ ② ازذھبی: ۳/۱۰۸۔ ③ ازذھبی: ۱/۱۴۔

ہوگئی ہو، نہ کہ حدیث کی عدم حجیت کی وجہ سے، جناب حافظ صاحب حجیت حدیث اور مثبت حدیث میں فرق ہے۔

عمران بن حصین کا جو قول آپ نے نقل کیا ہے (ص:۱۴۰۔۱۴۱) اس سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو اتنا کہ عمران روایت بالمعنی سے پرہیز کرتے تھے یہ تو نہیں کہ وہ قول نبی کو حجیت شرعیہ نہ جانتے تھے، چنانچہ آپ ہی کے منقولہ الفاظ یہ ہیں:

''عمران بن حصین صحابی فرماتے ہیں کہ واللہ مجھے اس قدر حدیثیں یاد ہیں کہ اگر میں دو روز برابر روایت کروں تو کرسکتا ہوں، لیکن مانع یہ ہے کہ چند صحابہ نے میری طرح حدیث کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے پھر بھی روایت میں غلطی کرتے ہیں، البتہ دیدہ و دانستہ جھوٹ نہیں بولتے، اگر میں بھی روایت کروں تو ڈر ہے کہ اسی گروہ میں میرا بھی شمار نہ ہو'' (تاویل مختلف الحدیث)[1]۔

یہ قول آپ کو تو کسی طرح مفید نہیں، ہمیں کسی طرح مضر نہیں۔ (ص:۱۴۱) پر آپ لکھتے ہیں:

''حضرت ابو ہریرہ نے روایت کی کہ احتیاج غسل کی حالت میں اگر روزہ دار صبح کرے تو روزہ نہ ہوگا، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صبح کے وقت غسل کیا اور روزہ رکھا، ابو ہریرہ کی یہ روایت غلط ہے''۔ (بخاری شریف)، (کتاب الصوم)[2]۔

اہلحدیث:

خدا جانے آپ اس خیال میں کیا کیا غلطیاں کر چکے ہیں اور کیا کیا کریں گے، اللہ تعالیٰ آپ کا خاتمہ بخیر کرے۔ ❁❁❁

---

① ازابن قتیبۃ: ص:۱۱۶۔

② باب الصائم يصبح جنبا ،حدیث: ۱۹۲۵۔۱۹۲۶، صحیح مسلم: كتاب الصيام ، باب صحة صوم من طلع عليه الفجر وهو جنب، حدیث:۱۱۰۹۔

قسط: ۱۵

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۲۱ر صفر ۱۳۴۹ھ = ۱۸ر جولائی ۱۹۳۰ء)

گذشتہ پرچہ میں (ص:۱۴۱) تک کا جواب درج ہو چکا ہے جہاں مصنف ''شرعۃ الحق'' نے ابو ہریرہ کے قول کو حضرت عائشہ کی روایت سے غلط کہا ہے اس کا جواب پڑھیے۔(مدیر)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بے شک روزہ دار کے حق میں فتوی دیتے تھے کہ صبح ہونے سے پہلے غسل کر چکے اور عائشہ صدیقہ کی روایت چوں کہ مرفوع ہے، اس لیے بحکم اصول حدیث وہ مقدم ہے کیوں کہ شارع علیہ السلام کا فعل ہے اور ابو ہریرہ کا فتوی اجتہادی ہے۔

حافظ صاحب:

قاعدہ ہے کہ جس قوم یا جس مذہب کا رد کیا جائے اس کے اصول سے واقف ہونا ضروری ہے، اس لیے محدثین کے اصول سے آپ کو واقف ہونا چاہیے کہ موقوف اور مرفوع کے مقابلہ میں مرفوع مقدم ہے، بلکہ ہم یہ کہیں گے کہ موقوف اور مرفوع کا مقابلہ ہی نہیں، نوکر اور مالک کی آراء میں مقابلہ کیا۔

ایک ابو ہریرہ کیا پچاس ابو ہریرہ بلکہ سو ابو بکر ایک فتوی دیں اور حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم اس کے خلاف ہو تو جو رسول اللہ کا فرمودہ ہو گا وہی واجب التعمیل ہو گا یہی معنی ہیں۔

عالم بمنت یک طرف
آن شوخ تنہا یک طرف

(ص:۱۴۱) پر لکھتے ہیں:

''حضرت ابن عباس اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم نے روایت کی کہ نمازی کے سامنے سے عورت یا کتا وغیرہ گزر جائے اور سترہ نہ ہو تو نماز جاتی رہے گی۔ (مشکاۃ) [1] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یہ روایت غلط ہے (بخاری)'' [2]۔

جواب:

محدثین کے قاعدے سے اس اعتراض کے دو جواب ہیں:

(اول) یہ کہ ابن عباس اور ابوہریرہ کی روایت درصورت صحیح مرفوع غیر ماول ہونے کے حضرت عائشہ کے قول اور روایت سے غلط نہیں ہوسکتی، نہ دونوں میں تعارض ہے، کیوں کہ ابوہریرہ کی روایت کا مطلب یہ ہے کہ عورت وغیرہ کی نمازی کے آگے گذرنے سے تو نماز ٹوٹے گی اور حضرت عائشہ کی روایت اس طرح کی نہیں، بلکہ وہ نماز شروع کرنے سے پہلے سامنے بیٹھی ہوتی تھیں آگے سے نہ گذرتی تھیں۔ فافہم۔

دوسرا جواب:

یہ ہے کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کا مطلب بھی اصلی قطع صلاۃ نہیں بلکہ قریب قطع مراد ہے، ان معنی کی تشریح اس حدیث سے ہوتی ہے جو ابوداود کی روایت سے آئی ہے،

---

[1] مشکاۃ المصابیح از خطیب التبریزی: (۲۴۲/۱)، کتاب الصلاۃ، باب السترۃ، الفصل الاول، حدیث: ۷۷۸۔

[2] صحیح بخاری: کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ الی السریر، حدیث: ۵۰۸، صحیح مسلم: کتاب الصلاۃ، باب الاعتراض بین یدی المصلی، حدیث: ۵۱۲۔

اور امام بخاری نے اس پر باب تجویز کیا ہے۔ باب لایقطع الصلاة شيء، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

قال رسول الله ﷺ: "لا يَقطَعُ الصَّلاةَ شَيءٌ، وادْرَؤُوا ما استَطَعتُم؛ فإنَّما هو شَيْطانٌ" (مشكاة باب السترہ)[1] یعنی فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی چیز نماز کو نہیں توڑتی البتہ گزرنے والے کو ہٹا دیا کرو کیوں کہ وہ شیطان ہے۔

اس حدیث نے ساری حدیثوں کو جمع کر دیا اور بتا دیا کہ حقیقت میں قطع صلاۃ نہیں ہوتی بلکہ قطع خشوع مراد ہے۔

اسی (ص:۱۴۱) پر آپ نے یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ:

''اس پر بھی توجہ کرو کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ولادت ہجرت کے تین سال قبل ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے وقت وہ تیرہ سال کے تھے، خود تو پچیس حدیثیں سنیں لیکن ایک ہزار چھ سو ساٹھ (۱۶۶۰) حدیثیں روایت کیں۔

عبداللہ بن عمر نبوت کے تین سال بعد پیدا ہوئے اور آپ کے وصال کے وقت بیس سال کے تھے لیکن ایک ہزار چھ سو بیس (۱۶۲۰) حدیثیں روایت کیں۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نبوت کے پانچ سال کے بعد پیدا ہوئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے وقت (۱۸) سال کی تھیں، لیکن دو ہزار دو سو دس (۲۲۱۰) حدیثیں روایت کیں''۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ۷ ہجری میں اسلام لائے اس وقت ان کی عمر چھبیس سال کی تھی

---

[1] ۱/ ۲۴۴، الفصل الثانی، حدیث: ۷۸۵۔ سنن ابوداؤد: كتاب الصلاة، باب من قال: لايقطع الصلاة شيء، حدیث: ۷۱۹، الخلافیات از بیہقی: (۱/ ۴۲۷)، حدیث: ۷۷۴۔

کل تین سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت سے فیضیاب رہے اور پانچ ہزار تین سو چھیتر (۵۳۷۶) حدیثیں روایت کیں۔

جواب:

اس اعتراض کو پڑھ کر ہم اسے سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس کو ابطال حجیت حدیث سے کیا تعلق، اگر مطلب سعدی دیگر است کے ماتحت یہ مراد ہے کہ ان اصحاب کی حدیثیں غلط ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ابن عباس کی اپنی مسموعہ (عن الرسول) حدیثیں بیشک تھوڑی ہوں گی، مگر دیگر اصحاب سے سنی ہوئی روایات کو یاد کر لینا کیا محال ہے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ابن عباس شوق علمی میں اپنی صاحبزادگی کے گھمنڈ سے الگ ہو کر بزرگ صحابہ کرام سے علم حاصل کرتے تھے، چنانچہ (تذکرہ) ذہبی میں لکھا ہے:

’’ قالَ مَعْمَرٌ: عامَّةُ عِلْمِ ابْنِ عَبّاسٍ مِن ثَلاثَةٍ: عُمَرَ وعَلِيٍّ وأُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ‘‘ (جلد اول ص:۳۵)[1]۔

یعنی ابن عباس کے علم کا اکثر حصہ ان تین اصحاب (عمر، علی اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم) سے حاصل تھا اور ممدوح کی عمر بھی اکہتر (۷۱) سال ہوئی تھی، اتنی عمر میں اتنی حدیثیں یاد کرنی کیا محل اعتراض ہے، یہی جواب ابن عمر، اور ابو ہریرہ اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کی بابت ہے۔

سوال:

کیا جناب والا جب تیرہ سال کی عمر میں تھے اس وقت آپ کو جتنا علم تھا آج اس سے زیادہ ہے یا نہیں۔

---

① ۱/ ۳۴۔

اسے بھی جانے دیجیے جن دنوں آپ حضرت مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری رحمہ اللہ کے درس میں بمقام پٹنہ بیٹھتے تھے اس زمانہ سے آج آپ کا علم زیادہ ہے یا نہیں؟ صاحب من! طالب علم تو ہر زمانہ لاحق میں زمانہ سابق سے علم میں ترقی کرتا رہتا ہے، فرمان خداوندی ہے: ﴿وَقُل رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا﴾ [طہ: ۱۱۴] اسی کا مصدق ہے۔

جناب حافظ صاحب:

علم مناظرہ میں ایک مسئلہ دعوی اور دلیل میں مطابقت کا بھی ہے جس کو باصطلاح مناظرہ تقریب تام کہتے ہیں، میں دیکھتا ہوں آپ عموماً اس سیدھے راستہ سے کترا کر جاتے ہیں، آپ کا دعویٰ ہے کہ حدیث نبوی حجت شرعیہ نہیں، دلیل آپ کی یہ ہے کہ ابن عباس کو اتنی حدیثیں کیوں یاد تھیں ابو ہریرہ اور عائشہ کو کیوں تھی؟

واللہ میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کی ان دلائل میں تقریب تام کیا تقریب ناقص بھی ہے یا نہیں، ہاں آپ کی کبرسنی کا لحاظ کر کے ایسے بیان کو ذہول کہہ سکتا ہوں۔ عفی اللہ عنک۔

آپ آئندہ کو بلا دغدغہ ایسی دلائل پیش کیا کریں ہم سننے کو تیار ہیں۔

ہاں تامل دم ناوک فگنی خوب نہیں
میری چھاتی ابھی تیروں سے چھنی خوب نہیں

قسط: ۱۶

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۲۸/صفر ۱۳۴۹ھ=۲۵/جولائی ۱۹۳۰ء)

گزشتہ پرچہ میں ہم ذکر کر آئے ہیں کہ مصنف ''شرعۃ الحق'' اصول مناظرہ اور علم کلام کے پابند نہیں، ان کے دعوی اور دلیل میں تقریب نہیں ہوتی، کیوں کہ دعوی ان کا یہ ہے کہ حدیث نبوی حجت شرعیہ نہیں، دلیل دیتے ہیں کہ فلاں بزرگ نے تھوڑی عمر میں بہت سی حدیثیں کیوں کر یاد کرلیں، آج کی صحبت میں ایسا ہی کچھ ارشاد ہے۔

''حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت فاروق اعظم نے اپنے عہد خلافت میں ابن مسعود، ابودرداء، ابومسعود انصاری کو اس جرم میں قید کیا کہ انہوں نے روایت حدیث زیادہ کی:''قال إبراهيم:''أَنَّ عمر حَبَسَ ثلاثة: ابْنَ مَسْعُودٍ، وأبا الدَّرْداءَ، وأبا مَسْعُودَ الأنْصارِيَّ، فَقالَ: قَدْ أَكْثَرْتُمْ الحَدِيثَ عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ''(تذکرۃ الحفاظ)(جلد ا ص:۷)[1] ۔حضرت ابن مسعود زیادہ روایت کرنے والوں میں شمار نہیں ہوئے، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا اتنا روایت کرنا بھی جائز نہیں رکھا۔(شرعۃ الحق،ص:۱۴۲)۔

اہلحدیث:

اس روایت سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہ کہ خلیفہ رضی اللہ عنہ کو اکثار حدیث برا معلوم ہوا، ممکن ہے اس کی وجہ کچھ ہو، لیکن اس سے حجیت حدیث پر شبہ نہیں ہوتا، حافظ صاحب آپ اپنا دعوی ملحوظ رکھئے پھر دلیل لائیے، اسی طرح آپ کا یہ قول بے تعلق ہے:

---

① ۱/ ۱۲۔

''ابن عیینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب کے پاس ایک جماعت بیٹھی دیکھی جن سے وہ حدیث روایت کررہے تھے آپ نے ابی پر درہ فاروقی اٹھایا، ابی نے کہا: دیکھو کیا کرتے ہو خدا تم پر رحم کرے، انہوں نے فرمایا کہ تم نے نہیں جانا کہ روایت کرنی تمہارے لیے فتنہ ہے اور سننے والوں کے لیے ذلت۔''قال ابن عيينه: رَأى عُمَرُ ابن الخطاب مَعَ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ جَماعَةً فَعَلاهُ بِالدِّرَّةِ فَقالَ: إنِّي أعْلَمُ ما تَصْنَعُ يَرْحَمُكَ اللّٰهُ، فَقالَ: أما عَلِمْتَ أنَّها فِتْنَةٌ لِلْمَتْبُوعِ مَذَلَّةٌ لِلتّابِعِ'' (تذکرۃ الحفاظ) (ج۱،ص:۷) (ص:۱۴۲)[1]۔

اہلحدیث:

ہر نکتہ مکانے دارد۔ وہر فعل زمانے دارد

خلیفہ کو حدیث کی حجیت میں کلام نہ تھا کیوں کہ وہ خود حدیث بیان کرتے اور حدیث پر عمل کرتے تھے، خلیفہ کی حدیث دانی اور عمل کے لیے (ازالۃ الخفا) حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ ملاحظہ ہو، بلکہ اس مجلس کی ہیئت کذائی پر خفا ہوئے جس کی وجہ روایت میں مذکور نہیں، آپ ایسی کوئی روایت بیان کریں جس سے حجیت حدیث کا انکار ثابت ہوتا ہو۔

آپ نے حضرت شاہ صاحب کا قول نقل کیا ہے کہ:

''درزمان (خلافت) روایت حدیث بسیار کم بود'' (ص:۱۴۳)۔

اس میں بھی حدیث کی حجیت کا انکار نہیں بلکہ عدم اکثار کا ذکر ہے، احادیث کی روایت کی کمی تو اس لیے تھی کہ اس زمانہ میں جتنے لوگ موجود تھے ان کے اپنے عمل کے لئے ان کو علم تھا، بہت کم امور ایسے تھے جن میں ان کو سوال کرنے کی ضرورت ہوتی تھی، پچھلے زمانہ میں چوں کہ ضرورت داعیہ ہوئی تو قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث کا

---

① ۱/ ۱۲۲۔

درس بھی ہونے لگا، فلیفهم۔

اس سے آگے آپ نے روایت بالمعنی کو سامنے رکھ کر انکار حدیث کرنا چاہا، چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

''امام المحدثین حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں جس کو علامہ ذہبی نے (تذکرہ الحفاظ)[1] میں ان کے تذکرہ میں نقل کیا ہے کہ:'' لَوْ أرَدْنا أنْ نُحَدِّثَكُمْ بِالحَدِيثِ كَما سَمِعْناهُ، ما حَدَّثْناكُمْ بِحَدِيثٍ واحِدٍ''، اگر ہم ایک حدیث اس طرح روایت کرنی چاہیں جس طرح سنا ہے تو روایت نہیں کر سکتے'' (ص:۱۴۳)۔

جواب:

اس سے کیا ثابت ہوا؟ یہ کہ راویان حدیث روایت بالمعنی بھی کیا کرتے تھے بالکل سچ ہے، اصل بات یہ ہے کہ عربی زبان بوجہ اپنی وسعت کے ایسی ہے کہ ایک ہی مضمون الفاظ مختلفہ سے بیان کریں تو بھی مقصود میں فرق نہیں آتا، چنانچہ آپ ہی کے پیش کردہ معتبر گواہ کی زبانی بھی ثابت ہوتا ہے جن کو آپ نے بطور گواہ پیش کیا ہے غور سے سنیے آپ ہی کا قول ہے:۔

''رئیس المحدثین حضرت امام ابن سیرین فرماتے ہیں کہ روایت باللفظ نہیں ہے روایت بالمعنی ہے۔(مصنف عبدالرزاق) میں ہے، عَنِ ابْنِ سِيرِينَ، قالَ: ''كُنْتُ أسْمَعُ الحَدِيثَ مِن عَشَرَةٍ، كُلُّهُمْ مُخْتَلِفٌ فِي اللَّفْظِ والمَعْنى واحِدٌ''[2]۔ابن سیرین فرماتے ہیں کہ

---

① ۱/۱۵۳۔

② مجھے یہ اثر مصنف عبدالرزاق میں تو نہ مل سکا، البتہ عبدالرزاق ہی کی سند سے مختلف علماء حدیث نے اسے نقل کیا ہے، دیکھیں: (الكفاية فى علم الرواية) از خطیب بغدادی: ۱/۲۰۶۔ (جامع بيان العلم و فضله) از ابن عبدالبر: (۱/۳۴۴)، حدیث: ۴۶۴۔ (معرفة السنن والآثار) از بیہقی: (۱/۱۳۴)، رقم: ۱۳۳۔

میں نے ایک ہی حدیث کو دس شیوخ سے سنا، سب مختلف الالفاظ بمعنی واحد تھے'' (ص: ۱۴۳)۔

اہلحدیث:

دیکھیے امام ابن سیرین آپ کی تائید کرتے ہیں یا ہماری؟ وہ فرماتے ہیں کہ دس استادوں سے میں نے مختلف الفاظ میں ایک ہی حدیث سنی مگر معنی ایک ہی تھے، کیا حرج؟

ہاں آپ کا یہ سوال قابل غور ہے:

''جب روایت حدیث باللفظ نہیں بالمعنی ہے تو جب کوئی لفظ کا ذمہ دار نہیں تو معنی کا ذمہ دار کون ہو، ایک جملہ کا مفہوم باعتبار موقعہ ومحل، باعتبار قابلیت تفقہ، باعتبار خیالات وجذبات فطری ہر کوئی اپنا سا سمجھتا ہے، اس لیے سمجھ میں اختلاف ہونا اقتضائے فطرت ہے، آج دنیا میں بداہتا دیکھ لو، باوجود ریل وتار برقی کے، باوجود ذرائع اخبار کے سہل ہونے کے، ایک ہی واقعہ دس حاضرین کی زبانی باختلافات کثیرہ سنا جاتا ہے، اس لیے حدیث میں اختلافات کا ہونا لازمی تھا، جو ہو کر رہا، اس اختلاف نے فرقہ بندی قائم کردی اور اسلام کو پاش پاش کردیا، فراست صدیقی وفاروقی نے اسکو خوب سمجھا تھا'' (ص: ۱۴۴)۔

اہلحدیث:

آپ کے بیان کو سن کر راویان حدیث کی کرامت یا کم سے کم حفاظت اور صیانت کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ وہ ایک ہی واقعہ کو دو چار نہیں، دس بیس بھی بیان کرتے ہیں تو باہم متخالف یا متضاد نہیں ہوتے، بشرطیکہ ثقاہت میں برابر ہوں، اسی لیے امام حاکم نے اعلان کیا تھا کہ کوئی دو صحیح حدیثیں متخالف نہیں ہیں، جس کو ملیں میرے پاس لاؤ، حاکم کی اتباع میں ہم خدام حدیث بھی منکرین حدیث کو چیلنج کرتے ہیں کہ کوئی دو حدیثیں متخالف متضاد لاؤ، ہم سنیں گے اور تطبیق دیں گے۔

رہا آپ کا یہ الزام کہ فرقہ بندی حدیث سے پیدا ہوئی، جناب حدیث سے نہیں

ہوئی بلکہ قرآن سے ہوئی، کیا آپ کو اس سے انکار ہے؟ آج فرقہ منکر حدیث (جن میں آپ بھی ایک ہیں) صرف قرآن کو مانتا ہے، تاہم ان میں کتنا اختلاف ہے؟ اتنا کہ ان میں سے بعض لوگوں کے عقائد کو آپ بھی کفر کہتے ہیں (بوقت ضرورت آپ کی قلمی تحریر شائع ہوگی) اور وہ آپس میں ایک دوسرے کو گمراہ اور کیا نہیں بولتے ہیں، کیوں؟ فہم کا اختلاف، اسی طرح اگر حدیث کے معنی سمجھنے میں فہم کا اختلاف ہو کر باعث اختلاف ہو تو حدیث پر کیا اعتراض؟ حافظ صاحب!

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند [1]

قسط: ۱۷

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۵ ربیع الاول ۱۳۴۹ھ = ۱ اگست ۱۹۳۰ء)

(گذشتہ پرچہ میں (ص: ۱۴۴) تک جواب درج ہو چکا ہے)

(ص: ۱۴۵) پر مصنف نے حضرت عائشہ کی روایت نقل کی ہے کہ:

''حضرت ابوبکر نے پانسو حدیثیں جلا دیں''۔

اس کا جواب شروع ہی میں ہم دے آئے ہیں کہ یہ روایت ہی غلط ہے۔ (ملاحظہ ہو اہلحدیث مؤرخہ ۲۷ شوال ۲۸ مارچ ۳۰ء)۔

---

① ترجمہ: یہ ایسا گناہ ہے کہ جو تمہارے شہر میں زیادہ ہوتا ہے۔

(ص:۱۴۶) پرآپ لکھتے ہیں:

''روایت کرنے والوں کا اصلی منصب یہ ہے کہ وہ بلفظ روایت کرے، اس لیے بالعموم مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ حدیثیں بلفظ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، اور اس بنا پر ان الفاظ سے استخراج و استنباط مسائل میں ان اصولی اصطلاحات کو دخل دیا گیا ہے جو علماء نے الفاظ قرآنی کے لیے مقرر کئے ہیں، مثلاً عام وخاص، مطلق ومقید، مجمل ومفصل، امر واباحہ وغیرہ وغیرہ، اور بعض محدثین کی غایت خوش اعتقادی نے تو اس درجہ ترقی کی کہ ان حدیثوں کے الفاظ کو بھی انکساراً بعد قرآن مجید معجزہ اور بلاغت وفصاحت کی اس حد میں داخل کیا ہے جہاں اور فصحا کی پرواز ممکن نہیں''۔

اہلحدیث:

محدثین روایت باللفظ کو مقدم کہتے ہیں مگر عربی زبان کے ماہر کے لیے بالمعنی روایت بھی جائز سمجھتے ہیں، اسی لیے محدثین کا احتیاطی قاعدہ ہے کہ بعد بیان کرنے روایت کے کہا کرتے ہیں اوکما قال، مجھے تو خیال ہوا تھا کہ آپ بعض محدثین کا یہ فعل بھی پیش کردیں گے کہ وہ مشکل امور میں صحیح بخاری کا ختم پڑھایا کرتے ہیں۔

حافظ صاحب! ان باتوں کا نفس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں ہوتا، نفس مسئلہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے سوا قول نبی شرعی حجت ہے یا نہیں، روایت کا سلسلہ اور بحث اس سے پیچھے ہے۔

(ص:۱۴۶) پرآپ نے ابن سعد کی ایک روایت یوں نقل کی ہے:

(مصنف عبدالرزاق) اور (طبقات ابن سعد) میں ہے: '' أرادَ عُمَرُ أنْ يَكْتُبَ السُّنَنَ، فاسْتَشارَ فِي ذَلِكَ أصْحابَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، فَأشارُوا عَلَيْهِ أنْ يَكْتُبَها، فَطَفِقَ عُمَرُ يَسْتَخِيرُ اللَّهَ فِيها شَهْرًا، ثُمَّ أصْبَحَ يَوْمًا وقَدْ عَزَمَ اللَّهُ لَهُ، فَقالَ: إنِّي كُنْتُ أرَدْتُ أنْ أكْتُبَ السُّنَنَ وإنِّي ذَكَرْتُ قَوْمًا كانُوا قَبْلَكُمْ

كَتَبُوا كُتُبًا فَأَكَبُّوا عَلَيْهَا وتَرَكُوا كِتابَ اللَّهِ تَعالى''[1]۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ارادہ ہوا کہ سنن کو لکھ ڈالیں، اور تمام صحابہ کے مشورہ سے یہ طے بھی ہو گیا، اس پر بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بارہ میں ایک مہینہ کامل استخارہ کیا، پھر ایک روز صبح کو فرمایا کہ میرا ارادہ حدیث جمع کرنے کا مستحکم ہو گیا تھا لیکن پھر اس قوم کا خیال آیا جس نے خود ایک کتاب لکھی اور اس پر اس قدر متوجہ ہوئی کہ خدا کی کتاب کو چھوڑ دیا۔

اہلحدیث:

حافظ صاحب! کن لفظوں سے آپ کی خدمت میں عرض کریں کہ آپ اپنے دعوی کو ملحوظ رکھیں کہ سنت کی عدم حجیت آپ کا دعوی ہے اور یہ روایت آپ کے دعوی کی تردید کرتی ہے، کیوں کہ حضرت عمر اگر سنت کو احکام شرعیہ میں نہ جانتے تو ان کے جمع کرنے کا ارادہ کیوں کرتے، ہاں اس ارادہ کی تکمیل اس لیے نہ کی کہ ان کو سمجھایا گیا کہ لوگ سنن میں مشغول ہو کر کتاب اللہ سے بے پرواہ ہو جائیں گے۔

یہ خیال غلط ہو یا صحیح اس سے حدیث کی حجیت پر اثر نہیں پہنچتا، بلکہ حدیث حجت ثابت ہوتی ہے۔

ابن علاء کی روایت جو آپ نے نقل کی ہے اس میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خفگی اکثار احادیث پر تھی نہ کہ نفس حدیث پر، اکثار حدیث میں غلو تک نوبت پہنچتی ہے یا پہنچنے کا احتمال ہوتا ہے۔

(ص:۱۴۷) پر آپ نے پھر وہی غلط روایت لکھی ہے جس کا جواب پہلے دیا گیا ہے۔

''حضرت صدیق اکبر نے اپنی جمع کردہ حدیثیں جلائیں، حضرت فاروق اعظم نے صحابہ کی جمع کردہ حدیثیں جلوائیں، اور دونوں نے فرمایا حسبنا کتاب اللہ، کتاب اللہ کافی ہے، صرف یہی نہیں

[1] مصنف عبدالرزاق: (۳۰۱/۱۰)، حدیث: ۱۹۱۸۳، طبقات ابن سعد: (۲۸۶/۳)۔

بلکہ فاروق اعظم نے تو حدیثوں کی زیادہ روایت کرنے کو قانونی جرم ہی قرار دیا تھا، ''صحیح بخاری شریف'' اور ''صحیح مسلم شریف'' عہد فاروقی میں تو تصنیف ہو نہیں سکتی تھیں، اگر بعد کو بھی نہ ہوتی تو غضب ہی ہو جاتا، کیوں کہ قرآن مجید کے اجمال کو کھولنے اور اس کی تفسیر کے لیے پھر سے سلسلۂ نبوت جاری کرنا پڑتا یا حضرت جبریل ہی کو تکلیف کرنی ہوتی''۔

اہلحدیث:

یہ آپ کا **استہزاء** ہم خوب سمجھتے ہیں، اس کا جواب آپ ہی کے قول سے دیتے ہیں جو پہلے نقل ہو چکا ہے، غور سے سنیے:

''صلاۃ کے پانچ وقت مقرر ہیں، صبح کی دو رکعتیں، مغرب کی تین اور ظہر وعصر اور عشاء کی چار چار رکعتیں ہیں''۔ (شرعۃ الحق، ص: ۲۳۲)

فرمایئے یہ تعیین رکعات حدیثی حکم مجمل قرآن کی تفصیل ہے یا حکم ہی جدید ہے، مجمل ہے تو آپ کے اس استہزاء کے خلاف ہے، جدید حکم ہے تو آپ کے اصل دعوی کے خلاف۔

نوٹ:

امرتسری اہل قرآن بھی اسی طریق پر عمل کرتے ہیں، مگر ثبوت قرآن سے نہیں دیتے جس پر ان کو کہا جاتا ہے ؎

منکر مے بودن وہم رنگ مستاں زیستن

ہم پہلے بتا آئے ہیں کہ سب سے پہلے جو ضرورت مسلمانوں کو پیش آئی تھی، نصب خلیفہ اور وراثت نبی تھی، ان دونوں ضرورتوں میں ان دونوں حضرات (صدیق و فاروق) نے حدیث ہی سے ثبوت دیا اور فیصلہ کیا تھا، اس لیے وہ اس قول میں حدیث کے منکر نہیں ہیں، بلکہ کتاب اللہ سے مراد ان کی شریعۃ اللہ ہے جو قرآن کی شکل میں ہو یا حدیث کی صورت میں۔

❁ ❁ ❁

قسط: ۱۸

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۱۲؍ربیع الاول ۱۳۴۹ھ = ۸؍اگست ۱۹۳۰ء)

(گذشتہ سے پیوستہ)

(ص:۱۴۸) پر مصنف شرعۃ الحق لکھتے ہیں:

"(صحیح مسلم) باب النہی عن الحدیث ، باب النہی عن الروایت اور باب"أَنَّ الإِسْنَادَ مِنَ الدِّينِ"، میں لکھا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ، عبدالرحمن بن مہدی رضی اللہ عنہ، ایاس بن معاویہ رضی اللہ عنہ نے صرف سن کر بغیر تحقیق کئے ہوئے حدیث بیان کرنے کو منع کیا، ضرور منع کیا ہوگا کیوں کہ خود خدا نے بھی منع کیا ہے: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِۦ عِلْمٌ ۚ إِنَّ ٱلسَّمْعَ وَٱلْبَصَرَ وَٱلْفُؤَادَ كُلُّ أُو۟لَـٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔولًا﴾ [الاسراء:۳۶] جس کا تم کو علم نہیں اس کے پیچھے نہ ہولو کیوں کہ کان آنکھ اور دل سب سے باز پرس ہوگی (بنی اسرائیل:۴۱) جس بات کا یقینی علم نہ ہو نہ بولو، سنی سنائی باتوں پر نہ جایا کرو، تو کیا ایسا نہیں ہوا کہ راوی نے سنا اور عقیدتاً مان کر بے تحقیق کئے ہوئے بے دھڑک روایت کردی، اگر ایسا ہوتا نہ تھا تو بلا تحقیق روایت سے لوگ منع کیوں کئے گئے تھے، اور اگر ایسا ہوتا تھا تو یہ قرآن وحدیث دونوں کے خلاف تھا پھر جہاں تک تحقیق ہوئی اور تحقیق نے جن حدیثوں کا سلسلہ رسول تک نہ پہنچایا اور جن پر ضعیف اور کمزور ہونے کی مہر لگائی، یا جن میں کچھ بھی شبہ کی گنجائش رہی، وہ حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ منسوب کیوں کی گئیں کیا حدیث ہی کے رو سے یہ سخت جرم نہیں ہے، کیوں نہیں ایسی حدیثیں چھانٹ دی گئیں" (ص:۱۴۸)۔

اہلحدیث:

خدا جانے آپ یہ طوالت کس غرض سے دے رہے ہیں، ایک بات بیان کرتے ہیں خود ہی اس کا جواب دے دیتے ہیں، سنیے محدثین بلا سند حدیث بیان کرنی برا جانتے تھے ہاں آپ کے اعتراض کا یہ نچوڑ ہے کہ غلط حدیثیں چھانٹ کیوں نہ دیں، حافظ صاحب! کیا غضب کرتے ہیں کیا آپ نے ذخیرہ حدیث میں موضوعات نہیں دیکھیں! (ص:۱۵۱) پر آپ خود موضوعات ذکر کرتے ہیں، یا ضعاف نہیں پڑھیں، ضرور پڑھی ہوں گی، پس ان کو بغور پڑھیے اور اپنا اعتراض واپس لیجیے۔

(ایضا ۱۴۸) پر آپ نے پھر بے تعلق بات لکھی ہے، آپ فرماتے ہیں:

''نمبر(۱) حضرت عبداللہ بن مسعود نے خلاف عقل حدیثیں بیان کرنے کو منع کیا کہ اس سے فتنے اٹھیں گے،[1] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ روایت حدیث میں مصلحت بینی بھی کرتے تھے، اب ہر کی مصلحت بینی ممکن ہے کہ صحیح ہو یا غلط اور اس وجہ سے ممکن ہے کہ بہیتری حدیثیں نہ بیان کی گئی ہوں جو موجودہ حدیثوں میں سے بہیتری حدیثوں کی ناسخ ہوں، جیسا کہ حضرت امام بخاری نے بہیتری حدیثیں چھانٹ کر موجودہ ذخیرہ جمع کیا ہے، اس سے سوا حضرت عبداللہ بن مسعود کے منع کرنے کو قوم نے نہ مانا، مانتی تو آج خلاف عقل حدیثیں نہ پائی جاتیں کہ تبلیغ میں حارج ہوں''۔

نمبر(۲) باوجودیکہ صحت حدیث کی جانچ کے لیے یہ شرط بھی موجود ہے کہ حدیث خلاف عقل نہ ہو۔

الجواب:

ہم اس کہنے پر مجبور ہیں کہ خدا آپ کا بھلا کرے آپ اپنے سوال کا جواب خود ہی

---

① اس کی تخریج آگے آئے گی ان شاء اللہ۔

دے دیتے ہیں، یا خدائی تصرف آپ ہی سے جواب لکھوا دیتا ہے، غور فرمایئے اس اقتباس میں نمبر اول اعتراض ہے تو نمبر دوم جواب، کیوں کہ آپ خود ہی مانتے ہیں کہ محدثین کے ہاں بھی یہ شرط ہے کہ حدیث خلاف عقل نہ ہو، رہا یہ کہ کسی نے اس پر عمل نہیں کیا نہ سہی، آیئے ہم اور آپ عمل کریں، بس۔

اب سنیے اور معاف فرمایئے، بوجہ شوق انکار حدیث آپ نے ابن مسعود کی روایت پر غور نہیں فرمایا، ابن مسعود کے الفاظ یہ ہیں:

''ما أَنْتَ بِمُحَدِّثٍ قَوْمًا حَدِيثًا لا تَبْلُغُهُ عُقُولُهُمْ، إِلّا كانَ لِبَعْضِهِمْ فِتْنَةً''۔(مقدمہ مسلم)[1]

یعنی ابن مسعود فرماتے ہیں، لوگوں کے سامنے کوئی بات ایسی نہ کہا کرو جوان کی عقل میں نہ آئے ورنہ بعض کے لیے باعث ضلالت ہوگا۔

اس روایت میں حدیث سے مراد حدیث رسول ہی نہیں، بلکہ ہر ایک بات خواہ قرآن میں ہو یا حدیث میں، فلسفہ میں ہو یا معقول میں، یہ ایک اخلاقی تعلیم سونے سے لکھنے کے قابل ہے نہ کہ اعتراض کے لائق۔

(ص:۱۴۹) پر آپ لکھتے ہیں:

''حضرت ابن عباس نے حدیث بیان کرنی اس سبب سے چھوڑ دی کہ لوگ غلط وصحیح سب طرح کی حدیثیں نقل کرنے لگ گئے تھے بلکہ انہوں نے تو حدیث کا سننا بھی ترک کر دیا تھا، یہ تھی روش صحابہ کی اور حضرت ابن عباس جیسے جلیل القدر صحابہ کی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ برگزیدہ اصحاب کی نسبت قرآن مجید کے ساتھ کیا تھی اور حدیث کے ساتھ کیا تھی، اگر وہ حدیث کو داخل فی الدین سمجھتے تو حدیث کا کہنا سننا ترک نہ کرتے بلکہ کہہ سن کر حدیث کی تصحیح کئے ہوتے''۔

---

① صحیح مسلم : باب النهى عن الحديث بكل ما سمع.

الجواب:

آپ تکلیف کرکے ابن عباس کے سارے الفاظ نقل کردیتے تو آپ کو یہ اعتراض پیش کرنے کی جرأت نہ ہوتی، ذرہ توجہ سے عباسی الفاظ سنیے:

''قال ابن عباس: كُنّا نُحَدِّثُ عن رَسولِ اللهِ ﷺ إذْ لَمْ يَكُنْ يُكْذَبُ عليه، فَلَمّا رَكِبَ النّاسُ الصَّعْبَ، والذَّلُولَ، تَرَكْنا الحديثَ عنه''۔(مقدمہ مسلم)(ص:۱۰)[1]

یعنی ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے نام کی حدیث بیان کیا کرتے تھے مگر اب جو لوگ حدیث کے بارہ میں بے پروائی کرنے لگ گئے ہیں تو ہم نے آنحضرت سے حدیث بیان کرنی چھوڑ دی۔

اس روایت کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ ہم نے حدیث رسول بیان کرنی چھوڑ دی، ان معنی پر اعتراض ہوسکتا کہ لوگوں کی بے پروائی سے حدیث رسول کیوں چھوڑ دی، چنانچہ حافظ محب الحق صاحب نے بھی انہی معنی سے اس قول کو پیش کیا ہے، یہ معنی ہمارے نزدیک مرجوح ہیں، دوسرے معنی یہ ہیں کہ لوگوں نے احادیث پاک پر عمل کرنے میں غفلت اختیار کی تو ہم نے حدیث بیان کرنی چھوڑ دی تاکہ حدیث کی بے قدری نہ ہو، بتایئے اس قول سے حجیت حدیث ثابت ہوتی ہے یا انکار حدیث ۔ انصاف

ایضا(ص:۱۴۹) پر لکھتے ہیں:

''حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ کتنی غلط روایتیں منسوب ہوئیں، حضرت مغیرہ کہتے ہیں کہ لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جو روایت کرتے تھے تو جب تک عبداللہ بن مسعود کے ساتھ اس

---

① مقدمہ مسلم:باب النهى عن الحديث بكل ما سمع۔

کی تصدیق نہ کرتے وہ مانی نہ جاتی، یہ ہے عقیدت کی ریشہ دوانی''۔

الجواب:

اس سے بھی اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہی کہ غلط حدیث قابل عمل نہیں، بلکہ صحیح واجب العمل ہے، جو بالکل صحیح ہے۔

قسط: ۱۹

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۱۹/ربیع الاول ۱۳۴۹ھ = ۱۵/اگست ۱۹۳۰ء)

(گذشتہ سے پیوستہ)

(ص: ۱۴۹) پر مصنف ''شرعۃ الحق'' لکھتے ہیں:

''شہاب بن خراش اور حجاج دونوں ثقہ مانے جاتے ہیں، مگر حجاج نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو روایت کی ہے اس کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ حجاج سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک اتنے بڑے بڑے جنگل ہیں کہ ان کو طے کرنے کے لیے اونٹوں کی گردنیں تھک جائیں، اس پر بھی یہ تو ثقہ مانے جائیں اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جو روایت بیان کی جائے اس کی تصدیق کے لیے عبداللہ بن مسعود کے ساتھی ڈھونڈے جائیں''۔

الجواب:

انکار حدیث کے کٹھن کام کو اپنے ذمہ لے کر جس تکلیف میں آپ مبتلا ہوئے ہیں

آپ نے اس سے رہائی پانے کی جو جو محنت کی ہے وہ قابل داد ہے۔

گواس محنت میں آپ کامیاب نہیں ہوئے، تاہم آپ کی محنت قابل داد ہے۔

حافظ صاحب! غور کیجیے آپ ثقہ ہوں، مگر آپ سے روایت کنندہ ضعیف ہوں، تو آپ کی ثقاہت ان کو کیا فائدہ دے سکتی ہے، اس طرح تو سارا سلسلہ روایات صحیح ہو جائے گا کیوں کہ ساری اسناد کا انتہاء صحابہ کرام تک پہنچتا ہے، جناب من! ثقہ سے راوی (شاگرد) کا ثقہ ہونا ضروری نہیں، حضرت علی کی روایات کی تائید کی ضرورت حضرت ممدوح کی وجہ سے نہ تھی بلکہ نیچے کے راویوں کی وجہ سے، آپ ناحق اس کو دوسری طرف لے گئے۔

ہاں آپ کا ایک کمال ہم اور بتاتے ہیں جسے دیکھ کر ہر ایک دانا سمجھ جائے گا کہ آپ اپنے دعوی کی حدود میں نہیں رہتے، بلکہ دریائے گنگا کی طرح ادھر ادھر بہت گھومتے ہیں، غور سے سنیے، آپ لکھتے ہیں:۔

''عن أبي هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: "كَفَى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ." ''[1]، کافی ہے آدمی کے جھوٹے ہونے کے لیے کہ جو سنے وہ بیان کردے''۔

یہ حدیث (صحیح مسلم) کی بالکل صحیح ہے چاہے سلسلہ روایت کچھ ہی ہو، اس لیے کہ اس حدیث کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ بات کو جب تک تحقیق نہ کرلیا کرو بیان نہ کیا کرو، بے تحقیق بیان کرنے سے کبھی سچے ہونے پر بھی جھوٹے سمجھے جاؤ گے، یہ حقیقت میں آپ نے اس آیت قرآنی کو سمجھایا ہے: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِۦ عِلْمٌ ۚ إِنَّ ٱلسَّمْعَ وَٱلْبَصَرَ وَٱلْفُؤَادَ كُلُّ أُو۟لَـٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔولًا﴾ [الاسراء:

[1] صحیح مسلم: مقدمه، باب النهی عن الحدیث بکل ما سمع۔

۳۶]الخ۔

جو آیت اوپر بیان ہوئی ہے یعنی (جس بات کا تم کو علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ ہولو)۔(بنی اسرائیل:۳۶) بے تحقیق بات زبان سے نہ نکالو، یہی اقتضاء عقل بھی ہے کیوں کہ بات اگر جھوٹی ہوئی تو تم سے سننے والے تم ہی کو جھوٹا سمجھیں گے۔(ص:۱۴۹،۱۵۰)

الجواب:

فرمایئے اس عبارت کو آپ کے دعویٰ انکار حدیث سے کیا تعلق، سنیے جس طرح آپ نے اس بیان میں کمال صفائی سے اس حدیث کو صحیح مانا ہے اسی طرح ہم بھی بالکل راستی سے کہتے ہیں کہ آپ نے بحیثیت مدعی اپنا وقت ضائع کیا کیوں کہ انکار حدیث کے دعوی سے اس کو کوئی تعلق نہیں، ہاں اس سے جو ثابت ہے وہ ہمیں مسلم ہے کہ ہر ایک سنی سنائی بات کو آگے بیان نہیں کر دینا چاہیے بلکہ تحقیق کرنا چاہیے، بالکل سچ ہے۔ صدق اللہ ورسولہ۔

(ص:۱۵۲) پر تو آپ نے کمال ہی کر دکھایا جس کو ہم اپنے الفاظ میں نہیں کہہ سکتے بلکہ اہل علم کے سامنے رکھ دیتے ہیں آپ کی عبارت کو پر لطف بنانے کے لیے ہم نے اس پر ہندسے لگا دیئے ہیں، آپ لکھتے ہیں:

''ا۔(مسلم)،(ترمذی)،اور(نسائی) نے ابوسعید الخدری سے مرفوعا روایت کی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے:''لا تَكْتُبُوا عَنِّي شَيْئًا سِوى القُرْآنِ فَمَن كَتَبَ عَنِّي شَيْئًا سِوى القُرْآنِ فَلْيَمْحُهُ، وحَدِّثُوا عَنْ بَنِي إسْرائِيلَ ولا حَرَجَ، وحَدِّثُوا عَنِّي ولا تَكْذِبُوا عَلَيَّ، فَمَن كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النّارِ''[1]،

① یہ روایت اس لفظ کے ساتھ نہ تو مسلم میں ہے، نہ ترمذی میں اور نہ ہی نسائی میں، یہ روایت صرف (مسند البزار): (۱۵/۲۷۷)، حدیث: ۸۷۶۳، میں ہے، اور امام ابن بزار نے اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد اس حدیث...

قرآن مجید کے سوا میرا کہا ہوا کچھ نہ لکھو، جس کسی نے کچھ لکھا ہو تو وہ مٹادے اور محو کردے''۔

۲۔ ہاں بنی اسرائیل سے حدیث بیان کرو کچھ مضائقہ نہیں، اور ہم سے بھی حدیث بیان کرو مگر جھوٹ نہ ہو، جو میری حدیث قصداً جھوٹ بیان کرے گا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔

۳۔ بنی اسرائیل سے حدیث بیان کرنے کا جواز یہ ثابت کرتا ہے کہ خود آپ نے حدیث کو دین میں داخل نہ فرمایا۔

۴۔ دوسرے اس حدیث سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے قرآن مجید کے سوا حدیث کی کتاب کو منع فرمایا تھا، ہاں زبانی روایت اور تذکروں کی بشرط صحت اجازت تھی۔

اس حدیث کی صحت میں سنداً کلام نہیں، کیوں کہ یہ مرفوع ہے اور نہ جانچنے کی ضرورت، کیوں کہ یہ بالکل قرآن مجید کے مطابق ہے۔

ناظرین!

اس عبارت پر غور کرنے سے پہلے حافظ محب الحق صاحب مصنف ''شرعۃ الحق'' کا دعوی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ جو یہ ہے کہ حدیث نبوی دلیل شرعی نہیں، اس کے بعد پہلا

... کو ضعیف قرار دیا ہے اس کے راوی عبدالرحمن بن زید کے ضعف کی وجہ سے، فرماتے ہیں: ''وهذا الحديث رواه همام عن زيد بن أسلم عن عطاء بن يسار، عن أبي سعيد ، عن النبي ﷺ، وعبدالرحمن بن زيد قد أجمع أهل العلم بالنقل على تضعيف أخباره التى رواها، وإنما ذكرنا حديثه لنبين أنه خالف هماما وأنه ليس بحجة فيما يتفرد به''۔

اس سلسلہ کی صحیح روایت جو ((صحیح مسلم)) وغیرہ میں ہے، اس میں: وحدثوا عن بنی اسرائیل '' کے بجائے ''وحدثوا عنی '' ہے، اور اس لفظ کے ساتھ مطلع بالکل صاف ہو جاتا ہے۔

فقرہ ملاحظہ ہو: حدیث مت لکھو، دوسرا فقرہ: سچی حدیث بے شک بیان کرو، اس سے حدیث بیان کرنے کی اجازت ہوئی چاہے زبانی سہی جو آپ کے دعوی کے خلاف ہے، تیسرا فقرہ: ان دونوں فقروں سے عجیب ہے، فرماتے ہیں:

''بنی اسرائیل سے حدیث بیان کرنے کا جواز یہ ثابت کرتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے خود اپنی حدیث کو دین میں داخل نہ فرمایا''۔

آپ کے اس فقرہ سے ہم نے یہ سمجھا کہ آپ اسرائیلی حدیث کو داخل دین سمجھتے ہیں، کیوں کہ اس کے بیان کرنے کی حضور نے اجازت دی ہے۔ اچھا یاد رکھئے اور اپنا چوتھا فقرہ سنیے:

''اس حدیث سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے قرآن مجید کے سوا حدیث کی کتابت کو منع فرمایا تھا ہاں زبانی روایت اور تذکروں کی بشرط صحت اجازت تھی''۔

حافظ صاحب!

آپ اپنا یہ قول غور فرمائیں گے تو مسئلہ متنازعہ کا اپنے ہاتھوں فیصلہ پائیں گے، کیوں کہ حدیث نبوی کو زبانی بیان کرنے کی اجازت بتا رہی ہے کہ حدیث نبوی داخل دین ہے، جیسا کہ آپ کے فقرہ ۳ کا مضمون ہے، کیا ہم اس موقع پر یہ شعر آپ کی نذر کریں ؎

شکر للہ کہ میان من و تو صلح فتاد
حوریاں رقص کناں سجدہ شکرانہ زوند

نوٹ!

گذشتہ نمبروں میں ہم بتا چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث لکھنے کی اجازت فرمادی تھی، (صحیح بخاری) میں حدیثیں لکھنے کا ایک مستقل باب ہے، اسی صفحہ پر سابق

سے عجیب تر لکھتے ہیں، آپ کے الفاظ یہ ہیں:

''اس حدیث کی صحت میں کلام نہیں کیوں کہ یہ مرفوع ہے'' (ص:۱۵۲)۔

حضرات علماء حدیث:

اس فقرہ میں صحت حدیث کی دلیل ملاحظہ کیجیے: ''کیوں کہ مرفوع ہے''، ثابت ہوا کہ حدیث مرفوع کا ہونا مستلزم صحت ہے، کیا خوب واقعی اصول حدیث میں ایک قابل قدر جدت ہے، پس آئندہ کو یہ کلیہ اصول حدیث میں درج کر دینا چاہیے، ''کل مرفوع صحیح''، غالبا یہ بات وہی کہے گا جو محدثین کی اصطلاح متعلق مرفوع نہ جانتا ہو۔ سچ ہے: ''من جهل شيئا عاداه''۔

اسی (صفحہ ۱۵۲):

پر اس سے بھی عجیب ترین فرمایا ہے، جو حافظ صاحب کے اندر انکار حدیث کے جذبہ کا نہیں بلکہ شغف کا ثبوت دے رہا ہے۔ فرماتے ہیں:

۱۔ ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡكُم مَّوۡعِظَةٞ مِّن رَّبِّكُمۡ وَشِفَآءٞ لِّمَا فِي ٱلصُّدُورِ وَهُدٗى وَرَحۡمَةٞ لِّلۡمُؤۡمِنِينَ ٥٧ قُلۡ بِفَضۡلِ ٱللَّهِ وَبِرَحۡمَتِهِۦ فَبِذَٰلِكَ فَلۡيَفۡرَحُواْ هُوَ خَيۡرٞ مِّمَّا يَجۡمَعُونَ﴾ [یونس:۵۷-۵۸] ''کہہ دو اے رسول، لوگو! تمہارے پاس خدا کی طرف سے موعظت و نصیحت یعنی قرآن مجید آ چکا ہے جو دل کی بیماریوں کے لیے شفاء اور مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے، کہہ دو کہ خدا کے فضل و رحمت یعنی قرآن ہی پر چاہئے کہ لوگ خوشیاں منائیں یہ اس سے بہتر ہے جو لوگ جمع کرتے ہیں''۔

۲۔ یہ کہنا کہ لوگ جو مال وخزانہ جمع کرتے ہیں اس سے قرآن بہتر ہے، یہ صحیح نہیں کیونکہ بہتر ہونا ہم جنس ہوتا ہے نہ غیر جنس میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ حدیث وغیرہ جمع کرنے لگ گئے تھے اسی کو خدا نے اس آیت میں منع فرمایا اور اسی کو اوپر کی حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

۳۔ کیوں کہ آپ کا فرمانا عین قرآن ہوا کرتا تھا۔

ناظرین کرام:

منکر حدیث کے قلم سے یہ فقرہ نکلنا کہ آپ کا فرمانا عین قرآن ہوا کرتا تھا۔
بے شک تصرف الٰہی سے ہے خیر حافظ صاحب کا شغف ملاحظہ ہو کہ خیر کا مفضل علیہ حدیث بتاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے دعویٰ کے اثبات میں کامیاب ہو گئے حالاں کہ آپ نے وہ کہا جو آپ کے مجیب کو کہنا چاہیے تھا کیوں کہ آپ کا یہ فقرہ۔

''بہتر ہونا ہم جنس میں ہوتا ہے، نہ غیر جنس میں''۔

ثابت کرتا ہے کہ حدیث قرآن کی ہم جنس ہے پس اگر یہ ہم جنسیت حجت شرعیہ ہونے میں نہیں تو کاہے میں ہے، ثابت ہوا کہ حدیث نبوی بھی حجت شرعیہ ہونے میں قرآن کی طرح ہم جنس (مثیل) ہے۔

جواب دوم:

نہ سہی، تاہم مفضل اور مفضل علیہ اصل وصف میں تو شریک ہوتے ہیں، تو بھی حدیث نبوی حجت شرعیہ ہونے میں قرآن کی سہیم ہوئی۔ لہ الحمد

قسط:۲۰

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۲۶ ربیع الاول ۱۳۴۹ھ = ۲۲ اگست ۱۹۳۰ء)

گذشتہ نمبر میں ''شرعۃ الحق'' کے (ص:۱۵۲) تک جواب درج ہوا ہے، مگر (ص:۱۵۰) کا ایک فقرہ جواب طلب رہ گیا، آج اس کا ذکر مع جواب کیا جاتا ہے۔

(ص:۱۵۰) پر آپ لکھتے ہیں:

''محمد بن یحیی بن سعید قطان نے اپنے باپ سے سنا وہ کہتے تھے کہ ہم نے صلحا یعنی نیک آدمیوں کو اتنا جھوٹا کسی چیز میں نہیں دیکھا جتنا جھوٹا حدیث کی روایت کرنے میں، امام مسلم نے اس کی تاویل کی ہے کہ جھوٹ ان کی زبان سے نکل جاتا ہے وہ قصداً جھوٹ نہیں بولتے، مانا کہ ان کی زبان سے جھوٹ نکل تو آتا ہے، ایسی صورت میں قطعیت پیدا کرنے کے لیے روایت کی منزلت ہی کیا رہی، اس پر خدشات تو دین کا ستون ہی ہلا دیتے ہیں، جس دین کا ستون روایت ہو، کیوں کہ امام مسلم اور حضرت امام بخاری رحمہ اللہ علیہم کیا صلحاء میں سے نہ تھے، اور کیا انہوں نے حدیثیں صلحاء سے روایت نہیں کیں، اور کیا صحت حدیث کے لیے صلحا کی قید نہیں رکھی گئی ہے جن کو امام مسلم مانتے ہیں کہ جھوٹ ان کی زبان سے بے ساختہ نکل آتا ہے''۔

اہلحدیث:

حقیقت یہ ہے کہ جب آدمی کسی بات کو رد کرنے پر تل جائے تو پھر جو بھی وہ سنے اس کو رد ہی سمجھتا ہے، محمد بن یحیی کا یہ قول (مقدمہ صحیح مسلم) میں ہے مگر اس کے معنی یہ ہیں کہ:

''جھوٹی حدیثیں بنانے اور بیان کرنے والے تقدس نما ہوتے ہیں''۔ جیسے آج بھی

بزبان حالی مرحوم کہا جاتا ہے ؎

بڑھے جس سے نفرت وہ تحریر کرنی — جگر جس سے شق ہو وہ تقریر کرنی

گناہ گار بندوں کی تحقیر کرنی — مسلمان بھائی کی تکفیر کرنی

یہ ہے عالموں کا ہمارے طریقہ — یہ ہے ہادیوں کا ہمارے سلیقہ

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ علم اور علماء برے ہیں؟ نہیں، بلکہ وہ لوگ برے ہیں جو علماء کے لباس میں ایسا کرتے ہیں، اسی طرح محمد بن یحیی کہتے ہیں کہ آج کل کے تقدس نما حدیث بنانے میں جتنا جھوٹ بولتے ہیں اتنا کسی کام میں نہیں، یہ مطلب نہیں کہ حقیقی صلحاء ایسے ہیں بلکہ صلاحیت نما ایسے ہیں۔

باوجود: اس کے ہم پوچھتے ہیں کہ اس روایت کو حجیت حدیث سے کیا تعلق؟ یہ تو راویان حدیث پر اعتراض ہے نہ کہ حدیث پر۔

(ص: ۱۵۴) پر آپ لکھتے ہیں:

''ا۔ (ترمذی)[1]، (نسائی)[2]، (ابن ماجہ)[3] اور (دارقطنی)[4] نے انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے انہوں نے کہا کہ ہم کو زیادہ حدیث بیان کرنے سے یہ بات روکتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''مَن تَعَمَّدَ عَلَيَّ كَذِبًا، فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النّارِ''[5]، جو کوئی قصداً ہماری

① سنن ترمذی: ابواب العلم، باب ماجاء فی تعظیم الکذب علی رسول اللہ ﷺ، حدیث: ۲۶۶۱۔

② سنن ابن ماجہ: مقدمہ، باب التغلیظ فی تعمد الکذب علی رسول اللہ ﷺ، حدیث: ۳۲۔

③ الکبری: (۵/ ۳۹۴)، حدیث: ۵۸۸۲۔ ④ علل الدارقطنی: ۴/ ۴۱۹۔

⑤ مرقومہ حوالہ جات حافظ محب الحق صاحب کی حدیثی صلاحیت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں، کیوں کہ صحیحین کی حدیث کو ڈھونڈ کر لائے ہیں ترمذی، ابن ماجہ، اور دارقطنی کے حوالہ سے، دیکھیں: (صحیح بخاری): کتاب العلم، باب اثم من کذب علی النبی ﷺ، حدیث: ۱۰۸، (صحیح مسلم): المقدمہ، باب تغلیظ الکذب علی رسول اللہ ﷺ، حدیث: ۲۔

طرف جھوٹ منسوب کر کے روایت کرے وہ جہنمی ہے، اے لوگو! یہ انداز تھا صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اور یہ روش تھی خلفاء رضوان اللہ علیہم کی جو اوپر بیان ہوئی۔

۲۔ اور یہی طریقہ تھا حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ کا، گرچہ محدثین اپنی نفسیات اور احبار پرستی کے سبب انہیں حدیث میں نابلد شمار کریں۔

۳۔ مگر جو روش ان کی تھی وہ قرآن و حدیث کے مطابق خلفاء راشدین اور صحابہ کبار رضی اللہ عنہم اجمعین کی طرح روش محتاط رکھتی تھی، اسی لیے جتنی حدیثیں ان سے مروی ہیں ان کی تعداد قوم سے مخفی نہیں، وہ بھی اس خدشہ سے محفوظ نہیں کہ جب قوم کو غلط حدیث نبی کی طرف منسوب کرنے میں دیر نہ لگی تو ان بزرگوں کی طرف غلط منسوب کرنے میں کون سی حقانیت مانع ہوئی ہوگی وہ بھی ان سے روایت ہے، ان بزرگوں نے نہ کتابت کی نہ کتابت کو جائز رکھا۔

۴۔ چوں کہ حضرت امام اعظم رحمہ اللہ نے بھی کسی نئی تصنیف سے بدعت کھڑی نہیں کی اس لیے ان پر پتھر پھینکے جاتے ہیں کہ یہ حدیث سے جاہل تھے کیوں کہ انہوں نے دین کے لیے قرآن کو کافی سمجھا اور حدیث کی دوکان نہ لگائی۔''

حافظ صاحب:

اس اقتباس کا نمبر اول تو ہمارے کسی طرح مخالف نہیں بلکہ ہمارا ایمان اور عمل ہے، دوسرے فقرے میں آپ کی نیت قطعاً قائلین حدیث کی دو جماعتوں (اہلحدیث اور حنفیہ) میں لڑائی ڈلوانے کی ہے جو یقیناً ایک برا فعل ہے کیوں کہ یہ کام ایک بری ہستی کی طرف منسوب ہے: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ ٱلشَّيْطَٰنُ أَن يُوقِعَ بَيْنَكُمُ ٱلْعَدَٰوَةَ وَٱلْبَغْضَآءَ﴾ [المائدۃ:۹۱]۔

تعجب:

فقرہ نمبر دوم میں آپ نے جو لکھا ہے اس کا جواب آپ ہی کی تحریر میں موجود ہے،

جو (ص: ۲۲) پر آپ محدثین کرام کے حق میں الفاظ مدحیہ لکھ آئے ہیں، یہاں اس سب سے چشم پوشی کر کے ان نیک نیت اور مقدس ہستیوں کو ''نفسانی'' لکھتے ہیں، اگر یہ نفسانیت نہیں، نسیان تو ضرور ہے۔

نمبر ۳:۔ امام ابوحنیفہ حدیث کے اتنے دلدادہ تھے کہ ان کا قول مشہور ہے، '' إذا صَحَّ الحَدِيثُ فَهُوَ مَذْهَبِي''۔ جب صحیح حدیث ملے وہی میرا مذہب ہے۔

حافظ صاحب:

خدا آپ کو امام ابوحنیفہ کا متبع کرے اور انہی کے ساتھ آپ کا حشر ہو، آمین۔

نمبر ۴:۔ یہ عجیب فقرہ ہے کہ امام اعظم صاحب نے کوئی تصنیف نہیں کی، یہ دعوی مولانا شبلی مرحوم کے قول سے بھی بڑھ کر ہے۔ مرحوم تو فرماتے ہیں:۔ ''امام ابوحنیفہ صاحب کی تصنیف بہت تھیں، مگر جل جانے کی وجہ سے کوئی نہ رہی''، آپ ان کی تصنیفات سے مطلق منکر ہیں، اچھا صاحب جس کی تصنیف نہ ہو اس کا عقیدہ اور مذہب معلوم کرنے کے لیے کیا صورت؟ ہمارے نزدیک دو صورتیں ہیں جن سے کسی غیر مصنف کا مذہب معلوم ہوسکتا ہے۔

۱۔ شاگردوں کی زبانی روایتیں۔

۲۔ احکام شرعیہ میں فتوی۔

امام ابوحنیفہ صاحب کا مذہب متعلق حدیث معلوم کرنے کے لیے یہ دونوں طریق موجود ہیں کہ وہ حدیث کو حجت شرعیہ جانتے تھے، کتب مصنفہ امام محمد وغیر ملاحظہ ہوں۔

یہ الاہنا بھی خوب ہے کہ ''حدیث سے قرآن کو منسوخ کرو''۔

اے جناب:

جو ایسا کریں ان کا ذاتی فعل ہے جس کے وہ ذمہ دار ہیں، اس سے حدیث کی حجیت

پر اعتراض کیا اور آپ کے دعوی کو مفید کیا؟ پس آئندہ ذرہ سوچ کر کہا کریں کیوں کہ جانچنے والے دنیا میں ہیں ؎

سنبھل کے رکھیو قدم دشت خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

❁ ❁ ❁

قسط: ۲۱

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۴/ربیع الثانی ۱۳۴۹ھ=۲۹/اگست ۱۹۳۰ء)

گذشتہ پرچہ میں ''شرعۃ الحق'' کے (ص: ۱۵۴) تک جواب دیا گیا، آج (ص: ۱۵۶) کا ذکر ہوتا ہے۔

مصنف ''شرعۃ الحق'' لکھتے ہیں:

''حدیث کی نسبت ارشاد خداوندی اشارۃ النص سے اور ارشاد نبوی صریحاً کیا گیا تھا، اور اس کے ساتھ خلفاء اور جلیل القدر صحابہ کا کیا سلوک رہا محض اختصار اور بہت کچھ فروگذاشت کے ساتھ میں نے بیان کردیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن ہی پر خوشی منانی اور قرآن ہی کو اپنے اوپر لازم کرلینا خدا اور رسول کی مرضی بھی تھی، اور خدا اور رسول کا محکوم علیہ بھی تھا، آپ کی حدیثیں بشرط صحت زبانی بیان کرنی ممنوع نہ تھی مگر کتابت اور کثرت روایت ممنوع تھی، چوں کہ قرآن کامل تھا، مفصل تھا، محتاج تفصیل وتفسیر نہ تھا، دین کی تکمیل ڈیڑھ دوصدی تک ملتوی نہ رہی اور انسانی سعی پر اٹھا نہ رکھی گئی،

رسالت اور تبلیغ رسالت رسول پر ختم ہوئی، نہ مصنفین صحاح پر'' (ص:۱۵۶)۔

اہلحدیث:

علماء اصول کی اصطلاح میں جو معنی اشارۃ النص کے ہیں وہ تو ہیں کہ '' کلام کا لفظی ترجمہ'' اگر سباق کلام بھی ملا دیا جائے تو نص یا صراحۃ النص ہوگی، اس تعریف کے مطابق ہم نے قرآن مجید میں کوئی آیت نہیں پائی جس میں حدیث نبوی کو حجت شرعیہ سے گرایا ہو، ہاں اشارۃ النص سے آپ کی مراد کچھ اور ہو تو بتانا چاہیے تھا، ہم بھی جگہ بجگہ بتا آئے ہیں کہ قرآن مجید حدیث نبوی کے اتباع کا حکم دیتا ہے، یاد نہ رہا ہو تو سنیے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥٓ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ ٱلْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾ [الاحزاب:۳۶]۔ (مفصل اہلحدیث، مؤرخہ ۲۵/اپریل ۱۹۳۰ء میں ملاحظہ ہو)۔

اسی طرح خلفاء کا برتاؤ بھی ہم بتا آئے ہیں کہ سب سے پہلے جو اہم معاملہ ان کو پیش آیا وہ مسئلہ خلافت اور مسئلہ وراثت نبی تھا، ان میں حدیث نبوی ہی سے فیصلہ ہوا بلکہ نبی علیہ السلام کے دفن کا فیصلہ بھی حدیث نبوی ہی سے ہوا۔

حافظ صاحب! آپ کو خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ گاہے گاہے امر حق بھی آپ سے لکھوا دیتا ہے، دیکھیے آپ کیا صاف لکھ گئے ہیں جس کی شاید آپ کو خبر نہ ہوگی، آپ کا قول ہے:

۱۔'' آپ (حضرت) کی حدیثیں بشرط صحت زبانی بیان کرنی ممنوع نہ تھیں۔

۲۔مگر کتابت اور کثرت روایت ممنوع تھی''۔

پہلے فقرے میں آپ کو تسلیم ہے کہ زمانہ رسالت وخلافت میں حدیث نبوی بیان ہوتی تھی، بہت خوب۔

ہاں دوسرے فقرے کا جواب ہم پہلے کئی مرتبہ دے آئے ہیں کہ کتابت سے بندش

اٹھائی گئی تھی (صحیح بخاری) باب کتاب العلم ملاحظہ ہو، اسی لیے صحابہ کرام کے پاس احادیث نبویہ مکتوبہ موجود تھیں۔

مصنفین صحاح کی بابت بھی بارہا بتایا گیا کہ انہوں نے سابقہ راویوں سے احادیث متفرقہ حاصل کر کے جمع کردی ہیں، احادیث بنائی نہیں۔ (ملاحظہ ہو اہل حدیث، یکم محرم الحرام ۴۹ھ، ۳۰ مئی ۳۰ء)

آگے چلیے!

آپ لکھتے ہیں:

”عربی زبان کا ماہر قرآن مجید کے رہتے ہوئے دین الٰہی کے لیے ساری کتابوں سے بے نیاز ہوگا، ہاں جو اس زبان کا ماہر نہیں وہ صرف ونحو، لغات، مصطلحات یعنی ادب کا ضرور محتاج ہوگا، پھر جن بزرگوں نے اس احتیاج کو رفع کیا ان کا وہ ضرور شکر گزار ہوگا، ہم ان کو سب کا ممنون احسان ہونا چاہیے جن کی سعی کی بدولت ہم قرآن مجید سیکھنے سمجھنے کے لائق ہو سکے، اسی طرح ہم کو تاریخ اسلامی یا سوانح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یعنی حدیث لکھنے والوں کا بھی ممنون ہونا چاہیے جن کی پاک نیتوں اور پاک سعی کی بدولت ہم کو تاریخ اسلام سے آگاہی حاصل کرنے کا موقعہ ملا، مسلمانوں کا ابتدائی تمدن اور معاشرت معلوم ہو سکی، اور آنحضرت کے سوانح مقدس سے کسی قدر اطلاع حاصل ہو سکی، مگر ان سب باتوں کے ایک حد تک نفع بخش ہونے کے باوجود یہ ساری کتابیں دین میں داخل نہ ہوجائیں گی، ان کو خبر واخبار ہی کہنا اور سمجھنا ہوگا“ (ص: ۱۵۶۔۱۵۷)۔

اہلحدیث:

اس اقتباس کی جان صرف یہ فقرہ ہے:

”کتب حدیث دین میں داخل نہیں“۔

اس پر مفصل بحث ہو چکی ہے، ملاحظہ ہو، اہل حدیث ۴/ذی قعدہ ۱۳۴۸ھ ۴/

اپریل وغیرہ۔

(ص:۱۵۸) پر آپ نے محدثین کی اصطلاحات لکھی ہیں جو نہ لکھتے تو اچھا ہوتا کیوں کہ بزرگوں کا قول ہے ؎

تا مردے سخن نہ گفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

ناظرین!

طلبۂ علم کی تصریح کے لیے موصوف کی عبارت اصلی الفاظ میں ہم نقل کرتے ہیں، سنیے!

''موقوف اور موقوف کے تینوں سلسلے مسند متصل اور منقطع جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب نہیں وہ کسی طرح بھی رسول کی حدیث نہیں جس کا سلسلہ بھی رسول تک نہ پہنچے تو اس کو رسول کی حدیث کہنا اور اس پر بنیاد دو دین قائم کرنا ظلم ہے''۔

اہلحدیث:

موقوف کی تعریف ہے صحابی کی طرف منسوب قول، مسند کی تعریف ہے نبی کی طرف منسوب ارشاد، متصل کی تعریف ہے جس میں سلسلہ روایت ملا ہو، منقطع کی تعریف ہے جس میں سلسلہ ٹوٹا ہو، ان تعریفات کے لحاظ سے موقوف اور مسند باہمی ضد ہیں، پھر مسند موقوف کی قسم کیوں ہوئی، ہاں متصل اور منقطع موقوف کی قسمیں ہوسکتی ہیں، لیکن موقوف (بہر دو نوع) پر محدثین بنیاد احکام نہیں رکھتے، بلکہ صاف کہتے ہیں: (الموقوف ليس بحجة)۔

قسط: ۲۲

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۱۱ ربیع الثانی ۱۳۴۹ھ = ۵ ستمبر ۱۹۳۰ء)

(ص: ۱۵۸) پر موقوف، مرسل، معلل، مدرج وغیرہ کا ذکر کرکے (ص: ۱۵۹) پر لکھتے ہیں، جو فن حدیث سے ناواقفی پر مبنی ہے، آپ فرماتے ہیں:

''علماء نے ایسی حدیثوں کو بے خوف وخطر حدیث میں داخل کرکے قوم سے منوالیا ہے کہ یہ سب حدیثیں ہیں اور حدیث کا منکر قول رسول کا منکر کافر ہے، اس کفر کے ڈر سے کوئی تحقیق نہیں کرتا اور جو تحقیق کرتا ہے وہ اپنی تحقیق کو ظاہر نہیں کرتا، ایسی حدیثیں خدا کے رسول کی ثابت نہیں ہوتیں، اس لئے وہ حدیث ہی نہیں ہوسکتیں جن میں شک وشبہ کی گنجائش ہو، ان کو رسول کی حدیث نہ کہو بلکہ حدیث کی کتاب سے نکال دو''۔

اہلحدیث:

حافظ صاحب! زیادہ نہیں تو اصول حدیث کی کتاب (نخبۃ الفکر) ہی ملاحظہ کرتے تو آپ علماء پر یہ ناکردہ گناہ نہ لگاتے، کیوں کہ علماء حدیث نے صاف الفاظ میں تصریح کی ہوئی ہے کہ اس قوم کی روایات (یعنی موقوف، مرسل، معلل، مدرج وغیرہ) احادیث رسول ﷺ نہیں، اس لیے آپ کا غصہ دراصل اصطلاحات حدیث سے ناواقفی پر مبنی ہے۔ سچ ہے:

''مَن جَهِلَ شَيْئًا عادَاهُ''۔

اسی صفحہ پر آپ کا یہ ارشاد بھی طلباء حدیث کے لیے موجب خندہ ہوگا، آپ لکھتے

ہیں:

''ہاں مرفوع، مسند، متصل، بس یہی ایک قسم کی حدیث رہ جاتی ہے جو قطعاً حدیث کہی جاسکتی ہے بشرطیکہ راویوں کی جانچ میں بھی صحیح اترے، یعنی وہ بھی صحیح، یا حسن، یا ضعیف، یا غریب ہو اور پھر یہ بھی یا متواتر، یا مشہور ہو''۔

اہلحدیث:

مرفوع، مسند، متصل بے شک حدیث ہے، مگر آپ کی عبارت میں لطف پر لطف ہے، مرفوع کے ساتھ مسند کا لفظ بے ضرورت ہے، اس پر یہ مستزاد کہ صحیح ہونے کی شرط اور صحیح کی تفصیل یہ فرمائی کہ ''وہ صحیح، یا حسن، یا ضعیف، یا غریب ہو''، پھر یہ بھی کہ ''متواتر ہو، یا مشہور''۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ فقرات کسی باخبر کے قلم سے نکلے ہیں یا حافظ محب الحق صاحب کے کسی غیر مخلص دوست نے الحاق کر دیئے ہیں، اس طریق پر صحیح کی تقسیم کرنے کی مثال یہ ہے کہ:

انسان یا آدمی ہے، یا گدھا ہے، یا چیل ہے، ماشاء اللہ کیا اچھی تقسیم ہے، کیا اچھا ہوتا کہ آپ یوں کہتے:

بشرطیکہ ایسی حدیث کے راوی سب ثقہ ہوں۔

یہ تو ایک معقول شرط قابل قبول ہوتی، مگر یہ جو کہا اس سے اصل راز کھل گیا کہ سخن شناس نئی صاحبا[1] خطا اینجاست

(ص: ۱۶۰ سے ۱۶۴) تک ضعیف راویوں کا ذکر کیا ہے، اسی ضمن میں آپ نے

---

[1] حافظ محب الحق صاحب عمر میں مجھ سے بڑے ہیں، یعنی اسی (۸۰) سے متجاوز ہوں گے۔ برائے عزت بزرگی ''دلبرا'' کی جگہ ''صاحبا'' لکھا گیا۔ کیوں کہ عمر میں بڑے کی عزت کرنا حدیث کا حکم ہے۔ (مؤلف)۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ کی مدح سرائی کر کے محدثین کو ان کی آڑ میں کوسا ہے، جس کا جواب مورخہ ۲۶ ربیع الاول ۴۹ھ (۲۲ اگست ۳۰ء) میں دیا گیا۔

اسی ضمن میں آپ نے امام بخاری پر طعن کیا ہے کہ انہوں نے بھی بعض ضعیف اور بعض اہل بدعت راویوں سے حدیث لی ہے، اس قسم کے اعتراضات آپ نے اپنے شہر کے عدو المحدثین مولوی عمر کریم کی کتاب الجرح علی البخاری سے لیے ہیں افسوس ہے کہ آپ نے ایسے اعتراضات کے جوابات کے لیے خود محدثین کی تصنیفات دیکھنے کی تکلیف گوارہ نہیں کی، زیادہ نہیں تو آپ (مقدمہ فتح الباری) از حافظ ابن حجر دیکھ لیتے، مقدمہ مذکورہ میں حافظ ممدوح نے مفصل جوابات دئے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ جو راوی اور محدثین کے نزدیک کسی وجہ سے ضعیف ہیں ان سے امام بخاری حدیث لیے لیتے ہیں کہ امام ممدوح کے نزدیک وہ راوی ثقہ ہوتے ہیں، کیوں کہ جس طرح مجتہد مسائل اجتہادیہ میں کسی دوسرے مجتہد کے اجتہاد کا پابند نہیں ہوتا محدث کامل بھی کسی دوسرے محدث کی رائے کا پابند نہیں ہوتا۔

۲۔ جن راویوں کو امام بخاری نے خود ضعیف کہا ہے پھر ان سے حدیث لی ہے تو اس لیے کہ وہ حدیث اصول میں نہیں بلکہ شواہد میں لی ہے۔

نوٹ!

محدثین کے نزدیک ایک روایت ہوتی ہے دوسری شاہد، اصل حدیث میں تمام رواۃ ثقہ ہونے چاہئیں، اصلی کی تائید میں جو بیان کی جائے وہ اگر کم درجہ بھی ہو تو جائز ہے، امام بخاری کی کوئی اصل روایت کسی ضعیف راوی سے نہیں، بلکہ شواہد میں ہے۔

۳۔ راستی، صداقت ہر مذہب میں برابر پسندیدہ ہیں، سنی ہو یا رافضی، خارجی ہو یا ناصبی ہر ایک اپنے مذہب کی ہدایت کے ماتحت صداقت کا پابند رہنے کا مامور ہے،

اختلاف ان کے فروعات میں ہے اس لیے بیان روایت میں سنی شیعہ سب برابر ہیں، ہاں بطور احتیاط محدثین نے یہ شرط لگادی ہے کہ وہ روایت داعیہ بدعت نہ ہو مثلاً کوئی رافضی تعزیہ کی ترغیب میں روایت بیان کرے تو قابل قبول نہ ہوگی۔

قرآن مجید میں بھی ارشاد ہے:

﴿إِن جَآءَكُمْ فَاسِقُۢ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوٓا۟﴾ [الحجرات:٦]۔

''یعنی بدکار یا بدخیال آدمی تمہیں کوئی بات سنائے تو اس کی تحقیق کرلیا کرو''۔

یہ آیت بعد تحقیق فاسقوں کی بات کو بھی قابل قبول بتاتی ہے، محدثین نے اس پر عمل کیا تو کیا گناہ کیا ہے۔

حافظ صاحب!

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند [1]

❁ ❁ ❁

---

① ترجمہ: یہ ایسا گناہ ہے کہ آپ کے شہر میں زیادہ ہوتا ہے۔

قسط: ۲۳

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۱۸/ربیع الثانی ۱۳۴۹ھ = ۱۲/ستمبر ۱۹۳۰ء)

گذشتہ پرچہ میں (ص: ۱۶۴) تک جواب درج ہو چکا ہے آج بھی (ص: ۱۶۴) سے اقتباس نقل ہے، حافظ صاحب لکھتے ہیں:

''میں صحیح حدیثوں کا منکر نہیں، اوراس کے منکر کو مستوجب سزا سمجھتا ہوں، لیکن موضوعی اور غلط حدیثوں کا میں حامی بھی نہیں اوراس کے حامی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اتہام رکھنے والا سمجھتا ہوں''۔

اہلحدیث:

علماء حدیث بھی یہی کہتے ہیں، جزاک اللہ، بارک اللہ، فنعم الوفاق

آگے چلیے:

''اگلے بزرگوں نے جائز یا ناجائز حدیث کے متعلق جو کوششیں کیں ان کا مطلب کیا تھا، صحیح حدیثوں کا غلط حدیثوں سے چننا، اسی غرض سے انہوں نے شرائط مقرر کیئے، میں ان بزرگوں کی عظمت کرتا ہوں، لیکن ان کو رسول مورد وحی نہیں مانتا، نہ ان کے شرائط کو 'مایوحی'' اور'' ماانزل اللہ'' مانتا ہوں، اس لیے حقیقت میں میرا اختلاف ان شرائط سے ہے جن شرائط پر حدیثیں پرکھی گئی ہیں، جس کو میں بیان کروں گا، کیوں کہ ان شرائط میں کوئی قطعیت نہیں'' (ص: ۱۶۵)۔

اہلحدیث:

بہت اچھا آپ اصل مسئلہ میں ہم سے متفق ہو گئے، باقی رہی شرائط پر گفتگو وہ ہم سننے کو تیار ہیں، آگے چلیے:

''ا۔اگر حدیثیں اس طرح پر جانچی جائیں جس طرح پر وہ جانچی گئی ہیں تو میں نے ابھی اوپر کے نمبر میں دکھایا ہے کہ صرف ایک ہی قسم کی حدیث یعنی مرفوع، مسند، متصل جو راویوں کی جانچ پر بھی صحیح اترے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کہی جاسکتی ہے۔

۲۔اگر اس میں بھی تواتر کی قید لگاؤ تو سوائے قرآن مجید کے اور کیا رہے گا، یا چار پانچ حدیثیں، کیوں کہ متواتر حدیثیں یا تو ہیں نہیں یا تین اور پانچ سے متجاوز نہیں، تو رہ گئی مشہور کی قید، اس طرح پر تو حدیث کا ذخیرہ ہی غائب ہوجاتا ہے۔

۳۔اس پر بھی حدیثیں افادہ ظن ہی کرتی ہیں اور ظنیات سے نہیں نکلتیں، اور خدا نے فرمایا: ﴿إِنَّ ٱلظَّنَّ لَا يُغْنِى مِنَ ٱلْحَقِّ شَيْـًٔا﴾ [یونس:۳۶] ''ظن وگمان حق سے کچھ بھی بے نیاز نہیں کرتا''۔

اس لیے حدیثوں کو اس طرح جانچو جس میں قطعیت پیدا ہو'' (ص:۱۶۵)۔

اہلحدیث:

سچ تو یہ ہے کہ آپ کے اس اقتباس کو ہم نہیں سمجھے کہ آپ کیا کہتے ہیں اور محدثین کے کس اصول پر اعتراض کرتے ہیں۔

نمبر اول میں جو آپ نے کہا ہے وہ ٹھیک ہے یہی علماء حدیث کا مذہب ہے کہ مرفوع، متصل جس کے راوی سب معتبر ہوں صحیح ہے۔

نمبر دوم میں جو لکھا ہے اس کی ضرورت نہ تھی، کیوں کہ تواتر اور شہرت کی قید صحیح حدیث کے لیے نہیں، بلکہ وہ الگ قسم صحیح کی قسیم ہے، کیوں کہ صحیح میں رواۃ سے بحث ہوتی ہے تو متواتر اور مشہور میں رواۃ سے بحث نہیں ہوتی بلکہ محض کثرت پر مدار ہے۔

ہاں نمبر ۳ میں جو فرمایا ہے قابل غور ہے، آپ کا ارشاد (اس پر بھی حدیثیں ظنی رہتی ہیں جو مفید نہیں وغیرہ) دو طرح سے مخدوش ہے۔

اول: اس لیے کہ ''اس پر'' کا اشارہ اگر متواتر اور مشہور کی طرف ہے تو غلط ہے، کیوں کہ یہ دونوں قسمیں مفید یقین ہیں، ورنہ بتائیے پیرس اور ماسکو وغیرہ شہروں کا علم یقینی ہے یا ظنی اور یہ علم تواتر اور شہرت سے ہے، یا آیات قرآنیہ سے؟ (انصاف)

دوم: ظن کو غیر مفید کہنا خود قرآن مجید کے خلاف ہے، غور فرمائیے:۔

﴿إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ﴿٤٥﴾ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُوا رَبِّهِمْ﴾ [البقرۃ: ۴۵-۴۶]، یعنی اللہ کے خاشعین بندے وہ ہیں جو خدا کی ملاقات کا ظن رکھتے ہیں۔

فرمائیے ظن مفید ہے یا نہیں، اصل یہ ہے کہ آپ نے قرآنی اصطلاحات پر غور نہیں فرمایا، پس ہماری معروض سنیے:

قرآن مجید دو گواہوں کی شہادت کافی قرار دیتا ہے: ﴿وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنكُمْ﴾ [الطلاق: ۲]، پس ان گواہوں کی گواہی پر فیصلہ کرنا بھی جائز ہوگا، حالاں کہ دو آدمیوں کی شہادت زیادہ سے زیادہ ظن تک ہی پہنچاتی ہے اس سے زیادہ نہیں۔ فرمائیے ظن مفید ہوا یا نہیں۔

ہاں جو آیت آپ نے پیش کی ہے اس میں ظن کے معنی (راجح خیال) نہیں بلکہ خیال باطل مراد ہے، اسی لیے وہ حق کے مقابلے آیا ہے، اس کی شہادت قرآن مجید سے سنیے! ﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۚ ذَٰلِكَ ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ [ص: ۲۷] ان کافروں کے غلط خیال ''ظن'' سے تعبیر فرمایا ہے، جس سے ثابت ہوا کہ جہاں جہاں ظن غیر مفید آیا ہے وہاں غلط خیال مراد ہے (راجح خیال) مراد نہیں، پس حدیث کو ظنی کہہ کر ناظرین کو ظن میں ڈالنا کار خردمنداں نیست۔

❁ ❁ ❁

قسط: ۲۴

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۲۵/ربیع الثانی ۱۳۴۹ھ=۱۹/ستمبر ۱۹۳۰ء)

گذشتہ پرچہ میں ''شرعۃ الحق'' کے (ص: ۱۶۵) تک ذکر ہو چکا ہے آج بھی صفحہ مذکور سے اقتباس درج ہے۔ (مدیر)

''میں نے مقدمہ میں فیصلہ کی زیر سرخی قرآن مجید کی آیتوں سے دکھایا ہے کہ قرآن مجید حق و باطل کی ترازو ہے اور خدائی ترازو، تو حدیثوں کو قرآن مجید پر ہی کیوں نہ تولو، جو حدیث قرآن مجید کے مخالف ہو تو وہ رسول کی حدیث ہو نہیں سکتی۔

۱۔ جو حدیث اضافہ علی القرآن اور قرآن مجید کی محدود کرنے والی ''کم و بیش کرنے والی'' اور اس طرح

۲۔ حدود اللہ کی توڑنے والی ہو، وہ بھی حکم خداوندی ''لاتعتدوا'' کے اصول پر رسول خدا ﷺ کی حدیث ہو نہیں سکتی، تو ایسی حدیثیں جو آنحضرت ﷺ کی ہو نہیں سکتیں ان کو حدیث کی کتابوں سے نکال دو، اور ان کو رسول خدا ﷺ کے ساتھ منسوب بھی نہ کرو۔

۳۔ اور قرآن مجید کے بالکل ہی مطابق ہونے کی صورت میں چاہے وہ موجودہ شرائط کے رو سے روایت اور راوی کے سلسلہ پر صحیح نہ بھی اتریں، لیکن وہ بعبارت دیگر قرآن ہیں، قرآن قول رسول ہے مگر منزل، حدیث قول رسول ہے مگر غیر منزل دونوں اقوال میں اتفاق تام کے سوا اور کوئی صورت نہیں''۔

اہلحدیث:

ہمیں اس بات کا افسوس ابتدا سے ہے کہ حافظ محب الحق صاحب اپنے دعوی کو ملحوظ

نہیں رکھتے ،آپ کا دعوی ہے کہ سوائے قرآن مجید کے حدیث نبوی شرعی سند اور دلیل نہیں ، یہ دعوی عام ہے اس سے حدیث قرآن کے مخالف ہو یا موافق، اس میں موافقت یا مخالفت کو دخل نہیں ، جیسے کوئی غیر مقلد (اہل حدیث) کہے کہ کسی امام کا قول حجت شرعیہ نہیں ،اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ قول امام مخالف قرآن ہو یا موافق فی نفسہ وہ حجت شرعیہ نہیں ، پس قرآن مجید کی مخالفت اور موافقت کا ذکر بے مطلب اور بے ضرورت ہے۔

ہاں یہ فقرہ آپ کا ضرور قابل غور ہے کہ اضافہ کرنے والی قرآن کی محدود کرنے والی وغیرہ حدیث ہونہیں سکتی۔الخ

جواب:

اس مسئلہ پر پہلے بھی بحث ہو چکی ہے،آج پھر عرض کرتے ہیں،لطف یہ ہے کہ بعض دفعہ آپ اپنا جواب خود ہی دے دیا کرتے ہیں۔

آپ کے اس کلام کے ۱۳ اجزاء ہیں:

۱۔اضافہ کرنے والی۔

۲۔محدود کرنے والی۔

۳۔موافق قرآن۔

حافظ صاحب! آپ نے جو (ص:۲۳۲) پر نمازوں کی ترتیب میں لکھا ہے:

''ہر دوسری رکعت کے بعد قعدہ، قیام میں الحمد اور کلام الہی کی کچھ آیتیں پڑھنی چاہییں اور رکوع وسجود میں تسبیح وتحمید اور قعدہ میں تحیات اور درود'' (ص:۲۳۲)۔

فرمایئے! یہ سب امور قرآن مجید میں ہیں؟ ہیں تو اسی طرح ہیں ، یا عام صورت میں؟ جو نہیں ہیں،مثلا: قعدہ میں التحیات کا پڑھنا اور قیام میں الحمد وغیرہ کا پڑھنا قرآن

مجید میں نہیں، یہ اضافہ ہوئے یا نہیں؟ اور جو ہیں مگر عام صورت میں اس کو خاص صورت میں رکھا گیا مثلاً رکوع سجود کا اس ترتیب سے کرنا، اور درود کا خاص کر قعدہ میں پڑھنا، بحالیکہ قرآن میں ان احکام کو عام رکھا گیا ہے تو یہ غیر محدود کی تحدید ہوئی یا نہیں؟ مثلاً قرآن مجید میں بیشک حکم ہے: ﴿صَلُّواْ عَلَيۡهِ وَسَلِّمُواْ تَسۡلِيمًا﴾ [الاحزاب: ۵۶] (نبی علیہ السلام پر درود وسلام پڑھو)۔

مگر خاص قعدہ سے اس حکم کو مخصوص کرنا اور بقول مصنف شرعۃ الحق نماز کا اس کو جزء بنانا یہ غیر محدود کی تحدید ہے یا نہیں؟ یقیناً ہے۔

اس تحدید کو علماء اصول تخصیص کہتے ہیں جو عام طور پر ہر فریق میں پائی جاتی ہے، پس۔

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

اس طرح علماء حدیث جملہ امور میں حدیث پر عمل کرتے ہیں۔

جواب ۳:

قرآن مجید کے موافق ہونے کی صورت میں کلام نبوی کو حدیث رسول ماننا پھر اس کو غیر منزل من اللہ کہنا کچھ معنی نہیں رکھتا، ایسا تو ہم آپ کے کلام کو اور آپ ہمارے کلام کو بھی یہ رتبہ دے سکتے ہیں، شیخ سعدی مرحوم نے تو اس سے بھی بڑھ کر تعلیم دی ہے ؎

مرد باید بگیر داندر گوش

در نبشتست پند بر دیوار

آگے چلیے آپ لکھتے ہیں:

''خلاف عقل حدیثیں تو قرآن مجید کی مطابقت میں اتریں گی نہیں ان کو حدیث سے اور قول رسول سے خارج کردو'' (ص:۱۶۶)۔

اہلحدیث:

خلاف عقل لفظ تشریح طلب ہے، بعض لوگوں کے نزدیک معجزات انبیاء کرام علیہم السلام سب خلاف عقل ہیں، عصا کا سانپ بن جانا، خاص قوم کے لیے دریا پھٹ جانا، وغیرہ کیا اس قدر خلاف عقل حدیث کو تو آپ نہ چھوڑیں گے۔ان شاءاللہ۔

آگے چلیے:

''انذار کی نسبت بھی حکم تھا: ﴿وَأَنذِرْ بِهِ ٱلَّذِينَ﴾ الخ [الانعام:۵۱]،قرآن مجید سے انذار کرنے کا، اس لیے اس سے فاضل جو انذار کی حدیث پائی جائے وہ بھی رسول کی حدیث نہیں'' (ص:۱۶۶)۔

اہلحدیث:

بے شک قرآن مجید ہی ذریعہ انذار ہے حدیث شریف میں جو انذار آئے ہیں وہ سب قرآن مجید کی تفسیر اور تفصیل ہیں جیسے نماز، روزہ، حج، زکاۃ وغیرہ ہیں اسی طرح ترغیب وترہیب بھی تفصیل ہے۔

قسط: ۲۵

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۳/جمادی الاولی ۱۳۴۹ھ=۲۶/ستمبر ۱۹۳۰ء)

گذشتہ پرچہ میں ''شرعۃ الحق'' کے (ص:۱۶۶) تک ذکر ہو چکا ہے، آج بھی بقیہ (ص:۱۶۶) کا جواب دیا جاتا ہے۔

مصنف ''شرعۃ الحق'' فرماتے ہیں:

''افسوس کہ قوم نے ادھر توجہ نہ کی اور حدیث کو قرآن مجید یعنی خدا کی دی ہوئی ترازو پر نہ تولا، اگر ادھر توجہ کرتی تو بہیتری حدیثیں قرآن مجید کے احاطہ میں ملتیں، اور وہ علاوہ اس کے کہ متواتر کے درجہ سے کم نہ ہوتیں، روایت اور راوی کی جانچ سے بھی بے نیاز کر دیتیں، مثلاً اس قدر اصولی حدیث ہے: '' إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى ''[1]۔ اس کے اسماء ورجال کو کیوں دیکھو، راویوں کے ادھیڑ پن میں کیوں پڑو، اس کو قرآن مجید میں کیوں نہ دیکھو، خدا کا فرمان ہے: ﴿وَمَن يُرِدْ ثَوَابَ ٱلدُّنْيَا نُؤْتِهِۦ مِنْهَا وَمَن يُرِدْ ثَوَابَ ٱلْـَٔاخِرَةِ نُؤْتِهِۦ مِنْهَا﴾ [آل عمران: ۱۴۵] جو ارادہ یا نیت کرتا ہے ثواب دنیا کا، اسے وہ ملتا ہے، اور جو ارادہ یا نیت کرتا ہے ثواب آخرت کا، اسے وہ ملتا ہے۔ یعنی جیسی نیت ویسا پھل، قرآن وحدیث دونوں کا ایک ہی مطلب ہے، اسی کو خدا نے سورہ بقرہ میں ارشاد فرمایا:۔ ﴿وَلَٰكِن يُؤَاخِذُكُم بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ﴾ [البقرۃ: ۲۲۵] اعمال کا مواخذہ خدا تمہاری نیت کے مطابق کرے گا

---

[1] صحیح بخاری: کتاب بدء الوحی ، باب کیف کان بدء الوحی، حدیث:۱، صحیح مسلم: کتاب الامارۃ، باب قوله ﷺ انما الاعمال بالنیات، حدیث:۱۹۰۷۔

جیسی نیت ویسا نتیجہ'' (ص:-۱۶۷،۱۶۶)۔

اہلحدیث:

حافظ صاحب! اس توافق سے یہ حدیث منزل من اللہ ہو جائے گی؟ یا غیر منزل قول رسول ہی رہے گی، جب کہ بقول آپ اس توافق سے بھی وہ محض قول رسول ہی رہے تو توافق اور تواتر سے فائدہ کیا ہوا؟ ذرہ کھول کر فرمایئے۔

نصیحت:

اس ضمن میں آپ نے مسلمانوں کا مرثیہ لکھ کر افسوس کیا ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کو چھوڑ دیا وغیرہ اس مرثیہ اور افسوس میں ہم بھی آپ کے شریک ہیں، قرآن مجید سے تمسک کرتے تو حدیث نبوی کی آنکھ ضائع کیوں کرتے، الی اللہ المشتکی۔

(ص:۱۶۹) پر آپ لکھتے ہیں:

''جو اقوال وافعال حضرت رسول معصوم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ثابت ہو جائیں وہ حدیث ہے یا جو مشتبہ رہیں وہ بھی، یا جو صحابہ تک سلسلہ نسبت رکھتے ہوں وہ بھی، جو تابعین تک سلسلہ نسبت رکھتے ہوں وہ بھی، جو تبع تابعین تک سلسلہ نسبت رکھتے ہوں وہ بھی، یا جن علماء نے حدیث تسلیم کرلیا ہو وہ بھی، یا حدیث کے معنی کتاب حدیث کے ہیں؟''۔

جواب:

حافظ صاحب! یہ عبارت آپ کی شروع کتاب میں چاہیے تھی، بلکہ بہتر تو یہ تھا کہ جن دنوں آپ جناب مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری مرحوم کے درس قرآن میں شریک ہوتے تھے اسی زمانہ میں مرحوم سے یہ سوال حل کر لیتے، اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے علم حدیث نہ پڑھا نہ سنا اور تردید میں اتنی بڑی کتاب لکھ ماری، سنیے!

جو حدیث حجت شرعیہ ہے جس میں علماء اہل حدیث منکرین سے بحث کرتے ہیں اس سے قول نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہے، جس کی بابت آپ (ص: ۱۶۵) پر لکھ چکے ہیں کہ:

''حدیث مرفوع، مسند، متصل جو راویوں کی جانچ پڑتال پر صحیح اترے حدیث کہی جاسکتی ہے'' (ص: ۱۶۵)۔

اقوال صحابہ کو آثار اور تابعین کے کلام کو اقوال کہا جاتا ہے۔

اسی صفحہ پر آپ نے کتابت حدیث سے منع کا ذکر کیا ہے جس کا جواب پہلے کئی دفعہ ہو چکا ہے (ملاحظہ ہو اہل حدیث مورخہ ۷ ر صفر، ۴ر جولائی ۳۰ء) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ منع بحکمت تھا جو آخری حیات نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والتحیہ میں مامور ہو گیا۔ (بخاری)

یہ استدلال ہے یا استہزاء:

حافظ صاحب تردید حدیث لکھتے لکھتے کچھ کھسیانے سے ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے ہمیں ان کے حال پر رحم آتا ہے، ہمارے ناظرین ہمارا قول مخالفانہ تبصرہ نہ جانیں، بلکہ ثبوت کے لیے مندرجہ ذیل اقتباس پڑھیں، آپ لکھتے ہیں:

''ایسی حدیث کی کتابیں کتاب اللہ کی شریک سہیم ہی ہو کر نہ رہیں، بلکہ اب تو دین کا مدار ہی حدیث کی کتابوں پر ہو گیا، اگر خدا قرآن مجید کو اٹھالے جیسے اس نے توریت وانجیل کو اٹھالیا تو قوم کچھ فریادی نہ ہو، کیوں کہ جس طرح متی ویوحنا کی انجیل موجود ہیں ہمارے پاس بھی حدیث کے تیسوں پارے موجود ہیں، بلکہ قرآن کا نعم البدل کہ یہ مجمل ہے اور وہ مفصل، یہ بے کار ہے اور وہ کام کے، اور اگر خدا حدیث کو اٹھالے تو بڑی مشکل آپڑے کہ فرقوں کا اختلاف اسی پر، عالموں کی ڈھال تلوار یہی، صوفیوں کی تلاوت اور درس کی پونجی یہی، وہ بھی ان کی جو متشرع ہوں، اور کفر کے فتوؤں کا آلہ یہی، مسلمانوں کا میدان رزم گاہ یہی، اور حافظان قرآن، حاملان وحی سہی، مگر یہ رگڑے جھگڑے کے کام نہیں تو ہیں کس گنتی میں، کس عظمت کے مستحق'' (ص: ۱۶۹، ۱۷۰)۔

اہلحدیث:

کیسی معقول تحریر ہے، ہاں صاحب! خدا اگر قرآن کو اٹھالے بلکہ حکومت کی طرف سے قرآن لکھنے اور چھاپنے ممنوع ہوجائیں تو کیا حرج، جب کہ آپ جیسے حافظان قرآن بکثرت موجود ہیں، تمام لوگ حفظ سے کام لیں گے، ہاں یہ تو فرمایئے کہ حدیث کی وجہ سے اختلاف زیادہ ہے یا قرآن مجید کی وجہ سے؟ ذرہ منکرین حدیث کے فرقوں اور اختلافات پر نظر کرکے کہیے گا، سنئے ایک آپ منکر حدیث ہیں تو ایک لاہور وغیرہ مقامات کے اہل قرآن بھی آپ کی صنف کے ہیں، مگر آپ جو ان کی بابت لکھتے ہیں آپ بھولے ہوں تو ہم یاد کرادیں، ذرہ غور سے سنئے:

''میں (حافظ محب الحق) ہرگز اہل قران نہیں، اہل قرآن نے قرآن کو چیستان اور معمہ بنا کر اسے کھینچ تان کر اس کی ہڈیاں مروڑ کر ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی ہے، الخ'' (ص:۶۹)۔

اسی طرح وہ آپ کے حق میں ''عطائے تو بلقائے تو'' پر عمل کر رہے ہیں، پھر گوجرانوالیوں، گجراتیوں، ڈیرہ اسماعیل خانیوں، امرتسریوں، وغیرہ پر بھی نظر ڈالئے گا تو آپ کو پتہ لگ جائے گا کہ ؎

ایں گناہیست کی در شہر شمانیز کنند

قسط:۲۶

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۱۰/جمادی الاولی ۱۳۴۹ھ = ۳/اکتوبر ۱۹۳۰ء)

گذشتہ پرچہ میں (ص: ۱۶۹) تک جواب دیا گیا تھا، (ص: ۱۷۰) پر حافظ صاحب نے مسلمانوں پر اظہار رنج فرمایا ہے کہ قرآن مجید پر عمل کرنا انہوں نے چھوڑ دیا، بے شک ہم بھی اس رنج میں آپ کے شریک ہیں قرآن پر عمل کرتے تو اتباع رسول سے روگردان کیوں ہوتے۔

(ص:۱۷۱) پر آپ نے ایک ایسی بات لکھی ہے جو متنازعہ نہیں، مگر آپ نے خواہ مخواہ اس کو مناظرہ کی کتاب میں لکھ کر زیر بحث کر دیا ہے، آپ لکھتے ہیں:

''میری غرض یہ ہے کہ حدیث کی کتاب تو حدیث نہیں ہوسکتی حدیث تو اقوال وافعال رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جو بلا شائبہ شک وشبہ ہم تک پہنچیں، اور ہم جانچ بھی لیں کہ آپ کے قول منزل اور غیر منزل میں اختلاف تو نہیں یا حدود اللہ تو نہیں ٹوٹتے، بس یہ حدیث ہیں اوروں کے اقوال وافعال حدیث نہیں سمجھے جاسکتے کہ یہ شرک فی النبوت ہوگا'' (ص:۱۷۱)۔

اہلحدیث:

بے شک جو کچھ آپ نے لکھا ہے صحیح ہے، غیر نبی کے اقوال متعارف حدیث نہیں ہیں، بس اب تو آپ راضی ہیں۔

چوں کہ حدیث کی تنقید کا مدار کتب اسماء الرجال پر ہے جن میں راویان حدیث کی وہ پڑتال کی گئی ہے، مولانا حالی نے جس کا نقشہ بتایا ہے ؎

کئے جرح و تعدیل کے وضع قانون
نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسوں

خدا کے فضل سے اسماء الرجال کے فن پر اہل اسلام کو وہ فخر حاصل ہے جو آج کسی قوم کو نہیں، منکرین حدیث جب سرے سے حدیث کے منکر ہیں تو یہ فن انکو کیسے بھائے اس لیے حافظ محب الحق صاحب نے اس فن پر بھی (جو مایہ صد ناز اہل اسلام ہے) ہاتھ صاف کرنا چاہا، چنانچہ آپ لکھتے ہیں:۔

''اسماء الرجال کی کتابیں کچھ وحی کی کتاب نہیں، منزل من اللہ نہیں، وہ کس اصول سے دین میں جگہ پانے کا استحقاق رکھتی ہیں، یوں بلا بینہ رب محض عقیدت کی بنا پر اتنا کچھ مانتے ہو تو تثلیث ماننے والے عیسائیوں سے کیوں جھگڑتے ہو'' (ص:۱۷۱)۔

اہلحدیث:

جناب! ایسی ضد بھی کیا کہ دنیا کی کل علمی بنیادوں کو ہلانے کی آپ نے ٹھان لی ہے، طبقات وسیر کی تحقیق کس طرح ہوتی ہے، آج بھی کوئی ہندوستان کے علماء کے حالات لکھے تو آپ کے یا آپ کے اساتذہ کے حالات کس طرح لکھے گا؟ بس اسی طرح کہ آپ کے قرب و جوار والوں سے دریافت کرے گا، آپ کی تصنیف سے کچھ لے گا آپ کے مخالفوں سے بھی سنے گا، پھر ان سب پر غیر جانبدارنہ ایک تحقیقی نظر ڈالے گا، اس کے بعد پبلک میں آپ کے حالات پیش کرے گا۔

اس طرح علماء حدیث نے راویان حدیث کے حالات بڑی محنت سے جمع کیے ہیں، تحقیق اور غیر جانبدارانہ تنقید سے ایسا کام لیا کہ ؎

طلسم ورع ہر مقدس کا توڑا نہ صوفی کو چھوڑا نہ ملا کو چھوڑا (حالی)

ایسے شریف اور مستند فن پر آپ کا منہ آنا حقیقت میں بے خبری پر مبنی ہے۔

(ص: ۱۷۴ سے ۱۷۸) تک آپ نے اس امر پر بحث کی ہے کہ قرآن مجید مجمل نہیں بلکہ مفصل ہے، چنانچہ آپ کا اقتباس یہ ہے:

''قرآن مجید مجمل ہے یا مفصل، کامل ہے یا ناقص، قرآن مجید کو مجمل محتاج تفسیر کہو تو اس کی دلیل قطعی کیا ہے، افسوس قرآن مجید اس برتاؤ کا مستحق ہرگز نہیں کہ اس کے ساتھ عقیدتاً اور عملاً یہ سلوک کیا جائے کہ وہ مجمل کہہ کے پس پشت ڈال دیا جائے۔ اور اس میں تدبر و تفکر سے ہر شخص روکا جائے'' (ص: ۱۷۴۔۱۷۸)۔

اہلحدیث:

معلوم نہیں حافظ صاحب کن لوگوں کا ذکر کررہے ہیں جو قرآن مجید میں تدبر و تفکر کرنے سے روکتے ہیں، ہم تو قرآن شریف میں تدبر کرنا فرض جانتے ہیں، ہاں اصل مضمون کا جواب پہلے کئی دفعہ ہو چکا ہے اور آپ کے مسلمات سے ثبوت دیا گیا ہے کہ آپ بھی علماء حدیث کی طرح قرآن مجید کو بعض احکام میں مجمل مانتے ہیں، پھر نزاع کیا ہے، سنیے آپ نے جو (ص: ۲۳۲) پر نماز پنجگانہ کی تفصیل لکھی ہے:

''صلاۃ کے پانچ وقت مقرر ہیں، صبح، ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور ہر نماز وضو رہتے ہوئے ہونی چاہیے، صبح کی دو رکعتیں، مغرب کی تین اور ظہر، عصر اور عشاء کی چار چار رکعتیں، ہر رکعت میں قیام، رکوع، سجود، علی الترتیب ہے اور ہر دوسری رکعت کے بعد قاعدہ، قیام میں الحمد اور کلام الٰہی کی کچھ آیتیں پڑھنی چاہیئں اور رکوع، سجود میں تسبیح وتحمید اور قاعدہ میں تحیات، درود، یہ روز کی نماز ہوئی، جمعہ کے دن بجائے ظہر جمعہ کی دو رکعتیں'' (ص: ۲۳۳)۔

فرمایئے جناب!

یہ تفصیل قرآن کے لفظوں میں آپ دکھا سکتے ہیں؟ آپ دکھائیں تو ہم دل سے مشکور ہوں گے، نہ دکھائیں اور نہ دکھا سکیں گے: ﴿وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ

ظَهِيرًا ﴾ [الاسراء:۸۸] تو پھر بتاویں قرآن کی آیت: ﴿وَأَقِيمُواْ ٱلصَّلَوٰةَ ﴾ اس تفصیل کے سامنے مجمل رہی یا مفصل۔

اسی طرح کا قرآن مجید میں بعض جگہ اجمال علماء حدیث مانتے ہیں، جو آپ نے بھی مانا بلکہ کر دکھایا ہے۔

حافظ صاحب:

عمر تھوڑی حسرتیں دل میں بہت — صلح کیجئے بس لڑائی ہو چکی

❁ ❁ ❁

قسط: ۲۷

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۱۷/ جمادی الاولی ۱۳۴۹ھ = ۱۰/ اکتوبر ۱۹۳۰ء)

گذشتہ پرچہ میں ''شرعۃ'' کے صفحات ۱۷۸ تک کا جواب دیا گیا ہے، آج اس سے آگے کا ذکر کیا جاتا ہے۔

قابل مصف کے اصلی خیالات تو ناظرین تک پہنچ چکے ہیں، تنقیح صرف اتنی ہے کہ قرآن مجید کا بعض حصہ متعلق احکام مجمل ہے، یا تمام قرآن مفصل ہے، بعض حصہ کو مجمل کہنے کا ثبوت کئی دفعہ دیا گیا اور جناب مصنف کے دستخط بھی اس پر کرائے گئے، اس لیے کتاب کی روح تو نکل چکی ہے، مگر چوں کہ ہم بھی ورق گردانی کرتے ہیں اس لیے جو جو مصنف موصوف نے لکھا ہے ناظرین تک پہنچاتے ہیں، ہاں اتنا کہے بغیر نہیں رہ

سکتے کہ یہاں تک پہنچ کر فاضل مصنف کچھ کھسیانے معلوم ہوتے ہیں، آپ کا مندرجہ ذیل قول ہمارے دعوی کی تصدیق کرتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

''تفاسیر جو موجود ہیں ان کی حقیقت کیا ہے اور اگر کوئی ان تفسیروں کے خلاف کوئی تفسیر بیان کرے تو چوں کہ وہ تفسیروں کے خلاف ہے گرچہ وہ عربی زبان کے مطابق ہی کیوں نہ ہو، کیا وہ تفسیر بالرائے ہوگی اور تفسیر بالرائے کس آیت کی رو سے ممنوع ہے اور ممنوع ہے تو تفسیروں میں اختلافات کیوں پائے جاتے ہیں؟'' (ص:۱۷۸)۔

اہلحدیث:

جناب حافظ صاحب! جو تفسیر عربیت کے موافق ہو اسے کون تفسیر بالرائے کہہ سکتا ہے کوئی کہے تو اسے ہمارے پاس بھیج دیجیے، تفسیر بالرائے وہی ہے جو عربیت کے خلاف ہو، قرآن مجید سے اس کی شہادت سننا چاہیں تو سنیں: ﴿إِنَّا جَعَلْنَٰهُ قُرْءَٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾ [الزخرف: ۳] بے شک ہم (خدا) نے اس (قرآن) کو عربی زبان میں نازل کیا تاکہ تم اسے سمجھو۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ قرآن مجید سمجھنے کے لیے عربی دانی کی ضرورت ہے اسی کا عکس القضیہ ہے کہ عربیت کے خلاف ترجمہ یا تفسیر صحیح نہ ہوگی، اسی غیر صحیح کا نام ہے تفسیر بالرائے۔

آگے چلیے:

''قرآن مجید جس طرح خدا نے نازل فرمایا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبلیغ فرما دی، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن مجید کو محتاج تفسیر سمجھا، نہ خلفاء نے، نہ صحابہ نے، اس لیے مدت مدید تک کوئی ضرورت محسوس نہ ہوئی جو تفسیر کی طرف مائل کرے، اللہ والے قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے اس میں تدبر و تفکر کرتے تھے، خدا کی راہ پاتے تھے، کہیں اختلاف آراء ہوا، اور اس موقع پر کسی نے کوئی

آیت پڑھ دی مومنوں کے سر جھک گئے، لیکن زمانہ نے پلٹا کھایا اور نفسانیت نے اپنی ہوا باندھی تو متعارض حدیثوں اور مروجہ فلسفہ کے حملوں اور ملت ومشرب کی پاسداریوں نے مرادی معنوں کی اینٹوں اور تاویلوں کے مصالحہ سے تفسیر کی بنیاد قائم کی اور اس پر اپنے تبحر کا قلعہ اٹھایا، رفتہ رفتہ تفسیر کا ہے کو، وہ رگڑے جھگڑے اور طبع آزمائیوں کی رزم گاہ ہوگئی'' (ص:۱۷۹)۔

اس اقتباس میں جواب طلب بات صرف اتنی ہے کہ:

''نہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کو محتاج تفسیر سمجھا، نہ خلفاء نے، نہ صحابہ نے''۔

بہت خوب:

نہیں سمجھا تو فرمایئے: ﴿إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَوٰةِ مِن يَوۡمِ ٱلۡجُمُعَةِ فَٱسۡعَوۡاْ إِلَىٰ ذِكۡرِ ٱللَّهِ﴾ الآیہ [الجمعۃ:۹]۔

کی جو وسعت ہے خود حضور علیہ السلام نے اور صحابہ کرام نے اس کو تنگ کیا یا نہیں، تفصیل سے معروض، سنیے۔

آیت موصوفہ اپنے ترجمہ کے لحاظ سے نماز جمعہ کا وقت معین نہیں کرتی بلکہ اتنا کہتی ہے کہ جس وقت جمعہ کے روز نماز کے لیے پکارا جائے تم لوگ اس پکار کو سن کر چلے جاؤ۔

فرمایئے صبح کی اذان یوم الجمعہ میں ہے یا نہیں، نیز عصر بلکہ مغرب، بلکہ عشاء کی بھی؟ پس (بقول آپ کے) مطلب یہ ہوا کہ بروز جمعہ صبح کی اذان سن کر پہنچ جانے والا اس آیت کے موافق نماز جمعہ پڑھتا اور اس حکم پر عامل ہے، ظہر کو پہنچنے والا بھی اسی آیت پر عامل ہے، عصر، مغرب بلکہ عشاء کو پہنچنے والا بھی عامل ہذا الامر ہے۔

حافظ صاحب!

کیا آپ کا یا دیگر جماعت ہائے منکرہ حدیث کا یہی اعتقاد اور عمل ہے جہاں تک ہمیں علم ہے ایسا نہیں، خاص کر آپ کا تو قول صاف ہے۔

''جمعہ کے دن بجائے ظہر کے دو رکعتیں'' (ص:۲۳۲)۔

فرمائیے قرآن مجید کو آپ نے اپنے حال پر رکھا؟ کیوں جمعہ کی نماز کو ظہر سے مقید کیا؟ اور بجائے چار کے دو کیوں رکھیں؟ آپ نے یہ بندش یا تخصیص حدیث نبوی کی بنا پر کی ہے تو (فبھا ونعمت) اور اگر از خود کی ہے تو آپ ہی اپنا انصاف کریں کہ آپ خود تو قرآن مجید کو عموم پر نہ رکھنے کا اختیار رکھیں مگر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اختیار نہ ہو۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا ①

قسط: ۲۸

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۲۴/جمادی الاولی ۱۳۴۹ھ = ۱۷/اکتوبر ۱۹۳۰ء)

گذشتہ پرچہ میں ''شرعۃ الحق'' (ص:۱۷۹) کے آگے حصہ تک جواب ہو چکا ہے، آج اس سے آگے درج ہے۔

اس معروضہ کے بعد آپ کا مندرجہ ذیل قول بالکل بے وزن ہو جاتا ہے جو آپ نے فرمایا ہے:۔

''جب حدیث کی کتابیں لکھی گئیں تو قرآن مجمل قرار پایا اور توجہ حدیث کی طرف جھکی تو مواجہہ ادھر سے ادھر ہو گیا، عقیدت نے یہ کہہ کر کہ حدیث مفسر قرآن بھی ہے، قرآن سے بے نیاز ہی کر دیا،

① ترجمہ: تو دیکھ راستہ کا فاصلہ کہاں سے کہاں تک ہے۔

حالاں کہ کوئی آیت یا کوئی حدیث صحیح اس کی حمایت کو نہیں کھڑی ہوسکتی، ایسے حال میں قرآن کا مصرف تلاوت، الفاظ، جھاڑ پھونک، عملیات، تسخیر جنات، توسیع رزق، وصال محبوبہ، ہلاکت دشمن، حصول اولاد، فتح یابی مقدمات، رد بلا، وغیرہ وغیرہ، کے سوا اور کیا تجویز ہوسکتا تھا، قرآن پر قناعت نہ ہوئی تو حدیث پر قناعت کس طرح ہوسکتی تھی، اس لیے فقہ اور قانون ملکی نے بھی دین الٰہی کی جگہ لی، یوں ذہانت اور تفنن نے اپنی گھوڑ دوڑ شروع کی، جب فلسفہ کا زور ہوا تو ضرورت ہوئی کہ قرآن اس کے مطابق کیا جائے، اس نے تاویل کا دروازہ کھولا اس پر کمزور حدیثوں نے اعانت پر اعانت کی اور مختلف حدیثوں نے اختلاف آرائی کی کھچڑی پکائی، یوں تفسیروں کا انبار لگا اور مذہب کو جاننے کے لیے کئی اونٹ کتابیں درکار ہوگئیں، اس کا لازمی نتیجہ تھا اختلاف کا ہونا، اور اختلاف کے سبب آپس میں جھگڑے ہونے وہ ہوکر رہے، یہ تفسیر ہوئی، پھر جو کوئی ان جھگڑوں کو بیان کرسکے وہ قرآن سمجھنے کا مستحق قرار دیا گیا، اب جب زمانہ بدلا، فلسفہ بدلا، اعتراضوں کا کینڈا بدلا تو مشکل پڑی کہ پہلا فلسفہ تو تفسیر میں داخل ہوکر دین ہو چکا تھا وہ چھوڑا جائے تو کیوں کر، اس لیے کفر کے فتووں کے سوا اور چارہ کار ہی کیا رہا، جب کفر کی گرم بازاری بھی سرد ہوئی اور دنیا داروں نے اسے لیڈری کا تمغہ بنالیا تو اب آنکھیں کھلیں اس پر کیا کھلیں، یہ سوجھ نہیں پڑتا کہ دین حنیف کی حمایت کے لیے انسانی ہتھیار کام نہیں دینے کے، خدائی ہتھیار یعنی قرآن اور صرف قرآن ہی لے کر میدان میں آجاؤ تو پھر میدان تمہارا ہی ہے اور کامیابی تمہاری ہی'' (ص:۱۷۹،۱۸۰)۔

اہلحدیث:

باوجود بے معنی اور بے تعلق ہونے کے آپ کا کلام نقل کرنے سے ہماری غرض یہ ہے کہ ناظرین آپ کی محنت کا اندازہ کرسکیں کہ آپ انکار حدیث میں کن کن مشکلات میں پھنسے ہوئے ہیں، خدا آپ کی مشکل آسان کرے، اس سارے اقتباس میں کوئی بات قابل جواب نہیں، اسی طرح (ص: ۱۸۹) تک آپ نے علماء اور مفسرین کی

شکایت کی ہے کہ یاجوج ماجوج کو یہ کہتے ہیں، فلاں کو یہ کہتے ہیں، کہئے ہم اس کے جواب کے ذمہ دار نہیں، ہم تو اصل مسئلہ میں جوابدہ ہیں، جو انکار حدیث ہے۔

(ص:۱۸۹) پر آپ نے جو لکھا ہے وہ بھی ہم اس لیے نقل کرتے ہیں کہ ناظرین ہمارے دعوی کی تصدیق کریں کہ کتاب کی روح نکل چکی ہے، دیکھیے آپ فرماتے ہیں:

''قرآن وحدیث وفقہ تینوں کی کیا کیا منزلتیں ہیں اور خدا ورسول کے ساتھ تینوں کی کیا کیا نسبتیں ہیں، اور تفقہ رسول معصوم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کیا منزلت ہے؟

قرآن مجید کی نسبت میں نے اوپر بیان کیا ہے اور نقلاً اور عقلاً ثابت کیا ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے، توریت کی بشارت ہے، خدا نے اسے نازل فرمایا، رسول معصوم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بذریعہ کتابت، بذریعہ حفاظ اور سنا سنا کر اس کی تبلیغ فرمائی، جو متواترا ہم تک پہنچا، اور ساری دنیا میں شائع ہوا، اور جوں کا توں شائع ہے، پھر کلام ربانی کی منزلت کا کیا پوچھنا، اس کی ثنا وصفت خود وہی کرے تو کرے، انسانی زبان کی کیا بساط، ہزار قرب کوئی حاصل کرے مگر کلام تو متکلم میں ہے، متکلم سے ہے، کلام ربانی کی روحانیت اک خدائی نور ہے جو خدا ہی کی طرف ہادی ہے، یہ کلام ہفتصد و ہفتاد قالب طے کر کے نہیں آیا بلکہ چوں کہ اس کی کوئی صفت بھی اس سے منتزع نہیں ہوسکتی، خصوصا صفت تکلمی کہ متکلم سے منتزع ہو ہی نہیں سکتی اس لیے اس پر بھی کہ وہ کلام ہم تک پہنچا اور یوں اس کی صفت تکلمی کا ظہور رہوا، وہ کلام متکلم ہی ہیں اور متکلم ہی سے ہے، پھر اس سے ذریعہ کے منازل قرب طے کرنے میں دوری کو گنجائش نہیں اور اس لیے اس راہ میں ٹھہراؤ کا مقام بھی نہیں، اس کے مسافر کو چونکہ ٹھہراو نہیں، رہزنوں اور قزاقوں کا کوئی کھٹکا بھی نہیں، تل اوجھل پہاڑ ہے، جو کلام بے کیفی میں ڈوبا اور اس کی کچھ تھاہ پائی وہ متکلم حقیقی تک پہنچا، ادھر ڈوبا ادھر پہنچا، ﴿يَهْدِي ٱللَّهُ لِنُورِهِۦ مَن يَشَآءُ﴾ [نور:۳۵] (خدا جسے چاہتا ہے اپنے نور کی راہ دکھاتا ہے) کلام ربانی کے ظاہراً متکلم ہمارے رسول معصوم ہیں، جیسے صفت خلاقی کے ظاہراً مظہر والدین ہیں، نہ خلاق

حقیقی والدین ہیں، نہ کلام ربانی کے حقیقی متکلم ہمارے رسول معصوم ہیں ﷺ، اس لیے اس کلام پاک کی تلاوت کا حق اگر ادا کرسکو اور اس میں ریاض قلبی صحیح نسبت اور یکسو توجہ کے ساتھ اگر کرسکو تو رسول معصوم ﷺ کے برزخ مقدس کی زیارت سے فیضیاب بھی ہو سکتے ہو، کیوں کہ کلام پاک کے مظہر آپ ہی ہیں یہ تو کرنے کی بات ہے کر کے دیکھو اگر کر سکتے ہو، غرض خدا اور سول سے ملانے والی چیز ہمارے پاس قرآن مجید ہی ہے تو ﴿وَٱعۡتَصِمُواْ بِحَبۡلِ ٱللَّهِ جَمِيعٗا وَلَا تَفَرَّقُواْ﴾ [آل عمران: ۱۰۳] خدا کی رسی کو مضبوط دھرلو اور اس میں پھوٹ نہ ڈالو۔ (آل عمران، ع:۱۱)

قسط: ۲۹

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(یکم جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ = ۲۴/ اکتوبر ۱۹۳۰ء)

گذشتہ پرچہ اہلحدیث میں ''شرعۃ الحق'' کے (ص: ۱۹۰) سے طویل مضمون نقل ہوا ہے جس میں کوئی بات قابل جواب نہیں، لہٰذا اس کی بابت اتنا ہی ریویو کیا گیا ہے۔

ناظرین:

خیال کیجیے کہ حافظ محب الحق صاحب (مصنف شرعۃ الحق) کیا فرما رہے ہیں، اس میں کوئی بات قابل جواب ہے؟ ہم تو اس کو کربلائی وعظ جانتے ہیں، لہٰذا۔

انیست جوابش کہ جوابش نہ دہی

آگے اس سے بھی لطیف تر ہے، آپ فرماتے ہیں:

”رہیں حدیث کی کتابیں تو وہ مصنفہ رسول نہیں، مصدقہ رسول نہیں، محکوم بہ اطاعت نہیں، ساری حدیثیں منسوب بہ رسول بھی نہیں، سلسلۂ روایت اور راوی کی جانچ غیر قطعی، غیر محفوظ اور معترض علیہ ہیں، باہمہ انتخاب جو رہتی بھی ہیں ان کی قطعیت باہمہ تحقیق شائبۂ ظن سے خالی نہیں، اس لئے حدیثیں ظنیات میں ہیں، خبر و تاریخ میں داخل، متواترات تو تین یا پانچ ہیں تو ظنیات کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذمہ دار نہیں، پھر جس کے آپ ذمہ دار نہیں، اس سے آپ کی نسبت کو قائم کرنا، اور اس سے آپ کے دینی اقوال وافعال کی نسبت جوڑنی آپ کی منزلت کو گھٹانا ہے اور آپ کے ساتھ ظنیات کی نسبت کرنی سوء ادب ہے، رسول معصوم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت اور منزلت تو قرآن کے ساتھ ہے، قرآن کریم قولی قرآن ہے اور رسول کریم عملی قرآن ہیں، قول بے کیف نے قرآن کا جامہ پہنا، اور فعل بے کیف یعنی حقیقت جامعہ نے رسول معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ خدا کا قول و فعل ایک ہے، احول کو دو نظر آئے گا اور حقیقت بیں کو ایک، وحدت کی جلوے آرائیاں دیکھو کہ مراد کو پہنچو“ (ص: ۱۹۰۔۱۹۱)۔

اہلحدیث:

ہم بارہا عرض کر چکے ہیں کہ اصل مبحث یہ ہے کہ قرآن کے ساتھ حدیث بھی حجیت شرعیہ ہے یا نہیں، یہ بحث نہیں کہ حدیث کا طریق وصول کیا ہے، حدیث ایک چیز ہے اور اس کا طریق وصول دوسری چیز۔

یہ تو ہے اصل مبحث پر آپ کی توجہ کا منعطف کرنا، اب اصل جواب سنیے!

آپ تو قرآن مجید کے ایسے ماہر ہیں کہ قرآن کے سوا کسی دوسری کتاب کو دینی کتاب نہیں جانتے، بایں ہمہ اس پر غور نہیں فرمایا کہ ظن ہی وہ فعل ہے جس پر قرآن مجید میں تحسین آئی ہے، غور سے سنیے: ﴿وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى ٱلْخَـٰشِعِينَ ﴿٤٥﴾ ٱلَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَـٰقُوا۟ رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَٰجِعُونَ﴾ [البقرة: ۴۵-۴۶]۔

یعنی ان لوگوں کی تعریف کی ہے جو اپنے رب سے ملنے کا ظن (غالب خیال) رکھتے ہیں۔

کیوں جناب!

کوئی منکر قرآن آپ کو طعنہ دے کہ قرآن ظنیات کی پیروی کرنے کا حکم بلکہ اس پر تحسین کرتا ہے، تو جو جواب آپ دیں گے وہی ہماری طرف سے منکرین حدیث کو پیش ہے۔

اور سنیے!

حدیث بطریق احاد اسی طرح ظنی ہے جس طرح دو شاہدوں کی شہادت سے روئداد مقدمہ ظنی ہوتی ہے، قرآنی نص دو گواہ مقرر کرنے کی ہے۔ ﴿وَأَشْهِدُواْ ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنكُمْ﴾ [الطلاق:۲] (واقعات پر دو گواہ مقرر کر لیا کرو)۔

یہ دو گواہ جب کسی واقعہ کی شہادت دیں گے تو تواتر کے برابر یقینی علم تو نہ ہوگا، پھر کیا ہوگا؟

وہی ظنی جس کو آپ بطور حقارت ذکر کرتے ہیں تو کیا ظن پر عمل کرنا قرآن کے موافق اور نہ کرنا قران مجید کے خلاف نہ ہوا، حافظ صاحب!

آپ ہی اپنے ذرہ جور وستم کو دیکھو
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

اس سے آگے فقہ اور کتب فقہ پر توجہ کر کے اخیر بطور نتیجہ فرماتے ہیں:

''اللہ اللہ یہ کیسا اندھیر ہوگیا کہ خدا کے بندے خدا کے بندے ہوکر اس کے بندوں کے بندے بنے، رشتۂ عبودیت توڑ دیا گیا، اور احکام دینی کے لیے، اہل حدیث حدیث کی طرف رجوع کرنے لگے اور مصنفین صحاح کے مؤمن ہوئے، اور اہل فقہ فقہ کی طرف رجوع کرنے لگے اور فقہاء کے مؤمن ہوئے اور مسائل روحانی کے لیے اللہ والے طالب حق اپنے اپنے طریقوں کے پیر و مرشد کی تصنیف مکتوبات وملفوظات مقولے، شاعری، اور افسانوں کی طرف رجوع کرنے لگے، اور صوفیوں کے مؤمن ہوئے، خدا کا کلام کسی کا نہ سمجھا گیا، نہ وہ کسی مسئلہ کا ماخذ، نہ اس سے تمسک

پکڑنا ہی جائز، غرض مسلمانوں کا دین منزل عملاً سمجھا گیا، صحیح بخاری شریف، صحیح مسلم شریف، نسائی، ابن ماجہ، ترمذی، سنن ابی داؤد، یعنی صحاح اور ہدایہ، شرح وقایہ، قدوری، کنز، فتاوی عالمگیری، فتاوی قاضی خان، اور روحانیت کے لیے مکتوبات وملفوظات اور ترکہ کے لیے سراجیہ، کوئی قرآن کی تبلیغ کرے، قرآن کی طرف بلائے تو اس سے زیادہ مجرم فاسق اور کافر کون، کیوں کہ وہ حدیث کا منکر، فقہ کا منکر، حدیث وفقہ کی کتابوں کا منکر، ان کے مصنفین کا منکر سمجھا جائے گا اور علماء کا مرتد اور دین سے برگردو تسلیم ہو کر خلود فی النار کا مستوجب قرار پائے گا'' (ص: ۱۹۴)۔

اہلحدیث:

معلوم نہیں اصل مسئلہ سے اور مبحث سے اس رام کہانی کو کیا تعلق۔

ہاں صاحب! جو کوئی قرآن مجید کی طرف توجہ نہ کرے، نہ اس سے حکم حاصل کرے وہ وہی ہے جو آپ نے لکھا، مگر آپ کو اس بات کا علم ہوگا کہ ہندوستان میں قرآن مجید کو رواج دینے والے علماء حدیث ہی ہیں، اعتبار نہ ہو تو واقعات سامنے رکھئے، سب سے اول ترجمہ قرآن دہلی میں شروع ہوا، تحریری تو حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ نے کیا، تقریری حضرت مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ نے شروع کیا، جو آج تک دہلی اور دیگر بلاد ہند میں جاری ہے، اس خاکسار کا درس قرآن بھی ۳۷ سال سے جاری ہے، لہ الحمد، یہاں تک کہ آپ (حافظ صاحب) بھی مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری رحمہ اللہ کے درس ترجمہ سے فیض یافتہ ہیں۔

برخلاف اس کے منکرین حدیث نے درس قرآن کا کوئی انتظام نہیں کیا، ہاں ان سے جو کچھ ہوا وہ اتنا ہی ہوا کہ سیکڑوں صفحات محض تردید حدیث پر لکھ ڈالے۔ الی اللہ المشتکی

❁ ❁ ❁

قسط: ۳۰

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۱۵ر جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ = ۷ر نومبر ۱۹۳۰ء)

اہلحدیث ۲۴ر اکتوبر میں ''شرعۃ الحق'' (ص: ۱۹۴) تک کا جواب درج ہوا، ۱۳۱ر اکتوبر کو سالانہ تعطیل تھی، آج اس سے آگے درج ہے:

حافظ محب الحق صاحب نے (ص:۱۹۵) پر ایک فقرہ لکھا ہے جسے اصل مبحث یا باصطلاح قانونی تنقیح کہتے ہیں، آپ لکھتے ہیں:

''ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تدبر اور تفقہ قطعاً ثابت ہوجائے یا عمل متواتر کی شہادت سے یا ان حدیثوں کی شہادت سے جن کی شرائط صحت کو میں نے اوپر بیان کیا ہے، جانچنے کے بعد جب یہ ثابت ہوجائے کہ یہ آپ کا تدبر و تفقہ ہے، تو ہر چند علماء و صلحاء کے لیے موجب ہدایت ورحمت ہے، مگر وہ آپ کی وحی منزل کے درجہ میں نہیں ہے، دین قرآن مجید میں کامل ہو چکا جس کا منکر کافر ہے اور تفقہ ہے مجاز میں، مجاز کو کسی ایک صورت میں منحصر کرنا چاہے وہ اعلی وارفع ہی کیوں نہ ہو، خدا کے مجاز کئے ہوئے کو ماندہ دینا اور محکوم علیہ بنا دیتا ہے، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تفقہ کے یہ معنی نہیں کہ آپ نے خدا کے مجاز کردہ کو محکوم علیہ بنا دیا ہے، بلکہ آپ نے از روئے تفقہ تعلیم دی ہے کہ یہ مجاز کی صورت ہے، اور ایسی صورتوں میں تفقہ کرنی چاہیے، نہ قطعی اور صریحی احکام میں'' (ص:۱۹۵۔۱۹۶)۔

اہلحدیث:

مطلب آپ کا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کام کریں اگر وہ نصوص قرآن میں نہیں

تو وہ حضور کا محض تفقہ اور اجتہاد ہے جو دین میں حجت نہیں، یہی اصل مبحث ہے جو ہم فریقین میں دائر وسائر ہے، ہم اس کو شرعی دلیل جانتے ہیں اور جماعت منکرہ حدیث اس کو وہی کہتی ہے جو اس اقتباس میں مذکور ہے۔

آپ کی ساری کتاب کی اصل غایت اس دعوی کا ثبوت دینا ہے جو آپ نے نہیں دیا، برخلاف اس کے ہم نے کئی آیات سے اپنا دعوی ثابت کیا ہے، ملاحظہ ہو اہلحدیث (مؤرخہ ۲۵/اپریل ۱۹۳۰ء وغیرہ)۔

عجیب تو یہ امر ہے کہ تعمیل احکام میں آپ بھی ہم سے متفق ہیں جس کا ذکر کئی دفعہ کیا گیا، کیوں کہ آپ بھی وضو، تیمم، پنجگانہ نماز اور جمعہ وغیرہ کی ترتیب اسی طرح مانتے ہیں جس طرح ہم (شرعۃ الحق ص: ۲۳۲)، اس لیے اگر کوئی غیر مسلم سوال کرے کہ ایسی نماز کیوں پڑھتے ہو؟ ہم تو کہہ دیں گے کہ قرآن مجید میں نماز کا جو حکم ہے اس کی تعمیل یا تفصیل کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سکھائی ہے اس لیے یہی نماز شرعی ہے۔

حافظ صاحب:

آپ کیا فرمائیں گے۔ آہ ؎

بروز حشر گر پرسند خسرو را چرا کشتی
چہ خواہی گفت قربانت شوم تا من ہماں گوئم

اگر آپ فرمائیں گے کہ یہ مسنونہ نماز شرعی نہیں، تو وہ کہے گا ساری عمر غیر شرعی پڑھتے رہے، اگر کہیں گے کہ شرعی ہے تو وہ کہے گا کہ آپ تو کہتے ہیں کہ قرآن مجمل نہیں۔ (ص: ۲۱۸)

اگر مجمل نہیں تو شرعی نماز جس صورت کی آپ نے لکھی ہے مفصل قرآن سے دکھا

دیں۔

حافظ صاحب:

حدیث کی حجیت کا انکار اور عمل اسی پر: ع

منکر مے بودن و ہمرنگ مستاں زیستن

حافظ صاحب:

نے اس گرفت سے مخلصی کی راہ نکالی ہے، لکھا ہے:

''اے قوم! قرآن مجید کوئی لغت کی کتاب نہیں، مصطلحات کی کتاب نہیں، جس میں لغات اصطلاحات حل کئے جائیں، اور لفظ پیچھے ایام جاہلیت کے اشعار سند میں لائے جائیں، قرآن مجید تو روحانی اور جسمانی ترقیوں اور تکمیل انسانیت کا قانون ہے جو زبان عرب میں نازل ہوا ہے، جسے لوگ بولتے اور سمجھتے تھے تاکہ وہ سمجھیں اور فائز المرام ہوں جیسا کہ مسائل حل طلب کے (نمبر ۱۵)[1] میں بوضاحت اور بدلائل قرآنی ثابت کیا گیا ہے، اس لیے صلاۃ کیا سارے ہی احکام اسی اصول پر دیئے گئے ہیں، جب ہی قوم نے حکم سنا اور اس کی تعمیل کی، یہ غلغلہ بلند ہی نہ ہوا کہ ما الصلاۃ وما الزکاۃ، مثلاً خدا نے فرمایا: ﴿وَٱلسَّارِقُ وَٱلسَّارِقَةُ فَٱقْطَعُوٓا۟ أَيْدِيَهُمَا﴾ [المائدۃ:۳۸] چور مرد یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو (مائدہ، پ:٦، ع:١٠) یہ نہ فرمایا کہ سرقہ کیا چیز ہے اور سارق کسے کہتے ہیں، اسی طرح اس نے فرمایا: ﴿ٱلزَّانِيَةُ وَٱلزَّانِى فَٱجْلِدُوا۟ كُلَّ وَٰحِدٍ مِّنْهُمَا مِا۟ئَةَ جَلْدَةٍ﴾ [النور:۲] زانی اور زانیہ ہر ایک کو سو کوڑے مارو (نور:۷) یہ نہ فرمایا کہ زنا کیا ہے اور زانی کسے کہتے ہیں۔''

اہلحدیث:

اس قتباس کا مطلب یہ ہوا کہ صلاۃ مسنونہ جس کی ترتیب آپ نے (ص: ۲۳۲)

---

[1] اس نمبر میں اتنی بات لکھی ہے کہ قرآن مجید عربی ہے اس لئے عرب اس کو سمجھتے تھے۔ (ص:۱۹۷) (مؤلف)۔

پر لکھی ہے یہ سب قرآن مجید میں مذکور ہے اور عرب العرباء اسی طرح سمجھتے اور عمل کرتے تھے، مگر افسوس ہے وہ ترتیب قرآن میں ہمیں تو کیا اہل قرآن کو بھی نہیں ملتی، حافظ صاحب مع دیگر منکرین ہم کو اتنا ہی بتا دیں کہ بقول آپ کے صبح کی دو مغرب کی تین اور ظہر، عصر اور عشاء کی چار چار رکعتیں ہیں۔ (ص: ۲۳۲)

قرآن مجید کی کونسی سورہ اور کونسی آیت میں یہ تفریق ملتی ہے کہ صبح کی دو، مغرب کی تین، اور باقی تینوں کی چار چار، دکھا دیں گے تو ہم آپ کے مشکور ہوں گے، نہ دکھائیں گے اور خود ہماری صلاۃ کی طرح نماز پڑھیں گے تو ہم اس مسرت میں یہ شعر آپ کو سنائیں گے ؎

راہ پر ان کو لے آئے ہیں ہم باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

قسط: ۳۱

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۲۲ر جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ = ۱۴ر نومبر ۱۹۳۰ء)

گذشتہ پرچہ میں (ص: ۱۹۵۔ ۲۱۸) کا ذکر آچکا ہے، جس میں قرآن مجید کے بعض احکام کے مجمل ہونے کی گفتگو تھی، آج اس سے آگے ملاحظہ کیجیے:

مصنف ممدوح نے (ص: ۲۰۳ سے ص: ۲۶۳) تک عبادات کا ذکر کیا ہے، ہر

عبادت کا ثبوت قرآن سے دیا ہے، جس سے ہمیں بھی انکار نہیں، نہ بحث ہے، بحث اس میں ہے کہ بعض احکام بے شک قرآن مجید میں مذکور ہیں، مگر اس صورت سے نہیں جس صورت سے امت محمدیہ میں تواتر او توارثاً چلے آئے ہیں، مثلاً سب سے مقدم نماز ہے جس کو آپ نے بھی مختلف صورتوں کی بیان فرمایا ہے، صبح کی دو، وغیرہ۔

ناظرین کرام:

حافظ محب الحق صاحب کا پہلے دعوی سن لیجیے، پھر جو ثبوت دیں گے وہ معلوم ہو جائے گا، آپ فرماتے ہیں:

''عبادات کی سرخی میں مجھے چند احکام وہدایات کو بیان کرنا ہے جن کی نسبت قدم قدم پر سوال ہوتا ہے کہ اگر قرآن مجید اپنے مفصل ہونے کے دعوی میں سچا ہے تو ان احکام کو مفصل بتاؤ، اور ان احکام کو اس لیے بھی مفصل دکھانا ہے تا کہ ہر فرقے اپنی اپنی غلطیوں کی قرآن مجید سے اصلاح کریں، اور فرقہ بندی سے تائب ہوکر: ﴿وَٱعۡتَصِمُواْ بِحَبۡلِ ٱللَّهِ جَمِيعًا﴾ [آل عمران: ۱۰۳] سب کے سب خدا کی رسی کو مضبوط پکڑ لیں''۔ (ص: ۲۰۳)

اس کے بعد آپ نے طہارت کا ذکر کیا ہے (صحیح) غسل کا ذکر کیا ہے (مناسب) ہاں وضو کے ذکر میں آپ نے یہ بھی لکھا ہے:۔

''قوم (عرب؟) وضو کو جانتی تھی جیسے غسل کو'' (ص: ۲۰۹)۔

بھلا اگر جانتی تھی تو اتنا کیوں نہ کہہ دیا: ''إذَا قُمْتُمْ إلى الصَّلَاةِ فَتَوَضَّئُوا'' (جب نماز پڑھنے لگو تو وضو کر لیا کرو)۔

برخلاف اس کے یہ فرمایا:

﴿فَٱغۡسِلُواْ وُجُوهَكُمۡ وَأَيۡدِيَكُمۡ إِلَى ٱلۡمَرَافِقِ وَٱمۡسَحُواْ بِرُءُوسِكُمۡ وَأَرۡجُلَكُمۡ إِلَى ٱلۡكَعۡبَيۡنِ﴾ [المائدۃ: ۶]۔

یعنی منہ اور ہاتھ کہنیوں تک اور پیر ٹخنوں تک دھویا کرو اور سر پر مسح کیا کرو۔

آپ تو حافظ قرآن ہیں۔ سارے قرآن میں کہیں وضو کا لفظ بھی آیا ہے؟ ہوتا تو اس تفصیل کی حاجت کیوں ہوتی، اچھا اس سے بھی ہمیں بحث نہیں، آگے چل کر (ص: ۲۱۲) پر تیمم کا ذکر ہے، (ص: ۲۱۴) پر اذان کا، یہ تو آپ نے بتایا کہ اذان کا ثبوت ہے، مگر اذان کے کلمات متوارثہ کا ثبوت قرآن میں کہاں ہے؟ اس کے آگے (ص: ۲۱۵) پر صلاۃ کا ذکر ہے، اس عنوان کے ماتحت آپ نے اس سوال کا جواب دیا ہے جو ہم نے گذشتہ نمبر میں کیا ہے کہ صبح کی دو، ظہر، عصر اور عشاء کی چار چار اور مغرب کی تین کہاں مذکور ہیں، آپ فرماتے ہیں:

''رکعات کی نسبت سورہ نساء کے پندرہویں رکوع میں صلاۃ قصر کو دیکھو، اس نے فرمایا کہ جنگ کے وقت ایک جماعت مسلح رہ کر امام کے پیچھے ایک رکعت پڑھ چکے تو وہ حفاظت کو کھڑی ہو اور دوسری جماعت آکر ایک رکعت وہ پڑھ لے، یہ صلاۃ قصر ہوئی، اور قصر کے معنی نماز کو آدھی کر دینے کے ہیں، تو جب امام کی دو رکعتیں ہوئیں اور مقتدیوں کی ایک ایک، اور یہ آدھی نماز ہے، تو اس سے معلوم ہوا کہ بلحاظ مقتدیوں کے قصر کے اصل نماز دو رکعت ہے اور بلحاظ امام کے قصر کے اصل نماز چار رکعتیں ہیں، یعنی نماز کی یہی دو چار رکعتیں اور تین چار میں داخل ہے، اس لیے نماز کی رکعتیں ۲، ۳، ۴ ہیں، صبح وشام ۲، ۳ اور باقی وقتوں میں چار چار'' (ص: ۲۳۵)۔

اہلحدیث:

یہ عبارت پہلے بھی نقل ہو چکی ہے، سچ تو یہ ہے کہ اس سرخی کو دیکھ کر ہم خوش ہوئے تھے کہ رکعتوں کا ثبوت قرآن سے ہو جائے گا تو ہمیں بھی بہت جگہ کام آئے گا، مگر مضمون پڑھنے سے ثابت ہوا کہ۔

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

ناظرین کرام:

کیا ہی لطیف ثبوت ہے، واللہ اس پر سوال کرنے کو جی نہیں چاہتا، اس لیے ناظرین کی رائے پر چھوڑتے ہیں۔

حافظ صاحب نے کمال کیا کہ صلاۃ کسوف خسوف اور تراویح کا بھی ثبوت قرآن ہی سے دکھایا، چنانچہ فرماتے ہیں:

''صلاۃ کسوف وخسوف بھی انہیں قرآنی اصولوں کے اندر آپ کا تفقہ ہے، فطرت کے وہ انقلابات جو عظمت وجلال کبریائی ظاہر کرتے ہیں، وہ موجب ہوتے ہیں رجوع الی اللہ کے، صلاۃ کسوف وخسوف رجوع الی اللہ کی ایک نہایت مقدس شان ہے، اور اظہار ہے اس کا کہ اے آفتاب پرستو! دنیا میں سورج کی تاثیرات کو دیکھ کر جو سورج کی پرستش کرتے ہو اس وقت دیکھ لو کہ اس قادر، قیوم نے اس کے اثر کو روک دیا، اس لیے اس فعال مطلق کی عبادت کرو، وہ مستحق عبادت ہے اس کے آگے جھکو اس کا وہی مستحق ہے'' (ص:۲۴۱)۔

حافظ صاحب:

اس سے تو ثابت ہوا کہ کوئی شخص کسی لڑکے کو اتنی مدت بعد دیکھے کہ اس میں بہت زیادہ تغیر آ چکا ہو تو اسے دیکھ کر بھی نماز پڑھے اور انقلاب زندہ باد کہے، خوب۔

قسط: ۳۲

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۲۹/جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ=۲۱/نومبر ۱۹۳۰ء)

گذشتہ پرچہ میں ''شرعۃ الحق'' کے (ص:۲۴۱) تک ذکر ہوا ہے اس میں صلاۃ کسوف وخسوف کے متعلق مصنف ''شرعۃ الحق'' کی عبارت نقل ہوئی ہے، آج اس سے آگے۔

نماز تراویح:

کی بابت اس سے بھی لطیف تر فرمایا:

''صلاۃ التراویح انہیں اصولوں پر خلیفہ دوم نے قائم کی، نماز تو محبت کے ساتھ شان تقدیس خداوندی کی طرز مستی ہے، کسی عاشق سے پوچھو وہ نوافل نہ پڑھے تو کیا کرے مگر صلاۃ تراویح نے علاوہ عبادت ہونے کے استحفاظ قرآن مجید کا وہ رنگ نکالا جس کی رنگینی سے اسلامی دنیا رنگا رنگ ہے'' (ص:۲۴۱)۔

حافظ صاحب:

کیا اسی کا نام قران مفصل ہے، ایسا مفصل تو ہم بھی مانتے ہیں پھر آپ ہم سے جدا کیوں ہوئے؟

(ص:۲۴۴، سے ص:۲۶۲) تک صوم اور حج کا بیان کیا ہے، اس میں وہی احکام بیان کیے ہیں جو قرآن مجید میں ان دو حکموں کی بابت آئے ہیں، صرف (ص:۲۶۰) پر اتنا لکھا ہے کہ:

’’رمی الجماراور بوسۂ حجر اسود کا ذکر تو قرآن مجید میں نہیں ہے، اس لیے یہ حج میں داخل نہیں، یہ بعد کے اضافے ہیں، مگر تاریخ سے یعنی حدیث سے بیان کیا جاتا ہے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فعل ہے، میں تو اس حدیث کو تسلیم نہیں کرتا کہ یہ اضافہ علی القرآن ہے‘‘ (ص: ۲۶۰)۔

جواب:

ایسے کئی ایک اضافے پہلے ہم بتا چکے ہیں، جمعہ کا خطبہ، صلاۃ تراویح، صلاۃ کسوف وغیرہ بھی تو اسی قسم کے اضافے ہیں۔

ناظرین:

باوجود اس انکار کے حافظ صاحب تقبیل حجر اسود کی شرح فرماتے ہیں:

’’بوسہ حجر اسود کے معنی یہ ہیں کہ عاشق تیری چوکھٹ کا پتھر چوم کے رخصت ہوتا ہے اور دل میں اور بھی درد بھر کر لیے جاتا ہے کہ اے غیب الغیب! اے وراء الوراء! تیرا دیوانہ دوڑا دھوپا، کہاں سے کہاں مارا پھرا، ادھر دوڑا ادھر دوڑا اور تو غیب الغیب ہی رہا، جو کچھ ان تجلی گاہوں میں دیکھا، تو وہ تجلی طور تھی، تو نہ تھا ’’اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ، واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد‘‘ تو وہم وفہم دیدوشنید اور جذبات ریاضت سے اعلیٰ تر ہے اور تو ہی حمد حقیقی کا مستحق ہے، پھر حجر اسود کا بوسہ پتھر کی عظمت سے نہیں بلکہ یہ تو مجنوں کے لیے مقام آہ وفریاد اور رخصت کے وقت بھرے دل سے چوکھٹ چومنا ہے‘‘۔ (ص: ۲۶۰)۔

حافظ صاحب!

ہم آپ کے مشکور ہیں کہ آپ ایک ایسے فعل کی حکمت بتاتے ہیں جس کو آپ شرعی فعل نہیں جانتے۔

(ص: ۲۶۳) سے (ص: ۲۷۸) تک حرام حلال کا بیان کیا ہے اس میں صرف ایک بات ہمارے خلاف کہی ہے، جو یہ ہے:

”سواری کے جانوروں سے سواری کی خدمت لو، اور جو جانور کھائے جاتے ہیں انہیں کھاؤ، یہ خدا کی ہدایت ہے، گھوڑے، خچر، ہاتھی وغیرہ سواری کے جانور ہیں تو انہیں کھاؤ نہیں ان سے سواری کا کام لو“ (ص:۲۶۶)۔

حافظ صاحب:

اگر کوئی اہل قرآن آپ کو یہ آیت سنا دے: ﴿قُل لَّآ أَجِدُ فِي مَآ أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُۥٓ إِلَّآ أَن يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَّسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنزِيرٍ فَإِنَّهُۥ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ ٱللَّهِ بِهِۦ﴾ [الانعام:۱۴۵][1] اور وہ پوچھے کہ جن گھوڑے، خچروں وغیرہ کو آپ نے حرام قرار دیا ہے اس فہرست میں ان کا ذکر کیوں نہیں؟ تو آپ کیا جواب دیں گے۔

مشکل بہت پڑے گی برابر کی چوٹ ہے

تعجب ہے:

آپ نے خود ہی آگے آیت لکھی، بغور ملاحظہ ہو:

”آپ ﷺ سے حلال وحرام کی نسبت لوگوں نے پوچھا تو آپ نے بحکم خداوندی جواب دیا: ﴿قُل لَّآ أَجِدُ فِي مَآ أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُۥٓ إِلَّآ أَن يَكُونَ مَيْتَةً﴾ الخ، کہہ دو اے رسول کہ کسی کھانے والے پر جو وہ کھائے ہم قرآن مجید میں مردار وغیرہ وغیرہ کے سوا اور کوئی چیز حرام نہیں پاتے۔ اور فاضل چیزوں کی نسبت جس کا بیان کتاب اللہ میں نہیں، خدا نے افترا علی اللہ فرمایا ہے: ﴿قُلْ أَرَءَيْتُم مَّآ أَنزَلَ ٱللَّهُ لَكُم مِّن رِّزْقٍ فَجَعَلْتُم مِّنْهُ حَرَامًا وَحَلَٰلًا قُلْ ءَآللَّهُ أَذِنَ لَكُمْ أَمْ عَلَى ٱللَّهِ تَفْتَرُونَ﴾

[1] اے رسول! آپ کہہ دیجئے کہ میں اس وحی میں جو میری طرف کی جاتی ہے ان چار چیزوں کے سوا کوئی چیز حرام نہیں پاتا، خود مردہ، جاری خون، لحم خنزیر اور غیر اللہ کے نام کی مقرر کی ہوئی۔ (مؤلف)۔

[یونس:۵۹] ’’اے رسول! کہہ دو بھلا دیکھو تو سہی کہ اللہ نے جو رزق تمہارے لیے اتارا تو ان میں سے بعض کو تم نے حلال وحرام ٹھہرا لیا، کہہ دو آیا اللہ نے حکم دیا ہے یا تم اللہ پر بہتان باندھتے ہو۔ حاشا آپ اپنی طرف سے حلال وحرام نہ فرماتے تھے‘‘ (ص:۱۷۰۔۱۷۱)۔

حافظ صاحب:

جب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سوائے وحی الٰہی کے کسی چیز کو حرام نہ فرماتے تھے تو آپ نے کیوں گھوڑا وغیرہ کھانے سے منع کرنے کو فرمایا، ’’گھوڑے وغیرہ کو کھاؤ نہیں‘‘۔

قسط: ۳۳

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۷/رجب ۱۳۴۹ھ = ۲۸/نومبر ۱۹۳۰ء)

گذشتہ پرچہ میں (ص:۲۷۰) تک لکھا گیا ہے اس سے آگے درج ذیل ہے۔

اسی طرح آپ کا یہ فرمانا کہ:

’’سونے اور ریشم اور گانے کی حرمت کی آیت پیش کرو، اگر کوئی آیت نہیں ہے تو اس کی حرمت کی حدیث کس طرح آنحضرت کی تسلیم ہو سکتی ہے، آپ نے قرآن سے فاضل حرام کیا ہی نہیں‘‘ (ص:۲۷۱)۔

جواب:

یہ سوال اس وقت ہو سکتا ہے جب ہم کو بھی یہ اصول تسلیم ہو، لیکن ہم تو شروع سے

کہتے چلے آئے ہیں اور بارہا ثبوت بھی دے چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام حدیثیہ ہوتے تو وحی سے تھے لیکن یہ ضروری نہ تھا کہ قرآن شریف میں موجود ہوں جیسے خطبہ جمعہ، اور تعیین رکعات وغیرہ آپ بھی مانتے ہیں، سونا ریشم بھی اسی قسم سے ہیں۔ پس جب تک آپ جمعہ، جماعت اور خطبہ وغیرہ نہ چھوڑیں ہم سے ان باتوں کی بابت سوال نہیں کر سکتے۔

لطیفہ:

حافظ صاحب کو قرآن فہمی کا دعوی ہے جو ایک مبارک بات ہے آپ نے اس دعوی پر (کہ اللہ ہی حرام کرنے والا ہے، نبی یا رسول نہیں) یہ آیت لکھی ہے: ﴿قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ ۖ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا﴾ الآیہ [الانعام:۱۵۱] اس کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

"اے رسول! کہہ دو آؤ میں تم کو پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے خدا نے تم پر کیا کیا چیزیں حرام کی ہیں وہ یہ ہیں کہ کسی کو خدا کا شریک نہ ٹھہراؤ"۔

حافظ صاحب!

خدا کا شریک ٹھہرانا حرام ہے یا نہ ٹھہرانا؟ نہ ٹھہرانا حرام ہے تو شریک واجب ہوگا کیوں کہ ماہ رمضان میں روزہ نہ رکھنا حرام ہے تو روزہ رکھنا فرض واجب ہوگا (یقیناً) پس آپ ذرہ سوچ سمجھ کر جواب دیجیے گا جلدی کی ضرورت نہیں۔

(ص: ۲۷۲ سے ۳۱۴) تک اصلاح تمدن نکاح، طلاق، خلع، سرقہ وغیرہ لکھے ہیں، جو قابل بحث نہیں، (ص: ۳۱۵) پر مسئلہ زنا لکھا ہے، زنا کی سزا میں رجم کے انکار پر بحث کی ہے، اصل الفاظ یہ ہیں:۔

"اب لوگوں نے قرآن پر اصلاح دی اور لگے خدا کی غلطیاں چننے اور محصن وغیر محصن میں اور

محصنہ اور غیر محصنہ میں فرق نکالنے، غیر محصن کو کوڑے کی سزا تجویز کی، اور محصن کے لیے سنگسار کرنا، خدا تو ایک حکم فاجلدوا فرمائے اور یہاں دوسرا حکم سنگسار کا بھی نکالا جائے، چوں کہ سنگسار کا حکم: ﴿فَٱحۡكُم بَيۡنَهُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ﴾ [المائدۃ:۴۸] کے خلاف ہے، چوں کہ سنگسار کا حکم: ﴿فَٱسۡتَمۡسِكۡ بِٱلَّذِيٓ أُوحِيَ إِلَيۡكَ﴾ [الزخرف:۴۳] کے خلاف ہے، اس لیے سنگسار کا حکم ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نہیں ہوسکتا، ایسی حدیث جو پائی جاتی ہے، وہ آپ کی نہیں۔

درے کی جگہ پر سنگسار کرو گے تو خدا کا حکم اٹھ جائے گا، عدول حکمی ہوگی اور حدود اللہ ٹوٹ جائیں گے، سنگسار کا حکم قرآن مجید میں کہیں نہیں ہے، اور آنحضرت علیہ الصلاۃ والسلام احکام دین بما انزل اللہ دیا کرتے تھے'' (ص:۳۱۵، ۳۱۶)۔

اہلحدیث:

یہ اعتراض اسی قسم کا ہے جو منکرین حدیث (اہل قرآن) بات بات پر کیا کرتے ہیں، یہ قرآن میں نہیں، وہ نہیں، ان سب کا جواب ایک ہی ہے کہ واقعی نہیں، لیکن پیغمبر صاحب وحی خدا کی وحی سے ایسا کرنے کا مجاز ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ عموم قرآنی کی تخصیص، مجمل قرآنی کی تفصیل حدیث سے ہوسکتی ہے، چنانچہ آپ کا بھی اس پر عمل ہے، اسی لیے آپ بھی جمعہ، جماعت اور خطبہ وغیرہ کے قائل ہیں جس کی تفصیل سابق میں کئی دفعہ ہو چکی ہے۔

ہاں آپ نے جو اپنے دعوی پر آیت لکھی ہے وہ قابل غور ہے، چنانچہ آپ کے الفاظ یہ ہیں اگر:

''الشَّیْخُ وَالشَّیْخَةُ إِذَا زَنَیَا فَارْجُمُوھُمَا'' کو خدا کا کلام منزل مانو اور رجم کا حکم اس آیت مفروضہ سے نکالو تو یہ ظلم ہے، کیوں کہ خدا کے کلام کی کوئی آیت نہیں، چوں کہ: ﴿وَإِنَّا لَهُۥ لَحَٰفِظُونَ﴾ [الحجر:۹] کے خلاف ہے، اس کے سوا شیخ کے معنی محصن کے نہیں ہیں۔

اس فرمان کی طرف بھی خیال کرو: ﴿فَإِذَآ أُحۡصِنَّ فَإِنۡ أَتَيۡنَ بِفَٰحِشَةٖ فَعَلَيۡهِنَّ نِصۡفُ مَا عَلَى ٱلۡمُحۡصَنَٰتِ مِنَ ٱلۡعَذَابِ﴾ [النساء: ۲۵]، یعنی مملوکہ زانیہ کی سزا خدا نے نصف سزائے محصنات فرمایا، اور رجم نصف نہیں ہوسکتا، دوسرے خدا نے سارے گناہوں کو بتادیا سب کی سزائیں فرمادیں، زنا کو بھی منع فرمایا اس کی سزا بھی درے لگانا تجویز فرمادی، پھر یہ بھی تاکید فرمادی کہ درے مسلمانوں کی ایک جماعت کے سامنے لگائے جائیں، یہ بھی فرمادیا کہ درے لگانے میں رحم نہ کیا جائے، ساری باتیں جزئیات تک تو مشرح بیان ہوں اور محصن اور محصنہ کے لیے رجم کا حکم ہی رہ جائے اور ایسا مہتم بالشان حکم'' (ص: ۳۱۶)۔

قسط: ۳۴

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۱۴/ رجب ۱۳۴۹ھ = ۵/ دسمبر ۱۹۳۰ء)

اہلحدیث:

جس آیت سے آپ نے استدلال کیا ہے وہ ساری یوں ہے:

﴿وَمَن لَّمۡ يَسۡتَطِعۡ مِنكُمۡ طَوۡلًا أَن يَنكِحَ ٱلۡمُحۡصَنَٰتِ ٱلۡمُؤۡمِنَٰتِ فَمِن مَّا مَلَكَتۡ أَيۡمَٰنُكُم مِّن فَتَيَٰتِكُمُ ٱلۡمُؤۡمِنَٰتِۚ وَٱللَّهُ أَعۡلَمُ بِإِيمَٰنِكُمۚ بَعۡضُكُم مِّنۢ بَعۡضٖۚ فَٱنكِحُوهُنَّ بِإِذۡنِ أَهۡلِهِنَّ وَءَاتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ بِٱلۡمَعۡرُوفِ مُحۡصَنَٰتٍ غَيۡرَ مُسَٰفِحَٰتٖ وَلَا مُتَّخِذَٰتِ أَخۡدَانٖۚ

فَإِذَآ أُحۡصِنَّ فَإِنۡ أَتَيۡنَ بِفَٰحِشَةٖ فَعَلَيۡهِنَّ نِصۡفُ مَا عَلَى ٱلۡمُحۡصَنَٰتِ مِنَ ٱلۡعَذَابِۚ﴾[النساء:۲۵]۔

(اور تم میں سے جس کو مسلمان بیبیوں سے نکاح کرنے کا مقدور نہ ہو تو خیر لونڈیاں (ہی سہی) جو (کافروں کی لڑائی میں) تم مسلمانوں کے قبضہ میں آجائیں، بشرطیکہ ایمان رکھتی ہوں، اور اللہ تمہارے ایمان کو خوب جانتا ہے (آدم زاد ہونے کے اعتبار سے) تم ایک دوسرے کے ہم جنس ہو، پس (بے تامل) لونڈی والوں کے اذن سے ان کے ساتھ نکاح کرلو اور دستور کے مطابق ان کے مہران کے حوالے کردو، مگر شرط یہ ہے کہ قید (نکاح) میں لائی جائیں (اور) نہ (تو تم سے) بازاری عورتوں کا سا تعلق رکھنا چاہتی ہوں اور نہ خانگیوں کا سا، پھر اگر قید (نکاح) میں آئے پیچھے کوئی بے حیائی کا کام کریں تو جو سزا بی بی کی اس کی آدھی لونڈی کی)۔

اس میں غور طلب بات یہ ہے کہ ''علی المحصنات'' میں ''محصنات'' کے کیا معنی ہیں؟ کچھ شک نہیں کہ اس آیت کے شروع میں ''المحصنات'' کا لفظ آیا ہے جس سے آزاد (غیر منکوحات) مراد ہیں، کیوں کہ ابھی فعل نکاح ان پر وارد نہیں ہوا، کلام کے آخر میں بھی یہی لفظ آیا ہے جس سے بقرینہ حالیہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی آزاد (غیر منکوحہ) عورت سے نکاح کرنے کی طاقت نہ رکھے وہ کسی کی لونڈی سے نکاح کرلے، پھر وہ لونڈی بعد نکاح کے بدکاری کرے تو اس پر آزاد (غیر منکوحہ) کی سزا سے نصف سزا ہے، اس سے ہم کو بھی انکار نہیں، کہ غیر منکوحہ پر سنگسار نہیں بلکہ (مائۃ جلدۃ) سو بید سزا ہیں۔

اگر اس پر زور دیا جائے کہ: ﴿مَا عَلَى ٱلۡمُحۡصَنَٰتِ﴾ میں ''المحصنات'' منکوحہ اور غیر منکوحہ بہر دو صنف کو شامل ہے پھر تم کیوں اس جگہ خاص غیر منکوحہ مراد لیتے ہو تو

اس کا جواب یہ ہے کہ مسئلہ ہذا در حقیقت تخصیص عام کے اصول پر مبنی ہے جس کی نظائر قرآن مجید میں بکثرت ہیں ۔مثلا:﴿ إِنَّ ٱلْإِنسَـٰنَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ ﴾ [ابراہیم: ۳۴] ﴿ وَكَانَ ٱلْإِنسَـٰنُ قَتُورًا ﴾ [الاسراء:۱۰۰] وغیرہ ،جس طرح اس ''عام انسان'' سے خاص نوع ''کافر'' مراد ہے، اسی طرح یہاں ''المحصنات'' سے غیر منکوحہ مراد ہیں بقرینہ سابقہ۔

نوٹ:

کسی اہل علم کو خیال ہو کہ منطقی اصطلاح میں ''الانسان'' مہملہ سے عام نہیں تو اسی طرح ''المحصنات'' کو سمجھ لینا چاہیے،سواء بسواء۔

منکرین حدیث:

کے عمل میں بھی اس کی نظیر ملتی ہے کہ قرآن مجید میں:﴿ إِذَا نُودِىَ لِلصَّلَوٰةِ مِن يَوْمِ ٱلْجُمُعَةِ فَٱسْعَوْا۟ إِلَىٰ ذِكْرِ ٱللَّهِ ﴾[الجمعة:۹] عام ہے یعنی صبح سے شام تک جس وقت بھی نماز کے لیے بلایا جائے تو چلے آؤ، مگر اہل قرآن کے جملہ اصناف عملی طور پر متفق ہیں کہ اس سے مراد ظہر کا وقت ہے، جسے نماز جمعہ کہتے ہیں ،کیا یہ عموم قرآنی کی تخصیص نہیں ۔پس ؎

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

اس کے بعد (ص: ۳۱۷ سے ۳۳۸) تک مختلف مضامین قرآنیہ لکھے ہیں ،مثلا: احکام مالی،اسراف،صدقہ وغیرہ،جن میں کوئی خاص بات قابل بحث نہیں۔

(ص:۳۳۸) پر زکاۃ کا ذکر کیا ہے چوں کہ علماء حدیث کے نزدیک زکاۃ بھی صلاۃ کی طرح قرآن میں مجمل صورت سے مذکور ہے اس کی تفصیل کا پتہ نہیں چلتا اور فاضل مصنف کا دعوی ہے کہ سوائے قرآن کے کوئی کتاب شرعی نہیں اس لیے پہلے تو

آپ نے نماز کی طرح زکاۃ کو معلوم العوام کے وصف سے یاد کیا، مگر آخر کار ہاتھ بڑھا کر ہم سے مصافحہ کرلیا۔ الحمدللہ۔

ہم اپنے اس دعوی کو مصنف کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں، آپ فرماتے ہیں:

''جس طرح صلاۃ اگلوں پر فرض تھی اسی طرح زکاۃ بھی، جس طرح صلاۃ ازلی ہے اسی طرح زکاۃ بھی، تو جس طرح صلاۃ ہم پر فرض ہوئی اسی طرح زکاۃ بھی، صلاۃ مصطلح قوم فرض ہوئی زکاۃ بھی مصطلح قوم ہی فرض ہوئی، قوم صلاۃ کو جانتی تھی تو زکاۃ کو بھی، جس طرح قوم نے یہ غلغلہ بلند نہ کیا کہ ''ماالصلاۃ'' اسی طرح قوم نے یہ صدا بلند نہ کی کہ ''ماالزکاۃ''، زکاۃ کی فرضیت بھی قطعی ہے، ظنیات پر مبنی نہیں، زکاۃ کی اصطلاح بھی کوئی فرشتوں کی اصطلاح نہیں۔ جس کو واضح کرنے کا کوئی فرشتہ مجاز ہو، عربی زبان کا لفظ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عرب تھے، فرشتوں سے بڑھ کر اس اصطلاح کو واضح کرنے کے آپ مستحق تھے، اور سارے عرب اس اصطلاح سے واقف تھے، کیوں کہ یہ انہی کی زبان کا لفظ ہے، اسی لیے لوگ مسلمان ہوتے آئے اسلام لائے، حکم سنا، تعمیل کی، کسی نے بھی آج تک یہ اعتراض نہ کیا کہ قرآن مجید انوکھی اصطلاح میں اترا ہے اور خدا نے بھی تو یہی فرمایا: **کذلک** ﴿إِنَّآ أَنزَلۡنَٰهُ قُرۡءَٰنًا عَرَبِيّٗا﴾ [یوسف:۲] ''ہم نے قرآن عربی زبان میں نازل کیا ہے'' اک خاص نمبر میں اس کو واضح کیا جا چکا ہے'' (ص:۳۳۹)۔

قسط: ۳۵

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۲۱/رجب ۱۳۴۹ھ = ۱۲/دسمبر ۱۹۳۰ء)

گذشتہ پرچہ میں زکاۃ پر بحث چلی آئی جس کے متعلق ''شرعۃ الحق'' (ص:۳۳۹) کی عبارت منقول ہو چکی ہے جس میں مصنف نے زکاۃ کو مثل صلاۃ کے معلومہ قوم لکھا ہے، اس کے جواب میں گذارش ہے۔

اہلحدیث:

اس اقتباس کے بعد حافظ صاحب نے حضرات انبیاء کرام، ابراہیم، اسحق، یعقوب، عیسی علیہم السلام کے ذکر میں، الصلاۃ کا حکم بتایا ہے مگر اتنے سے کام نہ چلنا خود ان کو بھی محسوس ہوا کیوں کہ یہ آیات سب مجملہ ہیں، اس لیے دست قدرت نے آپ سے مندرجہ ذیل عبارت لکھوائی جو غور سے سننے کے قابل ہے، آپ نے فرمایا:

''زکاۃ مصطلح قوم تو تھی، مگر تحقیق طلب یہ ہے کہ زکاۃ کی اصطلاح تھی کیا اور وہ کس مفہوم میں سمجھی جاتی تھی، اگر ہم اس تحقیق میں ناکام بھی ہوں تو اس سے میرا جہل ثابت ہوگا اور اصطلاح کی واقفیت سے مجبوری، مگر اس سے قرآن مجید خدا کے دعوی کے خلاف مجمل نہ ہو جائے گا۔

میں نے قرآن مجید سے دکھایا کہ زکاۃ ازلی فرض ہے اس لیے اصطلاح سے قوم واقف تھی، خدا نے زکاۃ کا حکم دیا قوم سمجھی اور اس پر عمل پیرا ہوئی، اس لیے زکاۃ کی اصطلاح عمل متواتر سے منکشف ہوگی، عمل متواتر میں جہاں تک اتفاق ہوگا اس سے اصطلاح زکاۃ واضح ہوگی، اور جہاں اختلاف ہوگا وہ عمل مجاز کی صورت تسلیم ہوگی، کیوں کہ افعال مجاز کے سوا فرض قطعی میں اختلاف ہو نہیں سکتا۔

عمل متواتر سے واضح ہوتا ہے کہ زکاۃ ایک سالانہ خدائی خراج ہے جو بحکم رب العالمین امیروں سے لیا جاتا اور مستحقوں کو دیا جاتا ہے (فرقہ نیشنلسٹ کو اپنے غیر معتدل اور خلاف فطرت خیال کو اعتدال پر لاکر اس کی حمایت میں کھڑا ہونا چاہیے کہ اس کی مانگی مراد حقیقت میں اسی راہ سے مل سکتی جو خلاق فطرت کی بنائی ہوئی ہے) یہ خراج ازلی وابدی ہے، ظلماً نہیں ہے، بلکہ نفعاً للغرباء ہے اور فاضل از ضرورت میں اگر کوئی عاقل بالغ مقروض نہ ہو تو تجارت اور پیداوار کی مخصوص چیزوں میں مقدار معین براک مقدار معین مستحقین کے لیے نکال دینا اس پر لازم ہے، یہی زکاۃ ہے، اور مفروضہ خداوندی'' (ص: ۳۴۱۔ ۳۴۲)۔

جناب حافظ صاحب:

بس اب ساری بحث مرکز پر آ گئی، آپ یہ بتادیں کہ وہ عمل متواتر قرآن ہے یا حدیث، قرآن تو کہہ نہیں سکتے کیوں کہ قرآن مجموعہ احکام ہے، عمل تو فعل عاملین کا ہے، قرآن کا نہیں، پس وہ عمل متواتر جس سے زکاۃ کی ادائیگی آپ کو معلوم ہوئی وہ حدیث ہے، تو پھر قرآن کے احکام (صلاۃ، زکاۃ) کے مجمل اور حدیث کی تفصیل ہونے میں کیا شبہ رہا۔

اس کے علاوہ:

مقدار مال اور مقدار زکاۃ پر بھی کچھ لکھا ہے، چنانچہ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

''مقدار معین پر مقدار معین زکاۃ حسب ذیل ہے:۔ مثلاً از قسم حیوان: اونٹ، بیل، اور بکرے میں، از قسم نباتات: پھل، اور اجناس میں، از قسم معدنیات: سونے اور چاندی میں۔ اونٹ اگر پانچ سے فاضل ہوں، گائے، بیل، اگر تیس سے فاضل ہوں، بھیڑ، بکرے اگر چالیس سے فاضل ہوں تو ایک بھیڑ یا ایک بکرا زکاۃ ہے، پھل اور اجناس میں عشر یعنی دسواں حصہ: ﴿وَءَاتُوا۟ حَقَّهُۥ يَوْمَ حَصَادِهِۦ﴾ [الانعام: ۱۴۱] کٹنے ہی کے دن اس کا حق نکال دو، سونا مسکوک ہو یا غیر مسکوک، اگر ۲۰ مثقال سے فاضل ہو اور چاندی بھی غیر مسکوک ہو یا مسکوک، اگر دوسو درہم سے

فاضل ہوتو چالیسواں حصہ سال میں ایک دفعہ زکاۃ دینا ہوگا'' (ص: ۳۴۲۔۳۴۳)۔

اہلحدیث:

کیوں صاحب! پانچ اونٹ اور بیس مثقال سونے والا توحکم زکاۃ کا مکلف ہو، مگر چار اور ۱۹ والا مکلف نہ ہو، یہ تفریق کس دلیل سے؟ زکاۃ کا حکم چوں کہ قرآن مجید سے ثابت ہے، جو قطعی ہے تو اسی طرح جس دلیل سے آپ نے یہ حکم صرف پانچ اونٹوں اور بیس مثقالوں تک محدود کیا ہے وہ دلیل بھی تو قطعی اور شرعی ہونی چاہیے، اب بتایئے وہ دلیل کیا ہے؟ ہم آپ کے الفاظ میں ناظرین کو سنانا چاہتے ہیں، جو یہ ہیں:

''پس اصطلاحاً زکاۃ اسی کو کہتے ہیں، یہ اصطلاح کی تحقیق عمل متواتر سے بھی ہوتی ہے، اور تاریخ مذہب، یعنی حدیث سے بھی'' (ص: ۳۴۴)۔

ناظرین کرام: بس ساری بحث کا یہی مرکز ہے بقول جناب حافظ محب الحق صاحب مصنف ''شرعۃ الحق'' حدیث نبوی شرعی دلیل نہیں، بلکہ مذہبی تاریخ ہے، لیکن قوت اس کے اندر ایسی ہے کہ مذہبی دلیل (قرآن مجید) کو بھی مخصوص کر دیتی ہے، یعنی قرآن مجید میں حکم ہے ﴿أَنفِقُواْ مِمَّا رَزَقْنَاكُم﴾ [البقرۃ: ۲۵۴] (جو بھی تم کو ہم نے دیا اس میں سے خرچ کرو)، یہ ''مارزقنا'' عام ہے، ایک سیر ہو یا پاؤ یا تولہ، پانچ اونٹ یا بیس یا دو، پھر تاریخ مذہب (حدیث شریف) کو اس میں کیا دخل، اور آپ جلدی سے اس کا دخل مان جائیں۔ فإلی اللہ المشتکی۔

اس کے ساتھ ساتھ آپ کا یہ ارشاد بھی ہدایت بنیاد ہے، جو آپ نے فرمایا:

''مگر وہ ماخذ استاد کی جگہ ہماری جہالت اور لاعلمی دور کرنے والے ہو سکتے ہیں، داخل دین ہو کر دین اللہ نہیں ہو سکتے، نہ قرآن مجید کی قطعیت چھین سکتے ہیں، نہ اصطلاح کی لاعلمی سے تم کو قرآن مجید کو مجمل کہنے کا حق ہو سکتا ہے'' (ص: ۳۴۳)۔

ناظرین!

حافظ صاحب کی محنت کی ہم داد دیتے ہیں کہ شروع کتاب میں جو موضوع (انکار حدیث) قرار دیا تھا آہستہ آہستہ سے ترک کر کے اصلیت پر آرہے ہیں۔

مبارکباد:

حدیث کو آپ (حافظ محب الحق صاحب) مثل استاد کے تسلیم کرتے ہیں، اب بات صرف اتنی سمجھنی رہ گئی کہ استاد شاگرد کو کتاب کے صرف الفاظ سنا دیا کرتا ہے یا ان کی تشریح اور تفصیل بھی کیا کرتا ہے، اس کا جواب مدارس کے معلم و متعلم دونوں دے سکتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

قسط: ۳۶

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۲۸/رجب ۱۳۴۹ھ = ۱۹/دسمبر ۱۹۳۰ء)

فاضل مصنف نے مسئلہ زکاۃ میں خود ہی اظہار فرمایا ہے کہ: ''زکاۃ کا نصاب اونٹ ہوں تو پانچ سے کم پر زکاۃ نہیں، سونا ہو تو بیس تولہ سے کم پر نہیں'' (گذشتہ اہل حدیث: (ص: ۱۴) کالم ۲)۔

ہاں صاحب:

جس حدیث سے اونٹوں کی تعداد پانچ اور سونے کی مقدار بیس تولے ثابت ہوئی اسی حدیث کو آپ اپنے لیے دافع جہالت اور معلم مطالب قرار دیتے ہیں، تو بس اب

اس کی مثال بالکل یہ ہوئی:

''آپ نے اپنے نوکر کو حکم دیا گھر سے کھانا لاؤ، آپ کے اہل بیت نے دودھ میں ڈبل روٹی بھگو کر پیالے میں رکھ کر حوالہ کی، نوکر کے خیال میں یہ کھانا نہیں وہ سمجھتا ہے کہ کھانا روٹی یا چاول ہوتے ہیں''۔

اب ہم آپ سے پوچھتے ہیں، کھانے کے لفظ کو جو آپ کے اہل بیت نے ڈبل روٹی سے مخصوص کیا ہے آپ کا منشاء معلوم کر کے کیا ہے یا ازخود کر دیا؟ غالباً آپ بھی یہ نہ کہیں گے کہ ازخود کر دیا، بس اسی طرح خدا کے سچے رسول خدا کی منشاء کے مطابق کسی جگہ عموم قرآن کو بشکل خاص بتایا کرتے ہیں، کسی جگہ خاص کو بصورت عام، جس کے ماننے میں اہل ایمان کو پس وپیش نہیں ہوتا، جیسا کہ آپ نے بھی تسلیم کیا، جزاکم اللہ۔

سچ تو یہ ہے کہ مسئلہ زکاۃ میں تو آپ نے مصالحت کا ہاتھ ہماری طرف بڑھایا ہے، مگر ایک فقرہ خدا جانے آپ نے کیوں لکھ دیا:

''حدیث کا عام مفہوم سمجھا گیا کہ قول وفعل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہو نہ ہو مگر حدیث کی کتاب میں ہو تو ہو بلا شک وشبہ قول وفعل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے، حالاں کہ یہ حدیث رسول کی نہیں ہوسکتی'' (ص:۳۴۵)۔

حالاں کہ یہ قول صحیح نہیں، اصول حدیث میں مرفوع، موقوف، اثر وغیرہ کی اصطلاح مفصل لکھی ہے، آپ نے خود بھی (ص:۱۹) پر یہ اصطلاحات نقل کی ہیں پھر یہ الزام کس پر؟ ہم پر یا اپنے بڑھاپے پر؟

(ص:۳۴۷ سے ۳۵۶) تک آپ نے نفقہ کے عنوان سے مضمون لکھا ہے جو اصولاً کسی طرح ہمارے خلاف نہیں۔

(ص:۳۵۶ سے ۳۶۱) تک قرض حسنہ کا بیان ہے، وہ بھی اصولاً مسئلہ انکار حدیث سے تعلق نہیں رکھتا، اس لیے چنداں قابل التفات نہیں۔

(ص:۳۶۱ سے ۳۷۷) تک مسئلہ ربا لکھا ہے، جو بلحاظ موضوع کتاب (انکار حدیث) کے قابل التفات نہیں، کیوں کہ اس میں ایک سطر بھی انکار حدیث کے دعوی پر دلیل نہیں، بلکہ مصنف نے کمال صداقت سے (ص:۳۶۵) پر حدیث ''كل قرض جر منفعة''[1] کو بڑی عزت کے ساتھ قبول کیا ہے۔

ہاں چلتے چلتے ایک فقرہ یہ بھی لکھ دیا ہے:

''ایسے حال میں خلیفہ دوم کی وہ حدیث کس طرح صحیح ہوسکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے اور ربا کا معاملہ نہ پوچھنے کے سبب ناصاف اور مجمل رہ گیا، حالاں کہ ناصاف کیا رہا، ربا کا معاملہ جو قوم میں جاری تھا اور جسے ہر کوئی سمجھتا تھا اور جسے بوجہ افراد قوم میں سے ہونے کے خود خلیفہ دوم نے بھی سمجھا ہوگا، وہ حرام ہوا، نہ اس سے زیادہ، نہ اس سے کم، پھر ناصاف کیا رہا، خدائی احکام ہرگز ناصاف نہیں ہوتے اس لیے وہ حدیث صحیح نہیں ہوسکتی، فرمودۂ خلیفہ نہیں ہوسکتی'' (ص:۳۶۳)۔

اہلحدیث:

آپ بوجہ کبرسنی اپنا زمانہ طلب علم بھول گئے ہوں گے، کسی طالب علم سے پوچھئے کہ جس روز وہ سبق میں شریک نہیں ہوتا، چاہے وہ سبق آسان بھی ہو، افسوس کرتا ہے کہ استاد کی تقریر نہ سنی، حدیث کو آپ استاد کی مانند مانتے ہیں صحابہ کرام بھی ایسا ہی جانتے تھے، اس لیے وہ بزبان صاحب الوحی آیت ربا کی تشریح نہ سننے پر افسوس کریں تو کیا اعتراض؟

لطیفہ:

امرتسر میں جن منکرین حدیث اصحاب نے آپ کو اپنے جلسہ میں تشریف آوری کی

---

[1] بغية الباحث (زوائد مسند الحارث): (۱/ ۵۰۰)، حدیث: ۴۳۷، اس حدیث کی سند ضعیف ہے، البتہ اس کے مفہوم پر سلف وخلف کا اجماع ہے، دیکھیں: (سنن صغیر) از بیہقی: (۲/ ۳۴۴۔ ۳۴۵)، مع تحقیق الجبوری۔

تکلیف دی تھی ان اصحاب میں ایک صاحب میاں مولا بخش صاحب سوداگر صابون ہیں، وہ گرمیوں میں کوہ منصوری گئے تو بیٹے کو ہدایت کر گئے کہ مولوی صاحب (اپنے لیڈر) کے خطبہ کی تقریر مجھے لکھتے رہنا، ایسا نہ ہو کہ میرا درس قرآن ناقص رہ جائے۔

دیکھیے ایک غیر صاحب وحی سے اتنا حسن ظن ہے تو صاحب وحی سے کیوں یہ عقیدت نہ ہو کہ ربا کی آیت تفسیر نہ سننے پر افسوس کرتے ہیں۔

(ص:۳۷۷) پر وصیت کا مسئلہ لکھا ہے، بلحاظ موضوع (انکار حدیث) اس عنوان کے ماتحت کوئی خاص بات قابل جواب نہیں، الا یہ کہ آپ نے بے تعلق ایک بات فرما دی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

''وصیت اور وراثت میں فرق یہ ہے کہ موصی حصص وراثت کا پابند نہیں، جس وارث کو ضرورت ہو اور جس انداز کی ضرورت ہو یا جس کو جتنا کچھ دینے کی مصلحت ہو اس کو اتنا دینے کی وصیت کر جائے، وصیت نہ کر سکا یا وصیت سے کچھ بچ رہا تو وراثت کے لیے حصص مفروض ہیں'' (ص:۳۷۹)۔

اہلحدیث: سر سید احمد خان مرحوم نے بھی ایسا ہی لکھا ہے، آپ دونوں کا مطلب یہ ہے کہ مورّث اگر بغیر وصیت کے مر جائے تو اس کا ترکہ بحکم قرآن تقسیم کیا جائے اور اگر وصیت کرنا چاہے تو جس کو جتنا چاہے دے، چاہے ذوی الفروض وارث کو بھی دے جائے، مگر حدیث میں یوں آیا ''لا وصية لوارث''[1] وارث کے حق میں وصیت کرنی جائز نہیں، اس کا مفصل جواب ہم تفسیر ثنائی میں دے چکے ہیں، آئندہ پرچے میں اس کا ملخص پیش کریں گے، ان شاء اللہ۔ ❁❁❁

---

[1] سنن ابوداود: كتاب الوصايا، باب ما جاء في الوصية للوارث، حدیث:۲۸۷۰، سنن الترمذی: أبواب الوصايا، باب ما جاء لا وصية لوارث، حدیث ۲۱۲۰، سنن ابن ماجہ: كتاب الوصايا، باب لا وصية لوارث، حدیث: ۲۷۱۳، اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

قسط: ۳۷

حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق

(۵؍شعبان ۱۳۴۹ھ مطابق ۲۶؍دسمبر ۱۹۳۰ء)

علماء اسلام کا قول ہے کہ کسی مسلم کو وارث کے حق میں وصیت کرنے کا حق نہیں، کیوں کہ جو خدا نے ورثا کو دینا ہے دے دیا، غیر وارث کے حق میں وصیت جائز ہے، وہ بھی سارے ترکہ میں سے ایک ثلث تک، یہ دونوں مسئلے چوں کہ احادیث سے ثابت ہیں، اس لیے مصنف ''شرعۃ الحق'' نے بتوافق سر سید احمد خان ان دونوں مسئلوں میں علماء اسلام سے اختلاف کیا، چنانچہ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

''خدا نے تو وصیت کو ترکہ پر مقدم کیا ہے اور قوم نے حدود اللہ کو توڑ کر دو حصہ حکم کا اٹھا دیا ہے کہ وصیت ثلث میں ہے اور یوں آیات وصیت کو بے کار کر دیا، معلوم نہیں خدا کو اتنا کچھ کلام بیکار ہی کر دینا تھا تو فرمایا ہی کیوں تھا، کس مصلحت سے، اور کس پولسی سے، کون سی شدید ضرورت اور مجبوری آ پڑی تھی کہ چند دنوں کے لیے وصیت کا حکم دیا گیا اور اس مہتم بالشان صورت سے کہ: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ﴾ اور ﴿حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ﴾ [البقرۃ:۱۸۰] اور پھر کیوں ایک لفظ ثلث کا نہ بڑھایا کہ وصیت ثلث میں جاری ہوگی۔

وصیت کا حکم وراثت سے نہیں اٹھ سکتا، یہ دونوں دو حکم ہیں، وصیت کا حکم مالک مال کو ہے اور وراثت کا حکم وارثوں کو، وصیت یہ ہے کہ مال مملوکہ والدین اور اقرباء کے حق میں اس طرح تقسیم کرو جس طرح تقسیم کرنا اقتضائے وقت سمجھو اور وراثت یہ ہے کہ مال متروکہ والدین اور اقربا کے حق میں اس طرح تقسیم کیا جائے جس طرح خدا نے مالک کا تقسیم نامہ نہ پا کر تقسیم کر دیا ہے، وصیت مالک

مال کا حیات میں حکم ہے، اور وراثت مالک مال کے مرنے کے بعد وصیت نہ کر جائے یا وصیت سے فاضل مال بچ رہنے کی صورت میں خدا کا حکم ہے، وصیت میں حصص کی پابندی نہیں اور وراثت میں حصص مفروض ہیں'' (ص: ۳۷۹، ۳۸۰)۔

اہلحدیث:

کچھ شک نہیں کہ یہ دونوں مسئلے حدیثی ہیں، مگر ایسے نہیں کہ قرآن کے خلاف ہیں بلکہ قرآن مجید کے مجمل حکم کی تفسیر ہیں، فاضل مصنف قرآن مجید پر گہری نظر سے تدبر فرماتے تو ان حدیثوں کو قرآن کے مخالف جان کر ترک نہ کرتے۔

حافظ صاحب! آیئے ہم آپ کی خدمت میں آسان طریق سے قرآن کا مطلب عرض کریں:

قرآن مجید میں وصیت کے موقع پر بالمعروف کا لفظ فرمایا ہے، چنانچہ آیت موصوفہ کے الفاظ یہ ہیں: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ ٱلْمَوْتُ إِن تَرَكَ خَيْرًا ٱلْوَصِيَّةُ لِلْوَٰلِدَيْنِ وَٱلْأَقْرَبِينَ بِٱلْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى ٱلْمُتَّقِينَ﴾ [البقرۃ: ۱۸۰] (جب تم میں سے کسی کو موت آئے مال چھوڑنے کی صورت میں وصیت کرے والدین اور قریبوں کے لیے یہ حکم متقیوں پر واجب ہے)۔

اور جناب کو معلوم ہوگا کہ معروف خاص کر المعروف قرآن کی اصطلاح میں احکام شرعیہ کا نام ہے، چنانچہ مسلمات بیعت کنندگان کے حق میں فرمایا: ﴿وَلَا يَعْصِينَكَ فِى مَعْرُوفٍ﴾ [الممتحنۃ: ۱۲] یعنی وہ عورتیں شرعی احکام میں تیری بے فرمانی نہ کریں۔

پس معنی آیت وصیت کے یہ ہیں کہ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ:

''اپنے ورثاء اور اقربا کے لیے شرعی ہدایت کی پابندی کی وصیت کر جائے''۔

یعنی وہ کہہ جائے کہ بموجب حکم شرعی ترکہ تقسیم کر لینا، اس تفسیر سے دونوں آیتیں

متفق ہیں، نہ کوئی ناسخ ہے، نہ منسوخ۔

ہاں ایک حصہ وصیت کا اور ہے جس کو آیت میراث شامل نہیں، اس کی بابت اتنا ارشاد ہے: ﴿غَيْرَ مُضَآرٍّ﴾ اس غیر مضار کی تشریح حدیث شریف نے ثلث تک کردی ہے، جس کی مثال ہم پہلے کئی دفعہ بتا آئے ہیں کہ جمعہ کی آیت مجملہ ہے اس کی تفسیر حدیث میں وقت زوال سے آئی ہے، جو آپ کو بھی منظور ہے، پس دونوں آیتیں اور حدیثیں باہم متفق ہیں۔ (مفصل تفسیر ثنائی جلد دوم میں زیر آیت ''یوصیکم اللہ'' مل سکتا ہے)۔

(ص: ۳۸۴) پر آپ نے وراثت کا عنوان لکھا ہے، کتاب کے اصل موضوع (انکار حدیث) کے لحاظ سے اس عنوان کے ماتحت کوئی بات قابل جواب نہیں، ہاں بعض سہو ونسیان ضرور ہیں، مثلاً آپ فرماتے ہیں:

''ذوی الفروض جن کو خدا نے ترکہ دلا دیا ہے وہ خصوصیت کے ساتھ تو والدین ہیں، پھر اولاد اور زن وشوہر اور بھائی، بہن، اصطلاحاً اب (باپ) میں دادا، نانا اور پردادا پرنانا داخل ہیں اور ماں میں دادی، نانی، پر دادی، پرنانی اور بنت میں ناتی نتنی، داخل ہیں، جیسا کہ: ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَٰتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ﴾ [النساء: ۲۳] کی حرمت میں، مگر یہ اصطلاح مجازاً ہے اس لیے یہ بھی مجازاً ترکہ پائیں گے، اور ذوی الفروض میں داخل ہوں گے، مجازاً پانے کا معنی یہ ہیں کہ میت کا باپ مر گیا تو باپ کا ترکہ (۱) دادا کو ملے گا، اور ان کے نہ ہونے پر دادا کو، اور علی ہذا قرآن نے کسی کو (۲) مجوب نہیں کیا، اسی طرح کوئی بیٹا مر گیا تو اس کا ترکہ پوتا، پوتی کو، اور ان کے نہ ہونے پر پر پوتا، پر پوتی کو ملے گا، اور علی ہذا قرآن نے کسی کو مجوب نہیں کیا، معلوم نہیں حجب کا خیال کس آیت کی رو سے دین میں اضافہ ہو گیا ہے'' (ص: ۳۸۵، ۳۸۶)۔

اہلحدیث:

اس عبارت میں جس جگہ ہم نے (۲) لگایا ہے اس کا جواب وہ ہے جس پر ہم نے

(ا) لگا یا ہے، تفصیل اس کی یہ ہے، حافظ صاحب مصنف ''شرعۃ الحق'' نے دعوی کیا ہے کہ قرآن نے کسی کو مجحوب نہیں کیا، مجحوب اصطلاح میں اس وارث کو کہتے ہیں جو کسی دوسرے کے ہوتے ہوئے حصہ نہ لے سکے، حالاں کہ حافظ صاحب خود ہی لکھتے ہیں، باپ مر گیا تو دادکو ملے گا۔

کیوں جناب!

اس کا مطلب یہ نہیں کہ باپ کے ہوتے ہوئے دادا مجحوب ہے، اسی طرح اور ورثاء بھی جن کو اصل کے مرنے پر حصہ ملے گا، مجحوب نہیں ہیں، تو کیا ہیں؟

حافظ صاحب:

اسی کو کہتے ہیں ؎

منکرے بودن وہمرنگ مستاں زیستن

اس عنوان کے ماتحت اور بھی بہت سے سہو ونسیان ہیں جن کو ہم اصل مضمون سے اجنبی جان کر چشم پوشی کرتے ہیں۔

خاتمہ:

الحمدللہ کہ آج ہم کتاب ''شرعۃ الحق'' کے جواب سے فارغ ہوئے۔ یہ قرضہ بہت گراں تھا اور ہماری غفلت سے ہم پر باقی رہا، خدا بھلا کرے امرتسری جماعت منکرین حدیث کا جنھوں نے ''شرعۃ الحق'' کا ذکر مبالغہ سے کر کے ہمیں جواب لکھنے پر آمادہ کیا تو ہم قرض سے سبکدوش ہوئے۔

سارا جواب کتاب کی صورت میں ان شاءاللہ شائع ہوگا۔

وآخِرُ دَعْوانا أنِ الحَمْدُ للهِ رَبِّ العالَمِينَ

❁ ❁ ❁

دفاع عن الحدیث

مؤلفہ

مناظرِ اسلام علامۂ عصر مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری

ان مضامین میں اڈیٹر ''نگار'' کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، جو قسط وار (۷ قسطوں میں) ''اخبار اہل حدیث'' امرتسر میں ۲۳/رجب المرجب ۱۳۵۰ھ (تا) ۱۳/رمضان المبارک ۱۳۵۰ھ = ۴/دسمبر ۱۹۳۱ء (تا) ۲۲/جنوری ۱۹۳۲ء شائع ہوا۔

تحقیق وتعلیق

عبدالاحد احسن جمیل آل عبدالرحمن

قسط:۱

دفاع عن الحدیث

(۲۳؍رجب المرجب ۱۳۵۰ھ = ۴؍دسمبر ۱۹۳۲ء)

ناظرین اہلحدیث ۲۳؍اکتوبر سنہ رواں کے (ص:۶) کالم ۲۔ ۳ پر دیکھیں گے کہ ''نگار'' کی دل نگاری کے جواب دینے کا ارادہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ جلد ۲۹ کے پہلے پرچے سے جواب شروع ہوگا، چوں کہ انکار حدیث کا ایک مضمون پہنچ گیا، جس کے جواب پر اخص مخلصین نے توجہ دلائی تو توسن قلم کا رخ ادھر ہوگیا، آج ''نگار'' کے مضامین کا جواب شروع ہوتا ہے۔

''نگار'' کے اڈیٹر نے اگر چہ اخباروں میں توبہ کا اظہار کیا ہے، تاہم ان کی باتیں جواب طلب ہیں، جیسے مہاشہ دھرمپال نے اپنے رسالہ ''ترک اسلام'' کے خیالات سے رجوع کر کے دھرمپال سے غازی محمود بن گئے تھے، تاہم ان کے خیالات جواب طلب تھے، چنانچہ آج تک ''ترک اسلام'' کا جواب ترک اسلام کی صورت میں دفتر اہلحدیث سے ملتا ہے۔

''نگار'' کے پرچے وصول کرنے میں ہمیں بہت دقت ہوئی، شروع میں ہم نے سنا کہ وہ عقائد اسلام پر کچھ لکھتا ہے تو ہم نے اس سے تبادلہ کرنا چاہا، کئی ایک پرچے بھیجے مگر تبادلہ جاری نہ ہوا، پھر ہم نے لکھا کہ ہمارے نام قیمت پر جاری کر دو، تو بھی نہ آیا، بہت دنوں بعد کسی خاص خریدار کی معرفت ہم کو اس کے چند پرچے ملے جن میں پہلا پرچہ مئی ۱۹۳۱ء کا ہے، اس لیے آج ہم جواب اسی سے شروع کرتے ہیں۔

نوٹ! ہمارے ناظرین میں سے کسی صاحب کے پاس اس سے قبل کے وہ پرچے ہوں جس میں حدیث یا اسلامی عقائد پر کچھ لکھا ہوتو وہ پرچے مستعار عنایت کریں بعد فراغت واپس کئے جائیں گے، ان شاء اللہ۔

''نگار'' نے مئی کے پرچے میں حدیث ''اسراء'' پر اعتراض کیا ہے اس کے اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ راوی حدیث حضرت انس ہیں، انس مدینہ میں حاضر خدمت ہوئے تھے، اس وقت عمران کی ۷، ۸ سال کی تھی، اور ''اسراء'' کا واقعہ مکہ کا ہے، پھر انس نے کس سے سنا، کسی اور شخص سے سنا تو اس کا نام کیوں نہیں بتایا، لہذا یہ حدیث حجت نہیں، چنانچہ اس کے اپنے الفاظ اس بارے میں یوں ہیں:

''یہ تو حدیث سے ظاہر ہے کہ اس روایت کے بیان کرنے والے انس ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ انس نے خود کس سے سنا، اگر آنحضرت ﷺ سے سنا تو یا تو اس کو معراج کی شب کے دوسرے روز سنا ہوگا، جب کہ آنحضرت نے اس کا اظہار قریش کے سامنے کیا اور ایک فتنہ کا باعث ہوا، یعنی مسلمان میں تشکک وضعف ایمان پیدا ہوا [1] اور قریش کو آنحضرت ﷺ سے مضحکہ کرنے کا موقع ہاتھ لگا، یا پھر آپ نے اس روایت کو آخر زمانہ میں بیان کیا، پہلی صورت میں انس کا سننا ناممکن ہے کیوں کہ انس مع اپنی والدہ ام سلیم مدینہ میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جب حاضر ہوئے تو وہ ایک طفل صغیر انس تھے، یعنی ان کی عمر تقریباً سات سال کی تھی، کیوں کہ آنحضرت کی رحلت کے وقت ان کی عمر ۱۸ اور ۱۹ کے درمیان تھی، اگر انہوں نے اس کا تذکرہ بعد کو رسول اللہ ﷺ کے زبانی مدینہ میں سنا، تو سوال یہ ہے کہ اس روایت کو آنحضرت نے مجمع میں بیان کیا یا انس کے کان میں کہا۔ قیاس یہ ہے کہ اگر آپ نے معراج کا واقعہ دہرایا ہوگا تو اس کے سننے والوں میں سے کم

---

[1] کیا اس وقت کے مسلمان آپ کی طرح ضعیف الایمان تھے؟ کوئی ایک مسلمان جس کو تشکک یا جس کے ایمان میں ضعف پیدا ہوا کی مثال تو دی ہوتی۔

سے کم حضرت عائشہ ضروری رہی ہوں گی، [1] مگر ان کا سکوت کچھ معنی ضرور رکھتا ہے، حالاں کہ وہ حدیث بیان کرنے میں انس اور ابوہریرہ سے کم نہیں، واقعہ یہ ہے کہ انس نے اس کو آنحضرت ﷺ سے نہیں سنا بلکہ بخاری [2] کی دواور روایتوں سے پایا جاتا ہے کہ یا تو انہوں نے ابوذر سے سنا اور یا مالک بن صعصعہ سے اور یا دونوں سے، افسوس میرے پاس اس وقت (صحیح بخاری) نہیں، البتہ صحاح [3] کی دوسری کتابیں بجز ترمذی، اور نسائی کے ہیں'' (نگار مئی ۱۹۳۱ء، ص:۱۲-۱۱)۔

اہلحدیث:

آپ نے سچ کہا کہ ''بخاری میرے پاس نہیں'' ایسا ہی ہم بھی سچ کہتے ہیں کہ بخاری اگر ہوتی اور آپ اس کو پڑھ لیتے تو یہ اعتراض نہ کرتے، مگر سوال یہ ہے کہ آپ کو جلدی کیا تھی کہ صحیح بخاری دیکھنے کے بغیر اعتراض کرنے بیٹھ گئے؟

عجیب مشابہت:

یاد آیا کہ ہمارے ملک پنجاب میں بھی آپ کی طرح عجلت پسند مصنف گذرے ہیں جن کو الہام کا بھی دعویٰ تھا انہوں نے ایک الہام انگریزی زبان کا کتاب میں لکھا، چوں کہ خود انگریزی نہ جانتے تھے اس لیے اس کو بے ترجمہ لکھنے پر عذر کرتے ہیں کہ ''اس وقت میرے پاس کوئی انگریزی داں نہیں ہے لہذا بے ترجمہ لکھتا ہوں'' (براہین احمدیہ، ص:۵۵٦) [4]۔

---

[1] عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کیوں، کوئی اور بیوی کیوں نہیں، یہ بھی عین ممکن ہے کہ انس رضی اللہ عنہ نے کہیں راستے میں مناسب وقت دیکھ کر سوال کیا ہو، اور اس وقت جب نبی ﷺ نے جواب دیا وہاں کوئی نہ رہا ہو۔

[2] بقول مصنف: ''معجزات نبوی''۔ (مؤلف)۔

[3] صحیحین اور سنن اربعہ پر کتب ستہ کی اصطلاح ہی زیادہ صحت کے قریب لگتی ہے، کیوں کہ سنن اربعہ کے مؤلفین نے صحیح حدیثوں کے ہی جمع کرنے کا اہتمام نہیں کیا ہے، بلکہ سنن ابن ماجہ میں تو بعض موضوع احادیث بھی ہیں۔

[4] دیکھیں: (روحانی خزائن): (۱/ ٦٦۴)۔

ہم حیران ہیں کہ آپ کو اوران مصنف صاحب کو جلدی کیا تھی، کیا گاڑی کا ٹکٹ خرید چکے تھے؟۔

خیر بخاری آپ کے پاس نہ تھی ہمارے پاس تو ہے، بخاری کا حوالہ سنیے! ''قال أَبُو سَلَمَةَ سَمِعْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا: أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: لَمَّا كَذَّبَنِي قُرَيْشٌ، قُمْتُ فِي الْحِجْرِ، فَجَلَا اللّٰهُ لِي بَيْتَ الْمَقْدِسِ، فَطَفِقْتُ أُخْبِرُهُمْ عَنْ آيَاتِهِ وَأَنَا أَنْظُرُ إِلَيْهِ''۔ (بخاری جلد ۲ ص: ۶۸۴)[1]

''ابوسلمہ کہتے ہیں میں نے جابر بن عبداللہ سے سنا وہ کہتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے فرماتے تھے (میرا واقعہ اسراسن کر) کفار قریش نے جب میری تکذیب کی تو میں حطیم میں کھڑا ہوا اس وقت خدا نے بیت المقدس میرے سامنے کر دیا تو میں اس کو دیکھ کر اس کے نشان بتا تا رہا''۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''اسراء'' کا قصہ مدینے میں بھی صحابہ کرام کو سنایا تھا، کیوں کہ جابر بن عبداللہ جو راوی ہیں اس حدیث کے مدینے کے رہنے والے انصاری ہیں، مدینے میں سنانے سے تمام اصحاب میں قصہ پھیل گیا، حضرت انس نے بھی اس حال میں سن لیا۔

رہا آپ کا یہ عذر کہ:

''اس کے سننے والوں میں سے کم سے کم حضرت عائشہ ضرور رہی ہوں گی مگر ان کا سکوت کچھ معنی ضرور رکھتا ہے''۔

---

① صحیح بخاری: كتاب مناقب الانصار، باب حديث الاسراء۔حدیث:۳۸۸۶، صحیح مسلم: كتاب الايمان، باب ذكر المسيح والمسيح الدجال۔حدیث:۱۷۰۔

اگر ہم یہ کہہ دیں کہ یہ بیان مسجد میں ایک خاص مجلس میں ہوا تھا جس میں جابر بن عبداللہ وغیرہ مرد تھے اور حضرت عائشہ نہ تھیں تو کیا حرج، بلکہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جس روز یہ گفتگو ہوئی حضرت عائشہ بیت نبوی میں آئی نہ تھیں تو کیا مانع۔

اصل بات جو روزمرہ ہمارے دیکھنے سننے اور استعمال کرنے میں آتی ہے یہ ہے کہ ایک واقعہ کی خبر گھر کے چند آدمیوں میں سے بعض کو ہوتی ہے اور بعض اس سے بے خبر رہتے ہیں، ایسے موقع پر یہ نہیں ہوتا کہ بے خبروں کے عدم علم پر بنا کی جائے، بلکہ باخبروں کے علم پر بنا کر کے بے خبری کو چھوڑ دیا جاتا ہے، کیوں کہ اہل منطق کہا کرتے ہیں کہ ''عدم علم عدم شئی کو مستلزم'' نہیں،[1] اسی لیے امام بخاری نے قانون لکھا:

المثبت مقدم على النافي[2]۔

بتانے والا نفی کرنے والے سے مقدم ہے۔

پس جابر بن عبداللہ کی روایت نے آپ کے سب اعتراضات دور کر دیئے۔

---

[1] اور علماء اصول کا قاعدہ ہے: ''العلم بعدم الدليل دليل، وليس عدم العلم بالدليل دليل''۔

[2] جزء رفع الیدین از امام بخاری۔

قسط:۲

دفاع عن الحدیث

(یکم شعبان المعظم ۱۳۵۰ھ=۱۱/دسمبر ۱۹۳۱ء)

گذشتہ پرچہ اہل حدیث میں حضرت انس کی حدیث متعلقہ ''اسراء'' پر ''نگار'' کا اعتراض اور جواب مذکور ہوا ہے، آج اسی کا تتمہ درج ہے:۔

''نگار'' نے اپنے محققانہ طرز سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث پر یہ اعتراض کیا ہے کہ فلاں عیسائی نے اس کا ذکر نہیں کیا، آپ کے الفاظ یہ ہیں:

''انس کی روایت کی تنقید کرنے سے پہلے ایک ناقد کا فرض ہے کہ وہ اس پر غور کرے کہ تا نہ باشد چیز کے مردم نہ گویند چیزہا کی رو سے ہر روایت کی حقیقت ہے کیا، بے سروپا روایتیں ہی اپنی راویوں کی جسمانی اور دماغی حالت کے ساتھ ان کی نیت کا پتہ دیتی تھیں۔

انس آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک نوعمر غلام تھے، اور ان کی کثرت حدیث کی سب سے بڑی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ ان کے مخاطب دوسری اور تیسری پشت کے مسلمان تھے، یعنی تابعین اور تبع تابعین، انس کا زیادہ تر قیام بصرہ میں تھا، مگر قرین قیاس ہے کہ ابتدائی زمانہ انہوں نے شام میں گزارا، کیوں کہ انس کے سلسلہ اسناد میں شہاب زہری اور قتادہ، حسن بصری، نافع، عروہ اور موسی، ابن عباس یہ سب ہی انس کے دیکھنے والے تھے، مگر ان لوگوں نے معراج کی حدیثوں کو بیان نہیں کیا ہے سوائے شہاب زہری اور قتادہ کے، امام مالک نے اپنی ''موطأ'' میں زہری سے زیادہ اعتناء کیا ہے مگر ''موطأ'' میں معراج کی یہ حدیث میری نظر سے نہیں گذری، ''موطأ'' میں عجیب تر بات یہ ہے کہ اس میں صرف زہری سے ہی روایتیں نہیں، بلکہ مروان حتی کہ عبدالملک سے بھی روایتیں

ہیں حالانکہ مروان اور عبدالملک دشمنان اہل بیت میں سے تھے، آل مروان کا سب سے بڑا کا رنامہ یہ ہے کہ انہوں نے حضرت علی پر تبرا کہنے کی بدعت خطبہ میں پیدا کی، چنانچہ خود (مسلم) کی اکثر روایتوں جبراً سے ظاہر ہوتا ہے کہ آل مروان کے خلیفہ جو مدینے میں مقرر ہوئے تھے وہ علانیہ حضرت علی پر ممبر پر تبرا کہتے تھے اور کہلواتے تھے، زہری ابو ہریرہ کی طرح مروان اور عبدالملک کے وظیفہ خوار تھے [1] لیکن اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ عیسائیوں کا بطریق یوحنا نحوی دمشقی جو عبدالملک کے زمانہ میں گذرا ہے، اس نے مسلمانوں سے اکثر مناظرے کیے ہیں اور اسلام سے اس کے مباحث اب بیروت میں چھپ گئے ہیں، اگر یہ کتابیں جعلی نہیں ہیں تو ان تحریروں سے یہ بات ثابت ہوتا ہے کہ پہلی صدی ہجری کے مسلمانوں میں معراج کا کوئی عقیدہ نہ تھا، ورنہ یوحنا ضرور اس کا ذکر کرتا، اور اس کی تردید کرتا، حالاں کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کوئی معجزہ والی بات نہیں کی، سوائے شق القمر اور اسرائے بیت المقدس کے، اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ باتیں کہاں سے دوسری صدی ہجری میں پیدا ہوئیں'' (نگار بابت مئی ۱۳ء، ص: ۱۵، ۱۶)۔

اہلحدیث:

ناظرین غور فرمائیں کہ ایسے محققین کا جواب کیا ہوسکتا ہے جو اتنا بھی نہیں جانتے کہ عدم ذکر سے عدم شئی لازم نہیں، اللہ اللہ! کہاں آل مروان اور آل رسول کا سیاسی اور

---

[1] ایڈیٹر صاحب منکر حدیث ہونے کے ساتھ صحابہ کرام اور محدثین عظام پر اتہام لگانے والوں میں سے بھی ہیں اور شیعوں کے طرز عمل کو اپنانے میں کافی ماہر بھی ہیں، کیوں کہ مروان کی محبت اہل بیت سے متعدد طرق اور تاریخ کی بیشتر کتابوں سے ثابت ہے، اور خود علی رضی اللہ عنہ مروان کا کافی خیال رکھتے تھے، چنانچہ جمل کے دن بصرہ میں معرکہ ختم ہونے کے علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے مروان کے بارے میں دریافت کیا تو کسی نے کہا کہ اے امیر المؤمنین آپ مروان کے بارے میں بہت سوال کرتے ہیں، تو جواب دیا کہ ''تعطفني عليه رحم ماسة، وهو مع ذلك سيد من شباب قريش''۔ اور علی بن الحسین مروان اور حکم کے سب سے زیادہ قریبی لوگوں میں سے تھے۔ دیکھیں: (سیر اعلام النبلاء) از: ذہبی: (۴/ ۳۸۹)۔

پولیٹکل جھگڑا، کہاں انس کی روایت پر اس کا اثر، کہاں یوحنا عیسائی کا مباحثہ پھر اس مباحثہ کا ثبوت، اسی کو کہتے ہیں: ع

دل کے لگنے کا ڈھنگ اور ہی ہے

سچ تو یہ ہے ایسے محققین کا فن حدیث جیسے ادق فن سے انکار کرنا، علم حدیث کی صحت کی دلیل ہے کیوں ؎

وإذا أتتْكَ مَذمَّتِي مِن ناقِصٍ
فَهِيَ الشَّهادَةُ لي بِأنِّي كَامِلٌ [1]

۞ ۞ ۞

قسط:۳

دفاع عن الحدیث

(۸؍شعبان المعظم ۱۳۵۰ھ = ۱۸؍دسمبر ۱۹۳۱ء)

یہ سلسلہ رسالہ ''نگار'' کے جواب میں جاری ہوا ہے، ''نگار'' نے ماہ جون ۱۹۳۱ء کے پرچے میں قتل مرتد والی حدیث پر بڑی سختی سے اعتراض کیا ہے، پہلے آپ نے قرآن مجید کی وہ آیات لکھی ہیں جن میں مذہبی آزادی کا ذکر ہے، اس کے بعد لکھا ہے:

''مگر افسوس کس قدر عبرت ناک امر ہے کہ قرآن کے اس طرۂ افتخار کو جو قیامت تک مخالفین

---

① جب کسی کم عقل کی جانب سے میری مذمت بیان کی جائے تو سمجھ لینا کہ یہ اس بات کی گواہی ہے کہ میں عقل مند ہوں۔

کے دلوں میں بھی رشک وحسد کی آگ بھڑکاتا رہے گا حدیث نے چھین لیا، اور ابن عباس کے ایک غیر ذمہ دارانہ قول نے قتل مرتد کی ایک بدعت پیدا کردی [1] کہ کتنی جانیں اس خطرناک قول کے صدقے فنا ہوئیں، کتنے لوگ اسلام ہی سے بدظن ہوگئے، کتنوں نے اس کی آڑ میں اپنے دشمنوں کو راستے سے ہٹایا، اور یہ واقعہ ہے کہ ممالک اسلامیہ کی موجودہ پستی کی ذمہ داری صرف اسی مسئلہ پر ہے، اگر ایک مجہول حدیث نے کچھ کمی چھوڑی تھی تو اس کی تکمیل فقہ کے ہاتھوں سے ہوئی'' (ص: ۱۲)۔

اہلحدیث:

حضرت ابن عباس کے قول کو غیر ذمہ دارانہ کہنا کسی ذمہ دار کا کام نہیں ہے، مگر ہم اس الجھن میں نہیں پھنستے بلکہ اصل بات کا جواب دیتے ہیں۔

''جن قوموں کی قومیت مذہب پر ہو ان میں مذہب ہی کے اتحاد سے محبت اور مذہب کے تغائر سے غیریت اور عداوت پیدا ہوتی ہے، کیوں؟ اس لیے کہ آپ کا بھی مسلمہ ہے کہ ''تم دنیا میں کسی قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو تو تم کو معلوم ہوگا کہ قوموں کے افکار وقلوب پر ہمیشہ مذہب کی حکمرانی رہی ہے'' (نگار بابت جون ۱۹۳۱ء، ص: ۲۰)۔

پس کسی مسلمان شخص کا اسلام سے نکل جانا، خصوصاً اس زمانہ میں جب اسلام ہی کی وجہ سے محبت تھی اور اسلام ہی کی وجہ سے عداوت، جیسے ارشاد ہے: ﴿وَٱلَّذِينَ مَعَهُۥٓ أَشِدَّآءُ عَلَى ٱلْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ [الفتح: ۲۹]۔

اور دیکھئے!

﴿يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ هَلْ تَنقِمُونَ مِنَّآ إِلَّآ أَنْ ءَامَنَّا بِٱللَّهِ وَمَآ أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَآ أُنزِلَ مِن قَبْلُ وَأَنَّ أَكْثَرَكُمْ فَٰسِقُونَ﴾ [المائدۃ: ۵۹]۔

---

① توہین صحابہ کا ارتکاب بھی ایڈیٹر صاحب دھڑلے سے کر لے جاتے ہیں۔

پس جب مذہب ہی دو قوموں میں موجب محبت اور باعث عداوت تھا تو جو شخص ادھر سے جاتا ہے، اس کے دل میں جانے سے پہلے ادھر کی عداوت پیدا ہو جاتی، اب اس میں دو باتیں جمع ہو جاتی ہیں: ایک ترک اسلام، دوم: عداوت اہل اسلام، بلکہ یہ کہیے کہ در باطن ترک اسلام عدوات کی فرع ہے اور در ظاہر عداوت ترک اسلام کی فرع ہے، اس فلسفیانہ اصول کو ملحوظ رکھ کر قتل مرتد کی ساری حدیث سنیے جس کے الفاظ یوں ہیں:۔ عن ابن مسعود أن رسول الله ﷺ قال: ”لا يَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ، يَشْهَدُ أَنْ لا إِلَهَ إِلّا اللَّهُ وأَنِّي رَسولُ اللهِ، إلّا بإحْدى ثَلاثٍ: الثَّيِّبُ الزّانِي، والنَّفْسُ بالنَّفْسِ، والتّارِكُ لِدِينِهِ المُفارِقُ لِلْجَماعَةِ ''، [1] یعنی کسی کلمہ گو کو قتل تین میں سے ایک کام پر جائز ہے (۱) شادی شدہ زنا کرے (۲) کسی جان کو مار دے (۳) دین کو چھوڑ کر جماعت مسلمین سے بھی الگ تھلگ ہو جائے، یعنی مسلمانوں کو چھوڑ کر اغیار میں جا ملے، پھر جو ان کا حکم وہی اس کا حکم''۔

قرآن مجید میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو کلمہ اسلام پڑھتے مسلمان کہلاتے تھے، مگر ہجرت نہیں کی تھی، اسے غور سے سنیے! ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا﴾ [الانفال:۷۲] جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت نہیں کی تمہارا ان سے کسی قسم کا دوستانہ نہیں، جب تک ہجرت نہ کریں۔

اس آیت میں غیر مہاجرین پر جو خفگی ہے وہ اس بنا پر کہ وہ اسلامی جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر اغیار کے سامنے متحد کیوں نہیں ہوتے، پس غور کیجیے کہ جو لوگ داخل اسلام ہو کر

[1] صحیح بخاری: كتاب الديات، باب قول الله تعالى: ”أن النفس بالنفس، والعين بالعين، حدیث:۶۸۷۸، صحیح مسلم: كتاب القسامة، باب ما يباح به دم المسلم، حدیث:۱۶۷۶۔

پھر اغیار میں جاملیں، وہ کتنی کچھ سزا کے مستحق ہوں گے، اسی لیے فرمایا ''من بدل دينه فاقتلوه''[1] الحدیث۔

قسط:۴

دفاع عن الحدیث

(۱۵/شعبان المعظم ۱۳۵۰ھ=۲۵/دسمبر ۱۹۳۱ء)

اڈیٹر ''نگار'' پر اب پھر چاروں طرف سے دارو گیر ہو رہی ہے، یہاں تک کہ فوجداری مقدمات بھی شروع ہو گئے ہیں، مگر ''اہلحدیث'' کو اس سے سروکار نہیں، ''اہلحدیث'' جواب مضمون کا ذمہ دار ہے۔

''نگار'' نے ماہ جولائی ۱۹۳۱ء کے پرچہ میں مسئلہ غلامی پر اعتراض کیا ہے، اس کے اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ ''قرآن مجید نے مسلمان کو غلام رکھنے کی اجازت نہیں دی، مگر حدیثوں میں اس کی اجازت ملتی ہے، اس لیے یہ حدیثیں قابل سند نہیں، ''نگار'' کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

''قرآن کریم نے دنیا کے تمام مذاہب سے علیحدہ یہ عجیب وغریب اصول پیش کیا تھا کہ مذہب میں کوئی جبر نہیں اور انسان اپنی رائے میں آزاد ہے اور اپنے ذاتی اعتقاد میں سوائے خدا کے کسی کا مسئول اور جوابدہ نہیں، پھر میں نے دکھلایا تھا کہ حدیث نے کس طرح اس زریں اصول کو پامال

[1] صحیح بخاری: كتاب الجهاد السير، باب لا يعذب بعذاب الله۔حدیث:۳۰۱۷۔

کر کے قرآن کا سب سے بڑا افتخار چھین لیا، آج ہم حریت انسان پر بحث کریں گے اور یہ دکھلائیں گے کہ قرآن اس اصول میں بھی تمام مذاہب سے جدا نظریہ پیش کرتا ہے، مگر حدیث نے اس اصول کی بھی مخالفت کی۔ (نگار بابت جولائی ۱۹۳۱ء)

اہلحدیث:

قرآن مجید نے جو اصول پیش کیا، کون ہے جو اس کی مخالفت کرے، حدیث اور اہل حدیث قرآن کی مخالفت نہیں کرتے، نہ کر سکتے ہیں، ہاں آپ کے فہم کی مخالفت ہو جائے تو گناہ نہیں جانتے، آپ نے جو قرآن کی تعریف میں کہا ہے کہ:

''سب سے پہلے تو قرآن نے ایک مسلم کو دوسرے مسلم کا بھائی تسلیم کیا کہ ایک مغلوب کے لیے آزادی حاصل کرنے کی سب سے بہتر صورت تو یہ ہے کہ وہ اسلام قبول کرے اور مسلمانوں کے ساتھ دوش بدوش کھڑا ہو جائے، اگر وہ اس کو قبول نہیں کرتا تو مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ وہ فدیہ لے کر یا احسان رکھ کر چھوڑ دیں، اگر یہ نہ کریں یا ان کے اختیار میں نہ ہو تو غلاموں کو آزاد کر کے اپنے گناہوں کا کفارہ دیں، اگر مسلمانوں کو اس میں بھی تامل ہو تو پھر مغلوب جس وقت اپنی قیمت ادا کرے آزاد ہے اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ غلاموں کی ایسی شرط سے ہرگز انکار نہ کریں'' (نگار مذکور، ص: ۵۴)۔

اہلحدیث:

یہ ہمیں دل و جان سے مسلم ہے، مگر آپ تسلی رکھیں حدیث اس مضمون کے خلاف نہیں بتاتی، سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ قرآن مجید سے غلاموں خاص کر مسلم غلاموں کا ثبوت ملتا ہے یا نہیں، پہلے ہم وہی آیت پیش کرتے ہیں جو ہمارے مخاطب نے خود پیش کی ہے۔ وہ یہ ہے: ﴿وَأَنكِحُوا۟ ٱلْأَيَـٰمَىٰ مِنكُمْ وَٱلصَّـٰلِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَآئِكُمْ ۚ إِن يَكُونُوا۟ فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ ٱللَّهُ مِن فَضْلِهِۦ ۗ وَٱللَّهُ وَٰسِعٌ عَلِيمٌ﴾

[النور: ۳۲] اس آیت کا ترجمہ کرنے میں ہم دو (فریقوں) کا باہمی اختلاف ہے اس لئے ہم دونوں ترجمے پبلک کے سامنے رکھ دیتے ہیں تا کہ حق وباطل میں تمیز ہو سکے۔

ہمارا ترجمہ:

مسلمانو! اپنے میں سے بیوہ عورتوں کا نکاح کردیا کرو، نیز اپنے غلاموں اور اپنی لونڈیوں کا نکاح بھی کردیا کرو، اگر وہ نادار ہوں گے تو خدا ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا، اللہ بڑی فراخی والا، علم والا ہے۔

اس آیت میں دو لفظ (عباد اور اماء) آئے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے نزول کے وقت مسلمانوں کے ہاتھ میں مسلمان غلام اور مسلم لونڈیاں بھی تھیں چوں کہ یہ آیت مسئلہ ہذا میں نص صریح اور فیصلہ کن ہے، اس لیے فاضل معترض نے اس آیت کا ترجمہ ایسا کیا جس سے ان کی کوشش کا پتہ چلتا ہے کہ وہ صرف حدیث پر ناراض نہیں بلکہ قرآن مجید کو بھی اپنا ماتحت بنانا چاہتے ہیں۔ وہ ترجمہ قابل دید وشنید ہے، فرماتے ہیں:

''اور مجردوں کا اپنے لوگوں میں سے نکاح کردو اور جو تمہارے خدمت گار مرد وعورتیں مسلمان ہوں، اگر یہ لوگ محتاج ہوں گے تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کردے گا اور اللہ واسع وعلیم ہے'' (ص: ۵۵)۔

اہلحدیث:

عباد اور اماء کا ترجمہ کس دلیری سے خدمت گار کیا ہے، خیر مگر ''حق برزبان جاری گردد'' اسی آیت کے ماتحت جو نتیجہ نکالا ہے اس میں دست قدرت کا تصرف معلوم ہوتا ہے، جو یہ ہے:

''یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے اس حکم کی تکمیل میں بسا اوقات ایسے غلاموں کو دامادی کا رتبہ دیا

ہے‘‘(ص:۵۵)۔

خدمت گاروں کے نکاح کرانے سے غلاموں کی دامادی کا ثبوت ہوا؟ ہم کیا جواب دیں۔بہرحال ؎

ہوا ہے مدعی کا فیصلہ اچھا مرے حق میں
زلیخا نے کیا خود پاک دامن ماہ کنعاں کا

اس کے علاوہ ایک اور آیت بھی نص صریح ہے اس بارے میں کہ مسلمان کے پاس مسلم غلام رہنا جائز ہے،قرآن مجید بے شک غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دیتا ہے، مگر یہ نہیں کہتا کہ مسلمان کا مسلم غلام خود بخود آزاد ہے،ان دونوں مفہوموں میں فرق کرنا اہل علم کا فرض ہے،بہرحال وہ آیت معترض نے خود ہی لکھی ہے اور اس کا جواب بھی دیا ہے،بہتر ہے کہ وہ آیت مع جواب کے ہم درج کر دیں،فاضل معترض بحیثیت مجیب مدافعت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’ممکن ہے کہ کوئی جوشیلا اہل حدیث یہ سوال کر بیٹھے کہ تمہارے اس قول کی کیا سند ہے کہ مسلمان غلام نہیں ہوسکتا،کیا قرآن کی آیت موجود نہیں ہے جس کے رو سے مسلمانوں کا غلام ہونا تسلیم کیا گیا ہے:﴿وَلَا تَنكِحُوا۟ ٱلْمُشْرِكَـٰتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ ۚ وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ ۗ وَلَا تُنكِحُوا۟ ٱلْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا۟ ۚ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ ۗ أُو۟لَـٰٓئِكَ يَدْعُونَ إِلَى ٱلنَّارِ ۖ وَٱللَّهُ يَدْعُوٓا۟ إِلَى ٱلْجَنَّةِ وَٱلْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِۦ ۖ وَيُبَيِّنُ ءَايَـٰتِهِۦ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ﴾[البقرۃ:۲۲۱] اور مشرک عورت سے نکاح مت کرو تاوقتیکہ وہ ایمان نہ لاویں،ایک مومنہ لونڈی ایک مشرک عورت سے بہتر ہے چاہے مشرک عورت تم کو مرغوب ہو،اور مت نکاح کرو مشرک مرد سے جب تک ایمان نہ لاویں اور ایک غلام مومن مشرک سے بہتر ہے،

خواہ وہ تم کو مرغوب ہو، وہ لوگ تم کو جہنم کی طرف بلائیں گے اور یہ لوگ جنت اور مغفرت کی طرف، اس کی مرضی سے۔ اور اللہ اپنی آیات کو انسانوں کے سمجھنے کے لیے صاف صاف بتا دیتا ہے'' (نگار مذکور، ص:۵۸)۔

لطیفہ:

اس آیت میں لفظ ''عبد'' ہے اور پہلی میں عباد ہے، جو جمع ہے عبد کی یہاں اس کا ترجمہ غلام سے کیا ہے اور وہاں خدمت گار۔ یہ اختلاف کیوں؟ ہم اسے چھوڑتے ہیں۔

بہر حال اس آیت میں بھی ''عبد مومن'' کے لفظ سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان کے پاس غلام مومن ہوسکتا ہے۔

اس کا جواب جو فاضل مجیب نے دیا ہے، وہ قابل دید وشنید ہے، لکھتے ہیں:

''پہلے اس کو سمجھ لو کہ یہ مومن غلام اور لونڈیاں کون تھیں؟ جس وقت قرآن نازل ہو رہا تھا عرب میں بردہ فروشی کی رسم جاری تھی، ہزاروں انسان غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے، جب عربوں نے اسلام کو قبول کیا تو ان کے غلاموں نے بھی اسلام قبول کیا، ایسے غلاموں کو فوراً اپنے اپنے مالکوں کی خدمت سے آزاد کرانا کسی طرح نہ مالک کے حق میں مفید تھا، نہ غلام کے، اور ان کی آزادی کی دوسری صورتیں تدریجاً پیدا کی گئیں، اگر ایک دم سے سارے غلام آزاد کر دیئے جاتے تو عرب کی سوسائٹی کو سخت صدمہ پہنچتا اور اس سے تبلیغ اسلام کی دقت پڑتی، از بس کہ یہ غلام غیر عرب تھے اور عرب کو اپنے نسب اور شرافت پر ناز تھا اور کفو کا ان کو بیحد خیال تھا، وہ اس کفو اور نسب کی خاطر سے عرب کو خواہ وہ مشرک ہی کیوں نہیں مومن غلام پر ترجیح دیتے تھے، چنانچہ قرآن نے کہا ہے: خواہ تم کو عرب کی شرافت اور نجابت پر بٹہ لگانا پڑے، مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ تم مشرک کو اپنا داماد اور خسر بناؤ، ان سے بہتر غلام عجمی ہے، اگر وہ مسلمان ہے، ورنہ اگر عرب کا مسلم و عبد مومنہ اور امۃ مومنہ سے

مراد لی جائے تو قرآن کو اس کے لکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی وہ تو بڑا تھا مشرک عرب سے بہتر ہے، غرض کہ قرآن کے نزدیک نہ کوئی مسلم غلام بنایا جاسکتا ہے اور نہ فروخت کیا جاسکتا ہے، اس سے خدمت لی جاسکتی ہے، مگر وہ اسی حیثیت سے گویا وہ خاندان کا ایک ہی فرد ہے'' (ص:۵۹)۔

اہلحدیث:

اس جواب میں مجیب نے دو دعوی کئے ہیں ایک تو یہ کہ: اس آیت میں جس عبد کا ذکر ہے وہ عبد عجمی ہے، دوم: ایک دم آزاد کرانا مناسب نہ تھا۔

ہمیں ضرورت نہیں کہ ہم مجیب کی باتوں کو رد کردیں، کیوں کہ بغیر رد کئے ہمارا مدعا ثابت ہے۔

ہاں صاحب! بہرحال اتنا تو اس آیت سے ثابت ہے کہ اس آیت کے اترنے کے وقت تک عبد مومن مسلمانوں کے پاس تھے، اس کے بعد کوئی حکم ایسا دکھایئے جس سے ثابت ہو کہ عبد مومن کو بحیثیت غلام مت رکھو، اگر ایسا حکم ہوگا تو ہم بھی گردن جھکا دیں گے اور اگر نہیں ہوگا تو آپ کو حدیث پر اپنا اعتراض واپس لینا ہوگا۔

قسط:۵

دفاع عن الحدیث

(۲۳؍شعبان المعظم ۱۳۵۰ھ = ۲؍جنوری ۱۹۳۲ء)

''نگار'' کے اگست ۱۹۳۱ء کے پرچہ میں تنقید کے ماتحت نماز کے متعلق احادیث پر اعتراض کئے ہیں، آپ کو اعتراض ہے کہ بعض افعال مروجہ نماز میں ایسے داخل کئے گئے ہیں جن کا قرآن مجید میں ثبوت نہیں ملتا، چنانچہ آپ کے الفاظ اس بارے میں یہ ہیں:

''(۱) نماز اسلام کی ویسی ہی علامت ہے، جیسے ہندوؤں میں گائے کا احترام، اور یہودیوں میں سبت، اور عیسائیوں میں صلیب، یہی ایک چیز ہے جس سے ایک مسلم کی غیر مسلم سے تمیز ہو سکتی ہے، اس لیے عملی اسلام میں سارا زور نماز پر ہے، نماز کئی چیزوں کا مجموعہ ہے، خدا کی تقدیس و تسبیح و تکبیر کے ساتھ سیدھے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا، جھکنا، سجدہ کرنا، طہارت لباس و بدن کے ساتھ۔

(۲) اصل نماز تو یہ ہے کہ خدا کی تقدیس و تسبیح کی جائے کھڑے ہو کر، سر جھکا کر اور سجدے میں اور جس نماز میں یہ باتیں شامل نہ ہوں وہ نماز نہیں۔

(۳) مسلمانوں میں نماز کے ساتھ ابراہیم اور حضرت محمد پر درود بھیجنا اور پھر دونوں طرف کراماً کاتبین کو سلام کرنا اور دعا مانگنا بھی ضروری ہے، اگرچہ قرآن سے یہ باتیں ثابت نہیں۔

(۴) لیکن جو چیز غیر خدا کے لیے کی جائے وہ نماز میں شامل نہ سمجھی جائے گی۔

(۵) قرآن میں نماز کی ترکیب و ترتیب کا ذکر نہیں، البتہ صلاۃ کے لفظ سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ نماز میں پہلے کھڑے ہوتے تھے اور سجدے کے بعد نماز کو ختم کر دیتے تھے۔ اور التحیات وسلام

وغیرہ کا کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا، قرآن کی دوسری آیتوں سے بھی رکوع، سجدہ، قیام ثابت ہے"
(نگار بابت ۱۳۱ء، ص:۹۔۱۰)۔

مجمل جواب:

تو ان سب کا وہی ہے جو آپ ہی کے کلام سے ماخوذ ہے، چنانچہ آپ اس بیان کے متصل خود ہی لکھتے ہیں:

"یہ بالکل صحیح ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس ترکیب وتعدیل سے نماز پڑھی تھی وہی طریقہ مسلمانوں کی نماز کا ہے، صرف چند فروعی باتوں میں اختلاف ہوتو ہو۔ کیوں کہ یہ ایسا مشہور وظاہر فعل تھا کہ کثرت سے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز میں اقتدا کی، پھر اخلاف نے اسلاف کو دیکھا، اور یہ ناممکن ہے کہ سلسلہ بہ سلسلہ وہ طریقہ جاری نہ رہتا اور بھلا دیا جاتا، قرآن شریف نے اس واسطے نماز کے طریقے وترکیب وترتیب سے اعراض کیا ہے کہ اس کی ضرورت رسول کے خود عمل سے باقی نہ رہتی تھی" (نگار بابت ۱۳۱ء، ص:۱۰)۔

پس جب یہ مسلم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو جو نماز پڑھی وہی متواتر چلی آئی اور اس میں یہ سب امور داخل ہیں تو پھر اعتراض کیا اور معترض کون؟

نمبر (۴) میں جو چیز آپ نے غیر کے لئے لکھی ہے وہ دراصل غیر کے لئے نہیں بلکہ خدا ہی کے لئے ہے۔ آپ کا اشارہ آنحضرت اور حضرت ابراہیم وغیرہ علیہم السلام پر درود شریف کی طرف ہے۔ درود کو آپ سمجھے ہیں کہ غیر خدا کے لئے ہے، بس یہی ایک ناقابل عفو آپ کی غلطی ہے، سنئے! اتنا تو آپ مانتے ہوں گے کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔ ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ صَلُّواْ عَلَيۡهِ وَسَلِّمُواْ تَسۡلِيمًا﴾ [الاحزاب: ۵۶]۔

(اے مؤمنو! نبی پر درود وسلام پڑھا کرو) اب یہ حکم خداوندی ہے اس کی تعمیل کس

طرح ہوگی اس طرح کہ مؤمن کہیں:

''اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَعَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَجِيدٌ''۔

پس مومنوں کا ایسا کہنا تعمیل ارشاد الٰہی ہے، حالاں کہ بقول آپ کے یہ کام غیر خدا کے لیے ہے، عجیب مضحکہ خیز بات یا عجیب فلسفہ ہے کہ مومن حکم الٰہی کی تعمیل کریں اور ''صاحب نگار'' اس کو غیر اللہ کے لیے قرار دے کر نفرت کریں، یا للعجب۔

ہاں اب سوال یہ ہوسکتا ہے اور غالبا صاحب نگار ہی کہیں گے کہ گو تعمیل ارشاد الٰہی ہے، مگر ہے تو غیر خدا کے لیے، یعنی نبی کے لیے جو خدا کا غیر ہے، بہت خوب۔

تو جناب غور فرمایئے اس طرح تو نماز میں یہ دعا بھی ممنوع ہوگی جس کے الفاظ بھی قرآن مجید میں آ گئے ہیں، غور سے سنیے۔

﴿رَّبِّ ٱرْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِى صَغِيرًا﴾ [الاسراء:۲۴]۔

اے خدا میرے ماں باپ پر رحم کر جس طرح انہوں نے مجھے لڑکپن میں پرورش کیا تھا۔

سنیے ایک اور دعا بھی غیر کے لیے ہونے سے منع ہوگی۔

﴿رَبَّنَا ٱغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَٰنِنَا ٱلَّذِينَ سَبَقُونَا بِٱلْإِيمَٰنِ﴾ [الحشر:۱۰]

شاید سوال ہو کہ ابراہیم کو کیوں داخل درود کیا گیا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کے حق میں آیا ہے: ﴿وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِى ٱلْءَاخِرِينَ ۝١٠٨ سَلَٰمٌ عَلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ﴾ [الصافات:۱۰۸-۱۰۹] پس درود میں دونوں کناروں اول آخر کو لیا گیا، جو بالکل قرآن ہے۔

در خانہ اگر کس ست یک حرف بس ست

رہا ملائکہ پر سلام، سو اس کا جواب یہ ہے کہ دائیں بائیں سلام کہنا حدیثوں میں آیا ہے، یہ علماء کی توجیہ ہے کہ سلام ملائکہ کو کیا جاتا ہے، دوسری توجیہ یہ ہے کہ جماعت میں دائیں بائیں کے نمازیوں کو سلام میں نیت کیا جائے، آپ کو ملائکہ والی توجیہ پسند نہیں تو آپ دوسری توجیہ منظور فرمائیے، خفا ہونے کی کیا بات ہے۔

رہا التحیات، البتہ یہ بھی حدیث کی ہدایت ہے، مگر نہ ایجاد بلکہ بوحی الٰہی قرآن مجید کی تعمیل جس میں ارشاد ہے: ﴿يَذْكُرُونَ ٱللَّهَ قِيَٰمًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ﴾ [آل عمران: ۱۹۱] (عقلمند لوگ اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے، بیٹھے بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر)۔

نماز میں قیام ہے (رکوع داخل قیام ہے) سجود بمنزلہ ''جنوبھم'' کے ہے ''قعودا'' کو داخل نماز کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیٹھ کر التحیات پڑھنا سکھا کر قرآنی اشارہ پر عمل کرایا تو کیا برا ہوا، چنانچہ آپ نے خود بھی یہی کہا ہے کہ قرآن شریف نے نماز کے طریقہ وترکیب سے اعراض کیا ہے کہ اس کی ضرورت رسول کے خود عمل سے باقی نہ رہتی تھی۔ فالحمد للہ۔

قسط:٦

دفاع عن الحدیث

(۲۹/شعبان المعظم ۱۳۵۰ھ = ۸/جنوری ۱۹۳۲ء)

گذشتہ پرچہ میں ہم ترتیب نماز سے فارغ ہو چکے ہیں آج ''نگار'' کے ایک معمولی اعتراض پر توجہ کرتے ہیں جو ایک واقف قرآن کے قلم سے نکلنے پر ہمیں تعجب ہے، نگار کو اوقات نماز پر بھی سوال ہے، چنانچہ اس کے الفاظ اس بارے میں یہ ہیں:

''قرآن کے اوقات نماز میں اوپر کی آیت پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ قرآن سے جو اوقات نماز واضح ہیں وہ صرف فجر، عصر اور عشاء کی نماز کے ہیں، ظہر اور مغرب کی نماز کا کہیں ذکر نہیں، اور یوں بھی درحقیقت ظہر اور مغرب کوئی وقت نہیں بلکہ محض اوقات عصر وعشاء میں تقدیم وتاخیر سے پیدا ہو جاتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی عشاء کی نماز جلدی پڑھ لی کبھی دیر کر کے، اسی طرح ظہر کی نماز کبھی دن ڈھلنے کے اول وقت پڑھ لی اور کبھی دن ڈھلنے کے آخر وقت۔ دیکھنے والوں نے یہ سمجھا کہ آپ نے دو علیحدہ اوقات میں نماز ادا کی، اور چوں کہ آپ فرض نمازوں کے علاوہ نوافل کثرت سے پڑھتے تھے لوگوں نے گمان کیا کہ آپ نے دو وقت کی نماز ادا کی، لیکن ایسا بھی ہوا کہ آپ نے ادا نہ کی اور بعضوں نے یہ گمان کیا کہ آپ نے دو وقتوں کی نماز جمع کر لی'' (نگار بابت اگست ۱۹۳۱ء، ص:۱۱)۔

اہلحدیث:

کہتے ہیں وہم کی دوا لقمان کے پاس بھی نہ تھی، اسی طرح ''ہوسکتا ہے''، ''ممکن ہے'' نصوص کے سامنے ایسے الفاظ اس آیت کے ماتحت ہیں:

﴿إِنَّ ٱلظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ ٱلْحَقِّ شَيْـًٔا﴾ [یونس:۳۶]۔

اس سے بہتر تھا آپ سوال کرتے کہ پانچ وقتوں کا ثبوت قرآن میں کہاں ہے، ہوتا تو بے چوں و چرا مان جاتے، نہ ہوتا تو پھر جو چاہتے اختیار کرتے۔ سنیے ارشاد ہے: ﴿وَأَقِمِ ٱلصَّلَوٰةَ طَرَفَيِ ٱلنَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ ٱلَّيْلِ﴾ [ھود: ۱۱۴] (نماز پڑھا کرو تو دن کی دو طرفوں میں اور رات کو بھی)۔

اس آیت میں تین وقتوں کا ثبوت ہے، صبح و شام، اور عشاء کا کیوں کہ: ﴿وَزُلَفًا مِّنَ ٱلَّيْلِ﴾، ﴿طَرَفَيِ ٱلنَّهَارِ﴾ کے بعد آیا ہے، ظہر کا ثبوت یہ ہے: ﴿أَقِمِ ٱلصَّلَوٰةَ لِدُلُوكِ ٱلشَّمْسِ﴾ [الاسراء: ۷۸] سورج کے ڈھلتے وقت نماز پڑھا کرو (جس کو ہم ظہر کہتے ہیں) چار نمازیں ہوگئیں، پانچویں کا ثبوت بھی لیجیے: ﴿حَٰفِظُوا۟ عَلَى ٱلصَّلَوَٰتِ وَٱلصَّلَوٰةِ ٱلْوُسْطَىٰ﴾ [البقرہ: ۲۳۸] سب نمازوں کی حفاظت کیا کرو خصوصا درمیانی نماز کی ضرور۔

اس آیت میں تمام نمازوں کے بعد خاص صیغے سے جس نماز کا حکم دیا ہے وہ صلاۃ وسطی یعنی عصر ہے، یہ ظاہر ہے کہ چار میں صلاۃ وسطی نہیں ہوسکتی کیوں کہ اس کی صورت یوں ہوگی.... اس صورت میں دو ایک طرف دو ایک طرف، ہاں یوں ہو تو وسطی ہوگی.. وسطی.. پس پانچوں اوقات نمازوں کے قرآن مجید سے ثابت ہوگئے، لہ الحمد۔

انہی پانچوں اوقات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھی جس پر آج ہم لوگ عامل ہیں، پس اب کسی ایچ پیچ کی ضرورت نہ رہی، لہ الحمد۔

قسط:۷

دفاع عن الحدیث①

(۱۳؍رمضان المبارک ۱۳۵۰ھ = ۲۲؍جنوری ۱۹۳۲ء)

’’نگار‘‘ کے جواب کا یہ ساتواں نمبر ہے، اس نمبر میں اس نے ایام صیام پر بحث کی ہے، ساری طویل بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ صیام کے متعلق ایام معدودات آئے ہیں، ایام ۳ سے ۹ تک ہوتا ہے، لہٰذا کم سے کم تین روزے فرض ہیں، تیس تمہاری فقہ اور حدیث نے تم پر لگائے ہیں، چنانچہ ’’نگار‘‘ کے الفاظ اس بارے میں یہ ہیں:

’’مسلمانوں کو رمضان کے چند دنوں میں روزے رکھنے کا حکم دیا گیا۔ ایام معدودات کے کیا معنی؟ گنتی کے چند روز۔ اگر تم کو عربی آتی ہے تو غالباً تم جانتے ہو گے کہ ایام بروزن افعال جمع ہے یوم کی اور یہ جمع قلت ہے یعنی وہ جمیع تعداد میں ڈھائی (دہائی ؟) سے نہ بڑھے۔ ۳ سے کم اور ۹ سے زیادہ پر بولا ہی نہیں جاتا، تمہارے پاس یہ جواب ہوسکتا ہے کہ فقہ اور حدیث نے تیس روزے مقرر کئے ہیں اور ہم قرآن کو نہیں جانتے‘‘ (نگار بابت ستمبر ۱۹۳۱ء، ص:۱۱، ۱۲، ۱۳)۔

---

① بعض اہل علم باصرار اطلاع دیتے ہیں کہ دفاع نکرہ صحیح نہیں ’’الدفاع‘‘ چاہئے، جواباً معروض ہے اس میں شک نہیں کہ فنون علم نحو میں یہی لکھا ہے کہ مبتدا معرفہ یا مخصصہ ہونا چاہئے، مگر شروح میں اس کے خلاف ہے، چنانچہ ((شرح جامی)) کی عبارت یوں ہے:

”قال بعض المحققين منهم، مدار صحة الأخبار عن النكرة على الفائدة لا على ما ذكروه من التخصيصات التي يحتاج في توجيهها إلى هذه التكلفات الركيكة الواهية، فعلى هذا يجوز أن يقال كوكب انقض الساعة لحصول الفائدة ولا يجوز أن يقال: رجل قائم لعدمه“۔ (فاندفع ما اورد)۔

اہلحدیث:

یہ جواب تو وہ دیگا جو واقعی قرآن نہ جانتا ہو، ہم تو بفضلہٖ تعالیٰ قرآن جانتے ہیں اور بحولہ وقوتہ خوب جانتے ہیں، منکرین حدیث کے سامنے ہم چیلنج کیا کرتے ہیں کہ مسائل متنازعہ میں قرآن مجید سے نہ ایک انچ ہٹیں گے نہ ہٹنے دیں گے۔

پس سنیے!

ایام بے شک بروزن افعال جمع قلت ہے مگر استعمال اس کا کثرت پر بکثرت آیا ہے خود قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَذَكِّرْهُم بِأَيَّىٰمِ ٱللَّهِ﴾ [ابراہیم:۵] ''حضرت موسیٰ کو حکم ہوتا ہے اللہ کے ایام کے ساتھ ان لوگوں کو ڈراؤ''۔

کیا اس جگہ یہ مراد ہے کہ ۹ دنوں کے واقعات سناؤ ،نہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ دنیا میں جو جو واقعات قدرت ہوئے اور ہوتے ہیں وہ ان کو سناؤ اور ڈراؤ۔

عربی علم ادب کی شہادت سنیے جس کا آپ نے خود ذکر کیا ہے، عرب کا مشہور شاعر متنبی کہتا ہے: ع

سَقى اللّٰهُ أيّامَ الصِّبا ما يَسُرُّها

(خدا جوانی کے ایام کو وہ چیز پلائے جس سے وہ خوش ہوں)

کیا ایام الصبا (جوانی کے دن) نو روز تک ہوتے ہیں؟ اپنے ضمیر سے پوچھئے، ''اسْتَفْتِ قَلْبَکَ''۔(اپنے دل سے پوچھئے)۔

اصل دلیل پورے ماہ صیام کی دوسری آیت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ ٱلَّذِىٓ أُنزِلَ فِيهِ ٱلْقُرْءَانُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَٰتٍ مِّنَ ٱلْهُدَىٰ وَٱلْفُرْقَانِ ۚ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ ٱلشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ [البقرة:۱۸۵]۔

آیت کا ترجمہ کرنے سے پہلے ایک لغوی اصول بتانا ضروری ہے۔

صمت في الشهر (فی کے ساتھ) اور ''صمت الشهر'' فی کے بغیر ان دو میں فرق ہے، پہلی مثال کا ترجمہ ہے، میں نے اس مہینے میں روزہ رکھے، دوسری مثال کا ترجمہ ہے، میں نے مہینہ بھر روزے رکھے، پہلی مثال میں سارے مہینے کے روزے مراد نہیں دوسرے میں سارے مہینے کے مراد ہیں، اردو میں اس کی مثال یہ ہے ''میں نے اس ہفتے میں رخصت لی، میں نے اس ہفتہ رخصت لی'' پہلی مثال میں سارا ہفتہ رخصت نہیں ہوگی، دوسری میں سارا ہفتہ رخصت ہوگی، یہی فرق ہے ''صُمْتُ فِي الشَّهْرِ اور ''صُمْتُ الشَّهْرَ'' میں۔

اب آیت مرقومہ کا ترجمہ سنیے، پہلے ہم اپنا ترجمہ پیش نہیں کرتے، بلکہ قابل راقم ''نگار'' ہی کا پیش کرتے ہیں جس سے ہماری ایک اور غرض بھی ثابت ہو جائے گی، وہ یہ ہے:

ہم علماء حدیث کو منکرین حدیث کے ترک حدیث پر رنج بے شک ہے، مگر اس سے زیادہ رنج یہ ہے کہ یہ لوگ قرآن کا ترجمہ اور تفسیر اپنی مرضی موافق کرتے ہیں یعنی قرآن کے تابع مرضی نہیں ہوتے، بلکہ قرآن کو اپنی تابع مرضی بناتے ہیں، یہ ہمارا دعویٰ بہت سی مثالوں سے ثابت ہے، منجملہ آج نگار کا ترجمہ بھی ایک مثال ہے نگاری ترجمہ یہ ہے:

''رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا جو لوگوں کا رہنما ہے اور اس میں ہدایت وحق و باطل کی تمیز کے کھلے کھلے حکم ہیں تو تم میں سے جو شخص اس میں موجود ہو چاہیے کہ وہ روزہ رکھے'' (نگار بابت ستمبر ۱۹۳۱ء، ص: ۱۳)۔

اہلحدیث:

جس لفظ پر ہم نے خط دیا ہے یعنی روزہ رکھے، نگار نے اسی میں کمال (باصطلاح

علماء سخت فریب) کیا ہے کیوں کہ اس ترجمہ میں روزہ کا مفعول نہیں بتایا جو قرآن مجید میں ''ہ'' کی ضمیر سے بتایا گیا ہے، کس قدر دلیری اور کتنی جرات ہے، قرآن مجید کے ترجمہ کرنے میں جس کے نہ جاننے کا الزام اپنے مخالف گروہ علماء پر لگاتے ہیں اور خود اس کو نہیں سمجھتے، اور اگر سمجھتے ہیں تو چھپا کر بد دیانتی کا ثبوت دیتے ہیں، بہر حال ان دو باتوں میں سے ایک کی تعیین کرنے کا اختیار ہم ''نگار'' کو دیتے ہیں کہ وہ اپنے لیے بے سمجھی کا اعتراف کرے یا بد دیانتی کا ؎

من نگوئم کہ ایں مکن آں کن　　　مصلحت بیں وکار آساں کن

اب سنیے! آیت مرقومہ کا ترجمہ یوں ہے:

''جو کوئی ماہ رمضان پائے وہ سارا مہینہ روزے رکھے''۔

کیوں کہ یہاں ''یصم'' فعل امر کا مفعول بہ ضمیر ''ہ'' ہے اور یہ قاعدہ ہم بتا آئے ہیں صیام کے مفعول پر ''فی'' نہ ہو تو سارے کو گھیرا کرتا ہے جیسے اردو کی مثال (میں نے اس ہفتہ رخصت لی) میں۔

پس ثابت ہوا کہ ایام صیام پورا ماہ رمضان ہے، ''نگار'' کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے متعلق اس کو بہت پریشانی لاحق ہے اس لیے وہ اس فکر میں ہے کہ میری بات بھی رہے اور آیت کی زد سے بھی بچ جاؤں، چنانچہ وہ ہمارے کئے ہوئے ترجمہ پر یوں اعتراض کرتا ہے:۔

''اگر رمضان کے پورے مہینے کا حکم اس آیت میں ہوتا تو یقیناً اس آیت کے بالکل بعد:

﴿فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾

[البقرۃ: ۱۸۴] میں ایام کا لفظ نہ بولا جاتا بلکہ من شہر آخر بولا جاتا کیوں کہ رمضان کے مہینہ ہی میں رمضان کی قضا کبھی رکھی نہیں جاتی'' (ص: ۱۳)۔

سچ یہ ہے کہ یہ دوسری مثال ہے ''نگار'' کی نافہمی یا دیانت کی۔ معلوم نہیں اس کھینچا تانی سے کیا فائدہ؟ اے جناب! ماہ رمضان سارا تو فرض صیام نے گھیر لیا، اب جس شخص کے اس مہینے میں چند روزے فوت ہوئے ان کی قضا رمضان میں نہیں کرسکتا، کیوں کہ رمضان تو صیام فرض سے گھرا ہوا ہے اس میں قضاء فوت کی جگہ نہیں وہ تو خود ادائے صیام کا زمانہ ہے، بس آپ اپنے اس قول پر نظر ثانی کیجیے اس میں کچھ فائدہ نہیں۔ اس کے بعد ''نگار'' نے بڑی کوشش سے تنقیح نکالی ہے کہ:

''(۱) آیا قرآن کا پہلا حکم (ایاما معدودات) قرآن یا حدیث سے منسوخ ہے۔

(۲) آیا حدیث سے تیس دن کے روزے ثابت ہیں'' (ص: ۱۳)۔

جواب} ۲ قرآن سے ثابت ہیں (فتذکر)۔

جواب} ۱ منسوخ نہیں ہے بلکہ مشرح بحال ہے، ہم ثابت کر چکے ہیں کہ ایام کا لفظ کثرت میں بھی آتا ہے اس لیے خدا تعالیٰ نے ایاماً کی تشریح خود شہر رمضان کے ساتھ فرما کر بندوں کو اس محنت سے بری فرما دیا {رَبّنا أرِنا مَناسِكَنا وتُبْ عَلَيْنا} اس نمبر کے مضمون کی جان اتنی ہے، باقی ''نگار'' کی طوالت اس شعر کی مصداق ہے ۔

ملے تو حشر میں لے لوں زبان ناصح کی
عجیب چیز ہے یہ طول مدعا کے لیے

تفسیر بالروایت

مؤلفہ

مناظرِ اسلام علامۂ عصر مولانا ابو الوفاء ثناء اللہ امرتسری

ان مضامین میں مولانا اسلم جیراجپوری کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، جو قسط وار (۱۴ قسطوں میں) ''اخبار اہل حدیث'' امرتسر میں بتاریخ ۹/صفر المظفر ۱۳۵۵ھ (تا) ۱۱/جمادی الاولی ۱۳۵۵ھ = یکم مئی ۱۹۳۶ء (تا) ۳۱/جولائی ۱۹۳۶ء شائع ہوا۔

تحقیق وتعلیق

عبد الاحد احسن جمیل آل عبد الرحمن

قسط:۱

تفسیر بالروایت

(۹/صفر المظفر ۱۳۵۵ھ = یکم مئی ۱۹۳۶ء)

قابل توجہ علماء حدیث:

جس طرح ہر زمانے میں قرآن مجید پر اعتراضات کی نوعیت جدا جدا رہی ہے کبھی اس کی تعلیمی حیثیت سے، کبھی اس کی اعجازی کیفیت سے، کبھی اس کی تاریخی حیثیت سے، کبھی اس کی کتب سابقہ کے ساتھ مطابقت کی رو سے، کبھی نیچرل حیثیت سے غرض ہر پہلو سے اس پر اعتراضات ہوتے آئے، اسی طرح احادیث نبویہ پر بھی مختلف اقسام کے اعتراضات ہو رہے ہیں اور ہر روز نئی قسم کے ہوتے ہیں، ایک زمانہ تھا کہ (صحیح بخاری) کی شروح (عینی) اور (فتح الباری) پر علماء حدیث نازاں تھے کہ بس حدیث کی تشریح ان بزرگوں نے ایسے عمدہ پیرائے میں کردی ہے کہ ''لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ'' والی مثال صادق آتی ہے، ہم بھی اس بات کے قائل ہیں کہ یہ شروح اپنی جگہ پر بے نظیر ہیں، خدا ان کے مؤلفین کو جزائے خیر دے (شَكَرَ اللّٰهُ سَعْيَهُمْ)۔

لیکن اتنا عرض کرنے سے ہم نہیں رک سکتے کہ جس طرح سوامی دیانند وغیرہ آریوں کے اعتراضات کے جوابات کے لئے تفاسیر سلف کافی نہیں اسی طرح آج کل کے اعتراضات کے دفعیہ کے لئے سابقہ شروح کافی نہیں۔

حدیث کے منکر بھی قرآن کی طرح دو قسم ہیں: پہلی قسم کے منکرین وہ لوگ تھے اور ہیں جو عربیت سے بالکل ناواقف، محض تراجم اردو کو سامنے رکھ کر اعتراض کرتے تھے

اور کرتے ہیں۔ اس گروہ کا بڑا فرد سوامی دیانند (آریوں کا گرو) گزرا ہے۔ جو اردو زبان سے بھی واقف نہ تھا، آپ نے اردو ترجمۂ قرآن کو ہندی میں نقل کرا کر قرآن مجید کا مطالعہ کیا اور بسم اللہ سے والناس تک (۱۵۹) اعتراضات کئے جن کے ضمن میں کئی کئی اعتراض ہیں۔ دوسری قسم کے منکرین قرآن وہ لوگ تھے اور ہیں جو عربیت میں کسی قدر دخل رکھتے تھے اور رکھتے ہیں۔ اس قسم کے معترضین میں پادری فنڈر (انگریز) اور مہاشہ دھرمپال (نو آریہ) تھے۔ آپ مہاشہ نے رسالہ (ترک اسلام) میں ایک سو سولہ اعتراضات کئے ہیں۔ ان سب کے جوابات بحولہ وقوتہ دیئے گئے جو مفید ثابت ہوئے۔ اسی طرح منکرین حدیث بھی دو قسم ہیں:۔ پہلی قسم کے لوگ محض اردو دان ہیں جو اردو تراجم کو سامنے رکھ کر احادیث پر اعتراض کرتے ہیں۔ ان کی مثال اڈیٹر ''نگار'' اور امرتسری منکرہ جماعت ہے۔ امرتسری جماعت منکرہ نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ:

''صحیح مسلم کے دیباچہ میں تو صاف لکھا ہے کہ جو شخص قرآن کے باہر وحی کا قائل ہے وہ بدمذہب ہے'' (رسالہ عقائد: ص: ۱۸)۔

جب انجمن اہل حدیث امرتسر کی طرف سے بذریعہ اشتہارات اس کا ثبوت مانگا گیا تو جواب ملا۔ (المعلم ترجمہ صحیح مسلم) میں ہے۔ حالانکہ اس میں بھی نہیں بلکہ فہم عالی کا قصور ہے۔

دوسری قسم وہ لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو عربیت سے واقف ہیں۔ (غالباً) حدیث کو باقاعدہ استاد بلکہ والد ماجد عالم حدیث سے پڑھے ہوئے ہیں۔

آج وہ بھی حدیث نبوی کو حجت شرعیہ نہیں مانتے ان کی مثال میں ہم اپنے دوست بلکہ برادر مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری کو پیش کر سکتے ہیں، جن کے مضامین

ناظرین اہل حدیث سابقہ پرچوں میں دیکھ چکے ہیں۔

ہمارا گمان ہے:

کہ کافر گروہ میں سے دوسری قسم (مہاشہ دھرمپال) کو جس طرح قبول حق کی توفیق ملی ہے اور وہ عرصہ دراز کے بعد یہ کہتے ہوئے کہ:

''ثناء اللہ نے ابن یعقوب کی طرح میرے دل پر اثر ڈالا''۔

اسلام میں واپس آگئے۔ اسی طرح برادر اسلم کو بھی خدا آفاتِ انکار سے سالم بلکہ اسلم رکھے گا۔ ﴿وَمَا ذَٰلِكَ عَلَى ٱللَّهِ بِعَزِيزٍ﴾۔

بھائی اسلم کی خدمت میں التماس:

بھائی صاحب! آپ جانتے ہیں کہ ایک بھائی کی بے راہی سے دوسرے بھائیوں کے دماغ چکرا جاتے ہیں، کوئی تو حضرت موسی کی طرح سخت گیری تک پہنچ جاتا ہے، کوئی خداوندی ارشاد: ﴿لِنتَ لَهُمْ﴾ [آل عمران:۱۵۹] کے ماتحت رہتا ہے۔ اس لئے اگر اہل حدیث برادران آپ سے مختلف برتاؤ کریں تو تحقیق حق اور رجوع الی الحق میں ان کے افعال مختلفہ کو داخل نہ کریں۔ بلکہ ان سب کو ارشاد ربانی: ﴿قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِۦ﴾ [الاسراء: ۸۴] کے ماتحت جان کر: ﴿فَرَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ أَهْدَىٰ سَبِيلًا﴾ [الاسراء: ۸۴] کے ماتحت آنے کی سعی کریں۔

اس تمہید کے بعد ہم حافظ اسلم صاحب کے مضمون تفسیر بالروایت کو بالاقساط مع جواب ناظرین تک پہنچائیں گے۔ حافظ صاحب موصوف نے امرتسری رسالہ منکر [1]

---

[1] منکرین حجیت حدیث کے کئی فرقے ہیں، مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی کے اتباع اپنا نام اہل قرآن رکھتے ہیں، امرتسری منکرین حدیث اہل قرآن نام ناپسند کرتے ہیں، اسی طرح ان میں اختلاف ہے، ہم نے بہت غور کیا کوئی مفہوم مشترک نکلے جو ان سب کو شامل ہو جیسے حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی، سب کو ''مقلد'' کا لفظ شامل ہے، ہمیں...

(بلاغ) میں ایک مضمون شائع کرایا ہے جس کی سرخی ہے تفسیر بالروایت۔ اس کے شروع میں آپ لکھتے ہیں:

''ائمہ حدیث نے حدیثوں کی رو سے تفسیر بالرائے کو تو حرام قرار دیا ہے لیکن تفسیر بالروایت کے طریق کو محفوظ خیال کیا ہے، حالانکہ روایت سوائے متواتر کے خواہ کسی درجہ کی ہو ظن سے آگے نہیں بڑھتی۔ علاوہ بریں تفسیر میں جو روایتیں ہیں ان کے متعلق خود ائمہ حدیث کی شہادت ہے کہ وہ بالعموم ضعیف بلکہ موضوع ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جو امیر المؤمنین فی الحدیث کہے جاتے ہیں ان کا قول ہے کہ ''تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں: ملاحم، مغازی اور تفسیر''، عام خیال یہ ہے کہ ''صحاح ستہ''[1] میں جو روایات ابواب التفسیر میں آئی ہیں وہ صحیح ہیں۔ مگر ان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ بھی امام موصوف کے اس قول سے مستثنیٰ نہیں ہیں، چنانچہ میں صحاح ستہ سے تفسیر بالروایت کی چند مثالیں نکال کر پیش کرتا ہوں۔ جن میں سے کچھ تو خود قرآن کے مخالف ہیں کچھ دوسری حدیثوں سے متعارض، اور بعض علم اور عقل کے خلاف۔ جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تفسیریں رسول اللہ ﷺ کی ہرگز نہیں ہو سکتیں'' (بلاغ امرتسر (ص:۵۸) اپریل ۳۶ء)۔

اہلحدیث:

کچھ شک نہیں کہ امام احمد کا یہ قول صاحب (اتقان) نے بے سند نقل کر کے معمولی

... نہیں ملا سوائے اس لفظ ''منکر'' کے، بس آئندہ کو ہماری اصطلاح ہوگی کہ ہم قرآن کے منکر کو کافر لکھا کریں گے، اور حدیث کو حجت شرعیہ نہ ماننے والے کو منکر لکھا کریں گے، اس میں ان کو بھی برا ماننے کی کوئی بات نہیں، ہماری محض اصطلاح ہے توہین یا ہتک منظور نہیں، باوجود اس کے اگر وہ انکار کی نسبت کو اپنے حق میں برا جانتے ہیں تو قائل ہو کر ہمیں اطلاع دیں، ہم بھی ان کو قائل لکھا کریں گے۔ (اہل حدیث)۔

[1] یہ اصطلاح صحیحین اور سنن اربعہ کے لئے برصغیر کے علماء عموماً استعمال کرتے ہیں، جب کہ زیادہ بہتر اصطلاح اس کے لئے ''کتب ستہ'' ہے کیوں کہ ''سنن اربعہ'' کے مؤلفین نے اپنی کتابوں کے جمع کرنے میں صحت کے لزوم کی شرط نہیں لگائی ہے، واللہ اعلم۔

سا جواب دیا ہے کہ یہ حکم مراسیل کے متعلق ہے، مگر ہمارا جواب اور ہے، ہم مانتے ہیں کہ امام احمد کا قول صحیح ہے لیکن ''عدم علم'' پر مبنی ہے اور عدم علم عدم شئی کو مستلزم نہیں۔ اسی لئے امام بخاری نے یہ اصول مقرر کیا ہے۔ المُثْبِت مُقَدَّم عَلى النَّافِي کیوں کہ نفی کا مبنی دو طرح ہوسکتا ہے: (۱) علم العدم، (۲) عدم علم، اس لئے جہاں نفی عدم علم پر مبنی ہو وہاں مثبت نافی پر مقدم ہے، امام احمد نافی ہیں، دیگر اصحاب صحاح مثبت ہیں۔ لہٰذا ان کو ترجیح ہوگی۔

نوٹ: حافظ اسلم صاحب نے ''تین کتابیں'' لکھا ہے۔ معلوم نہیں یہ تین کتابیں کون کون سی ہیں۔ ہم سے پوچھیں گے تو ہم عرض کریں گے کہ تین کتابیں کا لفظ ایجاد بندہ ہے۔ عفا اللہ عنہ۔

تفسیر بالروایت کی پہلی مثال:

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَٰهِـۧمُ رَبِّ أَرِنِى كَيْفَ تُحْىِ ① ٱلْمَوْتَىٰ ۖ قَالَ ② أَوَلَمْ تُؤْمِن ۖ قَالَ بَلَىٰ وَلَـٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِى ③﴾ [البقرۃ:۲۶۰] اور جب کہا ابراہیم نے کہ اے میرے رب! مجھے دکھلا دے کہ تو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا تو ایمان نہیں لایا ہے، ابراہیم نے کہا کہ بے شک (میں ایمان لایا ہوں) لیکن چاہتا ہوں کہ میرا دل مطمئن ہو جائے۔

اس کی تفسیر میں حضرت ابو ہریرہ سے (صحیح بخاری) میں یہ روایت درج کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہم ابراہیم سے زیادہ شک کرنے کا حق رکھتے ہیں جب کہ انہوں نے کہا کہ اے رب! مجھے دکھلا دے کہ تو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے۔

یہ روایت قرآن کے بھی خلاف ہے اور عقل کے بھی کیوں کہ قرآن نے حضرت ابراہیم کے ایمان کی تصریح کردی اور وہ بھی {بلی} کے لفظ کے ساتھ یعنی بیشک میں مومن

ہوں اور ایمان نام ہے علم الیقین کا جس میں کوئی شائبہ شک نہ ہو: ﴿إِنَّمَا ٱلْمُؤْمِنُونَ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا۟﴾ [الحجرات:۱۵] مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انہوں نے شک نہ کیا۔

چہ جائیکہ حضرت ابراہیم جیسے اولوالعزم رسول کا ایمان اللہ کے مردوں کے زندہ کرنے پر جو بادشاہ سے اسی مسئلہ پر بحث کر چکے تھے جس کا ذکر اس سے پیشتر کی آیات میں ہے، ان کو اس کے اوپر علم الیقین اور ایمان کامل حاصل تھا، وہ چاہتے تھے صرف اطمینان اور عین الیقین، نہ کہ کسی شک کا ازالہ، مگر یہ روایت ظاہر کرتی ہے کہ حضرت ابراہیم کو شک تھا۔

اور عقل کے خلاف اس وجہ سے ہے کہ جب دنیا کے دو سب سے بڑے پیغمبروں میں سے ایک کو اللہ کی صفت احیاء اموات میں شک ہو اور دوسرا اپنے آپ کو ان سے بھی زیادہ شک کا حقدار سمجھے تو پھر ایمان اور یقین کس کے اندر تلاش کیا جائے گا (حوالہ مذکور)

اہلحدیث:

میں نے عرصہ سے اس امر پر غور کیا الحمد للہ میری تسلی ہوگئی ممکن ہے میں اپنے مفہوم کو اچھی طرح ادا نہ کرسکوں، حافظ صاحب سے امید ہے کہ میری کج مج زبان قلم کو نہ دیکھیں گے بلکہ میرے مفہوم پر غور کر کے قبول فرمائیں گے۔

آیت مرقومہ کے تین حصے ہیں جن پر ہم نے ایک دو، تین کے ہند سے لگا دیئے ہیں، تینوں اپنے آپ میں الگ الگ ہیں، بحث کا دارومدار پہلے حصے پر ہے، اس لیے ہم اسے دوبارہ سامنے لاتے ہیں، چنانچہ ارشاد ہے: ﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَٰهِـۧمُ رَبِّ أَرِنِى كَيْفَ تُحْىِ ٱلْمَوْتَىٰ﴾ [البقرۃ:۲۶۰] یہ فقرہ اپنی ذات میں اس قابل ہے کہ اس کو مبنی بر شک کہہ سکیں، گو متکلم کو شک نہ ہوتا ہم سننے والا اس کو مبنی بر شک سمجھنے کا حق

رکھتا ہے، ادبیات میں اس کی مثالیں بکثرت ہیں، حافظ صاحب کی خاطر ہم یہاں ایک مسلم استاد کے قول سے استشہاد کرتے ہیں، عرب کا مشہور بلیغ شاعر امرء القیس اپنی محبوبہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

أفاطِمَ مَهْلًا بَعْضَ هذا التَّدَلُّلِ
وإنْ كُنْتِ قَدْ أزْمَعْتِ صَرْمِی فَأجمِلِي
إن تكُ قد ساءَتْكِ مِنِّي خَلِيقَةٌ
فَسُلِّي ثِيابِي من ثيابِك تَنْسُلِي

(اے محبوبہ اگر تو میری کسی عادت کی وجہ سے قطع تعلق کرنے کا پختہ ارادہ کر چکی ہے تو میرا دل اپنے دل سے ہٹا دے)۔

ان دونوں اشعار میں سے پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ اور دوسرے شعر کے اول مصرعہ میں جو حرف (ان) (شک کا لفظ) لایا گیا ہے محض ان مصرعوں کو دیکھنے والا ان دونوں مصرعوں کو مبنی پر شک قرار دے سکتا ہے یعنی سامع یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوگا کہ امراء القیس کو محبوبہ کی بے وفائی اور سرد مہری سے شک ہوا کہ وہ مجھ سے قطع تعلق کرنا چاہتی ہے اس امر سے قطع نظر کہ امراء القیس کو واقعی شک ہے یا نہیں محض ان دونوں مصرعوں سے سمجھا جاتا ہے کہ قائل کو شک ہے، لیکن جب وہ محبوبہ کے ساتھ وصال کو پہنچتا ہے اور وہی سامع اس کے منہ سے یہ شعر سنتا ہے ؎

هَصَرْتُ بفَودَيْ رأْسِها فَتَمايَلَتْ
عليَّ هَضِيمَ الكَشْحِ رَيّا المُخَلخَلِ

(ملاپ کے وقت میں نے محبوبہ کو اپنی طرف کھینچا پس وہ جھک آئی)

تو سامع کے دل سے سابقہ شک نکل جاتا ہے باوجود اس کے اس کلام کے موہم

شک ہونے میں شک نہیں۔

یہ ادبی اسلوب بیان صرف شعراء ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ قرآن مجید نے بھی اس کو استعمال کیا ہے غور سے سنیے!

﴿وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا﴾ [البقرہ: ۲۳]۔

﴿فَإِن كُنتَ فِي شَكٍّ مِّمَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ﴾ [یونس: ۹۴]۔

﴿وَإِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ﴾ [الانعام: ۳۵] وغیرہ وغیرہ۔

ان آیات میں وہی اسلوب ادبی اختیار کیا گیا ہے جو امرء القیس کے اشعار میں ہے، پھر جس طرح امرء القیس کے کلام کو سامع مبنی بر شک سمجھ کر محل شک یا موہم شک جان کر اگلے یقینی کلام سے اپنی رائے میں تبدیلی پاتا ہے اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کلام کا نمبر اول سامع کے نزدیک مبنی بر شک کہا جا سکتا ہے، مگر ایسا شک جس کا تیسرے فقرہ میں ازالہ ہو چکا ہے، لیکن فقرہ نمبر اول بذاتہ قطع نظر جواب کے موہم شک ہے، اس کی مزید توضیح یوں سمجھئے، عرب کے ایک شاعر نے افعال تکوینیہ کو زمانہ کی طرف منسوب کر دیا ہے، مثلاً کہا ؎

أشابَ الصَّغِيرَ وأفْنى الكَبِيرَ
كَرُّ الغَداةِ ومَرُّ العَشِي

(زمانے کی گردش نے بچوں کو جوان اور بوڑھوں کو فنا کر دیا)

اس پر صاحب ''مطول'' کو کہنا پڑا کہ ان اشعار کو سن کر سامع بھی فتوی لگا سکتا ہے کہ یہ شخص دہریہ ہے، مگر اخیر قصیدے میں اس نے جو یہ کہہ دیا ؎

قيلَ اللهُ للشَّمْسِ اطْلُعِي

(سورج کو طلوع ہونے کا خدا حکم دیتا ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ خدا کا قائل ہے، لہذا پہلا خیال تبدیل ہو گیا اور شاعر فتویٰ کی زد سے بچ گیا۔

حافظ صاحب:

میں آپ کو دور دراز راستے لے جانا نہیں چاہتا، صرف قرآن کے قلعہ میں رہ کر گفتگو کرتا ہوں، خبردار مجھے قرآن سے باہر نہ جانے دیجیے، لیکن آپ اگر گئے تو مجھے آپ کے پیچھے جانا پڑے گا۔ فقرہ نمبر اول بظاہر الفاظ اگر مبنی بر شک نہ تھا تو فرمان الٰہی (فقرہ ۲) ﴿أَوَلَمْ تُؤْمِن﴾ [البقرۃ:۲۶۰] کیوں ارشاد ہوا؟ کلامی طریق سے یہ سوال استفہام تقریری ہے اور منطقی طریق سے یہ اثبات نقیض ہے، کیوں کہ ایمان شک کی نقیض ہے، مطلب یہ ہوا نہ کہ ابراہیم تو ایسا فقرہ بولتا ہے جو موہم شک ہے حالاں کہ شک کی نقیض (ایمان) تجھ میں موجود ہے، حضرت ابراہیم فقرہ نمبر ۳ میں اپنے اندر نقیض شک کے تحقق کا اعتراف کرتے ہیں۔

حافظ صاحب! اس آیت کا طرز بیان بالکل اس آیت کی طرح ہے، جس میں سالبہ کلیہ کی نقیض موجبہ جزئیہ بتا کر مخالف کو خاموش کیا گیا ہے۔ غور سے سنیے!

﴿وَمَا قَدَرُوا۟ ٱللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِۦٓ إِذْ قَالُوا۟ مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ عَلَىٰ بَشَرٍ مِّن شَىْءٍ﴾ [الانعام:۹۱] (سالبہ کلیہ) ﴿قُلْ مَنْ أَنزَلَ ٱلْكِتَٰبَ ٱلَّذِى جَآءَ بِهِۦ مُوسَىٰ﴾ (موجبہ جزئیہ سالبہ کلیہ کی نقیض)۔

بے شک اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بقانون منطق[1] استفہام تقریری کے جواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نقیض شک (ایمان) کا اعتراف کرا کر قائل کر دیا۔ للہ الحمد!

---

[1] محرمین منطق یہ نہ پڑھیں نہ دیکھیں، نہ سنیں، بلکہ لامساس کہہ کر خاموش رہیں۔ (اہل حدیث)۔

اور سنیے!

آپ آیت کے فقرہ اول کو فقرہ (نمبر ۳) اور دیگر آیات کے ساتھ ملا کر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شک کو دور کرتے ہیں آپ کی سعی مشکور ہے، ہم فقرہ (نمبر ۳) اور دیگر کسی آیت کو ملائے بغیر بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بے شک مومن کامل جانتے ہیں اور ایک لمحہ کے لیے بھی حضرت ممدوح کو شک سے ملوث نہیں مانتے، باوجود اس کے حدیث کو قرآن کے خلاف نہیں جانتے کیوں کہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

''نَحْنُ أَحَقُّ بالشَّكِّ مِن إبْراهِيمَ، إذْ قَالَ: ﴿رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتَىٰ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن قَالَ بَلَىٰ﴾ (بخاری ص:۶۵۱)[1]۔

معروضات مرقومہ کو مدنظر رکھ کر تقدیر کلام یوں ہے۔

''نَحْنُ أَحَقُّ أَنْ نَسْتَفْهِمَ اللّٰهَ بِكَلَامِ ظَاهِرِهِ الشَّكَّ، وَالإِيْمَانُ فِي قُلُوبِنا كَمَا اسْتَفْهَمَ إبْراهِيْمُ بِكَلَامِ ظَاهِرِهِ الشَّكَّ وَفِي قَلْبِهِ إِيْمَانٌ''۔(فَانْدَفَعَ مَا أَوْرَدَ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ)۔

[1] صحیح بخاری:كتاب احاديث الانبياء ،باب قوله عز وجل :''ونبئهم عن ضيف ابراهيم اذ دخلوا عليه''،حدیث:۳۳۷۲،صحیح بخاری:كتاب تفسير القرآن ، باب : واذ قال ابراهيم رب ارنى كيف تحى الموتى،حدیث: ۴۵۳۷،صحیح مسلم:كتاب الايمان، باب زيادة طمانينة القلب بتظاهر الادلة،حدیث:۱۵۱،كتاب الفضائل، باب من فضائل ابراهيم الخليل ﷺ، حدیث:۱۵۱۔

قسط:۲

تفسیر بالروایت

(۱۶/صفر ۱۳۵۵ھ = ۸/مئی ۱۹۳۶ء)

یہ سلسلہ مولانا اسلم جیراجپوری کے جواب میں شروع ہوا ہے، جنہوں نے جماعت منکرۂ حدیث کی تائید میں چند احادیث بطور نمونہ پیش کرکے اپنے عقیدہ جدیدہ کو (بخیال خود) قوت دی ہے، اس کا ایک نمبر سابق پرچہ اہلحدیث میں درج ہو چکا ہے، آج دوسرا نمبر ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے، حافظ صاحب کے پورے الفاظ یہ ہیں:

''﴿إِنَّ زَلْزَلَةَ ٱلسَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ ۝١ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا﴾[الحج:۱-۲]'' بے شک قیامت کا زلزلہ بڑی چیز ہے جس دن تم اس کو دیکھو گے اس دن ہر دودھ پلانے والی اپنے بچہ کو جسے اس نے دودھ پلایا ہے، بھول جائیگی اور ہر حمل والی اپنا حمل جن دے گی''۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیامت کا زلزلہ اس قدر ہولناک ہوگا کہ اس کو دیکھتے ہی دودھ پلانے والیاں اپنے بچوں کو بھول جائیں گی اور حمل والیوں کے حمل مارے خوف کے گر جائیں گے، لیکن اس کی تفسیر روایت میں یوں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ عزوجل قیامت کے دن آدم سے کہے گا کہ تم اپنی ذریت میں سے جہنم کا حصہ نکالو، وہ کہیں گے کہ کس قدر، جواب ملے گا کہ ایک ہزار میں سے ۹۹۹، اس وقت حمل والیوں کے حمل گر جائیں گے۔

یہ خلاصہ ہے بخاری کی روایت کا اور یہی ترمذی میں بھی ہے، مگر یہ تفسیر قرآن کے بالکل منافی ہے۔ کیوں کہ قرآن میں ذھول اور وضع حمل کی علت زلزلہ کی ہولنا کی ہے، اور اس روایت میں جہنم

کا حصہ نکالنے کے حکم کی گرانی۔قرآن میں اس کا وقت ہے ﴿يَوۡمَ تَرَوۡنَهَا﴾ جس دن تم زلزلہ کو دیکھو گے، اور روایت میدان قیامت میں محاسبہ کا وقت اس کے لئے معین کرتی ہے جہاں کسی زلزلہ کا ثبوت نہیں۔

پھر یہ میدانِ قیامت میں ہر قسم کے مؤنث جانداروں میں حمل کس وقت کے ہوں گے جو گریں گے، اور وہاں ان کے اسقاط حمل کی غرض وغایت کیا ہوگی، اگر اس کو مجازاً محض شدت خوف کا استعارہ سمجھا جائے تو جب حقیقی معنی بن سکتے ہیں تو مجازی معنی لینے کی کیا ضرورت ہے۔

آیت سے ذہن جس امر کی طرف متبادر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ حالت دنیا میں نفخ صور اول کے وقت ہوگی۔ جب آسمان پھٹ جائے گا، ستارے ٹوٹ پڑیں گے۔ زمین میں بھونچال آئے گا اور شور برپا ہوگا۔لیکن یہ روایت اس کو نفخ صور دوم کے بعد میدان قیامت کا حال قرار دیتی ہے جو آیت کے سراسر خلاف ہے۔اس لئے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول ہرگز نہیں ہوسکتا۔(بلاغ امرتسر (ص: ۵۹-۶۰) اپریل ۳۶ئ)۔

اہل حدیث:

سارے اعتراض کا مبنی ایک ہی لفظ ہے جو بقول حافظ صاحب یہ ہے کہ:

''میدان قیامت میں کسی زلزلہ کا ثبوت نہیں''۔

پس اگر ہم قرآن مجید سے میدان قیامت میں زلزلہ کا ثبوت دے دیں تو قضیہ ختم ہوسکتا ہے، پس غور فرمایئے! قرآن کریم میں ارشاد ہے :﴿إِذَا زُلۡزِلَتِ ٱلۡأَرۡضُ زِلۡزَالَهَا ۝١ وَأَخۡرَجَتِ ٱلۡأَرۡضُ أَثۡقَالَهَا ۝٢ وَقَالَ ٱلۡإِنسَٰنُ مَا لَهَا ۝٣ يَوۡمَئِذٖ تُحَدِّثُ أَخۡبَارَهَا ۝٤ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوۡحَىٰ لَهَا ۝٥ يَوۡمَئِذٖ يَصۡدُرُ ٱلنَّاسُ أَشۡتَاتٗا لِّيُرَوۡاْ أَعۡمَٰلَهُمۡ﴾ الآیۃ[الزلزال:۱-۶]۔

پہلے اس آیت کی ترکیب ملاحظہ ہو''اذا'' ظرف زمان ہے''يَوۡمَئِذٖ'' اس کا بدل

ہے، دوسرا ''یَوۡمَئِذٍ'' پہلے سے بدل یا تاکید ہے۔ بہرحال ''اذا'' اور ''یَوۡمَئِذٍ'' کا مصداق ایک ہی یوم ہے اور وہ روز قیامت ہے، قرینہ بلکہ دلیل اس کی کہ سب واقعات کا مصداق ایک ہی روز قیامت ہے، {یَصۡدُرُ} اور {لِّیُرَوۡا۟} وغیرہ افعال ہیں، پس معنی آیت موصوفہ کے یہ ہوئے کہ:

جس وقت زلزلہ آئے گا اس وقت لوگ اپنے اعمال کا بدلہ دیکھیں گے۔

حافظ صاحب! آپ تو حافظ قرآن ہیں پھر یہ آیت آپ کے حفظ سے کیوں ذہول ہوگئی؟ بجز اس کے اور کوئی وجہ نہیں کہ آپ جب سے منکر حدیث ہوئے ہیں غالباً تالیٔ قرآن بھی نہیں رہے، خدا کرے میرا خیال غلط ہو۔ لیجئے ہم مانتے ہیں کہ وقت فنا بھی زلزلہ آئے گا اس کا اثر یہ ہوگا کہ:۔

﴿فَصَعِقَ مَن فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَن فِي ٱلۡأَرۡضِ﴾[الزمر:٦٨] ''سب آسمان والے اور زمین والے بے ہوش ہوجائیں گے''۔

فنا کے بعد میدان محشر میں زلزلہ ہوگا جس کا ثبوت ہم سورہ زلزال سے دے چکے ہیں۔

ہاں یہ بات کہ میدان محشر میں موثات کا حمل کہاں جو ساقط ہوجائے، قابل غور ہے مگر جناب حافظ صاحب لاہوری اور امرتسری منکران حدیث علوم معقول اور علوم آلیہ سے بے خبری میں ایسی ویسی بات کہہ دیں تو بحکم ''مَنۡ جَهِلَ شَيۡئًا عَادَاهُ'' معذور ہوسکتے ہیں۔ لیکن کسی عالم علوم آلیہ کے قلم سے تو ایسی بات نہیں نکل سکتی جو قرآنی اسلوب بیان کے بھی مخالف ہو، غور فرمائیے، قرآن کیا فرماتا ہے: ﴿فَكَيۡفَ تَتَّقُونَ إِن كَفَرۡتُمۡ يَوۡمٗا يَجۡعَلُ ٱلۡوِلۡدَٰنَ شِيبًا﴾[المزمل:١٧] ''قیامت کا دن بچوں کو بوڑھا کردے گا''۔

اور سنیے!

﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾[القلم:۴۲]۔

جس کی بابت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے لے کر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب تک کنایہ از شدت حال کہہ رہے ہیں، انہی دو آیتوں کی طرح یہ تیسری آیت اور حدیث مذکور بھی کنایہ از شدت حال ہے، دگر ہیچ، غالباً آپ نے علم معانی میں اسلم کثیر الرماد وطویل النجاد کی مثال بھی سنی ہوگی، کیا واقعی اسلم کے دروازے پر راکھ بہت ہوتی تھی اور وہ لمبی پیٹی پہنتا تھا، یا اس سے کوئی کنایہ مراد ہے؟ حافظ صاحب!

ہوا تھا کبھی سر قلم قاصدوں کا
یہ تیرے زمانے میں دستور نکلا

اظہار تعجب:

حافظ صاحب کے ایک مقولہ سے، مجھے سخت تعجب ہی نہیں بلکہ بڑا رنج ہوا، چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

''اگر مجازاً محض شدت خوف کا استعارہ سمجھا جائے تو جب حقیقی معنی بن سکتے ہیں تو مجازی معنی لینے کی کیا ضرورت ہے''۔

وجہ رنج یہ ہے کہ میرے گمان کو جو حافظ صاحب کی استعداد علمی کے متعلق ہے اسے سخت صدمہ پہنچا لیکن خدا کے فضل سے ابھی تک وہ گمان قائم ہے، جناب غور سے سنیے! ہمارے پیش کردہ معنی نہ مجاز ہیں نہ استعارہ بلکہ کنایہ ہیں، کنایہ میں حقیقت ممکن بلکہ متصور ہوتی ہے، کیا میری پیش کردہ مثال ''اسلم کثیر الرماد'' میں اسلم کے ہاں کثرت رماد محال ہے ہرگز نہیں، باوجود امکان حقیقت کے کثرت سخاوت سے کنایہ ہے، آپ کا یہ فرمانا بھی فہم قرآن کے خلاف ہے۔

آیت سے ذہن جس امر کی طرف متبادر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ حالت دنیا میں نفخ صوراول کے وقت ہوگی۔الخ

جناب حافظ صاحب نفخۂ اولیٰ کا اثر قرآن مجید نے صاف بتایا ہے: ﴿فَصَعِقَ مَن فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَن فِي ٱلۡأَرۡضِ﴾ [الزمر:٦٨]، ﴿فَلَا يَسۡتَطِيعُونَ تَوۡصِيَةٗ وَلَآ إِلَىٰٓ أَهۡلِهِمۡ يَرۡجِعُونَ﴾ [یسین:٥٠] یہ اثر موت الناس کا مظہر ہے اور آیت زیر بحث میں: ﴿وَتَرَى ٱلنَّاسَ سُكَٰرَىٰ﴾ [الحج:٢] انسانوں کی زندگی کا اثبات ہے، پھر یہ اجتماع نقیض کیسے صحیح ہوسکتا ہے۔

حافظ صاحب! یہ تو دانستہ بزور آیت وحدیث میں تخالف پیدا کر کے حدیث کو مورد الزام بتانا ہے، آپ یادرکھیں جب تک خدام حدیث میں معقول جاننے والے موجود ہیں، ایسی مساعی پادر ہوا ثابت ہوں گی، اس لیے بڑی محبت سے آپ کو اطلاع دیتا ہوں۔

سنبھل کے رکھیو قدم دشت خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

❁ ❁ ❁

قسط: ۳

تفسیر بالروایت

(۲۳؍صفر المظفر ۱۳۵۵ھ = ۱۵؍مئی ۱۹۳۶ء)

سابقہ دونمبروں میں دو حدیثوں کے متعلق بحث ہوئی ہے، آج تیسری حدیث کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مولانا حافظ اسلم صاحب جیراجپوری لکھتے ہیں: ﴿وَلَقَدْ ءَاتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ ءَايَـٰتٍۭ بَيِّنَـٰتٍ﴾ [الاسراء:۱۰۱] ''اور ہم نے موسیٰ کو نو کھلی ہوئی نشانیاں دیں''۔ اس کی تفسیر روایت کے ساتھ اس طرح کی گئی ہے:

''ایک دفعہ آنحضرت تشریف فرما تھے، سامنے سے دو یہودی گذرے، ایک نے دوسرے سے کہا کہ چلو اس پیغمبر سے کچھ سوال کریں، دوسرے نے کہا کہ پیغمبر نہ کہو، سن لے گا تو اس کی چار آنکھیں ہوجائیں گی (یعنی خوش ہوگا) اس کے بعد وہ آپ کی خدمت میں آئے اور دریافت کیا کہ موسیٰ کو نو آیتیں کون سی دی گئی تھیں آپ نے فرمایا وہ یہ ہیں: کسی کو خدا کا شریک نہ بناؤ، زنا نہ کرو، کسی بے گناہ کو قتل نہ کرو، چوری نہ کرو، جادو نہ کرو، کسی حاکم کے پاس بے جرم کی چغلی نہ کھاؤ، سود نہ کھاؤ، کسی پاکدامن پر تہمت نہ لگاؤ، اور میدان جہاد سے نہ بھاگو (اس نویں حکم میں راوی کو شک ہے) اور خاص تمہارے لیے اے یہود! دسواں حکم یہ ہے سبت کے دن زیادتی نہ کرو، یہ سن کر دونوں یہودیوں نے آپ کے دست و پا کو بوسہ دیا۔

یہ حدیث جامع ترمذی، مسند امام احمد، نسائی، ابن ماجہ اور ابن جریر میں ہے۔

حضرت موسیٰ کے تسع آیات کی تفسیر توریت کے احکام تسعہ کے ساتھ جو اس حدیث میں کی گئی

ہے، اور جس کو امام ترمذی نے حسن صحیح کہا ہے، نہ صرف یہ کہ یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ قرآن کی رو سے اس کا صحیح ہونا ممکن ہی نہیں ہے، کیوں کہ یہ نو نشانیاں حضرت موسیٰ کو اس وقت ملی تھیں، جب مدین سے مصر جاتے ہوئے اللہ نے ان کو فرعون قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا اور اس وقت تک نہ توریت نازل ہوئی تھی اور نہ اس کے احکام عشرہ تھے، ان دونوں باتوں کی تصریح قرآن میں موجود ہے، سورہ نمل میں ہے: ﴿فِي تِسْعِ ءَايَٰتٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهِۦٓ﴾[نمل:۱۲] نو نشانیاں لے کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف۔

پھر سورہ اعراف میں حضرت موسیٰ کا قصہ تفصیل کے ساتھ بیان کر کے ان نشانیوں کو گنا دیا ہے یعنی عصا، ید بیضا، قحط، نقص ثمر، طوفان، ٹڈھی، جوں، مینڈک، اور خون۔

اس کے مدتوں بعد حضرت موسیٰ اللہ کے حکم سے ہی بنی اسرائل کو مصر سے لیکر نکلتے ہیں، فرعون معہ اپنے لشکر کے ان کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں غرق ہوتا ہے، اور حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لیے ہوئے کوہ طور کی طرف آتے ہیں، وہاں اللہ ان کو میقات پر بلاتا ہے اور بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے توریت عطا کرتا ہے: ﴿يَٰمُوسَىٰٓ إِنِّي ٱصْطَفَيْتُكَ عَلَى ٱلنَّاسِ بِرِسَٰلَٰتِي وَبِكَلَٰمِي فَخُذْ مَآ ءَاتَيْتُكَ وَكُن مِّنَ ٱلشَّٰكِرِينَ ﴿١٤٤﴾ وَكَتَبْنَا لَهُۥ فِي ٱلْأَلْوَاحِ مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾[الاعراف:۱۴۴-۱۴۵]
''اے موسیٰ! میں نے تجھ کو اپنے پیغامات اور اپنی ہم کلامی کے لیے لوگوں پر چن لیا، سو جو کچھ میں تجھ کو دیتا ہوں لے اور شکر کر، اور ہم نے اس کے لیے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر شیء کی تفصیل لکھ دی'' (بلاغ امرتسر:۶۰-۶۱، بابت اپریل ۳۶ء)۔

اہلحدیث:

حافظ صاحب کے اعتراض کی قدر کر کے جواب میں عرض کرتے ہیں کہ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت اور آیات کا لفظ معجزات اور احکام پر بطور اشتراک کے بولا

گیا ہے، امتیاز ان میں یوں ہے کہ جہاں رؤیت کا تعلق ہو وہاں نشان قدرت یا نشان نبوت (معجزہ) مراد ہوتا ہے، مثلا: ﴿وَإِن يَرَوْاْ ءَايَةً يُعْرِضُواْ﴾ جہاں پڑھنے کا ذکر ہوتا ہے وہاں الفاظ احکام مراد ہوتے ہیں، جیسے: ﴿إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ءَايَٰتُ ٱلرَّحْمَٰنِ خَرُّواْ سُجَّدًا وَبُكِيًّا﴾ [مریم:۵۸] اس اشتراک کے بعد حدیث مذکور کو قرآن مجید کے ساتھ سمجھ لینا آسان ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید میں جو الفاظ {تِسۡعِ آيَات} ہیں ان سے مراد یقیناً معجزات موسومہ ہیں، لیکن یہودی سائل کا سوال معجزات سے نہ تھا بلکہ احکامی آیات سے تھا جس کے لیے لفظ آیات بالاشراک متحمل ہے اور اس کا بڑا اقوی قرینہ یہ ہے کہ سائل جواب نبوی سنکر خاموش رہا، جواب غیر متعلق ہوتا تو وہ فوراً کہتا کہ ؎

سوال از آسماں جواب از ایسماں

یہودی سائل کا خاموش رہنا صاف قرینہ ہے کہ اس کی مراد تسع آیات سے آیات کے دوسرے معنی (احکام) ہی تھے۔

ہاں ہماری اس تاویل پر ایک اعتراض ہوسکتا ہے جس کو حل کرنا بھی ہمارا فرض ہے، اعتراض یہ ہے کہ روایت کے الفاظ یہ ہیں:

سألاه عن قول الله تعالیٰ: ﴿وَلَقَدْ ءَاتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ ءَايَٰتٍۭ بَيِّنَٰتٍ﴾۔

روایت کے ان الفاظ میں صاف ذکر ہے کہ یہودیوں نے اللہ تعالی کے قول ''تسع آیات'' سے سوال کیا تھا، اور قرآن کی تسع آیات سے مراد یقیناً معجزات موسومہ ہیں، پھر احکام کیوں بتائے گئے؟

جواب یہ ہے:

کہ روایت میں عن قول اللہ: ﴿وَلَقَدْ ءَاتَيْنَا مُوسَىٰ﴾، فہم راوی ہے، اصل الفاظ

صرف اتنے ہیں عن ''تسع آیات بینات'' راوی کی نظر میں آیت قرآنیہ تھی، اس نے سمجھا کہ یہی تسع آیات ہیں جو قرآن میں مذکور ہیں، اس لیے اس نے عن قول اللہ کا لفظ بطور تشریح از خود بڑھا دیا۔

تصرف قدرت:

ہم خدائی تصرفات کے قائل ہیں کہ وہ اندر ہی اندر احادیث نبویہ سے دفاع کیا کرتے ہیں، حافظ صاحب نے ترمذی کی روایت کا ذکر کیا، لیکن ترجمہ ایسا آسان کیا کہ ہمارے دعویٰ کو مؤید ہے، ناظرین غور فرمائیں، آپ لکھتے ہیں کہ دریافت کیا موسی کو نو آیتیں کون سی دی گئی تھیں۔

اس ترجمہ میں عن قول اللہ کا ذکر نہیں، واقعی نہیں ہونا چاہیے تھا۔

حافظ صاحب:

میں آپ کی خاطر کئی ایک مثال ایسی بتا سکتا ہوں جن میں احادیث نبویہ کا بیان بظاہر قرآن کے خلاف ہے، لیکن دراصل خلاف نہیں مگر خطرہ ہے کہ جماعت منکرہ کو ''اونگھتے کو ٹھیلتے'' کا بہانہ نہ مل جائے، اس لیے ایک ہی واقعہ آپ کے سامنے لاتا ہوں۔

ازواج النبی رضی اللہ عنہن کو ''یا نساء النبی'' سے مخاطب کر کے اخیر تک خطاب کیا گیا، اخیر میں فرمایا: ﴿ إِنَّمَا يُرِيدُ ٱللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ ٱلرِّجْسَ أَهْلَ ٱلْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ﴾ [الاحزاب: ٣٣] خدا کو یہی منظور ہے کہ تم اہل بیت کو ہر قسم کی ناجائز آلودگی سے پاک کرے۔

اس آیت کے سیاق سے صاف ثابت ہے کہ اہل بیت ازواج مطہرات ہیں جو: ﴿ يَٰنِسَآءَ ٱلنَّبِيِّ ﴾ میں مخاطب ہیں، باوجود اس کے حدیث آپ کو معلوم ہوگی کہ رسالت مآب علیہ السلام اپنی بیٹی، داماد اور دونوں نواسوں کو کملی میں لے کر فرماتے ہیں

''اللّٰہُمَّ ھٰؤُلَاءِ أَھْلُ بَیْتِي فَطَہِّرْھُمْ''۔

حافظ صاحب:

اگر یہ حدیث بھی آپ کو کچھ کام دے سکتی ہے تو درج فہرست کر لیجیے اور ہماری دریا دلی کی داد دیجیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح ہم مقابل کا وار اپنے اوپر لے لیتے ہیں، کیوں کہ ؎

کیوں نہ ٹھہریں ہدف ناوک بے داد کہ ہم

خود اٹھا لاتے ہیں جو تیر خطا جاتا ہے

اس حدیث ''کسا'' کا مطلب بھی یہی ہے کہ اصل اہل بیت تو ازواج النبی ہیں، اصحاب کسا ملحق بہم ہیں، جیسے علم صرف میں بعض الفاظ اصل رباعی ہوتے ہیں اور بعض ملحق بالرباعی اسی طرح آپ کی پیش کردہ آیت اور حدیث کی تطبیق کی ہے کہ قرآن مجید میں جن تسع آیات کا ذکر ہے وہ تو معجزات مثبتہ نبوت ہیں، حدیث میں جو تسع آیات ہیں وہ احکام ہیں۔ فاندفع ما اورد۔

رہا: بائیبل کے متعلق آپ کا فرمانا کہ یہ حدیث بائیبل کے بھی خلاف ہے، آپ کے الفاظ یہ ہیں:

''علاوہ بریں اس روایت میں (۱) سود نہ کھاؤ، (۲) جادو نہ کرو، (۳) میدان جہاد سے نہ بھاگو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے احکام عشرہ میں سے گنائے گئے ہیں، حالاں کہ ان تینوں میں سے ایک بھی ان میں سے نہیں ہے، احکام عشرہ یہ ہیں:

میرے آگے تیرا کوئی دوسرا خدا نہ ہو، تو خداوند اپنے خدا کا نام بے سبب نہ لے، جھوٹی قسم نہ کھا، سبت کے دن کی یاد رکھ، اپنے باپ اور ماں کو عزت دے، خون نہ کر، زنا نہ کر، چوری نہ کر، اپنے ہمسایہ کی جورو کو مت چاہ، اپنے ہمسایہ پر جھوٹی گواہی نہ دے، اپنے ہمسایہ کے کسی مال کا لالچ نہ کر''

(توریت سفر استثناء:۵۔۲۶)(حوالہ مذکور)

اہلحدیث:

اس اقتباس میں آپ نے تین اعتراض کئے ہیں جن پر ہم نے نمبر لگا دیئے ہیں، ان کے جوابات نمبروار، سنیے!

(۱) اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی کو جو تیرے آگے محتاج ہے کچھ قرض دیوے تو اس سے بیاجیوں کی طرح سلوک مت کر اور اس سے سود مت لے (خروج ۲۲،۲۵)

(۲) جادو سے منع کا ثبوت، سنیے!

تم ان کی طرف جن کا یار دیو ہے توجہ نہ کرو، اور نہ جادوگروں کے طالب ہو کہ ان کے سبب سے ناپاک ہو جاؤ گے، میں خداوند تمہارا خدا ہوں۔ (احبار ۱۹۔۳۱)

اس کے متعلق بہت سے حوالوں کے علاوہ قرآنی تصدیق بھی موجود ہے: ﴿وَلَقَدْ عَلِمُوا۟ لَمَنِ ٱشْتَرَىٰهُ مَا لَهُۥ فِى ٱلْءَاخِرَةِ مِنْ خَلَٰقٍ﴾ [البقرۃ:۱۰۲]۔

(۳) جب تم جنگ کے لیے ان کے نزدیک جاؤ تو اے اسرائیل تم دشمنوں سے ہراساں نہ ہو، تم خوف نہ کرو اور مت کانپو اور ان سے دہشت نہ کھاؤ۔ (استثناء ۲۰: ۲-۳)

اس کا مطلب منع عن الفرار ہے اس کے ساتھ استثناء باب ۷ سارا پڑھ جایئے تو حدیث کی صداقت میں ذرہ شبہ نہیں رہتا مگر انصاف شرط۔

حافظ صاحب:۔ انبیاء کرام کا علم میرے اور آپ کے علم کی طرح تھوڑا سا نہیں ہوتا وہ بڑے وسیع العلم ہوتے ہیں، آپ نے اپنے گمان کے مطابق ان حکموں کو احکام عشرہ میں تلاش کیا، جب نہ ملے تو اعتراض جڑ دیا، اب جو مل گئے تو آپ کی دیانت پر اعتماد کر کے ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ آپ صاف لفظوں میں اعتراف کریں گے کہ فرمان خداوندی:

﴿وَمَآ أُوتِيتُم مِّنَ ٱلۡعِلۡمِ إِلَّا قَلِيلٗا﴾ [الاسراء:۸۵] کے مخاطبوں میں سے ایک فرد میں بھی ہوں ۔

نہ تنہاء تو دریں میخانہ مستی
جنید و شبلی و عطار شد مست [1]

❁ ❁ ❁

قسط:۴

تفسیر بالروایت

(۳۰/صفر المظفر ۱۳۵۵ھ = ۲۲/مئی ۱۹۳۶ء)

ناظرین آگاہ ہوں گے کہ ہمارے مہجور برادر حافظ اسلم بن مولانا شیخ سلامت اللہ بھوپالی مرحوم نے انکار حدیث کا مشرب اختیار کر کے سلسلہ تردید حدیث جاری کیا ہے، جس کی سرخی رکھی ہے ''تفسیر بالروایت''۔ تفسیر بالروایت کے متعلق ہمارا مشرب وہی ہے جو ہم نے اپنی متعدد تصنیفات آیات متشابہات وغیرہ میں لکھا ہے۔ مگر حافظ صاحب موصوف کا مقصد اس کے ضمن میں انکار اور تردید حدیث ہے۔ اس لئے ہم نے ان کے جواب میں قلم اٹھایا ہے۔ آج اس کا چوتھا نمبر ہے۔ ہماری معروضات کو دیکھ کر مولانا جیراجپوری نے ایک طویل خط لکھا۔ جس کے چند الفاظ حسب ذیل ہیں:

''مولانا! جماعت اہل حدیث جس کے اندر کبھی ایمان کے شعلے بھڑکتے تھے اب ایک راکھ کا

---

[1] اس میخانہ میں تو اکیلا مست نہیں جنید، شبلی اور عطار بھی مست ہیں۔

ڈھیر ہے، ان کے علماء مقلدوں کے علماء سے بھی زیادہ بے معنی ہیں۔لیکن اس ڈھیر میں ایک چنگاری صرف آپ کی ذات کو سمجھتا ہوں۔آپ نے آریوں کا مقابلہ کیا اور خوب کیا۔عیسائیوں کا مقابلہ کیا اور خوب کیا۔اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پنجاب میں قادیانیت کے سیلاب کو روکنے کے لئے جس پامردی کے ساتھ آپ کھڑے ہوگئے کچھ عجب نہیں کہ وہ آپ کی نجات کا ذریعہ بنے۔میری التجا صرف یہ ہے کہ فرقہ پروری کا خیال چھوڑ کر محض حق کو پیش نظر رکھئے''۔

(ایسا ہی کرتا ہوں اور ایسا ہی کروں گا،آپ سے بھی یہی امید ہے۔اہل حدیث)

اس خط کو دیکھ کر بے ساختہ منہ سے نکلا ؎

ہماری راکھ کو کیوں چھیڑتی ہے باد صبا
کہ اس میں آگ بھی شاید کہیں دبی ہوگی

حافظ صاحب لکھتے ہیں:

''بدقسمتی سے مسلمانوں میں عہد صحابہ ہی میں ابوبکر وعلی کے جھگڑے پیدا ہوگئے تھے۔جس کی وجہ سے اشخاص کے مناقب قرآنی آیات سے بھی نکالنے کی کوشش ہونے لگی تھی، چنانچہ بہت سی آیتوں کی تفسیریں ایسی روایتوں کے ذریعہ سے کی گئی ہیں جن سے معتقد علیہ شخصیتوں کے فضائل ثابت ہوں،سورہ حج میں ہے:

﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ ٱللَّهَ يَسْجُدُ لَهُۥ مَن فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَن فِى ٱلْأَرْضِ وَٱلشَّمْسُ وَٱلْقَمَرُ وَٱلنُّجُومُ وَٱلْجِبَالُ وَٱلشَّجَرُ وَٱلدَّوَآبُّ وَكَثِيرٌ مِّنَ ٱلنَّاسِ ۖ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ ٱلْعَذَابُ ۗ وَمَن يُهِنِ ٱللَّهُ فَمَا لَهُۥ مِن مُّكْرِمٍ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۩ ﴿١٨﴾ ۞ هَٰذَانِ خَصْمَانِ ٱخْتَصَمُوا۟ فِى رَبِّهِمْ﴾[الحج: ۱۸-۱۹] ''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں وہ اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جاندار اور بہت سے آدمی۔اور بہتوں پر عذاب کا

فیصلہ ہو چکا ہے۔ اور جس کو اللہ ذلیل کرے اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں۔ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، یہ دو فریق ہیں جنہوں نے اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کیا ہے''۔

قرآن میں ''ھذ ان'' کا مشار الیہ موجود ہے کہ بنی نوع انسان میں بہت سے ایسے ہیں جو اپنے رب کو سجدہ کرتے ہیں اور بہت سے نہیں کرتے، یہ دونوں فریق ہیں کہ ان میں باہمی نزاع رب کے بارے میں ہے مگر روایت یہ کہتی ہے کہ ''یہ آیت جنگ بدر میں حضرت علی اور حمزہ اور عبیدہ کے متعلق نازل ہوئی جو شیبہ اور عتبہ اور ولید کے مقابلہ کے لیے گئے تھے''۔

مشکل یہ ہے کہ سورہ حج مکی ہے اور جنگ بدر مدینہ میں ہوئی اس لئے یہ شانِ نزول کیسے صحیح ہوسکتا ہے، لیکن چونکہ روایت بخاری میں ہے اس وجہ سے علامہ جلال الدین سیوطی کو ''ھذ ان'' سے تین اور جامع البیان کو چھ آیتوں کو مدنی قرار دینا پڑا۔ متأخرین نے تو پوری سورہ کو مدنی کہہ دیا، چنانچہ وہ مصاحف میں مدنی ہی لکھی جاتی ہے۔ اذنِ قتال سے جو اس سورہ میں مسلمانوں کو دیا گیا ہے یہ خیال ہوسکتا تھا کہ یہ مدنی ہے کیوں کہ یہ اجازت مدینہ ہی میں مل سکتی تھی مگر جامع ترمذی میں روایت ہے کہ یہ اجازت مکہ سے نکلتے وقت ملی۔ اس لئے اس بنیاد پر بھی اس سورہ کو مدنی کہنا صحیح نہ ہوگا، بالفرض اگر یہ آیات مدنی بھی ہوں تو قرآن سے عدول کرنا جس میں ''ھذ ان'' کا مشار الیہ مذکور ہے کس طرح جائز ہوسکتا ہے'' (بلاغ امرتسر۔ اپریل ۳۶ء، (ص: ۶۲-۶۱))۔

اہلحدیث:

حافظ صاحب کو شانِ نزول کی حقیقت سمجھنے میں غلطی لگی ہے۔ موصوف سمجھتے ہیں کہ شانِ نزول میں جس کے حق میں آیت کے نزول کا ذکر ہو لازمی ہے کہ وہ شخص یا واقعہ نزول آیت کے زمانہ میں ہوا کرے۔ حالانکہ لزوم اس کا غلط ہے۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم مسئلہ شانِ نزول کے متعلق اہل حدیث کا اصول پیش کریں نہ اپنے الفاظ میں بلکہ بڑے معتبر حکیم امت حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کے الفاظ ہیں۔ حضرت شاہ

صاحب فرماتے ہیں:

والذي يظهر من استقراء كلام الصحابة والتابعين أنهم لا يستعملون نزلت في كذا لمحض قصة كانت في زمنه ﷺ وهي سبب نزول الآية بل ربما يذكرون بعض ما صدقت عليه الآية مما كان في زمنه ﷺ أو بعده ﷺ يقولون نزلت في كذا ولا يلزم هناك انطباق جميع القيود بل يكفي انطباق أصل الحكم فقط، وقد يقررون حادثة تحققت في تلك الأيام المباركة و استنبطﷺ حكمها من آية وتلاها في ذلك الباب ويقولون نزلت في كذا وربما يقولون في هذه الصورة فأنزل الله قوله كذا فكأنه اشارة إلى أنه استنباطه ﷺ وإلقاؤها في تلك الساعة بخاطره المبارك أيضا نوع من الوحي والنفث في الروع فذلك يمكن أن يقال فأنزلت ويمكن أيضا أن يعبر في هذه الصورة بتكرار النزول ويذكر المحدثون في ذيل آيات القرآن كثيرا من الأشياء ليست من قسم سبب النزول في الحقيقة مثل استشهاد الصحابة في مناظراتهم بآية أو تمثيلهم بآية أو تلاوته ﷺ آية للاستشهاد في كلامه الشريف أو رواية حديث وافق الآية في أصل الغرض أو تعيين موضع النزول أو تعيين أسماء المذكورين بطريق الإبهام أو بطريق التلفظ بكلمة قرآنية أو فضل سور وآيات من القرآن أو صورة امتثاله ﷺ بأمر من أوامر القرآن ونحو ذلك وليس بشيء من هذا في الحقيقة من أسباب النزول"(الفوز الكبير:(ص:۵۷۔۵۸))۔

صحابہ اور تابعین کے کلام سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آیت کا نزول محض اس قصے کے لئے استعمال نہ کرتے تھے جو زمانہ رسالت میں ہوا ہو بلکہ کئی دفعہ ایسے واقعات کو بھی بطور شانِ نزول کے ذکر کرتے تھے جن پر وہ آیت بطور وضع عام موضوع لہ خاص صادق آتی ہو خواہ واقعہ زمانہ رسالت میں ہوا ہو یا بعد، چنانچہ وہ کہا کرتے تھے کہ یہ آیت اس کے متعلق اتری ہے اس سے یہ لازم نہیں تھا کہ ساری قیود اس پر صادق آسکیں۔ بلکہ اصل حکم کا انطباق کافی تھا (الخ)۔

حافظ صاحب! آپ نے جو واقعہ نقل کر کے اعتراض جمایا ہے حضرت شاہ صاحب کی تفصیل کے ماتحت اس کو دیکھ کر تسلی فرمایئے۔

لطیفہ:۔ حافظ صاحب ممکن ہے میرے جوابات سے آپ کبیدہ خاطر ہو گئے ہوں اس لئے میں آپ کو ایک لطیفہ سنا کر محظوظ کروں تو مناسب ہے۔

آپ کی قرآنی حمایت اور تردید حدیث پر نظر کر کے آپ کا پڑوسی اخبار ''محمدی'' امرتسر کے ''اہل حدیث'' کو اگر نصیحت کرے کہ میاں کیوں وقت ضائع کرتے ہو، ایسے لوگوں کے حق میں تو شیخ سعدی مرحوم فرما چکے ہیں ؎

آنکس کہ بقران وخبر زد نہ رہی
انیست جوابش کہ جوابش ندہی

بلکہ حافظ شیرازی کے شعر میں آپ (حافظ) اسلم صاحب کو مخاطب کر کے یہ کہہ دیں ؎

حافظا مے خور درندی کن وخوش باش ولے
دام تزویر مکن چوں دگراں قرآں را

تو کیا آپ ان کے جواب میں یہی اعتراض فرما دیں گے کہ میں سعدی اور حافظ کے

زمانہ میں کہاں تھا، ورنہ اگر آپ ایسا کہیں گے تو وہ آپ کے حق میں کہیں گے:

سخن فہمیٔ عالم بالا معلوم

مختصر یہ ہے کہ شانِ نزول کا مسئلہ وہی حقیقت رکھتا ہے، جو نحوی اصطلاح میں وضع عام اور موضوع لہ خاص رکھتا ہے۔ (شرح ملا جامی ملاحظہ ہو)

بیادر بزم زنداں تا بہ بینی عالم دیگر
بہشت دیگر وابلیس دیگر آدم دیگر

قسط:۵

تفسیر بالروایت

(۷؍ربیع الاول ۱۳۵۵ھ = ۲۹؍مئی ۱۹۳۶ء)

جناب حافظ اسلم صاحب جیراجپوری کے سلسلہ میں چار نمبر مع جوابات شائع ہو چکے ہیں، آج پانچواں نمبر درج کر کے جواب دیا جاتا ہے۔

حافظ صاحب لکھتے ہیں:

"﴿كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ﴾ کے تحت میں صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن میری امت کے کچھ لوگ لائے جائیں گے جن کو فرشتے بائیں طرف لے جائیں گے (یعنی جہنم میں) مَیں کہوں گا کہ اے میرے رب! یہ تو میرے اصحاب ہیں، جواب ملے گا کہ تم نہیں جانتے تمہارے بعد انہوں نے کیا کچھ کیا ہے، تب میں وہی کہوں گا جو نیک

بندے (عیسی) نے کہا تھا کہ میں جب تک ان میں رہا ان کا نگراں تھا۔ جواب ملے گا کہ جب سے تم نے ان کو چھوڑا یہ برابر مرتد رہے۔

یہ روایت صحیح نہیں ہوسکتی کیوں کہ:

(۱) قرآن کی رو سے ایسی پیشین گوئی حدود نبوت سے خارج ہے اور یہ نبی کا کام ہی نہیں۔

(۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کو غائر نظر سے دیکھنے کے بعد ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے صحابہ کے متعلق اس قسم کی غیر ضروری پیشین گوئی کریں' (بلاغ امرتسر (ص: ۶۲)، اپریل ۳۶ء)۔

اہلحدیث:

حقیقت یہ ہے کہ حافظ صاحب نے حدیث فہمی میں عجلت سے کام لیا ہے، سچ ہے: ﴿خُلِقَ ٱلۡإِنسَـٰنُ مِنۡ عَجَلٍ﴾ [الانبیاء:۳۷]۔ جناب حافظ صاحب آپ مسن بزرگ ہو کر ایک اصولی غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ خدا جانے آپ کب اس غلطی کو چھوڑیں گے، وہ غلطی یہ ہے کہ کسی کلام کی توجیہ کے لئے امکان صحت کافی ہوتا ہے مگر آپ اعتراض کے لئے امکان کافی جانتے ہیں۔ انا للہ!

پس سنئے! حدیث بخاری میں ''أُصحابي'' سے مراد ''امت محمدیہ'' ہے۔ اس میں شک نہیں کہ امت محمدیہ میں نیک اور بد ہر قسم کے انسان ہیں، قرآن مجید سے اس کی شہادت سنئے:

﴿ثُمَّ أَوۡرَثۡنَا ٱلۡكِتَـٰبَ ٱلَّذِينَ ٱصۡطَفَيۡنَا مِنۡ عِبَادِنَاۖ فَمِنۡهُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهِۦ وَمِنۡهُم مُّقۡتَصِدٌ وَمِنۡهُمۡ سَابِقُۢ بِٱلۡخَيۡرَٰتِ بِإِذۡنِ ٱللَّهِ﴾ [فاطر:۳۲]۔

اس آیت نے امت محمدیہ وارث کتاب اللہ کو تین قسموں میں منقسم کیا ہے۔ ان میں سے ایک قسم ظالم بھی ہے یہی قسم حدیث بخاری میں مراد ہے۔ خود حدیث مذکور کے

الفاظ سے یہی مفہوم ہوتا ہے۔اس میں الفاظ ہیں:۔''فیجاء برجال من أمتي'' ۔(یعنی میری امت کے چند آدمی لائے جائیں گے)۔[1]

حافظ صاحب! جس طرح قرآن وحدیث دونوں متفق ہیں کیا اچھا ہو کہ آپ بھی متفق ہوجائیں ؎

جنگ کردی آشتی کن زانکہ نزد عاقلاں

ایں مثل مشہور اول جنگ آخر آشتی

❁ ❁ ❁

قسط:۶

تفسیر بالروایت

۱۴/ربیع الاول ۱۳۵۵ھ = ۵/جون ۱۹۳۶ء

اس سلسلہ کا آج چھٹا نمبر ہے۔اس نمبر میں حافظ اسلم صاحب نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ثلاث کذبات والی روایت پر اعتراض کیا ہے۔آپ کے الفاظ اس بارے میں یہ ہیں:

﴿قَالُوٓاْ ءَأَنتَ فَعَلۡتَ هَٰذَا بِـَٔالِهَتِنَا يَٰٓإِبۡرَٰهِيمُ ۝٦٢ قَالَ بَلۡ فَعَلَهُۥ كَبِيرُهُمۡ

---

① صحیح بخاری:کتاب بدء الخلق، باب كما بدأنا أول خلق نعيده وعدا علينا،حدیث: ۴۷۴۰،صحیح مسلم:كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، باب فناء الدنيا وبيان الحشر يوم القيامة ،حدیث:۲۸۶۰۔

هَٰذَا فَسْـَٔلُوهُمْ إِن كَانُوا۟ يَنطِقُونَ ﴾[الانبیاء:۶۲-۶۳]، بت پرستوں نے پوچھا کہ اے ابراہیم! کیا تو نے ہمارے بتوں کے ساتھ یہ کیا ہے؟ کہا بلکہ اس بڑے (بت) نے کیا ہے۔ ان (ٹوٹے ہوئے بتوں) سے پوچھو اگر بول سکتے ہوں۔

اس کی تفسیر میں حضرت ابو ہریرہ سے امام ترمذی نے روایت کیا ہے کہ ابراہیم نے کبھی جھوٹ نہیں کہا مگر تین بار، انہوں نے کہا کہ میں بیمار ہوں حالانکہ بیمار نہ تھے۔ اور (اپنی بیوی) سارہ کو بہن بتلایا۔ پھر بتوں کو خود توڑا اور جب بت پرستوں نے پوچھا تو کہا کہ اس بڑے بت نے توڑا ہے۔

یہ روایت قرآن کریم کے بالکل خلاف ہے کیوں کہ اس میں ابراہیم سے متعلق ہے: ﴿إِنَّهُۥ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا﴾[مریم:۴۱]، حقیقت یہ ہے کہ وہ نہایت سچے نبی تھے۔

اللہ جس کو تحقیق کے ساتھ سچا قرار دے یہ کیسے ممکن ہے کہ رسول اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو اسی کی اولاد اور اسی کی ملت کے پیرو تھے اس کو کاذب کہیں۔ یہ تین کذب حضرت ابراہیم کے جو بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں سے حضرت سارہ کو بہن بتانے کا واقعہ قرآن میں نہیں ہے اور جس طرح پر یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے اس سے صاف طور پر اس کا بھول ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ دوسرا جھوٹ کہ انہوں نے کہا کہ میں بیمار ہوں تو کیا بیماری کوئی ایسی چیز ہے جو انسان میں نادر و نایاب ہے؟ ہزار ہا قسم کی چھوٹی بڑی بیماریاں ہیں جن سے کمتر کوئی انسان خالی ہوتا ہے۔ اگر اس وقت جبکہ مشرک ان کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے انہوں نے اپنی بیماری کا عذر کیا تو اس کو کذب قرار دینے کی کیا دلیل ہے۔ رہا تیسرا جھوٹ کہ انہوں نے بتوں کو خود توڑا اور الزام لگایا بڑے بت پر، تو یہ طریق معرض بحث میں مخالفوں کو ساکت کرنے کے لئے اختیار کیا تھا جس سے بہتر احقاق حق کی کوئی صورت نہ تھی۔ چنانچہ اس کو مشروط کر کے اس طرح فرمایا کہ یہ بڑے بت کا فعل ہے اگر یہ بت بول سکتے ہوں تو ان سے پوچھ کر دیکھو۔ جس کو سن کر مشرکوں نے کچھ دل میں سمجھا اور سر جھکا لیا اور کہا کہ تمہیں تو یہ معلوم ہے کہ یہ بولتے نہیں۔ اس لئے اس قول کو دنیا میں صاحب عقل جھوٹ نہیں کہہ سکتا، امام

رازی نے اس کو اپنی تفسیر میں اصول مناظرہ کے لحاظ سے معارضہ قرار دیا اور پانچ وجوہ سے ثابت کیا ہے کہ یہ جھوٹ نہیں ہے۔ آخر میں یہ بھی کہا ہے کہ بجائے ایک صدیق نبی کے اس روایت کے راویوں کو جھوٹا کہنا زیادہ آسان ہے" (بلاغ امرتسر ماہ اپریل ۱۹۳۶ء (ص: ۶۳۔ ۶۴))۔

اہلحدیث:

آج تو ہمارا دل چاہتا ہے کہ حافظ صاحب سے ایک منطقی اصول سے گفتگو کریں کیوں کہ ہمارا گمان ہے کہ آپ محض روایت کش ملا نہ ہوں گے بلکہ معقول داں بھی ہوں گے۔ امید ہے کہ آپ متوجہ ہوکر ہمارا جواب سنیں گے۔

﴿ كَانَ صِدِّيقًا ﴾ یہ قضیہ ضروریہ مطلقہ ہے یا دائمہ مطلقہ ہے؟ اگر ضروریہ ہے تو اس کی نقیض ممکنہ عامہ ہے، اگر دائمہ مطلقہ ہے تو اس کی نقیض مطلقہ عامہ ہے، اس کے بعد ﴿ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ ﴾ پر غور کریں کہ مطلقہ عامہ ہے۔ اس کے متعلق آپ کا قول کہ یہ طریق معرض بحث میں مخالفوں کو ساکت کرنے کے لئے اختیار کیا تھا واقعی قابل تسلیم ہے مگر جناب حافظ صاحب! یہ ہے تو جملہ خبریہ، جب کہ خبریہ ہے تو اس کی حکایت کے لئے محکی عنہ بھی ضرور چاہئے جو نہیں، پس علم نحو کے قانون کے ماتحت یہ جملہ صادقہ ہے یا کاذبہ اس کی تعیین کیجئے؟ اس میں بھی شک نہیں کہ کیفیت وقوع نسبت کے لحاظ سے یہ قضیہ مطلقہ عامہ ہے جو نقیض ہے دائمہ مطلقہ کی۔

پس ﴿ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ ﴾ نے ﴿ كَانَ صِدِّيقًا ﴾ کو دائمہ مطلقہ نہ رہنے دیا۔ جب دائمہ مطلقہ ثابت نہ ہوا تو دوام اس میں نہ رہا بلکہ اکثریت رہ گئی۔ اس لئے دوسرے اور تیسرے واقعہ کے دفاع کا زور بھی اس میں نہ رہا۔

حافظ صاحب! ہم مانتے ہیں کہ جالینوس کے قول کے مطابق دنیا میں کوئی شخص بھی تندرست نہیں کیوں کہ اس کا قول ہے کہ تندرست وہ ہے جس کے اعضا میں سے ہر عضو

پورا کام کرے۔ حالانکہ ایسا کوئی متنفس نہیں۔ اس لئے سب انسان مریض ہیں، پھر ایک مرض مانع کار یا مانع رفتار ہوتا ہے مگر دوسرا ایسا نہیں ہوتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ارشاد: ﴿إِنِّي سَقِيمٌ﴾ [الصافات:۸۹] مانع رفتار مرض کے لئے ہے۔ اس لئے آپ کا یہ فرمانا کہ ''انسان میں چھوٹی بڑی ہزاروں بیماریاں ہوتی ہیں''، محض دفع الوقتی ہے اور موقع ناشناسی ہے کیوں کہ عذر کے موقع پر راستی کی شکل میں وہی بیماری بتائی جاتی ہے جو مانع کار ہو۔

حضرت سارہ کا قصہ مروجہ بائبل میں پورا ملتا ہے (ملاحظہ ہو کتاب پیدائش)

اخیر میں ہم آپ کو اسی واقعہ کے متعلق ایک روایت کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ جس کے الفاظ یہ ہیں:

'' قالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: " فِي كَلِماتِ إبْراهِيمَ الثَّلاثِ الَّتِي قالَ: ما مِنها كَلِمَةٌ إلّا ما حلَّ بِها عَنْ دِينِ اللَّهِ، أي: جَادِلٌ، وَدَافِعٌ عَنْ دِينِ اللّٰہِ''[1] (عون الباری برحاشیہ نیل الاوطار جلد ۱۶، مطبوعہ مصر (۶۰))[2]۔ یعنی ان تینوں واقعات میں جو الفاظ بھی بظاہر غلط ہیں ان کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے دین سے مدافعت کی تھی۔

ثابت ہوا کہ یہ تینوں واقعات قبیح بعینہ اور حسن لغیرہ ہیں، اس کی مثال قرآن مجید

---

① تفسیر ابن ابی حاتم: (۲۲۶/۱۳)، رقم: ۹۲۵، مع تحقیق حکمت بشیر، تفسیر ابن کثیر: (۲۵/۷)، مع تحقیق سلامہ: اس حدیث کی سند میں علی بن زید بن جدعان نامی ایک راوی ہیں جو ضعیف ہے، لیکن اس کی شاہد صحیحین میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے جس میں ہے: لم یکذب ابراہیم الا ثلاث کذبات، الخ، صحیح بخاری: کتاب احادیث الانبیاء ، باب قول اللہ تعالیٰ ''واتخذاللہ ابراھیم خلیلا''، حدیث ۳۳۵۸، صحیح مسلم: کتاب الفضائل ، باب من فضائل ابراھیم خلیل ﷺ حدیث: ۲۳۷۱۔

② عون الباری: ۹۸/۴۔

سے سنئے! چنانچہ قطعی حکم ہے: ﴿إِذَا لَقِيتُمُ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ زَحۡفٗا فَلَا تُوَلُّوهُمُ ٱلۡأَدۡبَارَ﴾ [الانفال:١٥]، مسلمانو! جب کبھی تم کافروں سے میدان جنگ میں ملوتو ان کی طرف پیٹھ نہ پھیرو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ میدانِ جنگ میں پیٹھ پھیرنا حرام (قبیح بعینہ) ہے۔ حالانکہ ایک موقع پر اس کی اجازت بھی ہے:

﴿إِلَّا مُتَحَرِّفٗا لِّقِتَالٍ أَوۡ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٖ﴾ [الانفال:١٦]، جولڑائی کے کرتب میں منہ پھیرے یا اپنی جماعت میں ملنے کی نیت سے (تو جائز ہے)۔

اس صورت میں یہ (تَوَلِّي یومَ الزَّحفِ) قبیح بعینہ، حسن لغیرہ ہے۔

مختصر یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہ واقعات ثلاثہ قبیح لذاتہ حسن لغیرہ کی قسم سے ہیں جیسے تَوَلِّي یومَ الزَّحفِ لِلْقِتَالِ وغیرہ۔

حافظ صاحب! آپ کا یہ قول تشریح طلب ہے۔ جو آپ فرماتے ہیں کہ:

''اس کو مشروط کر کے اس طرح فرمایا کہ یہ بڑے بت کا فعل ہے، اگر بت بول سکتے ہیں تو ان سے پوچھ کر دیکھو۔ (تا) جھوٹ نہیں کہہ سکتے'' (ص:٦٤)۔

اس سے شبہ ہوتا ہے کہ آپ ''إِن كَانُواْ يَنطِقُونَ'' کی شرط کو ''فعله'' کے ساتھ لگاتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں بلکہ یہ ''فَسۡـَٔلُوهُمۡ'' کے متعلق ہے۔ ''بل فعله'' جملہ خبریہ ہے اور یہ جملہ انشائیہ ہے۔ غالباً ایسا لکھنے میں آپ کو سہو ہو گیا۔ عَفَا اللّٰهُ عَنْکَ۔

حافظ صاحب! آپ کے اس فقرے سے مجھے سخت ملال پیدا ہوا کیوں کہ میرے گمان کو جو آپ کے متعلق ہے اس سے صدمہ پہنچا ہے۔ آپ جملہ انشائیہ مشروطہ (فَسۡـَٔلُوهُمۡ) کی نسبت کہتے ہیں کہ ''کوئی صاحب عقل جھوٹ نہیں کہہ سکتا''۔

صدق اور کذب جملہ خبر یہ کی صفت ہے جملہ انشائیہ کی نہیں، پھر آپ نے اس سے دفع کذب کرنے میں کیوں محنت کی؟ جناب مولانا! ؎

مستِ مئے الست ہوں تو بد گمان نہ ہو
اے شیخ میری شورش مستانہ دیکھ کر

❁ ❁ ❁

قسط:۷

تفسیر بالروایت

(۲۱/ربیع الاول ۱۳۵۵ھ = ۱۳/جون ۱۹۳۶ء)

اس سلسلہ کے بانی مولوی حافظ اسلم صاحب جیراجپوری مقیم دہلی ہیں۔آپ حدیث کی حجیت شرعیہ سے منکر ہیں اور اس خیال میں دن بدن ترقی پذیر ہو رہے ہیں، جوابی سلسلہ یکم مئی ۱۹۳۶ء سے شروع ہوا ہے، جس کا آج ساتواں نمبر ہے۔اخبار اہل حدیث کا بحیثیت اہل حدیث ہونے کے حدیث سے مدافعت کرنا فرض اولین ہے اس لئے باقی مضامین سے توجہ ہٹا کر اسی طرف لگائی گئی ہے لیکن بالکلیہ نہیں ہٹائی گئی بلکہ بحکم ''آت کل ذی حق حقه''[1] کم وبیش ہر ایک کو حق دیا جاتا ہے۔وفقنا اللہ لما یحب ویرضی۔

ساتویں نمبر میں حافظ صاحب جیراجپوری نے مندرجہ ذیل بیان دیا ہے:

---

① مسند البزار: (۱/ ۱۵۲)، حدیث ۴۲۲۳، صحیح ابن حبان: (۲/ ۲۴)، حدیث: ۳۲۰، المعجم الکبیر از طبرانی: (۲۲/ ۱۱۲)، حدیث: ۲۸۵، مسند ابی یعلی: (۲/ ۱۹۲)، حدیث: ۸۹۸، یہ حدیث اس سند سے صحیح ہے۔

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَكُونُوا۟ كَٱلَّذِينَ ءَاذَوْا۟ مُوسَىٰ فَبَرَّأَهُ ٱللَّهُ مِمَّا قَالُوا۟﴾[الاحزاب:٦٩]،اے مومنو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جنہوں نے موسیٰ کو اذیت دی۔ سو اللہ نے اس کو ان کی تہمت سے بری کیا۔

اس کی تفسیر (جامع ترمذی) میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ حضرت موسیٰ بڑے حیادار تھے، اس طرح جسم کو چھپائے رکھتے تھے کہ کوئی حصہ اس کا دکھائی نہ دیتا تھا۔ بنی اسرائیل کے لوگوں نے ان کو ستانا شروع کیا اور کہا کہ یہ اس قدر جو اپنے بدن کو چھپائے رکھتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو برص یا اور اسی قسم کی کوئی بیماری ہے۔ اللہ نے چاہا کہ موسیٰ کو ان کی تہمت سے بری کرے، سو موسیٰ ایک دن تنہائی میں اپنے کپڑوں کو ایک پتھر پر رکھ کر غسل کرنے لگے۔ جب فارغ ہوئے اور کپڑے لینے کو اس کی طرف بڑھے تو پتھر ان کے کپڑوں سمیت بھاگا، موسیٰ لٹھ لے کر اس کے پیچھے دوڑے یہ کہتے ہوئے کہ اے پتھر! میرے کپڑے۔ اے پتھر! میرے کپڑے، یہاں تک کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت میں پہنچ گئے۔ انہوں نے ان کو برہنہ دیکھ لیا کہ وہ ساخت میں سب سے بڑھ کر حسین تھے، اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے الزام سے موسیٰ کو بری کر دیا۔ اس جگہ پر پہنچ کر پتھر رک گیا۔ موسیٰ نے اپنے کپڑے لے کر پہنے، پھر پتھر کو لٹھ سے مارنے لگے۔ اللہ کی قسم اس میں ان کی لاٹھی کے نشانات ہیں۔ تین، چار یا پانچ۔ ①

اس روایت میں غور کرنے کے قابل امر یہ ہے کہ (۱) راوی قسم کھا کر بیان کرتا ہے کہ پتھر میں ان کی ضرب کے نشانات ہیں اس جزم ویقین کے ساتھ کہ گویا اس نے خود مارتے دیکھا ہے۔ اور یہ اس کے سچے ہونے کی نشانی نہیں ہے۔

(۲) علاوہ بریں پتھر بے جان۔ بے ارادہ اور غیر متحرک شئے ہے۔ اس کا کپڑوں کو لے کر

---

① سنن ترمذی: ابواب التفسیر ، باب ومن سورۃ الاحزاب، ۱۹، حدیث: ۳۲۲۱، یہ حدیث بسند صحیح مروی ہے۔

بھاگنا ایک معجزانہ امر ہوگا جو منجانب اللہ ہی ہوسکتا ہے۔ اور (۳) یہ چیز حضرت موسیٰ جیسے اولوالعزم رسول پر مخفی نہیں رہ سکتی تھی۔ پھر اس کولٹھ سے مارنے کے کیا معنی، غرض اشارات کذب اس روایت میں واضح ہیں'' (بلاغ امرتسر (ص: ٦٤) اپریل ۳٦ء)۔

اہل حدیث: حافظ صاحب ہر نمبر میں اپنے فرض سے غفلت کرتے ہیں کہ آیت کی صحیح اور پسندیدہ تفسیر خود کرنے کے بغیر تفسیر بالروایت پر اعتراض کرنے لگ جاتے ہیں جو دأب محصلین کے خلاف ہے اس لئے اصل جواب سے پہلے ہم اس آیت کے متعلق اپنی عربی تفسیر کے الفاظ نقل کرتے ہیں، جو یہ ہیں:

''{لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ آذَوْا مُوسى} نَسَبُوا إلى جَنَابِه مَا لايَلِيقُ بشَأنِهِ مِنَ السِّحَرِ والجُنُونِ وَالأذٰى وَغَيْرِهِ}(۱) لقوله تعالى: ﴿إِنَّ رَسُولَكُمُ ٱلَّذِىٓ أُرۡسِلَ إِلَيۡكُمۡ لَمَجۡنُونٌ﴾[الشعراء:۲۷]، (۲) وقوله تعالى: ﴿قَالَ لِلۡمَلَإِ حَوۡلَهُۥٓ إِنَّ هَٰذَا لَسَٰحِرٌ عَلِيمٌ﴾[الشعراء:۳۴]، (۳) وقوله تعالى: ﴿وَإِذۡ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوۡمِهِۦ يَٰقَوۡمِ لِمَ تُؤۡذُونَنِى وَقَد تَّعۡلَمُونَ أَنِّى رَسُولُ ٱللَّهِ إِلَيۡكُمۡ﴾[الصف:۵]۔ (تفسیر القرآن بکلام الرحمن طبع دوم: (ص: ۲۰۷))''۔

اس تفسیر میں خاکسار نے ہر پہلو کا لحاظ رکھا ہے، قرآن مجید کی آیات جو بطور شواہد پیش کی ہیں دو قسم کی ہیں۔ پہلی اور دوسری آیات میں ایذا کے جو الفاظ ہیں وہ فرعون کے ہیں۔ تیسری میں حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ تم مجھے کیوں تکلیف دیتے ہو، بنی اسرائیل کی ایذا کی نوعیت فرعونی ایذا کی نوعیت سے الگ تھی، جس حدیث کو آپ نے نقل کیا ہے اس پر غور کریں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ اس ایذا کی تفسیر ہے جو بنی اسرائیل کی طرف سے پہنچ رہی تھی جس کو حضرت موسیٰ نے بصیغۂ خطاب ﴿لِمَ تُؤۡذُونَنِى﴾ فرمایا۔ پس وہ حدیث بلحاظ تفسیر قرآنی آیات کے خلاف نہ

ہوئی، کیوں کہ اس حدیث نے اس ایذا کی تشریح کی ہے جو بنی اسرائیل کی طرف سے پہنچ رہی تھی نہ اس کی جو فرعون کی طرف سے تھی اب ہم آپ کے اعتراضات کے جواب پر توجہ کرتے ہیں:

(۱) راوی پر آپ خفا ہیں حالانکہ راوی نے قسم نہیں کھائی بلکہ راوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قسمیہ الفاظ نقل کرتا ہے، یعنی یہ الفاظ مرفوع ہیں، موقوف نہیں۔

(۲) پتھر بے شک بے جان ہیں تا ہم قرآن میں ارشاد ہے: ﴿وَإِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡيَةِ ٱللَّهِ﴾ [البقرة:۷۴]، (بعض پتھر اللہ کے خوف سے گر جاتے ہیں) فرمایئے اگر وہ پتھر بھی اسی قسم سے ہو جو بتحریک خدا متحرک ہو جاتا ہے تو کیا تعجب اور کیا انکار؟

(۳) معجزہ دراصل فعل خداوندی ہے بحکم: ﴿وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَن يَأۡتِيَ بِـَٔايَةٍ إِلَّا بِإِذۡنِ ٱللَّهِ﴾ [غافر:۷۸]، (کوئی رسول معجزہ نہیں لا سکتا مگر اللہ کے اذن سے) اس کی اطلاع رسول کو ہو یا نہ ہو۔ اطلاع ہوتی ضرور ہے تو آخر حضرت موسیٰ کو اطلاع سے بڑھ کر مشاہدہ ہو گیا تھا پھر سوال کیا؟

رہا ننگے ہونے کا سوال۔ سو جناب حافظ صاحب ننگا ہونے کا فعل قبیح بعینہ نہیں بلکہ بدستور عام کے ماتحت قبیح لغیرہ ہے، اور قبیح لغیرہ کسی معقول وجہ سے وقوع پذیر ہو سکتا ہے، جیسے عضو مخصوص کو بغرض علاج ننگا کرنا یا حضرت آدم علیہ السلام کا ننگا ہونا مصلحت الٰہی کے ماتحت قبیح نہیں رہا تھا، اسی طرح کا یہ فعل تھا۔

حافظ صاحب! جس امر کا نمونہ قرآن شریف سے ملے اسے بھی رد کرنا آپ ہی کا حوصلہ ہے پہلے تو کوئی ایسے حوصلہ کا نہیں ہوا ؎

ہوا تھا کبھی سر قلم قاصدوں کا　　　یہ تیرے زمانے میں دستور نکلا

قسط:۸

تفسیر بالروایت

(۲۸/ربیع الاول ۱۳۵۵ھ = ۱۹/جون ۱۹۳۶ء)

مولانا حافظ اسلم صاحب جیراجپوری کے اعتراضات میں سے آٹھواں نمبر درج ذیل ہے۔

اس نمبر میں تو آپ نے کمال بے انصافی سے کام لیا ہے جس کا گلہ ہمیں نہ کرنا چاہئے؛ کیوں کہ انسان جب کسی مذہب یا مشرب کو چھوڑ دیتا ہے تو اس میں ہر طرح کی برائی اسے نظر آتی ہے۔ سچ ہے ؎

عَيْنُ السُّخْطِ تُبْدِي المَسَاوِيا

بہر حال حافظ صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

﴿وَءَاخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُواْ بِهِمْ﴾ [الجمعة:۳] کی تفسیر میں (جامع ترمذی) میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ کسی نے سوال کیا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش رہے پھر اپنا ہاتھ سلمان (فارسی) کے اوپر رکھا اور فرمایا کہ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر ایمان ثریا پر بھی معلق ہو تو اس کی قوم میں ایسے لوگ ہوں گے جو اس کو پالیں گے۔

پھر آیت ذیل کی تفسیر میں: ﴿وَإِن تَتَوَلَّوْاْ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ﴾ [محمد: ۳۸]، اور اگر تم پیٹھ موڑو گے تو تمہارے سوا کسی اور قوم کو اللہ تمہارے عوض میں بدل لے گا۔ یعنی اے عرب! اگر تم اللہ کے ان فرائض تبلیغ وغیرہ میں جو اس نے تمہارے ذمہ عائد کئے ہیں اور جن کی ادائیگی کی وجہ سے تم کو "خیر امت" کا لقب دیا ہے کوتاہی کرو گے تو وہ تم کو چھوڑ کر کسی دوسری قوم کو

امام الاقوام بنادے گا جوان فرائض کو اچھی طرح ادا کرے گی۔

امام ترمذی حضرت ابو ہریرہ کی روایت لکھتے ہیں کہ لوگوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ کس قوم کو اللہ ہماری جگہ چن لے گا۔ آپ نے سلمان کے مونڈھے پر ہاتھ مار کر فرمایا، اس کی قوم کو، اس کی قوم کو"[1]۔

ان روایات سے اہل فارس کے ایمان کی پختگی، ان کی دماغی برتری اور ذھنی فوقیت کی سند رسول اللہ کی زبان سے مہیا کرنا مقصود ہے، کیوں کہ وہی خلافت عباسیہ میں جملہ مناصب حکومت پر قابض تھے اور رواۃ حدیث بھی زیادہ ترعجم ہی تھے۔ ورنہ تاریخ کی رو سے اہل فارس کی فضیلت شامیوں یا مصریوں پر ایمان یا خدمت اسلام کے لحاظ سے نہیں ثابت کی جاسکتی۔ (بلاغ امرتسر (ص: ۶۴-۶۵) اپریل ۳۶ء)۔

اہلحدیث:

امام ترمذی نے اس حدیث کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بطریق محدثین آسان بات یہ تھی کہ اس حدیث کو زیر بحث نہ لایا جاتا۔ مگر ہم حافظ صاحب کی ہر طرح خاطر داری کرنے کا ارادہ کر چکے ہیں تاکہ آپ کو جدائی کے علل میں ہماری عدم رواداری بھی علت کا کام نہ دے۔

حافظ صاحب کے اعتراض کا خلاصہ منطقی اصطلاح میں رفع تالی ہے، جس کو رفع مقدم لازم ہے، دگر ہیچ، حافظ صاحب میرے پاس ہوں تو میں محبت بھرے لفظوں

---

[1] سنن ترمذی: ابواب تفسیر القرآن ، باب ومن سورۃ محمد ﷺ، حدیث: ۳۲۶۱، وباب ومن سورۃ الجمعۃ، حدیث: ۳۳۱۰، ابواب المناقب، باب فی فضل العجم، حدیث: ۳۹۳۳، امام ترمذی کہتے ہیں: اس کی سند میں عبداللہ بن جعفر ہیں جو علی ابن المدینی کے والد ہیں، اس کو یحی بن معین نے ضعیف کہا ہے، اس کی اور بھی مختلف سندیں ہیں۔

میں آپ سے پوچھوں کہ میں نے آپ کے اعتراض کا خلاصہ مطلب صحیح بتایا یا کچھ کمی کی؟ طلباء کے لئے ذرہ صاف لفظوں میں بتاتا ہوں، تقدیر کلام یوں ہے:

''إِنْ تَوَلَّى الْعَرَبُ عَنْ خِدْمَةِ الدِّينِ يَخْدِمْهُ الفَارَسُ، لٰكِنَّ الْفَارَسَ لَمْ يَخْدِمْ''۔

یعنی قیاس استثنائی جو اوپر مذکور ہے یوں ہوا کہ عرب لوگ اگر خدمت دین سے منہ پھیر لیتے تو اہل فارس اس کی خدمت کرتے، لیکن فارسیوں نے خدمت نہیں کی۔

صورت قیاس استثنائی میں رفع تالی مذکور ہے اور یہ تو قاعدہ ہے کہ ''رَفْعُ التَّالِي يَسْتَلْزِمُ رَفْعَ الْمُقَدَّمِ'' رفع تالی سے رفع مقدم کا نتیجہ بے شک صحیح ثابت ہے یعنی یہاں عدم تولی عرب متحقق ہے۔ فَهُوَ لَيْسَ بِضَارٍ لَنَا وَلَا نَافِعٍ لِغَيْرِنَا، فَانْدَفَعَ مَا تَوَهَّمَ ۔

خطرہ ہے کہ ہمارے صدری (دہلوی) بھائیوں کی طرح حافظ صاحب بھی یہ نہ کہہ دیں کہ ہم حضرت سلیمان کی طرح منطق الطیر (علم منطق) نہیں جانتے صاف صاف انسانی زبان میں بولیے، لیجیے صاحب جون سی زبان آپ بولیں اور سمجھیں ہم اسی میں آپ سے بولیں گے، سنئے:

﴿وَإِن تَتَوَلَّوْا﴾ شرط ہے {یستبدل} اس کی جزاء شرط کے موجود ہوتے جزا نہ پائی جائے، تو اعتراض ہے لیکن شرط متحقق نہ ہو تو جزاء کے نہ ہونے سے کوئی اعتراض نہیں ہوتا، مثلاً آیت: ﴿لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾ [ابراہیم:۷]، شکریہ مزید نعمت کا وعدہ ہے۔

﴿وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ﴾ [ابراہیم:۷]، ان دونوں شرطیہ جملوں میں اگر شرط نہ پائی جائے تو جزاء نہ پائے جانے پر اعتراض نہیں ہوسکتا۔ یعنی اگر کوئی

شخص شکر نہ کرے تو مزید نعمت اس کو نہ ملنے پر اعتراض نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح کفر نہ کرے تو عذاب نہ ہونے سے کوئی اعتراض نہیں۔

آیت زیر بحث کے مخاطبوں نے ''تولی'' (روگردانی) نہ کی تو اہل فارس کے عدم استبدال یا عدم خدمت پر کوئی اعتراض نہیں، کیوں کہ شرط کے عدم پر عدم جزاء مرتب ہونا محل اعتراض نہیں ہوا کرتا۔

''قَدْ بَقِيَ خَبَايَا فِي الزَّوَايَا'' ناظرین کرام! حدیث مذکور میں لفظ (لَوْ) ہے۔ چنانچہ الفاظ حدیث یوں ہیں: '' لَوْ كان الإيمانُ بِالثُّرَيّا لَتَناوَلهُ رِجالٌ من هؤلاءِ''[1]۔

''لوْ'' کی اصل وضع شرط ماضی کے لئے ہے۔ حافظ صاحب آپ (ماشاء اللہ) ادیب ہیں یہ مصرع آپ سے مخفی نہ ہوگا:

لَوْ كُنتُ من مازِنٍ لم تَسْتَبِح إبِلِي

پس اصل معنی حدیث کے یہ ہیں:

اگر دین ثریا پر ہوتا تو فارس کے لوگ اسے لے آتے۔

فارس کی یہ کیفیت زمانہ ماضی کی ہے، مقصود کلام سے یہ ہے کہ فارس کے سلف بڑے ذہین اور طباع تھے۔ اس سے زمانہ حال یا مستقبل پر استدلال نہیں ہوسکتا۔ جیسے کوئی کہے کہ عرب کبھی ایسے تھے کہ جدھر منہ کرتے فتح قدم چومتی۔ اس سے زمانہ حال یا استقبال پر استدلال کرنا معلوم، اسی طرح آپ کے استقبال کی حقیقت معلوم۔

حافظ صاحب! علوم آلیہ اور ادبیہ سے کام نہ لینا اہل علم سے بعید ہے ؎

ما هكَذا يا سعدُ تُورَدُ الإبلُ

---

[1] اس کی تخریج گذر چکی ہے۔

قسط:۹

تفسیر بالروایت

(۶ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ = ۲۶ جون ۱۹۳۶ء)

ہمارے ناظرین مولانا حافظ جیراجپوری کے سلسلہ سے اکتا گئے ہوں گے، خیال کرتے ہوں گے کہ ان کا ذکر کیوں کیا جاتا ہے۔ ایسے خیال کے اصحاب اگر قرآن مجید کو غور سے پڑھیں تو متعدد جگہ مخالفوں کے ناشائستہ کلمات متعلقہ الوہیت ورسالت پائیں گے جو بغرض جواب نقل کئے گئے ہیں مثلاً آیات ذیل ملاحظہ ہوں:

(۱)﴿وَقَالَ الظَّالِمُونَ إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا﴾[الفرقان: ۸]۔

(۲) ﴿أَفْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَم بِهِ جِنَّةٌ﴾[سبا:۸]۔

(۳)﴿قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ بَلِ افْتَرَاهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ﴾[الانبیاء:۵]۔

ان آیات میں ذات رسالت کے حق میں کیسے کیسے ہتک آمیز الفاظ نقل ہوئے ہیں مگر نہ بغرض تعلیم بلکہ بغرض جواب۔ یہ الفاظ صاحب حدیث کے حق میں تھے۔ ہم جو نقل کرتے ہیں وہ حدیث کے حق میں ہیں۔ جو پہلے کی نسبت ہلکے ہیں۔

مقام مسرت:

گزشتہ نمبروں میں تو ہمیں جواب دینے کی محنت کرنی پڑی تھی لیکن آج کے نمبر میں ہم حافظ اسلم صاحب کے مشکور ہیں کہ انہوں نے اپنے اعتراض کا جواب خود ہی دے دیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو اپنے اعتراض کو خود ہی بھول گئے یا تصرف قدرت ہوا

ہے۔ باوجوداس کے ہم آپ کے اعتراض کی قدر کرتے ہیں، کیوں کہ ؎

تیغ تو اوچھی پڑی تھی گر پڑے ہم آپ ہی
دل کے قاتل کو بڑھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

حافظ صاحب نے اپنے اعتراض کو پانچ نمبروں میں تقسیم کیا ہے۔ ہم بھی اپنے جواب کوترتیب وار پانچ نمبروں میں پورا کریں گے۔ چنانچہ حافظ صاحب کا نمبراول مع تمہید درج ذیل ہے:

''جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ صَلُّواْ عَلَيۡهِ وَسَلِّمُواْ تَسۡلِيمًا﴾ [الاحزاب:۵۶]، (اے مؤمنو! نبی پر درود بھیجواور سلام)۔ تو حضرت بشیر بن سعد نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہم کس طرح آپ کے اوپر درود بھیجا کریں آپ نے دیر تک سکوت کیا۔ پھر فرمایا کہو: ''اللّٰهُمَّ صَلِّ علی مُحَمَّدٍ وعلَی آلِ مُحَمَّدٍ، کما صَلَّيْتَ علَی إبْرَاهِيمَ وعلَی آلِ إبْرَاهِيمَ.. الخ''[1]۔ یہ وہی درود ہے جس کو مسلمان نمازوں میں پڑھا کرتے ہیں۔

ہر چند کے یہ روایت (صحیح بخاری) اور (جامع ترمذی) دونوں میں ہے لیکن بوجوہ ذیل قرآن اوراسلام دونوں کے سراسر منافی ہے، اور کبھی قول رسول نہیں ہوسکتی:

(۱) ''قرآن میں صرف نبی پر درود بھیجنے کا حکم ہے نہ کہ ان کی آل پر'' (بلاغ امرتسر (ص: ۶۵)، اپریل ۱۹۳۶ء)۔

---

[1] صحیح بخاری: کتاب احادیث الانبیاء، باب، حدیث: ۳۳۶۹، کتاب الدعوات ، باب هل يصلى على غير النبى ﷺ، حدیث: ۶۳۶۰، صحیح مسلم: کتاب الصلاة، باب الصلاة على النبى ﷺ، حدیث: ۴۰۵، سنن ترمذی: ابواب تفسير القرآن، باب ومن سورة الاحزاب، حدیث: ۳۲۲۰۔

اہلحدیث:

سب سے پہلے ہم آپ کی غلطی دفع کرنے کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ درود میں آل محمد سے مراد اتباع محمد ہے، (تفصیل کے لئے (نیل الاوطار) (جلد ۲، ص: ۱۸۵)[1]، ملاحظہ فرمائیں)۔

اس وسعت میں اولاد صالحہ بھی داخل ہے جو لوگ آل محمد سے خاص نسلی اولاد تعیین کرتے ہیں ان سے پوچھیئے کہ پادری سید نیاز علی (مسیحی) مصنف (نیاز نامہ) اور سید ناصر نواب (احمدی) خسر مرزا صاحب قادیانی وغیرہ بھی درود شریف کے الفاظ (آل محمد) میں حصہ دار ہیں؟ اگر نہیں تو ثابت ہوا کہ نسلی تعلق مراد نہیں۔ دلائل اس دعوے کے (نیل الاوطار) میں دیکھیئے۔ ہمارا اعتقاد ہے ؎

آلُ النَّبِيِّ هُمُ أَتْباعُ مِلَّتِهِ
مِنَ الأعاجِمِ والسُّودانِ والعَرَبِ

اس تفسیر کے ساتھ قرآن مجید کی آیت غور سے پڑھیئے جو نمبر (۲) میں آپ نے خود ہی لکھا ہے:

"(۲) اللہ نے فرمایا ہے:

﴿هُوَ ٱلَّذِي يُصَلِّي عَلَيۡكُمۡ وَمَلَٰٓئِكَتُهُۥ لِيُخۡرِجَكُم مِّنَ ٱلظُّلُمَٰتِ إِلَى ٱلنُّورِۚ وَكَانَ بِٱلۡمُؤۡمِنِينَ رَحِيمٗا﴾ [الاحزاب: ۴۳]۔ (وہی ہے جو تمہارے اوپر درود بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تا کہ تم کو تاریکیوں سے روشنی میں نکالے اور وہ ایمان والوں پر مہربان ہے)۔

جب اللہ اور اس کے فرشتے تمام مومنوں پر درود بھیجتے ہیں تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ

---

① ۳/۵۷/۴، بتحقیق محمد صبحی حلاق۔

اس کا نبی جو رحمۃ للعالمین ہے صرف اپنی آل پر درود بھیجے اور امت کو اسی کی تعلیم دی جائے''۔

اہلحدیث:

جس طرح آیت موصوفہ میں صلاۃ الٰہی اور صلاۃ ملائکہ کا مورد الطاف صلحاء امت ہیں اسی طرح آل محمد سے مراد بھی اتباع محمد یعنی جماعت صالحین ہے۔ آیت کے ارشاد کی تعمیل کا طریقہ حدیث نے متعین کر دیا تو کیا اعتراض!

قرآن مجید میں ایک مقام پر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ہے کہ تم زکاۃ لانے والوں پر درود پڑھا کرو، حافظ صاحب کو یہ مقام بھی کھٹکا ہوگا، اس لئے آپ نے خود اس کو نقل کر دیا، جس کے لئے ہم آپ کے مشکور ہیں، فرماتے ہیں:

''(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خود حکم دیا گیا ہے کہ وہ صدقہ دینے والے مؤمنوں پر درود بھیجیں۔ اس میں کسی خاندان کی تخصیص نہیں ہے۔

﴿وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ صَلَوٰتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ﴾[التوبہ: ۱۰۳]، (تو ان کے اوپر درود بھیج کیوں کہ تیرا درود ان کے لئے سکون (قلب) ہے)'' (بلاغ، حوالہ مذکور)۔

اہلحدیث:

ہم بھی آل محمد میں کسی خاندان کی تخصیص نہیں رکھتے، کیوں کہ اس تعلیم کے معلم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خود فرمایا ہے:۔

''كل تقي آلي'' (الحدیث)[1]، اس کی تائید قرآن مجید کی آیت بھی کرتی ہے: ﴿إِنَّآ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا إِلَّآ ءَالَ لُوطٍ ۖ نَّجَّيْنَٰهُم بِسَحَرٍ﴾[القمر: ۳۴]، (ہم

---

[1] المعجم الاوسط، از: طبرانی: (۳۳۸/۳)، حدیث: ۳۳۳۲، اس حدیث کی سند ضعیف جدا ہے، لیکن اس کی تائید آیت کریمہ سے مؤلف رحمہ اللہ نے ثابت کر دی ہے۔

نے آل لوط کو بچا کر لوطیوں پر عذاب بھیجا) اس آیت میں آل لوط سے اتباع لوط مراد ہیں، اسی طرح وعلی آل محمد سے اتباع محمد مراد ہیں۔

حافظ صاحب! کہئے قرآن اور حدیث دونوں متفق ہیں یا نہیں۔ حافظ صاحب اپنے فہم میں آل محمد کو مخصوص بقوم سید جان کر خائف ہوئے کہ سیدوں میں تو بہت سے بدعمل بھی ہیں، بدعقیدہ بھی ہیں، تبرائی بھی ہیں، پھر کیا ہم (ایسے حافظ قرآن) (ایسے لوگوں) پر درود پڑھیں؟ چنانچہ آپ کے الفاظ یہ ہیں:۔

''(۴) اس درود میں ''آل محمد'' میں کوئی استثناء نہیں ہے، حالانکہ ان میں بیشتر ایسے لوگ ہیں جو اپنے اماموں کو معصوم سمجھتے ہیں اور صحابہ کرام پر جن کے اوصاف قرآن میں اور جن کے اسلامی کارنامے دنیا میں روشن ہیں، تبرا بھیجتے ہیں۔ یہ کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ ایسے تبرائیوں پر ہم درود بھیجیں'' (بلاغ، حوالہ مذکور)۔

اہلحدیث:

(۴) ہماری پیش کردہ آل محمد کی تفسیر پڑھیں گے تو یہ استبعاد آپ کا رفو چکر ہو جائے گا، ان شاءاللہ!

آپ کا پانچواں نمبر بہت ہی دلچسپ ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

''(۵) یہ درود سراسر خاندان پرستی ہے جس سے اسلام کا دامن بالکل پاک ہے۔ اللہ نے مقبولیت کی بنیاد نسل اور خون پر نہیں بلکہ ایمان اور عمل صالح پر رکھی ہے، جس کے لئے کوئی کنبہ یا قبیلہ مخصوص نہیں۔ یہود جو اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے ان کا گھمنڈ توڑنے کے لئے صاف کہہ دیا کہ تم نہ اس کے بیٹے ہو نہ محبوب بلکہ اس کے پیدا کئے ہوئے جیسے اور انسان ہیں ویسے ہی تم بھی ہو۔

قرآن کے حکم کی تعمیل صرف نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجنے سے ہو جاتی ہے۔ اس میں آل محمد کا اضافہ یقیناً اس وقت ہوا ہے جب کہ بنی امیہ کے تغلب سے بنی ہاشم سلطنت سے محروم ہو کر دین کی راہ سے

مسلمانوں کے دلوں میں اپنی عظمت قائم کرنے کی کوشش کررہے تھے'' (بلاغ امرتسر، حوالہ مذکور)۔

اہلحدیث:

اس نمبر کا پہلا حصہ بالکل صحیح ہے، دوسرا حصہ کہ '' آل محمد'' کا اضافہ ایجاد بنی ہاشم ہے''، صحیح نہیں۔ کیوں کہ قرآن بھی اس کی تائید کرتا ہے آپ نے خود دو آیتیں نقل کی ہیں۔ ان کے علاوہ آپ ایک اور جگہ بھی اس اعتراض کا جواب خود دے چکے ہیں۔ جہاں فرمایا ہوا ہے:

''تعلیم کتاب کا ایک شعبہ یہ بھی تھا کہ رسول اس کے احکام پر عمل کرکے دکھادے۔ تاکہ امت اسی نمونہ پر عامل ہوجائے۔

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ [الاحزاب:۲۱] تمہارے لئے رسول اللہ کے اندر اچھا نمونہ ہے، چنانچہ ہمارے رسول نے جملہ احکام قرآنی مثلاً نماز، روزہ، حج، زکاۃ وغیرہ پر عمل کرکے دکھلا دیا اور مسلمان اسی نمونہ پر عمل کرنے لگے، یہ اسوۂ حسنہ امت کے پاس عمل متواتر کی شکل میں موجود ہے جس کے مطابق رسول اللہ کے عہد سے نسلاً بعد نسل وہ عمل کرتی چلی آئی ہے، اس لئے یہ یقینی ہے اور دینی ہے اور اس کی مخالفت خود قرآن کی مخالفت ہے'' (تعلیمات قرآن (ص:۱۵۶) مصنفہ مولانا اسلم صاحب جیراجپوری)۔

اہلحدیث:

حافظ صاحب! اگر نماز متواتر ہے تو نماز میں درود بھی متواتر ہے۔

حافظ صاحب! کیا میں کہہ سکتا ہوں؟

ہوا ہے مدعی کا فیصلہ اچھا میرے حق میں
زلیخا نے کیا خود پاک دامن ماہ کنعان کا

❁ ❁ ❁

قسط:۱۰

تفسیر بالروایت

(۱۳/ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ=۳/جولائی ۱۹۳۶ء)

یہ سلسلہ تاریخ یکم مئی ۱۹۳۶ء سے شروع ہے، ہمارے بھائی حافظ اسلم (ابن مولانا شیخ سلامت اللہ مرحوم جیراجپوری مصاحب نواب صدیق حسن خان مرحوم) حدیث کی حجیت سے منکر ہوکر تفسیر بالروایت پر اعتراض کرتے ہیں اور پبلک کو اس طریق کا غلط ہونا بتاتے ہیں، ہم اپنی عادت کے ماتحت ان کے والد مرحوم کی وجہ سے (بحکم ﴿وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا﴾ [الكهف:۸۲]، اس کوشش میں ہیں کہ مہاشہ دھرمپال کی طرح ان کو اپنی جماعت میں لاکر مثل غازی محمود مولانا اسلم شیخ الحدیث کی شکل میں دیکھیں۔ اللّٰهُ قَدِيرٌ وَبِالإِجَابَةِ جَدِيرٌ۔

آج اس سلسلہ کا دسواں نمبر ہے۔ جس میں سے چار ابھی باقی ہیں۔ حافظ صاحب ہمیں معاف رکھیں آج کے نمبر میں تو آپ بہت ہی اوچھے ہتھیاروں سے آئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے محدثین (اہل حدیث) کا مذہب سمجھا ہی نہیں، اگر سمجھا ہے تو ذہول ہو چکا ہے۔ (عفا اللہ عنک)

آپ کے الفاظ ہی اپنا مدعا بتانے کو کافی ہیں:

"﴿قُل لَّآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا ٱلْمَوَدَّةَ فِى ٱلْقُرْبَىٰ﴾ [الشورىٰ:۲۳]، (کہہ دے کہ اس (تبلیغ) پر میں کوئی اجر تم سے نہیں مانگتا بجز رشتہ کے سلوک کے۔

(۱) حضرت ابن عباس نے اس کی تفسیر کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قرابت جملہ بطونِ

قریش میں تھی۔اللہ نے آپ کی زبان سے اعلان کرایا کہ کہہ دو کہ میں تبلیغ قرآن اور تعلیم دین پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں ،صرف رشتہ داری کا برتاؤ میرے ساتھ رکھو[1] ۔امام ترمذی نے اس کو درج کرنے کے باوجود سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ''قربیٰ'' کے معنی اس آیت میں ''آل محمد'' کے ہیں،یعنی میری تبلیغ کا اجر کچھ نہیں ہے سوائے اس کے کہ میری اولاد کے ساتھ محبت رکھو۔[2] یہ بھی دراصل وہی پروپیگنڈا ہے اور قرآن کی سراسر تحریف ، کیوں کہ قرآن میں ''إلا المودة لأقربائي ''نہیں ہے، بلکہ ''إِلَّا ٱلْمَوَدَّةَ فِي ٱلْقُرْبَىٰ ''اور''قربیٰ'' کے معنی رشتے کے ہیں ، رشتہ داروں کے نہیں ہیں،عترت کی محبت لازمی گردانتے سے ان کو خلافت دینا بھی امت کا فریضہ ہوجاتا ہے۔اور یہی ان کا مقصود تھا۔(جامع البیان)[3] میں اس آیت کی تفسیر میں ہے کہ

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عباس سے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ کسی شخص کے دل میں ایمان اس وقت تک داخل نہیں ہوسکتا جب تک کہ تم (یعنی عباس اوران کی اولاد) کو اللہ کے رسول کے لئے محبوب نہ رکھے[4] ۔

امام ترمذی نے ابواب التفسیر میں تو نہیں مگر کتاب المناقب میں اس کو درج کیا ہے، یہ روایت عباسی خلفاء کی محبت کو لازم گردانتی ہے جو بغداد میں حکمران تھے۔سوال یہ ہے کہ کیا اس مہبط وحی

---

① تفسیر الطبری:۲۰/۴۹۵۔

② سنن ترمذی:ابواب تفسیر القرآن،حدیث ۳۲۵۱،صحیح سند سے وارد ہے۔

③ تفسیر الایجی:جامع البیان فی تفسیر القرآن:(۴/۶۴)۔

④ سنن ترمذی:ابواب المناقب، باب مناقب ابی الفضل عم النبی ﷺ وهو العباس بن عبدالمطلب رضی الله عنه ، حدیث:۳۷۵۸، مسند احمد: (۲۹۵،۲۹۴/۳)، حدیث: ۱۷۷۲، اس حدیث کی سند میں ایک راوی یزید بن ابی زیاد ضعیف ہے،لہذا یہ حدیث ضعیف ہوئی ،ہاں مگر بعض محدثین کے یہاں اس کے اخیر میں'' يا أَيُّها الناسُ! من آذى عَمِّي فقد آذاني، فإنما عَمُّ الرجلِ صِنْوُ أبيهِ'' کا ٹکڑا دوسری صحیح سند سے وارد ہونے کی وجہ سے صحیح ہے، واللہ اعلم۔

سے جوتوحید کا منارہ دنیا میں بلند کرنے کے لئے آیا تھا ایسا شرکیہ قول ممکن بھی ہے کہ جب تک کسی کے دل میں اپنے ہی جیسے بے بس دوسرے انسان کی محبت نہ ہو اس وقت تک ایمان کا داخلہ ہی اس میں نہیں ہوسکتا، تعجب ہے کہ امت اسلامیہ کے بہترین افراد حضرات عشرہ مبشرہ واصحاب بدر کے دلوں میں کیسے ایمان داخل ہو گیا، کیوں کہ اس وقت تک تو حضرت عباس جن کی محبت شرط ایمان ہے خود ہی ایمان نہیں لائے تھے''(بلاغ امرتسر (ص:٦٧۔٦٨) اپریل ٣٦ء)۔

اہلحدیث:

نمبر اول میں تو سارے اعتراض کی بنا سعید بن جبیر کا قول ہے جس کا جواب بطریق محدثین یہ ہے کہ یہ قول حدیث نبوی نہیں ہے محض ایک تابعی کی رائے ہے۔ (هُمْ رِجَالٌ وَنَحْنُ رِجَالٌ) مگر میں بذات خود اس کا جواب (منطق الطیر) کی اصطلاح میں دینا چاہتا ہوں۔

حافظ صاحب! اہل منطق علم کی تعریف کیا کرتے ہیں''حُصُوْلُ صُوْرَةِ الشَّيْءِ فِي الْعَقْلِ''، چونکہ حصول صورت علم نہیں ہے اس لئے اس کی تعبیر یوں کرتے ہیں:

''الصُّوْرَةُ الحَاصِلَةُ فِی الْعَقْلِ''۔

آپ نے صحیح فرمایا کہ''قربیٰ''کے معنی رشتے کے ہیں جیسے حصول (مصدر) کے معنی حاصل ہونے کے ہیں مگر مراد اس سے صورت حاصلہ ہے۔ممکن ہے کہ ہمارے صدری (دہلوی) بھائیوں کی طرح منطق الطیر سمجھنے میں آپ کو بھی دقت محسوس ہوگی۔اس لئے عرض کرتا ہوں کہ یہ محاورہ آج کل بھی مستعمل ہے، آپ یہ فقرہ لکھتے پڑھتے ہوں گے کہ جلالۃ الملک ابن سعود نے یہ حکم صادر فرمایا۔اس میں مرکب اضافی کا معنی مرکب توصیفی ہے یعنی الملک الجلیل، ممالک عربیہ میں کسی دوست کے ساتھ آپ کی مراسلت ہوگی، اس میں لکھا ہوگا:

اَلْمَرْجُو مِنْ فَضِيْلَتِكُمْ ، أَيْ مِنْ نَفْسِكُمْ الفَاضِلَةِ، پس جس صاحب نے ''القربیٰ'' سے آل محمد مراد بتائی ہے گواس کا قول حجت شرعیہ نہیں تا ہم غلط بھی نہیں، کیوں کہ معنی اس کے یہ ہیں: ''آل محمد القریب منہ

اس تفسیر پر آیت کے معنی یہ ہیں کہ:

میں آل سے محبت چاہتا ہوں بوجہ اپنے قریب ہونے کے تمہارے ساتھ، یعنی میں تمہارا قریبی ہوں میری آل میری قریبی ہے، پس تم میرے ساتھ اور میری آل کے ساتھ قرابت کا لحاظ رکھو (بطریق تمثیل)۔

رہا یہ خیال کہ ''قربیٰ'' کی تشریح میں اپنی آل ہی کو کیوں پیش کیا یہ تو ذاتی غرض ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ''آل محمد'' بطور مثال کے مفہوم کلی کے فرد کی حیثیت سے مذکور ہے نہ کہ حصر کے طور پر۔ عموماً درس تدریس میں آپ بھی انسان کی مثال میں زید، بکر اور عمرو کہتے ہوں گے، کبھی ثناء اللہ، ابراہیم اور محمد نہیں بولتے ہوں گے۔ پھر کیا یہ تینوں افراد انسان نہیں؟ سوچ کر جواب دیجئے گا۔

ٹھیک اسی طرح لسان نبوت میں بھی بطور مثال کسی کا نام آجاتا ہے بے خبر لوگ اس کو حصر سمجھ کر اعتراض کر دیتے ہیں حالانکہ وہ مثال ہوتی ہے۔

(نمبر: ۲) میں تو آپ نے غضب ہی کیا، حافظ صاحب آپ جیسے خاندانی اہل حدیث سے ایسی ناواقفی اچھی نہیں ؎

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر تیرے عہد سے پہلے تو یہ دستور نہ تھا

حافظ صاحب سنئے! ارشاد خداوندی سامنے رکھئے۔ میں اس پر کچھ کہنا چاہتا ہوں:

﴿وَٱلْمُؤْمِنُونَ وَٱلْمُؤْمِنَٰتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ﴾ [التوبہ:۷۱]، (مؤمن

مرد اور مؤمن عورتیں سب ایک دوسرے کے محبوب اور پیارے ہیں)۔

اس آیت کے ماتحت میں بلاخوف تردید کہتا ہوں کہ:

بحیثیت ایمان حافظ اسلم مولوی عبدالحیٔ ،ڈاکٹر ذاکر حسین بلکہ جملہ طلبائے جامعہ ملیہ کی محبت جس کو حاصل نہ ہوگی وہ مؤمن نہ ہوگا۔

حافظ صاحب !قلم دوات لے کر فتوی کفر وشرک لگائیے ؎

ہاں تامل دم ناوک فگنی خوب نہیں

میری چھاتی ابھی تیروں سے چھنی خوب نہیں

غضب ہے کوئی صحابی ،کوئی مفسر کسی آیتِ قرآنی کو ذہن میں ملحوظ رکھ کر بطور مثال کسی صنف یا فرد کا ذکر کرے تو آپ جھٹ سے اس پر اعتراض کر کے اہل قرآن (بے حدیثہ پارٹی) کو خوش کرنے کے لئے ایک نمبر شرک وکفر کا بڑھا کر فتوی لگا دیتے ہیں۔ اب میں کھلے لفظوں میں کہتا ہوں کہ

حافظ اسلم کے دل میں ایمان اس وقت تک داخل نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ ثناءاللہ کو اللہ اور رسول کی وجہ سے محبوب نہ رکھے۔

ہاں اس فتوے کو منطق الطیر کی اصطلاح میں لا بشرط شیٔ کے درجے میں سمجھئے۔ بشرط لا نہیں ورنہ مقسم شیٔ قسیم شیٔ بن جائے گا۔ وھو خلف۔

حافظ صاحب !اخیر میں مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کی خدمت میں ایک شعر عرض کردوں ؎

چو بشنوی سخن اہلِ دل مگو کہ خطاست

سخن شناس نہو دلبرا خطا اینجاست

قسط:۱۱

تفسیر بالروایت

(۲۰/ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ=۱۰/جولائی ۱۹۳۶ء)

مولانا حافظ اسلم جیراجپوری کے اعتراضات میں سے آج گیارھواں نمبر ہے۔اس نمبر میں بھی آپ نے (ترمذی) کی حدیث کوقرآن مجید کے خلاف دکھایا ہے۔آپ کے الفاظ یہ ہیں:

''(ترمذی) میں حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جبرئیل کہتے تھے کہ جب فرعون غرق ہونے لگا اور ایمان لانا چاہتا تھا، کاش اس وقت اے محمد! تم مجھے دیکھتے کہ میں سمندر کی مٹی لئے ہوئے اس کے منہ میں ٹھونس رہا تھا اس خوف سے کہ کہیں یہ کلمہ نہ پڑھ دے اور اس پر اللہ کی رحمت نہ آجائے''۔

اہلحدیث:

اس واقعہ کے متعلق دو روایات آئی ہیں آپ نے دوسری روایت کا ترجمہ نقل کیا ہے۔اول روایت کے ساتھ ملائی جائے تو مطلع صاف ہوجاتا ہے، اول روایت کے الفاظ یہ ہیں:

''لمّا أغرقَ اللَّهُ فِرعونَ قالَ: آمَنْتُ أَنَّهُ لا إِلَهَ إلّا الَّذِي آمَنَتْ بِهِ بَنُو إِسْرائِيلَ، فقالَ جبريلُ: يا محمَّدُ فلو رأيتَني، وأَنا آخذٌ من حالِ البحرِ وأدسُّهُ في فيهِ مخافةَ أن تُدْرِكَهُ الرَّحمةُ''[1]۔

[1] سنن ترمذی: أبواب التفسیر، باب من سورۃ یونس، حدیث: ۳۱۰۷، صحیح۔

اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالی کے حکم سے فرعون غرق ہونے لگا تو اس نے ''آمنت'' کہا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کو کلمہ پڑھنے سے جبرئیل نے نہیں روکا، نہ جبرئیل کو اس سے روکنا منظور تھا۔ بلکہ منظور اس کو یہ تھا کہ اس کا کلمہ پڑھنا باعث دامن گیری رحمت نہ ہوجائے۔ اس ترجمہ کو ملحوظ رکھ کر آگے چلئے۔

آپ نے اس پر مندرجہ ذیل اعتراضات کئے ہیں:

''یہ روایت قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے اس وجہ سے اس کا صحیح ہونا ممکن نہیں ہے کیوں کہ (۱) جبرئیل ہر جگہ اللہ کی طرح موجود نہیں رہتے [1] ۔قرآن میں صاف کہہ دیا گیا ہے کہ فرشتے بلا حکم الٰہی نہیں اترتے: ﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ﴾ [مریم: ۶۴]۔

(۲) جبرئیل روح القدس ہیں جن کا وظیفہ یہ ہے کہ انبیاء کرام کے پاس اللہ کے پیغامات پہنچائیں نہ کہ کلمۂ حق سے روکنے کے لئے فرعون کے منہ میں مٹی ٹھونسیں۔

(۳) فرشتے اپنے ارادہ یا جذبہ سے کوئی کام نہیں کرتے بلکہ: ﴿وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾ [التحریم: ۶]، وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے۔ اگر جبریل کا یہ فعل بحکم الٰہی تھا تو فرعون ان کے اوپر غالب کیوں رہا، کیوں کہ قرآن میں تو تصریح ہے کہ اس نے کلمہ پڑھ دیا۔ ﴿قَالَ ءَامَنتُ أَنَّهُۥ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا ٱلَّذِىٓ ءَامَنَتْ بِهِۦ بَنُوٓا۟ إِسْرَٰٓءِيلَ وَأَنَا۠ مِنَ ٱلْمُسْلِمِينَ﴾ [یونس: ۹۰]، (فرعون نے کہہ دیا کہ میں ایمان لایا کہ کوئی معبود نہیں بجز اس معبود کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں مسلمان ہوں) اور جبریل کی ساری محنت اکارت گئی'' (بلاغ امرتسر بابت اپریل ۳۶ء (ص: ۶۸))۔

---

[1] مولانا اسلم صاحب سے جو غلطی ہوئی سو ہوئی یہاں ایک بہت بڑی عقدی خرابی بھی موجود ہے کہ اللہ تعالی ہر جگہ موجود ہے، سلف کا عقیدہ ہرگز یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالی ہر جگہ موجود ہے، بلکہ سلف کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالی اپنے علم سے ساری چیزوں کا احاطہ کئے ہوئے، مگر وہ بذات خود اپنے عرش پر مستوی ہے۔ واللہ اعلم۔

اہلحدیث:

آپ کا یہ قول کہ ''جبریل ہر جگہ موجود نہیں رہتے'' بالکل صحیح ہے، جس وقت جبریل فرعون کے غرق ہونے کے مقام پر تھے اس وقت دہلی اور امرتسر میں نہ تھے، بلکہ سدرۃ المنتہی پر بھی نہ تھے۔ پس حافظ صاحب منطق الطیر کا مسئلہ ہے:

مطلقہ عامہ دائمہ مطلقہ کو مستلزم نہیں۔ جبریل بحکم خدا فرعون کو غرق کرنے آئے تھے ارشاد باری کی تعمیل کردی مگر رحمت واسعہ پر نظر کر کے خوف زدہ ہوئے۔ اور غیرت دینی میں جو کرنا تھا کر گزرے۔

پس اب اس کی نظیر تلاش کرنی ہے کہ کسی بدکار کے عذاب جہنم میں مبتلا ہونے کی خواہش کرنے کا ثبوت ملتا ہے؟

حضرت آدم علیہ السلام کے دو حقیقی بیٹوں کا حال قرآن مجید میں پڑھیے، جب ایک نے ظالمانہ حملہ کیا تو مظلوم کہتا ہے کہ میں تیرے حملے کا جواب نہ دوں گا۔

﴿إِنِّيٓ أُرِيدُ أَن تَبُوٓأَ بِإِثۡمِي وَإِثۡمِكَ فَتَكُونَ مِنۡ أَصۡحَٰبِ ٱلنَّارِۚ وَذَٰلِكَ جَزَٰٓؤُاْ ٱلظَّٰلِمِينَ﴾ [المائدۃ:۲۹]، اس آیت میں مظلوم صاف کہتا ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ تو بوجہ ظلم کے جہنم میں جائے۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ کسی بدکار کے حق میں دخول جہنم کی خواہش کرنی جائز ہے، حالانکہ وہ (قاتل) بھی تائب ہو کر مغفور ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کی مغفوریت کی نقیض کی تمنا کی گئی۔ جس پر خدا تعالی نے اظہار ناراضگی نہیں فرمایا، کیوں کہ ''إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ''۔

حافظ صاحب! آیئے ہم آپ کو ایک آسان راہ سے لے چلیں۔ سنئے! توبہ کے قبول ہونے یا نہ ہونے کے اوقات قرآن مجید نے صاف صاف بیان کر دیئے ہیں۔ عدم قبولیت کے اوقات میں سے ایک وقت یہ ہے کہ جب موت کے آثار نظر آنے لگ

جائیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَلَيْسَتِ ٱلتَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ ٱلسَّيِّـَٔاتِ حَتَّىٰٓ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ ٱلْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ ٱلْـَٔـٰنَ﴾ [النساء:۱۸]، یعنی برے اعمال کرنے والے موت کے وقت توبہ کریں تو قبول نہیں ہوسکتی۔

اس اصول کو خوب یاد رکھئے اور سنئے کہ فرعون نے کس حالت میں توبہ کی تھی:
﴿حَتَّىٰٓ إِذَآ أَدْرَكَهُ ٱلْغَرَقُ قَالَ ءَامَنتُ﴾ [یونس:۹۰]، (جب پانی اس کے منہ میں پڑکر اسے غرق کرنے لگا تو اس نے ایمان کا اظہار کیا)۔

منطق الطیر کی اصطلاح میں دوسری آیت صغری ہے پہلی کبری، نتیجہ صاف ہے کہ فرعون نے جس وقت توبہ کی تھی وہ قبولیت کا وقت نہ تھا۔

پس آپ کا فقرہ کہ "کلمہ حق کہنے سے روکنے کے لئے فرعون کے منہ میں مٹی ٹھونس دی"۔ فرعوں کی توبہ کی طرح بے محل اور ناقابل توجہ ہے۔ ہاں باوجود اس کے جبریل نے وہ فعل کیوں کیا جس کا ذکر حدیث میں ہے۔

فرمان خداوندی: ﴿إِنَّ رَبَّكَ وَٰسِعُ ٱلْمَغْفِرَةِ﴾ [النجم:۳۲]، کے اعلان پر نظر کر کے ایسا کیا، جو کیا وہ محض دینی غیرت سے کیا۔ کسی ذاتی غرض سے نہ کیا، دینی غیرت سے تورات کی تختیوں کو دے مارنا۔ بڑے بھائی کو جو بے گناہ تھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹنا بھی تو ثابت ہے۔ غرض یہ سب کچھ دینی غیرت سے ہوا اس لئے "إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" کے ماتحت ہے۔

حافظ صاحب! آیات قرآنیہ جواب کے لئے کافی ہیں تاہم شاعرانہ تخیل میں ایک بات آپ کو بتاتا ہوں کہ شیخ سعدی مرحوم کو خدا بخشے اس نے جبریل کے کانوں میں ایسی بات کہہ دی، جس سے متأثر ہوکر وہ بے چارہ جلدی میں وہ کام کر گزرا جس پر آپ

کو اعتراض سوجھا۔ شیخ نے کہہ دیا ہوگا ؎

اگر در دہد یک صلائے کرم
عزازیل گوئد نہ نصیبے برم

آپ بھی استاد غالب کی طرح اپنی غلطی کا اعتراف کر لیجئے۔ دیکھئے استاد موصوف کہتا ہے ؎

دھول دھپا اس بت سیمیں کی عادت نہ تھی
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

(نمبر ۳) میں آپ اپنی کمال سادگی کا ثبوت دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''فرعون جبرئیل پر غالب آ گیا کیوں کہ اس نے کلمہ پڑھ دیا، جبرئیل کی محنت اکارت گئی''۔

حالانکہ ہم نے جس حدیث کے الفاظ پیش کئے ہیں اس میں فرعون کا اظہار ایمان (قول آمنت) جبریلی فعل سے مقدم ہے بلکہ یوں کہئے کہ اس کے قول کے باعث جبرئیل کا فعل صادر ہوا۔ اس نے کیوں ایسا کیا؟ اس کا جواب مکرر عرض کرتے ہیں کہ اس کے دو وجوہ تھے۔ ایک یہ کہ قبولیت کا وقت گزر گیا تھا۔ دوسرے یہ کہ ولد آدم الوالعزم رسول موسی علیہ السلام کی طرح غیرت دینی میں ایسا کیا نہ کہ کسی ذاتی غرض سے یا نفسانی رنج میں۔

یا اخانا! آپ کی ایسی بے پروائی اور سادہ مزاجی پر اگر اعیان اہل حدیث خفا ہوں تو وہ بھی حضرت موسی کی طرح معذور ہیں۔ مگر میں تو آپ سے کبھی خفا نہ ہوں گا، کیوں کہ ؎

عاشقاں از ہیبت تیغ تو سر پیچیدہ اند
جامیؔ بے چارہ را چوں دیگراں پنداشتی

❁ ❁ ❁

قسط: ۱۲

تفسیر بالروایت

(۲۷/ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ = ۱۷/جولائی ۱۹۳۶ء)

آج سلسلہ جیراجپوری کا بارھواں نمبر ہے۔ اس کے بعد دو نمبر رہ گئے ہیں، ممکن ہے کہ وہ ایک نمبر میں جمع کر دیئے جائیں۔ بہر حال حافظ اسلم صاحب کے اعتراض کا بارھواں نمبر درج ذیل ہے:

﴿وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِۦ وَنُمِيتُ وَنَحْنُ ٱلْوَٰرِثُونَ ﴿٢٣﴾ وَلَقَدْ عَلِمْنَا ٱلْمُسْتَقْدِمِينَ مِنكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا ٱلْمُسْتَـْٔخِرِينَ ﴿٢٤﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ﴾ [الحجر: ۲۳-۲۵]۔

''اور ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہم ہی وارث ہیں، اور ہم اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی جانتے ہیں، یہ تیرا رب ہی ہے جو ان کو حشر میں لائے گا''۔

اس آیت میں سیاق وسباق پر نظر ڈالنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ اس میں اگلوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو پہلے گزر گئے اور پچھلوں سے وہ لوگ جو ان کے بعد مرے یا مریں گے۔ یہ سب کے سب اللہ کے علم میں ہیں جو ان کو قیامت کے دن میدان حشر میں جمع کرے گا۔ اسی مفہوم کی تفصیل دوسری آیت میں ہے:

﴿قُلْ إِنَّ ٱلْأَوَّلِينَ وَٱلْـَٔاخِرِينَ ﴿٤٩﴾ لَمَجْمُوعُونَ إِلَىٰ مِيقَٰتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ﴾ [الواقعہ: ۴۹-۵۰] ''کہہ دے کہ اگلے اور پچھلے ضرور معینہ دن کی میعاد پر جمع کئے جائیں گے''۔

لیکن (جامع ترمذی) میں روایت ہے حضرت ابن عباس سے کہ ایک حسین ترین عورت (مسجد میں) رسول اللہ کے پیچھے نماز پڑھنے آیا کرتی تھی۔ صحابہ میں سے کچھ لوگ تو آگے کی صف میں بڑھ

جاتے کہ اس کو نہ دیکھیں مگر کچھ لوگ پیچھے کی صف میں شریک ہوتے تھے اور رکوع کی حالت میں بغل کے نیچے سے اس کی طرف جھانکتے تھے اس پر اللہ نے یہ آیت اتاری کہ ہم تم میں سے اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی جانتے ہیں۔ ①

مستقدمین اور مستأخرین کی ایسی تشریح اور صحابہ کرام پر ایسا الزام نہ صرف قرآن بلکہ عقل کے بھی منافی ہے'' (بلاغ امرتسر (ص:٦٨۔٦٩) اپریل ٣٦ء)۔

اہلحدیث:

جواب اول تو یہ ہے کہ ہم نمبر چہارم میں بحوالہ ((فوز الکبیر)) بتا آئے ہیں کہ شانِ نزول کا بہت سا حصہ فہم راوی پر مبنی ہوتا ہے۔ اسی بنا پر حضرت ابن عباس کا یہ قول مبنی ہے، چنانچہ آپ نے لغوی وسعت سے مستقدمین اور مستأخرین کے معنی سمجھ کر پہلی صف کو مستقدم قرار دیکر دوسری کو مستأخر بنایا جو بلحاظ لغت غلط نہیں اور ہمارے لئے باوجود صحیح ہونے کے حجت نہیں۔ فاندفع ما اورد۔

جواب دوم: مستقدمین اور مستأخرین کو انہی معنی میں محصور جاننا جو آپ نے کئے ہیں صحیح نہیں۔ قرآنی شہادت اس کے خلاف ہے۔ اس پر غور فرمایئے: ﴿إِذَا جَآءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَـْٔخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ﴾ [یونس:٤٩] ''اجل آنے پر نہ کوئی مستقدم ہوسکتا ہے نہ مستأخر''۔ فرمایئے! آپ لفظ استقدام وغیرہ کو اپنے پیش کردہ معنی

① سنن ترمذی: ابواب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ الحجر، حدیث: ٣١٢٢، یہ اثر اس سند سے صحیح ہے، اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد امام ترمذی ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''وروی جعفر بن سلیمان هذا الحديث عن عمرو بن مالک ، عن ابی الجوزاء'' نحوه ولم يذكر فيه عن ابن عباس ، وهذا اشبه ان يكون اصح من حديث نوح''، گویا امام ترمذی رحمہ اللہ اس اثر کے اندر ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ذکر کو نوح بن قیس الحدانی کی شاذ روایت قرار دے رہے ہیں۔ واللہ اعلم۔

میں محصور کر سکتے ہیں؟ صحیح بات یہ ہے کہ یہ حکم ہر مستقدم اور مستأخر کو شامل ہے ہم ان معنی سے انکار نہیں کرتے جو آپ نے کئے ہیں۔ ہاں ہم اور ابن عباس آپ کے معنی میں حصر نہیں مانتے۔ آپ ہم کو حصر منوانے کے لئے کوئی دلیل لائے۔ ہاں آپ کا فرمانا کہ صحابہ کرام پر ایسا الزام عقل اور قرآن کے منافی ہے۔

حافظ صاحب! یہ تو ایک آدھ جوان آدمی کا فطری تقاضا ہے جس کا اظہار آپ جیسے فطرت نویس نے یوں کیا ہے ؎

بل بے خود بینی زاہد کہ تیرے دیکھنے کو
منع کرتا ہے تو یہ اور تماشا دیکھو

اگر اس سے بڑا واقعہ قرآن مجید خود بتائے تو آپ کیا کہیں گے۔ سنیے اور غور سے سنیے!

﴿مِنكُم مَّن يُرِيدُ ٱلدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ ٱلْـَٔاخِرَةَ﴾ [آل عمران:۱۵۲]، اس آیت کا ترجمہ ہم آپ ہی پر چھوڑتے ہیں ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

قسط: ۱۳

تفسیر بالروایت

(۴؍جمادی الاول ۱۳۵۵ھ = ۲۴؍جولائی ۱۹۳۶ء)

آج ہم اس سلسلہ کو ختم کرنا چاہتے تھے مگر دوسرے ضروری مضامین کی وجہ سے ایک ہی نمبر پر اکتفا کرتے ہیں، نمبر ۱۳ حسب ذیل ہے:

''دو ایک مثالیں تفسیر بالروایت کی ایسی لکھتا ہوں جن کی خود دوسری حدیث مخالفت کرتی ہے، اسرا کی تفسیر میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب ہم بیت المقدس میں آئے تو جبرئیل نے اپنی انگلی سے پتھر کی طرف اشارہ کیا۔ اس میں سوراخ ہو گیا۔ براق کو اسی میں (غالباً رسی ڈال کر) باندھ دیا[1]۔

اس کے دو ہی صفحہ کے بعد پھر امام ترمذی حضرت حذیفہ بن الیمان سے یہ روایت لکھتے ہیں کہ: لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے براق کو باندھ دیا تھا، کیوں؟ کیا اس لئے کہ بھاگ نہ جائے! حالانکہ اس کو تو اللہ نے ان کے لئے مسخر کر دیا تھا[2]۔ (یعنی نہ وہ بھاگ سکتا تھا، نہ اس کو باندھنے کی ضرورت تھی)۔

یہ دونوں حدیثیں امام ترمذی کے بیان کے مطابق صحیح ہیں'' (بلاغ امرتسر بابت ماہ اپریل ۳۶ء (ص:۶۹))۔

---

① سنن ترمذی: ابواب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ بنی اسرائل، حدیث: ۳۱۳۲، مستدرک حاکم (۲/ ۳۹۲)، حدیث: ۳۳۷۰، صحیح ابن حبان: (۱/ ۲۳۵)، حدیث: ۴۷، یہ حدیث اس سند سے صحیح ہے۔

② سنن ترمذی: ابواب تفسیر القرآن، باب من سورۃ بنی اسرائیل، حدیث: ۳۱۴۷، مسند احمد: (۳۸/ ۳۲۱)، حدیث: ۲۳۲۸۵، یہ حدیث اس سند سے حسن ہے۔

حافظ صاحب! واللہ! اس نمبر میں تو میں اتنا کہنے کی ضرور ہی اجازت لیتا ہوں کہ آپ ایک محدث خاندان کے ممبر ہونے کے باوجود محدثین کا مذہب بھول گئے۔ اور اگر کوئی بدگمان بدظنی کرے تو کہہ سکتا ہے کہ آپ نے دانستہ ایسا کیا ہے۔ خیر جو کچھ بھی ہو ہماری دعا ہے:۔''عفا اللہ عنک''۔

سنئے جناب! پہلی حدیث مرفوع (قول رسول) ہے، دوسری روایت (حذیفہ کا قول) موقوف ہے، موقوف کو مرفوع سے متعارض کہنا اس پر موقوف ہے کہ دونوں کا درجہ ایک ہی ہو۔ حالانکہ موقوف بذاتہ لیس بحجۃ خاص کر مقابلے مرفوع کے تو بجوئے نارزو۔ پس اس جواب سے آپ کا سارا تار پود ٹوٹ گیا۔

اب ہمارا مقابلہ حذیفہ سے رہا مگر آپ کے توسط سے۔ اس لئے آپ خود بھی سنیں اور اگر ہو سکے تو حذیفہ تک بھی پہنچادیں کہ جناب قرآن مجید کی نص صریح ہے:﴿سَخَّرَ لَكُم مَّا فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِى ٱلْأَرْضِ﴾[لقمان:۲۰] ''سب کچھ تمہارے لئے مسخر کردیا ہے''۔

حافظ صاحب! فرمایئے تو آپ نے سفر حج میں جب دیکھا تھا کہ آپ کے جمال نے آپ کے اونٹ کا گھٹنا باندھ دیا۔ اس وقت آپ نے اس کمبخت کو ایسا کرنے سے منع کیوں نہ کیا کہ اللہ تعالی کے مسخر کئے ہوئے کو تو کیوں باندھتا ہے۔ اچھا حافظ صاحب سفر حج میں اگر منع نہیں کیا تو دہلی میں تانگے پر بیٹھے ہوئے کم بخت تانگے والے کو تو ضرور منع فرمایئے کہ گھوڑے کے منہ میں لگام کیوں دیتا ہے۔ جب کہ قرآن مجید کی نص صریح اس کے مسخر ہونے کی بابت خبر دیتی ہے۔

او ظالم! کیا تو قرآن شریف کا منکر ہے؟ پھر جو کچھ جواب میں کہے اسے بھی ''بلاغ'' میں یا (بمشورہ عبدالحیٔ پروفیسر دینیات جامعہ دہلی) ''جامعہ'' میں شائع کروا دیجئے۔

ثابت ہوا کہ حذیفہ کو اور حذیفہ کے بعد آپ کو خدائی تسخیر سمجھنے میں غلطی لگی ہے جو اس کو تقیید کے خلاف سمجھتے ہیں۔ حالانکہ خلاف نہیں۔

حافظ صاحب! ؎

سرمستاں منطق الطیر است جامی لب بیند
جز سلیمانے نبائد فہم ایں گفتار را

❁ ❁ ❁

قسط: ۱۴

تفسیر بالروایت

(۱۱/جمادی الاولی ۱۳۵۵ھ =۳۱/جولائی ۱۹۳۶ء)

حسب اعلان آج سلسلہ ہذا بادل نخواستہ ختم کیا جاتا ہے۔ چند ہفتوں تک حافظ صاحب جیراجپوری کے ساتھ مصاحبت اور علمی صحبت رہی، امید ہے کہ حافظ صاحب موصوف آئندہ بھی اسی طرح اہل علم کی علمی ضیافت کرتے رہیں گے تاکہ کچھ وقت علمی تحقیق میں گزرتا رہے۔ آج کے اعتراض کے الفاظ درج ذیل ہیں:

”(جامع ترمذی) میں حضرت ابوہریرہ سے ایک طویل روایت بیان کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ زمین سے آسمان تک پانسوسال کی راہ ہے، پھر آسمان سے دوسرے آسمان تک بھی اسی قدر فاصلہ ہے اور آسمان سات ہیں جن کے اوپر عرش ہے اس کا فاصلہ بھی ساتویں آسمان سے پانسوسال کی راہ ہے۔ اسی طرح زمین کے نیچے زمین ہے پانسوسال کی راہ

کی مسافت پر۔ اور زمینیں بھی سات ہیں جن میں سے ہر ایک سے دوسری کا فاصلہ اسی قدر ہے۔ قسم ہے اللہ کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے، اگر تم میں سے کوئی رسی میں باندھ کر زمین کے اسفل ترین طبقہ میں لٹکایا جائے تو وہ ٹھیک اللہ کے اوپر جا کر گرے گا۔ پھر آپ نے پڑھا: ''هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ''[1] الآیۃ۔

''هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ'' کی یہ تفسیر کہ اللہ ادھر سب سے اوپر عرش پر ہے اور ادھر سب سے نیچے تحت الثری میں۔ رسول اللہ کی نہیں ہوسکتی۔ رواۃ کو تو نہیں لیکن اس حدیث کے شارحین کو یہ احساس ہوا کہ اس سے اللہ کا تعدد لازم آتا ہے۔ چنانچہ خود امام ترمذی نے ان کی یہ توجیہ نقل کی ہے کہ وہ جو رسی میں باندھ کر لٹکایا جائے گا اللہ کی ذات پر نہیں بلکہ اللہ کے علم پر گرے گا، کیوں کہ اللہ کی ذات تو ایک ہی ہے اور وہ قرآن کی تصریحات کے مطابق عرش پر ہے۔

مگر پھر بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا جب وہ رسی میں باندھا جائے گا اور طبقہ در طبقہ زمینوں میں لٹکایا ہوا جائے گا تو اللہ کا علم اس کو محیط نہ ہوگا۔ پھر تحت الثری میں پہنچ کر علم الٰہی پر گرنے کے کیا معنی'' (بلاغ امرتسر (ص: ۶۹-۷۰) اپریل ۱۹۳۶ء)۔

اہلحدیث:

حافظ صاحب! واللہ میں سچ عرض کرتا ہوں کہ اس نمبر نے میرے دل کو بہت ہی متاذّی کیا، کیوں کہ میرے گمان کو سخت ٹھیس لگی جو میں آپ کی نسبت رکھتا تھا یا اب بھی رکھتا ہوں۔ خدا نہ کرے کہ یہ نمبر کہیں ((اخبار محمدی)) دہلی کے دفتر میں پہنچ جائے، کیوں کہ وہ تو پہلے ہی آپ سے بدظن ہیں۔

---

[1] سنن ترمذی: ابواب تفسیر القرآن، باب: ومن سورۃ الحدید حدیث: ۳۲۹۸، مسند احمد: (۱۴/ ۴۲۲)، حدیث: ۸۸۲۸، یہ حدیث اس سند سے ضعیف ہے، اس میں ایک راوی حکم بن عبدالملک ہے جن کے ضعف پر علماء کا تقریباً اتفاق ہے۔

حافظ صاحب! میرے صدمے کے دو وجوہ ہیں:

(۱) آپ کا ترجمہ جس پر میں نے لکیر کھینچ دی ہے۔

(۲) آپ کا اعتراض۔

ترجمہ بالکل غلط۔ ایسا غلط کہ ادنی لیاقت کا طالب علم بھی روایت کے الفاظ سامنے رکھ کر اس ترجمہ کو پڑھے گا تو صاف کہہ دے گا ؎

کارِ طفلاں تمام خواہد شد

میں مدارس عربیہ کے علماء اور طلباء کے استحضار کے لئے روایت کے الفاظ سامنے رکھ دیتا ہوں:۔"والَّذِي نَفْسُ محمَّدٍ بِيَدِهِ، لَوْ دَلَّيْتُمْ بِحَبْلٍ إلى الأَرْضِ السُّفْلى لَهَبَطَ عَلى اللَّهِ"(ترمذی تفسیر سورہ حدید)①۔

اس عربی عبارت میں "دلیتم" مخاطب کا صیغہ ہے "بحبل" محل مفعول بہ میں ہے۔ "ھبط" کی ضمیر "حبل" کی طرف راجع ہے۔ پس حدیث کے معنی یہ ہیں:

اگر تم رسی نچلی زمین کی طرف ڈالو تو وہ بھی اللہ کے علم پر گرے گی، یعنی اس کو بھی خدا جانتا ہے۔

میں مدارس عربیہ کے اساتذہ کو ان کے علم کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ وہ بحکم ﴿كُونُواْ قَوَّامِينَ بِٱلْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلَّهِ﴾[النساء:۱۳۵] بتائیں کہ حافظ صاحب کا ترجمہ صحیح ہے یا میرا؟

ہاں آپ کا اصل اعتراض (جس پر بھی میں نے خط دے دیا ہے) بے شک قابل جواب ہے۔ پس سنیے: آپ اگر اس حدیث کو آیت قرآنیہ کی روشنی میں دیکھتے تو دونوں کو ہم معنی (متفق) پاتے۔ چنانچہ مذکورہ آیت وہ ہے جس میں حضرت لقمان علیہ السلام

① سنن ترمذی: أبواب التفسير، باب ومن سورة الحديد، حديث: ۳۲۹۸، اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔

اپنے بیٹے کوفرماتے ہیں:

﴿يَٰبُنَيَّ إِنَّهَآ إِن تَكُ مِثۡقَالَ حَبَّةٖ مِّنۡ خَرۡدَلٖ فَتَكُن فِي صَخۡرَةٍ أَوۡ فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ أَوۡ فِي ٱلۡأَرۡضِ يَأۡتِ بِهَا ٱللَّهُۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَطِيفٌ خَبِيرٞ﴾ [لقمان:۱۶]۔

''اے میرے بیٹے تیرا کوئی کام خواہ رائی کے دانے کے برابر بھی ہو پھر وہ کسی پتھر کے نیچے ہو یا آسمانوں پر یا زمین کے اندر ہو تو اس کو بھی خدا لاکر موجود کر دے گا، کیوں کہ اللہ تعالی بڑا باریک بین اور باخبر ہے''۔

اس آیت نے بڑی صفائی سے بتا دیا ہے کہ جو واقعہ تحت الثری میں ہو اس کو بھی اللہ تعالی جانتا ہے، یہی مضمون حدیث نے بتایا ہے کہ جو رسی تم نچلی زمین تک پہنچاؤ اسے بھی خدا جانتا ہے۔ پس تحت الثری میں علم الٰہی پر گرنے کے وہی معنی ہیں جو آیت مذکورہ کے علاوہ آیت ذیل کے ہیں:

﴿وَمَا تَسۡقُطُ مِن وَرَقَةٍ إِلَّا يَعۡلَمُهَا﴾ [الانعام:۵۹]۔

حافظ صاحب! کوئی اور پیدائشی مخالف حدیث ایسے اعتراض کرتا تو ہم اسے معذور جانتے لیکن آپ کا ہمارا معاملہ بیگانگت کا نہ تھا بلکہ یگانگت کا، باوجود اس کے ہم اعتراضات کی قدر کرتے اگر آپ کے خاندانی علمی وجاہت پر مبنی ہوتے۔ سر دست تو ہم یہی کہتے ہیں کہ آپ ہم سے جدا ہو کر کسی معقول پسند جماعت میں نہیں گئے۔ جس کا ہمیں افسوس ہے۔ اس لئے ہم بحکم: ﴿وَكَانَ أَبُوهُمَا صَٰلِحٗا﴾ [الکہف:۸۲]، مولانا جامی مرحوم کا محبت آمیز شعر ھدیۃً پیش کرتے ہیں ؎

جنگ کردی آشتی کن رانکہ نزدیک عاقلاں
ایں مثل مشہور اول جنگ آخر آشتی

نوٹ: آپ نے ایک روایت جو حضرت عباس کے واسطے سے ((ترمذی)) کے

حوالے سے نقل کی ہے، ((ترمذی)) میں ہمیں نہیں ملی۔ اگر مل گئی تو کچھ عرض کیا جائے گا۔

یار زندہ صحبت باقی

میں مکرر آپ کے لطف صحبت کا شکریہ ادا کر کے کچھ وقت کے لئے اخباری صفحات میں آپ سے جدا ہوتا ہوں ؎

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

ختم شد

بلاغ کا باطل گو نامہ نگار

مؤلفہ

مناظرِ اسلام علامۂ عصر مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری

ان مضامین میں ''حق گو'' صاحب کی کتاب ''بلاغ الحق'' کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، جو قسط وار (۲ قسطوں میں) ''اخبار اہل حدیث'' امرتسر میں ۲۸/جمادی الاولی ۱۳۵۶ھ (تا) ۱۲/جمادی الثانیہ ۱۳۵۶ھ = ۶/اگست ۱۹۳۷ء (تا) ۲۰/اگست ۱۹۳۷ء شائع ہوا۔

تحقیق وتعلیق

عبدالاحد احسن جمیل آل عبدالرحمن

قسط:۱

بلاغ کا باطل گو نامہ نگار

(۲۸/جمادی الاولی ۱۳۵۶ھ=۶/اگست ۱۹۳۷ء)

امرتسری منکرین حدیث کے رسالہ ''بلاغ'' میں ایک شخص کی طرف سے جس کا لقب ''حق گو'' ہے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں یوں تو ہر شخص کا حق ہے کہ اپنا نام جو چاہے رکھ لے، عبداللہ رکھے یا رام دتا، مگر ایسا نام یا لقب جس کا اثر عوام پر پڑتا ہو اس پر رائے زنی کرنے کا حق ہر ایک شخص کو حاصل ہے۔

ہم عرصے سے ان ''حق گو'' صاحب کے مضامین دیکھ رہے ہیں، اب ہمارا جی چاہتا ہے کہ خود ان کو دیکھیں، خدا کرے ہماری آرزو پوری ہو (ہماری ان سے ملاقات ہوجائے) پھر ہم دیکھیں گے کہ ان کی حق گوئی ہم پر اثر کرتی ہے یا ہماری معروضات کو وہ قبول کرتے ہیں، ان کی ساری حق گوئی کا خلاصہ اس ایک ہی عربی شعر میں آجاتا ہے:

كانَتْ مَواعِيدُ عُرْقُوبٍ لَها مَثَلًا
وما مَواعِيدُها إلّا الأباطِيلُ[1]

(ترجمہ) عرقوب کے وعدہ کی مثال دی جاتی ہے اس کا وعدہ کیا تھا صرف جھوٹ اور باطل کا پلندہ۔

یہ حضرت حدیث نبوی کے حق میں تو سرے ہی سے بدگو ہیں، مگر علمائے اسلام کو اتنا

---

① یہ کعب بن زہیر کا شعر ہے۔

کوستے ہیں جتنا کہ ''شیعہ'' حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو، یا خارجی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو۔

کوئی تحریر ان کی سخت کلامی یا گندہ دہنی سے خالی نہیں ہوتی اس لیے ہم نے آج تک ان کو قابل خطاب ہی نہیں سمجھا، آیہ کریمہ: ﴿وَقُل لِّعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ [الاسراء:۵۳] ان کے نزدیک منسوخ التلاوت اور متروک العمل ہے ہمیں ان حضرت سے تعارف نہیں ہے، مگر ہم ان کو استاد صائب کے اس شعر میں نصیحت کر دینا مناسب سمجھتے ہیں ؎

دہن خویش بدشنام میالا صائب
کیں زرِ کلب ہر کس کہ دہی باز دہد

اب ہم نے بھی ارادہ کرلیا ہے (خدا ہمارے ارادے کو پورا کرے) کہ ان حضرت کی بدزبانیوں اور تلخ کلامیوں سے پر مضامین کا جواب دے کر ان کی تسلی کریں، چنانچہ آج ہم اس سلسلے کو شروع کرتے ہیں (بحولہ وقوتہ)۔ آپ نے رسالہ بلاغ بابت جولائی سن رواں میں اپنے مواعظ کے سلسلہ میں یہ آیت لکھی: ﴿وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُوا الْأَلْبَابِ﴾ [البقرۃ:۲۶۹] پھر اس کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

''وہ حکمت دیتا ہے اور جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی خیر وبرکت کی چیز دی گئی اور خدا کی اصل یاد کرنے والے وہی لوگ ہیں جو اہل حکمت (صاحبان دانش) ہیں''۔

اس آیت اور اس کے ترجمے سے آپ نے جو نتائج اخذ کئے ہیں اور جو متفرعات پیدا کی ہیں ان کا ذکر آگے آتا ہے، سردست ہم یہ بتاتے ہیں اس ترجمہ میں آپ نے دو فاش غلطیاں کی ہیں، ایک یہ کہ حکمت کا ترجمہ ہی نہیں کیا کہ کون سی حکمت مراد ہے

(علم طبیعات یا علم طب، یا علم ریاضی یا منطق وفلسفہ) کیوں کہ حکمت کا اطلاق سب علوم پر ہوتا ہے۔

دوسری غلطی یہ ہے کہ یذکر کا ترجمہ یاد کرنے والے کیا ہے جو غلط ہے، اس معنی کے لیے یذکر مجرد کا صیغہ آتا ہے اس پر بھی آپ کا یہ دعویٰ کرنا کہ میں اپنی طرف سے ایک شوشہ بھی نہیں بڑھا رہا ہوں۔ حیرت افزا ہے۔

اب ہم حکمت کا معنی قرآن شریف ہی سے بتا کر آپ کی جملہ تفریعات کو غلط ثابت کرتے ہیں، قرآنی اصطلاح میں حکمت اس نسبت کے جاننے کا نام ہے جو خالق اور مخلوق کے درمیان پائی جاتی ہے حکمت کوئی علم طب یا فلسفہ وغیرہ نہیں ہے بلکہ اس نسبت کا علم ہے جو حادث کو محدث کے ساتھ ہے۔

اہل منطق کہا کرتے ہیں:

''اَلْعِلْمُ إِنْ كَانَ إِذْعَانًا لِلنِّسْبَةِ فَتَصْدِيْقٌ''۔

اس سے ان کی مراد ہر وہ نسبت ہوتی ہے جو کسی قضیے میں پائی جائے وہ قضیہ موجبہ ہو یا سالبہ، حملیہ ہو یا شرطیہ، صادقہ ہو یا کاذبہ، اس لیے ان کے نزدیک اگر مسیح کو ابن مریم جاننا تصدیق ہے تو مسیح کو ابن اللہ جاننا بھی تصدیق ہی ہے۔

مگر قرآنی اصطلاح میں حکمت سے مراد یہ ہے:

''اَلْعِلْمُ إِنْ كَانَ إِذْعَانًا لِلنِّسْبَةِ بَيْنَ الْخَالِقِ وَالْمَخْلُوْقِ فَحِكْمَةٌ''۔

اس کا ثبوت ہم قرآن مجید کی نص صریح سے دیں گے، کیوں کہ ہم آپ کی طرح صرف منہ سے باتیں کرنے کے عادی نہیں ہیں۔

نوٹ! ہم اپنے مخاطب اور جملہ منکیرین حدیث کو بڑے زوردار الفاظ میں نوٹس

دیتے ہیں اگر وہ ہمارے جواب یا خطاب میں کوئی مضمون لکھیں تو نفس قرآن ہی سے لکھا کریں، ہم انچ بھر قرآن شریف سے نہ خود ہٹیں گے، نہ آپ کو ہٹنے دیں گے، کیوں کہ ہمارے نزدیک فی مابین فیصلہ کن معیار قرآن شریف ہی ہے، مگر ہم قرآنی یوسف کو برادران یوسف کے حوالے نہیں کریں گے، یعنی ہم یہ اصول تسلیم نہ کریں گے کہ قرآن شریف کے جو معنی منکرین حدیث بیان کردیں وہی صحیح ہوں (خواہ وہ معنی کیسے ہی بھونڈے ہوں) بلکہ قرآنی تصریح یا تائید سے عربی زبان کے قواعد کے ماتحت جو معنی نکلیں گے وہ صحیح تصور کئے جائیں گے اس معروض کو مدنظر رکھ کر ہماری طرف سے قرآنی شہادت سنیے۔ جو یہ ہے: ﴿وَلَقَدْ ءَاتَيْنَا لُقْمَٰنَ ٱلْحِكْمَةَ أَنِ ٱشْكُرْ لِلَّهِ﴾ [لقمان: ۱۲] اس آیت میں صاف ارشاد ہے کہ ہم نے لقمان کو یہ حکمت دی کہ خدا کا شکر کیا کر، شکر متفرع ہے اس نسبت کے سمجھ لینے پر جس کا ذکر ہم مندرجہ بالا سطور میں کرچکے ہیں، انہی معنی میں کسی اہل معرفت نے یہ شعر کہا ہے ؎

چند چند از حکمت یونانیاں
حکمت ایمانیاں دا ہم بخواں

پس آیت زیر بحث کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ اپنی معرفت کا علم جسے چاہتا ہے دے دیتا ہے اور جس کو یہ علم دیا گیا اس کو بہت سی بھلائی دی گئی، (اللہ کے نزدیک) عقلمند وہی لوگ جو نصیحت پاتے ہیں۔

قرآن شریف میں شجرۂ ممنوعہ سے متعلق یہود ونصاری کا عقیدہ بیان کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:

''اہل دانش اور علم سے ہمیشہ مذہبی لوگوں کی پرخاموش رہی اور مذہب کی سب سے بڑی سرگرم حامی اکثر بےوقوفوں کی جماعت ہوا کی ہے، چنانچہ اگر ہمارے ہاں یہ حدیث بیان کی جاتی ہے کہ

" أهْلِ الجَنَّةِ بُلْهٌ"[1] تو عیسائیوں کے ہاں بھی یہ ہے کہ مبارک ہیں وہ جو دل کے بھولے بھالے ہیں کیوں کہ آسمانی بادشاہت انہیں کے لیے ہے، اس کے برخلاف قرآن کیا کہتا ہے کہ جس کو حکمت دی گئی اس نے گویا بڑی برکت کی خیر پائی، اور اصل تو یہ ہے کہ خدا پرستی صاحبان دانش وفرزانہ لوگوں کے لیے مخصوص ہے، میں اپنی طرف سے ایک شوشہ نہیں بڑھا رہا ہوں، قرآن کی اوپر آیت جس کا جی چاہے قرآن میں دیکھ لے اور اس کے صاف وصحیح معنی جس عربی دان سے چاہے پوچھ کر اپنی تشفی کر لے" (بلاغ امرتسر ص: ۷ ۴ جولائی ۳۷ء)۔

اہلحدیث:

جس بنا پر آپ کی یہ تقریر مبنی ہے اسے ہم پہلے ہی مسمار کر چکے ہیں اور ثابت کر چکے ہیں کہ آپ کا یہ دعویٰ کہ میں نے ایک شوشہ بھی نہیں بڑھایا بالکل غلط ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ سارا تانا بانا آپ کا نفسانی ڈھکوسلہ ہے، ہاں آپ کی جرأت کی داد دیئے بغیر ہم نہیں رہ سکتے کہ باوجود عربی زبان سے ناواقف ہونے کے آپ کس دلیری سے کہتے ہیں: جس عربی دان سے چاہیں پوچھ کر اپنی تشفی کر لیں۔

مہربانی کر کے تو یہ بتائیں کہ عربی زبان کے لحاظ سے یدکرا اور یذکر میں کچھ فرق ہے یا نہیں؟ اگر تکلیف نہ ہو تو یہ بھی بتا دیجیے کہ یذکر (بالذال المعجمہ) اور یدکر (بالدال المہملہ) بلحاظ معنی کے ایک ہی ہیں یا مختلف، ہاں یہ بھی بتائیں کہ قرآنی لفظ مدکر کا ماخذ

---

[1] شعب الایمان از بیہقی: (۲/ ۴۹۷)، حدیث: ۱۳۰۳، مسند البزار: (۱۳/ ۳۲)، حدیث: ۶۳۳۹، شرح مشکل الآثار: از طحاوی: (۷/ ۴۳۱)، حدیث: ۲۹۸۲، اس حدیث کی سند ضعیف ہے، امام ابوجعفر طحاوی ((مشکل الآثار)) میں فرماتے ہیں: "میں نے یہ حدیث احمد بن ابوعمران سے ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ اس کا معنی صحیح ہے، آگے فرمایا: والبله المرادون فيه هم البله عن محارم الله عز وجل لا من سواهم ممن به نقص العقل بالبله (حوالہ مذکور)۔

کیا ہے۔

ناظرین کرام:

ریشنلزم انگریزی زبان کا ایک لفظ ہے آج کل اس سے مراد ہے کہ مذہبی تقیدات سے آزاد ہوکر ہراس چیز کو داخل عقیدہ کیا جائے جو بزعم خود معقول نظر آئے خواہ وہ کہیں سے ملے۔

اس تشریح کے ماتحت اگرکسی کی نظر میں کفارہ مسیح معقول ہےتو کسی کی نظر میں مسئلہ نیوگ بھی بہت مفید ہے، اس کے ساتھ ہی تعدد ازواج ناپسندیدہ ہے، کسی کو چھوت چھات بھلی معلوم ہوتی ہے، اور دختر رز مرغوب بلکہ حافظ شیرازی کا یہ شعر اس کی نگاہ میں ہر طرح صحیح المعنی ہے ؎

شراب دوسالہ ومحبوب چہار دہ سالہ
بس است ہمیں مرا صحبت صغیر وکبیر

ایسے اشخاص ریشنلزم کے پابند اور ہمارے مخاطبوں کے نزدیک بڑے محققین ہیں، چنانچہ اس بارے میں آپ کے الفاظ یہ ہیں:

''اللہ اکبر حکمت یا بمعنی دیگر ''ریشنلزم'' جس کو دو ہزار برس سے عیسائی دنیا ملعون اور مطعون کر رہی ہے اس کی حمایت ایک ایسی آسمانی کتاب میں دیکھ کر اور اسی کتاب کو آسمانی ووحی الٰہی ماننے والی جماعت کی موجودہ حالت کا موازنہ کرتے ہوئے بس خدا کی شان نظر آتی ہے اور دل بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ خداوندا اس کتاب کا حامل اہل یورپ امریکہ وجاپان کے بجائے افغان ترک، عرب، ہندوستان، وافریقہ کے لوگوں کو کیوں بنایا جس نے تیرے ایک ایک قول واصول کی عملی تکذیب اور تردید کی ہے، ایک منٹ کے لیے قرآن کے صفحہ پر ہاتھ رکھ لو اور ذرا مسجد میں اپنی طرف سے ایک وعظ تو کہہ ڈالو کہ:

(۱) مذہب کھانے پینے پر موقوف نہیں [1] نہ ایک طرف منہ کر لینے سے اور نہ ایک خاص قسم کے مناسک کے ساتھ بلکہ مذہب تقوی احسان اور اخلاق کا نام ہے۔

(۲) مذہب بغیر علم ودانش کے ایک بیکار محض چیز ہے۔

(۳) مذہب کسی پیر ومولوی کی ضرورت نہیں چاہتا، کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ اٹھا نہیں سکتا ،خدا کے سوا کوئی دوسرا مطاع نہیں۔

(۴) خدا کو قربانی کا گوشت وخون نہیں پہنچتا بلکہ تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

(۵) عورتوں کے مردوں پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے عورتوں پر، دونوں خدا کے آزاد بندے ہیں اور قید وبند سے باہر جیسا فطرت نے ان کو بنایا ہے۔

(۶) مسلمان کوئی قوم نہیں ہے جو ایک خاص لباس وزبان ومعاشرت کے ساتھ یہودیوں یا پارسیوں کی طرح دنیا میں پھیلی ہوئی ہے بلکہ ہر خدا پرست جماعت مسلمان ہے خواہ جس قوم سے ہو۔

تو اگر تم پر تکفیر کا فتویٰ نہ پڑے تو میرا ذمہ حالاں کہ یہ ساری باتیں خود قرآن ہی کی ہیں، نوبت بایں جا رسید کہ یاروں نے حکمت کے معنی ہی الٹ دیے ہیں اور اہل حدیث نے اس کے معنی اقوال انس، ابو ہریرہ، وابن عباس سے لیے ہیں [2] اور یہی وجہ ہے کہ عربی مدرسے کا پڑھا ہوا مولوی اپنے آپ کو عالم کہلانے میں ویسا ہی بے باک ہے جیسا کہ حلال خورا پنے کو مہتر کہلانے میں، اسی کو برعکس نہند نام زندگی کا فور کہتے ہیں، پھر یہ ہمارے علماء اگر اہل علم ودانش کو مذہب سے دور رکھنے میں

---

① بکرا ہو یا سور؟ (اہل حدیث)۔

② اجلہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی توہین -نعوذ باللہ-، یہ وہ صحابہ ہیں جنہیں مکثرین فی الروایہ کہتے ہیں، یعنی جن سے بہت زیادہ حدیثیں مروی ہیں۔ یہ گاج یوں ہی نہیں گری ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک بھیانک مقصد ہے، اور وہ مقصد قلعہ حدیث کی پہلی سیڑھی کو ہی ڈھا دینا ہے۔

کامیاب ہوں تو اس کا سہرا کس کے سر (حق گو) (بلاغ امرتسر ص: ۷ ۴، ۸ ۴ جولائی ۷۳۰ھ)۔

اہلحدیث:

ناظرین کرام! دیکھا نہ ان حق گو صاحب کی باطل گوئی کہاں تک پہنچتی ہے، اسلام اس کے نزدیک گویا ریشنلزم کا دوسرا نام ہے۔ اوپر ہم بتا چکے ہیں کہ ریشنلزم اہوائے نفسانیہ کا مجموعہ ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ حدیث نبوی کی مخالفت کرتے ہیں، کیوں کہ حدیث شریف میں مذہبی تقید و پابندی کی سخت تاکید ہے، یہ لوگ مذہبی تقیدات سے اس جاندار کی طرح بھاگتے ہیں جس کا ذکر قرآن شریف میں بالفاظ: ﴿فَرَّتۡ مِن قَسۡوَرَةٍ﴾ [المدثر:۵۱] کیا گیا ہے، ہاں حلال خور کو مہتر کہنے والوں کی طرح باطل گو کو حق گو کہنے والے بھی دنیا میں موجود ہیں، اخیر میں ہم حق گو صاحب کو استاد کے اس شعر پر توجہ دلاتے ہیں ؎

انہوں نے خود غرض شکلیں کبھی دیکھی نہیں شاید
وہ جب آئینہ دیکھیں گے تو ہم ان کو بتادیں گے

قسط:۲

بلاغ کا باطل گونامہ نگار

امت مسلمہ امرتسر کا غیر اسلامی وعظ

(۱۲/ جمادی الثانیہ ۱۳۵۶ھ = ۲۰/ اگست ۱۹۳۷ء)

امرتسر کی منکرۂ حدیث جماعت اپنا نام امت مسلمہ رکھتی ہے مگر اس کی تحریروں اور تقریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس بابرکت نام سے بھی اسی طرح بیزار ہے جس طرح حدیث نبوی کے نام سے، چنانچہ ایک دفعہ انہوں نے اپنے برہموسماج [1] ہونے کا اعلان بھی کیا تھا، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو برہما (آدم) بھی لکھ مارا ہے [2]، حال ہی میں ان کے باطل گونامہ نگار نے اپنی شوخ نگارانہ عادت کے ماتحت رسالہ ''بلاغ'' بابت اگست رواں میں مسلم فرقوں اور علمائے اسلام کو کوستے ہوئے مسلمانوں کو بحیثیت قوم دیکھنے اور سننے سے بھی بیزاری کا اعلان کیا ہے، ہمیں ایسے نامہ نگاروں پر کچھ تعجب نہیں کیوں کہ یہ لوگ اپنے خیال میں تمام علمائے اسلام اور بزرگان دین کو بیک جنبش قلم جاہل، مخرب دین، طالب دنیا، صاحب البطن قرار دیا کرتے ہیں، ان کی طرف سے ایسے ایسے القاب سن کر ہمارے منہ سے بے ساختہ نکل جاتا ہے ؎

---

① بنگال میں کچھ لوگ رہتے ہیں جو کسی خاص مذہب کے پابند نہیں۔ ان کا اصول ہے کہ اچھی بات ہر جگہ سے اخذ کر لینی چاہیے۔ اسی اصول پر ہمارے مخاطب کار فرما ہیں، چنانچہ وہ اس کا اعلان رسالہ (بلاغ) بابت مارچ ۲۹ سنہ ء (ص:۱۰) پر کر چکے ہیں۔ (اہل حدیث)۔

② ملاحظہ ہو: (تفسیر بیان) منزل اول (ص:۱۳۳)۔

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق راؤ باز کشی

ان لوگوں کی کوشش ہی یہ ہے کہ مسلم قوم بحیثیت مسلم دنیا سے مٹ جائے، ان کے نزدیک مسلم سے مراد کسی خاص قوم کا فرد نہیں بلکہ ہر وہ شخص جو خدا کو ماننے والا ہے وہ مسلم ہے خواہ وہ کسی شکل و شباہت میں ہو، مسجد میں جاتا ہو یا مندر میں، گرودوارے میں جاتا ہو یا کلیسا میں، مگر خدا کو یاد کرتا ہو، چنانچہ نامہ نگار مذکور نے اپنے اس دعوی پر آیہ کریمہ: ﴿وَقَالُواْ لَن يَدْخُلَ ٱلْجَنَّةَ﴾ الآیۃ [البقرۃ:۱۱۱] پیش کر کے اس کا ترجمہ وتفسیر یوں کی ہے:

''یہود ونصاری کا قول ہے کہ جنت میں بجز ان لوگوں کے جو یہود ونصاری ہیں کوئی نہ جائے گا، یہ سب ان کے دل بہلانے کی باتیں ہیں، ان سے کہو کہ ان کے اس لاطائل قول کی دلیل کیا ہے، ہرگز نہیں بلکہ ہر شخص جو خدا کے آگے اپنا سر جھکائے اور وہ لوگوں کے ساتھ نیکی کرے۔ خدا کے ہاں اس کا اجر ہے اور ایسے لوگوں کو کوئی خوف و ہراس اور مایوسی نہ ہوگی۔

قرآن نے یہود ونصاری کی محض ایک مثال دی ہے لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہود ونصاریٰ کی جگہ اگر مقلد، غیر مقلد، شیعہ، حنفی، وہابی یا قادیانی کا لفظ رکھ دیا جائے تو ٹھیک یہ ہی قول ہمارے لیے موزوں نہ ہوگا، پھر اس قول سے ہم کو کیا سبق ملا، یاد رکھو یہ قول معمولی شخص کا نہیں ہے کہ ہم اس کو ٹال جائیں، وہ تو ایسی ہستی کا قول ہے جو ہماری رگ رگ سے واقف ہے، خدا کے آگے سر جھکانے والا اور لوگوں پر احسان کرنے والا خواہ وہ عرب ہو یا ایرانی، انگریز ہو یا ہندوستانی، چینی ہو یا جاپانی، پارسی ہو یا یہودی، ویسا ہی بہشت کا حقدار ہے جیسا کہ وہ طرفہ معجون مرکب قوم جو نہ ہندی ہے، نہ ترک، نہ جرمن، نہ فرانسیسی، جس کی کوئی ملکی معاشرت، تہذیب ولٹریچر نہیں، یعنی وہ مذہبی قوم جو مسلمان کے نام سے مشہور ہے جس کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ عرب بننے کی کوشش میں نہ

عربی بنتا ہے اور نہ غیر عربی، اور آخر میں اسی مذہبی جنون میں مبتلا پایا جاتا ہے جس میں دنیا کے سارے مذاہب باطلہ مبتلا ہیں کہ سوائے ان کے دنیا اور آخرت میں کسی دوسرے کو رہنے کا حق نہیں، یہ ہی مذہبی جنون ہے جس کا ادنیٰ کرشمہ ''فساد فی الارض'' اور آخر میں وہی شخص جس کی ذات سے دنیا کو امن وراحت کی امید ہوتی ہے، قومی عناصر میں سب سے زیادہ خطرناک صورت اختیار کرلیتا ہے'' (بلاغ امرتسر ص:۷ بابت اگست ۱۹۳ء)۔

ناظرین!

مرقومہ بالا عبارت کو قرآن کریم کی ان آیات کی روشنی میں دیکھیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) ﴿وَمَن يُشَاقِقِ ٱلرَّسُولَ مِنۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ ٱلۡهُدَىٰ وَيَتَّبِعۡ غَيۡرَ سَبِيلِ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ نُوَلِّهِۦ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصۡلِهِۦ جَهَنَّمَۖ وَسَآءَتۡ مَصِيرًا﴾ [النساء: ۱۱۵]۔

(۲) ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ ءَامِنُواْ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَٱلۡكِتَٰبِ ٱلَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِۦ وَٱلۡكِتَٰبِ ٱلَّذِيٓ أَنزَلَ مِن قَبۡلُۚ وَمَن يَكۡفُرۡ بِٱللَّهِ وَمَلَٰٓئِكَتِهِۦ وَكُتُبِهِۦ وَرُسُلِهِۦ وَٱلۡيَوۡمِ ٱلۡأٓخِرِ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلَٰلَۢا بَعِيدًا﴾ [النساء: ۱۳۶]۔

(۳) ﴿ٱتَّبِعُواْ مَآ أُنزِلَ إِلَيۡكُم مِّن رَّبِّكُمۡ وَلَا تَتَّبِعُواْ مِن دُونِهِۦٓ أَوۡلِيَآءَۗ﴾ [الاعراف: ۳]۔

(۴) ﴿وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ وَءَامَنُواْ بِمَا نُزِّلَ عَلَىٰ مُحَمَّدٖ وَهُوَ ٱلۡحَقُّ مِن رَّبِّهِمۡ كَفَّرَ عَنۡهُمۡ سَيِّـَٔاتِهِمۡ وَأَصۡلَحَ بَالَهُمۡ﴾ [محمد: ۲]۔

ترجمہ آیات:

(۱) جو شخص راہ راست کے ظاہر ہوئے پیچھے پیغمبر سے کنارہ کش رہے اور مسلمانوں

کے رستے کے سوا (دوسرے رستے) ہولے تو جو (رستہ) اس نے اختیار کرلیا (ہے) ہم اس کو اسی رستے چلائیں گے اور (آخرکار) اس کو جہنم میں (لے جا) داخل کریں گے اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔

(۲) مسلمانو! اللہ پر ایمان لاؤ اور اسکے رسول (محمد) پر اور اس کی کتاب (قرآن) پر جو اس نے اپنے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اتاری (ہے)، اور ان کتابوں پر جو (قرآن سے) پہلے (دوسرے پیغمبروں پر) اتاریں اور جو شخص اللہ کا منکر ہوا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اور روز آخرت کا تو وہ (راہِ راست) سے بڑی دور بھٹک گیا۔

(۳) (لوگو! یہ قرآن) جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر اترا ہے اسی (کی ہدایت) پر چلے جاؤ، خدا کے سوا (اپنے بنائے ہوئے) کارسازوں (معبودوں) کی پیروی نہ کرو۔

(۴) اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل (بھی) کیے اور (قرآن) جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا ہے اس پر (بھی) ایمان لائے اور وہ برحق ہے، خدا نے ان کے گناہ ان پر سے اتار دیئے اور ان کی (دینی دنیوی) حالت (بھی) درست کردی۔

مندرجہ بالا آیات پر غور کرنے سے یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ منزل قرآن کا منشا یہی ہے کہ مسلم قوم بحیثیت قوم کے دنیا میں زندہ رہے اور بزبان باطل گو اس کا مقولہ یہ نہ ہو ؎

دیر ہو یا طور ہو کعبہ ہو یا عرش بریں
ڈھونڈ ہی لیتا ہے تجھ کو جو ترا دیوانہ ہے

رسالہ ''بلاغ'' امرتسر انکار حدیث میں ایسا متوالا ہے کہ ہر منکر حدیث کا مضمون

شائع کر دیتا ہے، خواہ اس مضمون سے قرآن مجید کی صراحۃ تردید ہوتی ہو۔ اس کا نام اس نے تبلیغ دین اور اشاعت اسلام رکھا ہوا ہے ؎

سَتَعلَمُ لَيلى أيَّ دَينٍ تَدايَنَتْ
وأيّ غَريمٍ لِلتَّقاضِي غرِيمُها[1]

❁ ❁ ❁

[1] دیکھیں: ((مغنی اللبیب عن کتب الاعاریب)) از ابن ہشام: (ص: ۵۴۵)، یہ ابوذویب الھذلی کا شعر ہے۔

تصدیق الحدیث

((بیان الحق بجواب بلاغ الحق))

مؤلفہ

مناظرِ اسلام علامۂ عصر مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری

ان مضامین میں حافظ محب الحق (پنڈت) صاحب کی کتاب ''بلاغ الحق'' کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو قسط وار (۱۵ قسطوں میں) ''اخبار اہل حدیث'' امرتسر میں ۱۲/ جمادی الثانی ۱۳۵۶ھ (تا) ۱۳/ شوال ۱۳۵۶ھ = ۲۰/ اگست ۱۹۳۷ء (تا) ۱۷/ دسمبر ۱۹۳۷ء تک شائع ہوا۔

تحقیق وتعلیق

عبدالاحد احسن جمیل آل عبدالرحمن

قسط:۱

تصدیق الحدیث

''بیان الحق بجواب بلاغ الحق''

(۱۲/ جمادی الثانی ۱۳۵۶ھ = ۲۰/ اگست ۱۹۳۷ء)

اَلْحَمْدُ للهِ الَّذِي أنزلَ الكتابَ هُدًى للنَّاسِ، والصلاةُ والسَّلامُ عَلَى رسولِهِ الَّذِي عَلَّمَ وَبَيَّنَ الْكِتابَ لِلنَّاسِ، وعلى آله وأصحابِه الَّذينَ هُمْ هُداةً للنّاسِ، وَنَعُوذُ بِاللهِ مِنْ شُرُورِ أنْفُسِنا وَمِنْ شَرِّ الْوَسْواسِ الْخنَّاسِ الَّذِي يُوَسوِسُ فِي صُدُورِ النّاسِ مِنَ الجِنَّة والنَّاسِ، اَللّٰهُمَّ أَرِنَا الْحَقَّ حَقًا وَالْبَاطِلَ بَاطِلًا بِاتِّبَاعِ الْقُرْآنِ وَسُنَّةِ نَبِيِّ الْجِنَّةِ والنَّاسِ۔

ناظرین کرام:

آج دنیا میں اسلام پر جس قدر حملے ہو رہے ہیں وہ اگر تقسیم کئے جائیں تو ان میں سے ایک تہائی یا چوتھائی قرآن شریف پر ہیں اور دو تہائی بلکہ تین چوتھائی ایسے ہیں جن کی زد احادیث نبویہ علی صاحبھا الصلاۃ والتحیۃ پر پڑتی ہے، کیوں کہ قرآن مجید پر اعتراض کرنے والے صرف غیر مسلم لوگ ہیں اور احادیث نبویہ پر اعتراض کرنے والے علاوہ غیر مسلموں کے وہ لوگ بھی ہیں جو کلمہ اسلام کے قائل ہیں اور ان کے حق میں خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان الہام ترجمان سے الفاظ ''هُمْ مِنْ جِلْدَتِنَا

وَمِنْ أَنْفُسِنَا‘‘[1]، نکلے ہوئے ہیں، یعنی امت مسلمہ کہلانے والے بھی احادیث پر معترض ہوتے ہیں۔

پھر لطف یہ ہے کہ خاص کر وہ اصحاب زیادہ سختی سے معترض ہوتے ہیں جو جماعت اہل حدیث کی گود میں پلے ہوئے ہیں، جن کو اس نسبت کی وجہ سے علم حدیث سے پوری واقفیت ہونی چاہیے تھی، مگر ان کے بیدردانہ اعتراضات سے معلوم ہوتا ہے کہ نیاز بریلوی کا یہ مصرع (شاید) ان پر صادق آ گیا ہے: ع

جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے اک دم میں سارا بھلا دیا

اعیان اہل حدیث توجہ فرمائیں:

حضرات! جس طرح پہلی صدی میں عقائد اسلامیہ پر حملات کو روکنے کے لیے علم کلام تجویز ہوا تھا، وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا یا ناکام رہا، اس جگہ یہ بحث قابل ذکر نہیں، ہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ آپ معترضین کے اعتراضات کو معلوم کر کے اپنی اذہان عالیہ میں غور کریں کہ ایسے معترضین کے مقابلے میں کیا شروح حدیث (فتح الباری، عینی وغیرہ) کی توجیہات اور تطبیقات کام دے سکتی ہیں؟ جہاں جہاں کام دیں وہاں ان کو مقدم رکھیں، جہاں معترضین ان شروح پر مزید اعتراض پیدا کریں وہاں اپنی خداداد قابلیت سے کام لے کر معترضین کی تسلی و تشفی کرنا مناسب ہے یا خود سکوت اختیار کر کے ان کو دلیر کرنا احسن ہے، علماء حدیث (حنفی ہوں یا اہل حدیث) کی خدمت میں یہ سوال بغرض غور و فکر پیش کیا گیا ہے۔

---

[1] یہ حدیث اس الفاظ سے تو نہیں البتہ: ’’هُمْ مِنْ جِلْدَتِنَا وَمِنْ أَنْفُسِنَا وَيَتَكَلَّمُوْنَ بِأَلْسِنَتِنَا‘‘ جو خوارج کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہے کئی علماء حدیث نے روایت کیا ہے، ممکن ہے کہ مؤلف رحمہ اللہ نے اسی کا مفہوم یہاں ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہو۔

میرے دل کو دیکھ کر میری وفا کو دیکھ کر
بندہ پرور! منصفی کرنا خدا کو دیکھ کر

تمثیل: زمانۂ سلف میں احادیث نبویہ پر جس نوع کی بحثیں اور سوالات ہوتے، شراح حدیث اسی نوع کے جوابات دیتے تھے "تَقَبَّلَ اللّٰهُ مَسَاعِيَهُمْ" ان کی اور آج کل کی مباحث کی مثال یہ ہے کہ گذشتہ زمانے میں باتباع فلسفہ یونان فلکیات پر اس طرح بحث ہوتی تھی: "الفَلَکُ يَقْبَلُ الْخَرْقَ وَالالْتِيَامَ أمْ لَا؟"، یعنی آسمان چرتا پھٹتا ہے یا نہیں؟ اس سوال پر فریقین نے خوب خوب طبع آزمائیاں کیں، لیکن حال کے سائنس داں کہتے ہیں "الفَلَکُ لَيْسَ بِشَيءٍ" یعنی آسمان کوئی چیز نہیں، اب غور کیجیے کہ سابقہ مباحث اور دلائل آج کل کے منکروں کے سامنے کتنی کوڑی قیمت پائیں گے؟

تمثیل (۲): ہم نے جو عرض کیا ہے کہ بعض معترضین علمائے اہل حدیث سے صحبت یافتہ اور مستفیض ہیں۔ آج ہم جس بزرگ سے مخاطب ہوتے ہیں وہ اس کی مثال کافی ہیں، آپ اکابر علمائے اہل حدیث مثل مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم سے صحبت یافتہ ہیں، آپ کا نام نامی پنڈت [1] محب الحق (حافظ) ساکن عظیم آباد پٹنہ ہے، موصوف نے عرصہ ہوا ایک کتاب "شرعۃ الحق" تردید حدیث میں لکھی تھی جو بڑی ضخیم کتاب ہے اور (۳۹۶) صفحات پر ختم ہوئی ہے۔

---

① "پنڈت" کا لفظ ہندوؤں کے مذہبی علماء کے لئے ہے، مگر حافظ محب الحق صاحب نے علماء اسلام کے حق میں کئی جگہ پنڈت لکھا ہے، ملاحظہ ہو آپ فرماتے ہیں: ۔تم نے سمجھا کہ قرآن مسلمان پنڈتوں کے علاوہ کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ (ص: ۵۰، وغیرہ)۔

بادل ناخواستہ ہم نے یہ لفظ (پنڈت) حافظ محب الحق صاحب کے حق میں لکھا ہے تا کہ وہ استاد صائب مرحوم کی نصیحت یاد رکھیں، جو یہ ہے ؎

دہن خویش بدشنام میالا صائب کایں زرِ قلب بہر کس کہ دہی باز دہد (مؤلف)

ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ اتنی ضخیم کتاب میں جو کچھ مصنف نے لکھا ہوگا وہ ان کا مافی الضمیر ظاہر کرنے کو کوفی ہوگا، اس کتاب کا جواب اخبار اہلحدیث میں بعنوان ''حکمۃ الحق'' طلقاً طلقاً (تھوڑا تھوڑا) مکمل دیا گیا۔

اس سلسلہ میں ابتداء ۲۸/مارچ ۳۰ء کو ہوئی اور انتہا ۲۶/دسمبر ۳۰ء کے پرچے میں۔ اس کتاب کے بعد مصنف موصوف نے اسی موضوع (انکار حدیث) پر ایک اور کتاب لکھی ہے جس کا نام ((بلاغ الحق)) رکھا ہے، جس کو دیکھ کر بے ساختہ ہمارے منہ سے یہ مصرع نکل گیا۔ ع

پھر دوبارہ عشق کا دل میں اثر پیدا ہوا

ناممکن ہے کہ حدیث پر حملہ ہوا اور دفتر اہل حدیث خاموش بیٹھا رہے۔ کیوں ؎

بلائیں زلف جاناں کی
اگر لیں گے تو ہم لیں گے

آج ہمارا روئے سخن اسی کتاب ((بلاغ الحق)) کی طرف ہے، اس کے بعد ہم اس مضمون پر بھی نظر ڈالیں گے جو رسالہ ترجمان القرآن حیدر آباد دکن بابت ماہ صفر ۵۶ھ میں شخصیت پرستی کے عنوان سے چھپا ہے۔ إن شاء الله بحوله وقوته۔

مصنف بلاغ الحق نے شروع کتاب میں ہمارے سابق جواب کا ذکر کرتے ہوئے ہماری شکایت بہت مکروہ الفاظ میں کی ہے۔ جو یہ ہیں:

''ذرا علم وتعصب کا کرشمہ ملاحظہ ہو۔ پنجاب کے ایک مولانا جو اپنی جماعت میں مقتدر بھی ہیں۔ ''شرعۃ الحق'' پر اعتراض کرنے، اس کا جواب دینے اور اس کے باطل کرنے کو ڈنکے کی چوٹ کھڑے ہوئے، ان کو اختلاف تھا تو اس میں کوئی مضائقہ نہ تھا، اختلاف تو فطرت میں ہے، یہ دنیا تو نیرنگ اختلاف وتضاد ہی کی جلوہ گاہ ہے، جب تو قرآن مجید کی کوئی آیت بھی اختلاف آراء سے

نہ بچی، امام رازی کی تفسیر بین شہادت موجود ہے، مگر (شرعۃ الحق) میں پندرہ دفعات ہیں جو قرآن مجید ہی سے حل کیے گئے ہیں تو ان دفعات کو یا کسی ایک دفعہ کو بھی قرآن مجید ہی کی آیتوں سے باطل کرنا تھا کیوں کہ قرآن کے مقابلہ کے لئے کوئی اور ہستی نہیں کھڑی کی جا سکتی، یہ تو کیا نہیں، اور کسی ایک نمبر کو بھی باطل نہ کر سکے۔ کیا تو یہی کہ بہت کچھ میری کتاب کی عبارت نقل کی گئی، نہ معلوم میرا مقصد پورا کرنے کے لیے تبلیغاً یا اعتراضاً، مگر بعض بعض جملوں پر آوازے کسے گئے، بعض بعض جملوں کا جواب دیا گیا، جواب کیا ذاتیات پر حملے کئے گئے، فرقہ پرستی کے جوش میں برا بھلا کہا گیا کہ مقتدیوں کے خیالات سکون میں رہیں ۔

دوستو! یہ جواب نہیں یہ تردید نہیں، جواب اور چیز ہے اور دل کے پھپھولے توڑنا اور بات ہے، مگر اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا، قرآن کا بطلان تو کفر کا خریدنا تھا'' (بلاغ الحق، ص:۶-۵)۔

اہلحدیث:

ہم اس کے جواب میں زبانی عرض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے اور نہ ایسا زبانی جواب دینا جائز ہے، بلکہ اخبار اہلحدیث کے پرچہ ہائے متضمنہ جوابات کی تواریخ بتا دیتے ہیں غور سے پڑھیے آپ کی پندرہ دفعات کے جوابات مندرجہ ذیل تواریخ کے پرچوں میں درج ہیں، کل پرچے آپ کو پہنچے ہوئے ہیں، کھول کر پڑھ لیں:

نمبر سوال	شرعۃ الحق کے صفحہ	تواریخ اہل حدیث متضمن جوابات
۱	۷۴_۸۱	۲۷/جون ۳۰ سنہ ء، ص:۱۱
۲	۸۱_۹۳	۲۵/اپریل ۳۰ سنہ ء، ۲۷/جون ۳۰ سنہ ء۔
۳	۹۵ تا ۹۹	۲۳/مئی ۳۰ سنہ ء، ص:۱۱
۴	۱۱۱ تا ۱۱۴	۲۵/اپریل ۳۰ سنہ ء، ص:۱۱، ۲۷/جون ۳۰ سنہ ء
۵	۱۱۴ تا ۱۱۶	۲۷/جون ۳۰ سنہ ء، ص:۱۱

٦	۱۱٦ تا ۱۲۸	۲۵/اپریل ۰۳ء، ص۱۱، ۲/مئی ص:۱۱، ۲۷/جون ۰۳ء
۷	۱۲۸ تا ۱۳۲	۲۵/اپریل ۰۳ء، ۲۳/مئی ۰۳ء، ۲۷/جون ۰۳ء، ص:۱۱
۸	۱۳۲ تا ۱۳۷	۲۷/جون ۰۳ء، ص:۱۱
۹	۱۳۷ تا ۱۵۷	٦/جولائی ۰۳ء، ص:۱۱، ۲۹/اگست ۰۳ء، ص:۱۲
۱۰	۱۵۷ تا ۱٦۴	۵/ستمبر ۰۳ء تا ۲٦/ستمبر ۰۳ء، ص:۱۲
۱۱	۱٦۹ تا ۱۷۲	۳/اکتوبر ۰۳ء، ص:۱۲
۱۲	۱۷۲ تا ۱۷۸	۳/اکتوبر ۰۳ء، ص:۱۲
۱۳	۱۷۸ تا ۱۸۹	۱۰/اکتوبر ۰۳ء، ص:۱۲
۱۴	۱۸۹ تا ۱۹۷	۱۷و۲۴/اکتوبر ۰۳ء، ص:۱۲
۱۵	۱۹۷ تا ۲۰۰	۷/نومبر ۰۳ء، ص:۱۲

ان جوابات کے متعلق حافظ محب الحق صاحب اگر یہ لکھتے کہ جوابات غیر کافی یا ناقص ہیں تو ہم ان کو بحیثیت فریق مخالف معذور سمجھتے، مگر انہوں نے جوابات سے مطلق انکار کر دیا اس لیے ہم ان کی بزرگی (پیر مردی) کا لحاظ کر کے ان کے انکار کو جھوٹ کی قبیح صفت سے موصوف نہیں کرتے، ہاں حدیث نبوی کے ماتحت سمجھتے ہیں، جو حدیث یہ ہے۔ ''نَسِيَ آدمُ، فنَسِيَتْ ذُرِّيَّتُه''[1] آدم بھولا تو اس کی اولاد بھی بھولی۔

حافظ صاحب!

حدیث کے منکر ہو کر بھی حدیث کے ماتحت عمل کرنا اسی کو کہتے ہیں۔

منکرِ مے بودن وہم رنگِ مستاں زیستن

① سنن ترمذی: ابواب التفسیر، باب ومن سورۃ الاعراف، حدیث: ۳۰۷٦، مسند ابویعلی: (۱۲/۸)، حدیث: ٦٦۵۴، اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

قسط:۲

تصدیق الحدیث

''بیان الحق بجواب بلاغ الحق''

(۱۹/ جمادی الثانی ۱۳۵۶ھ = ۲۷/اگست ۱۹۳۷ء)

گذشتہ پرچہ میں اس سلسلہ کی ابتداء اور وجہ اجراء درج ہو چکی ہے، آج اس سے آگے پڑھیں۔

ناظرین کرام!

یہ کتاب (بلاغ الحق) دراصل کتاب ''شرعۃ الحق'' کا مجمل بیان ہے، ہاں اس میں زیادتی ہے تو یہ ہے کہ مصنف موصوف کا لب ولہجہ تیزی میں اتنی ترقی کر گیا جتنی کہ حجاز کے سالن کی نسبت دہلی کی جامع مسجد کے کباب، بات بات پر علمائے حدیث کو کوستے ہیں، حدیث کے ماننے والوں پر بے طرح الزام لگاتے ہیں، جو بات ان کے خیالات میں نہیں بلکہ جس بات کو وہ کفر سمجھتے ہیں، حافظ صاحب اسے بھی ان پر چسپاں کرتے ہیں، اس امر میں ہم نے بامعان نظر غور کیا تو حافظ محب الحق صاحب کو مولوی احمد رضا خان مرحوم بریلوی کے مانند پایا، مثال کے طور پر چند فقرات آپ کی شیریں کلامی کے درج ذیل ہیں:

(۱) تم (قائلین حدیث) نے طبع آزمائیوں کے ہاتھوں قرآن مجید کو چاک چاک کر ڈالا۔ (ص:۵۴)

(۲) قوم (قائلین حدیث) اخبار پرست ہوگئی، خدا کی حکم عدولی ہو تو ہو مگر راویوں پر حرف نہ

آئے۔(ص:۶۹)

(۳)راویوں کی صحت کے لیے قرآن کے توڑ مروڑ کی ضرورت پیش آئی۔(ص:۶۲)

(۴) قوم (قائلین حدیث) نے روایتوں کی بدولت رسول کو منافق بنایا، خدا کو متشتت کلام کرنے والا، جھوٹا الزام لگانے والا۔(ص:۶۳)

(۵)علماء نے کوششیں بہت کیں مگر الشیخ والشیخۃ کی تحریف قرآن میں داخل نہ ہوسکی۔(ص:۶۶)

(۶) قوم قرآن کے حلال کو حرام کرنے کی مجاز ہوگی، سونا اور ریشم مردوں کے لیے حرام کیا۔ (ص:۶۹)

(۷)علماء کے اختلاف نے قرآنی شریعت کو تباہ کیا اور ماسوا کو شریک شریعت بنایا۔(ص:۶۹)

(۸)فرقہ پرست لوگ فرقہ پرستی میں اندھے اور بہرے ہیں۔(ص:۷۰)

(۹)تم نے اپنی الٹی سمجھ سے سمجھا تو یہ سمجھا کہ قرآن مبین نہیں ہے بلکہ نہایت ادق اور معمہ ہے کہ مسلمان پنڈتوں کے سوا کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔(ص:۵۰، بلاغ الحق)۔

یہ ہے حافظ صاحب کی شیریں کلامی کا نمونہ، جو قرآن مجید کی پاک تعلیم مزید: ﴿وَقُل لِّعِبَادِي يَقُولُواْ ٱلَّتِي هِيَ أَحۡسَنُ﴾ [الاسراء:۵۳] کے خلاف ہے، ہمیں اس سے کچھ مزید تعرض نہیں بقول: كُلُّ إناءٍ يَتَرَشَّحُ بِما فِيهِ۔

حافظ صاحب کے دل میں جو تھا انھوں نے ظاہر کر دیا اچھا کیا فرمان خداوندی: ﴿قَدۡ بَدَتِ ٱلۡبَغۡضَآءُ مِنۡ أَفۡوَٰهِهِمۡ وَمَا تُخۡفِي صُدُورُهُمۡ أَكۡبَرُ﴾ [آل عمران:۱۱۸] کی صداقت ظاہر ہوگئی۔

جرأت:

حافظ محب الحق صاحب نے کتاب ''بلاغ الحق'' میں کمال جرأت سے کام لیا ہے، جماعت اہل حدیث کے تین چیدہ علماء کی شہادت بتائید ''شرعۃ الحق'' لکھی ہے۔

(۱) مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری۔

(۲) مولانا شاہ عین الحق پھلواروی۔

(۳) مولانا سید عبدالحی ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

ان تینوں کی شہادت متفقہ یہ بتائی ہے کہ کتاب ''شرعۃ الحق'' کے مضامین صحیح ہیں۔

میں اس پر اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتا، کتاب ''شرعۃ الحق'' کی روح اور اس کا موضوع انکار حجیت حدیث نبوی ہے، اسی موضوع پر مصنف موصوف نے تین سو چھیانویں صفحات لکھے ہیں، جن کے جوابات ۱۹۳۰ء کے اہل حدیث میں دیئے گئے، جو مضیٰ ما مضیٰ۔ ناظرین کے استحضار کے لیے ''شرعۃ الحق'' سے اس کا موضوع مندرجہ ذیل فقرہ میں ہم دکھاتے ہیں جو یہ ہے:

''حدیث کی کتابیں داخل فی الدین نہیں''۔ (شرعۃ الحق ص:۱۹۱)

اسی مضمون کی تائید (ص:۱۹۶) ''شرعۃ الحق'' میں بھی ہے۔

استفسار:

تینوں حضرات رحمہم اللہ آج ہم سے جدا ہیں اس لیے ہم ان سے تو دریافت نہیں کر سکتے، البتہ ان کے متعلقین اقرباء، تلامذہ، اور مخلصین سے پوچھتے ہیں خواہ وہ لکھنؤ میں ہوں یا غازی پور میں، چھپرے میں ہوں یا کلکتہ میں، مظفر پور میں ہوں یا دربھنگہ میں، پٹنہ میں ہوں یا آرہ میں، وہ للہ شہادت حقہ ادا کریں کہ کیا مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری مع دونوں حضرات کے حدیث نبوی کو داخل فی الدین نہیں سمجھتے تھے، شہادت پہنچنے کے بعد حافظ محب الحق کی اس جرأت پر ہم یہ عرض کریں گے ؎

بروز حشر گر پرسند خسرو را چرا کشتی

چہ خواہی گفت قربانت شوم تا من ہماں گویم

مجمل جواب:

حافظ محب الحق صاحب کی تصنیفات عموماً اور ''بلاغ الحق'' خصوصاً حشو وزوائد اور بیکار طوالت اور فضول تکرار کے وصف میں اس شعر کی مصداق ہیں ؎

ملے تو حشر میں لے لوں زباں ناصح (حافظ) کی
عجیب چیز ہے یہ طول مدعا کے لیے

اس لیے ہم مفصل جواب سے پہلے مجمل جواب دے کر اپنے فرض کا بڑا حصہ ادا کردیتے ہیں۔

ناظرین عموماً، حافظ صاحب خصوصاً توجہ سے سنیں!

محدثین کرام علیہم الرضوان کی مساعی جمیلہ احادیث جمع کرنے میں ایسی معقول اور مقبول ہیں جس کا اظہار مولانا حالی مرحوم نے اپنی مسدس میں یوں فرمایا:۔

گروہ ایک جویا تھا علم نبی کا — لگایا پتہ جس نے ہر مفتری کا
نہ چھوڑا کوئی رخنہ کذب خفی کا — کیا قافیہ تنگ ہر مدعی کا
کئے جرح وتعدیل کے وضع قانون — نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسوں
کیا فاش راوی میں جو عیب پایا — مناقب کو چھانا مثالب کو تایا
مشائخ میں جو قبح نکلا جتایا — ائمہ میں جو داغ دیکھا بتایا
طلسم ورع ہر مقدس کا توڑا — نہ ملا کو چھوڑا نہ صوفی کو چھوڑا

یہ اشعار مدحیہ محض خوش اعتقادی پر مبنی نہیں بلکہ واقعات صحیحہ پر مبنی ہیں، اس لیے حافظ محب الحق صاحب بھی مندرجہ ذیل رائے ظاہر کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

کتاب ''بلاغ الحق'' میں حدیث اور کتب حدیث کو علم تاریخ اور کتب تاریخ سے زیادہ صحیح مان کر آپ فرماتے ہیں:

حدیث کو قرآن سے نہ ٹکراؤ بہ ایں نگہداشت

حدیث سے جو فوائد تم حاصل کر سکتے ہو کرو

کون منع کرتا ہے:

مثلاً تاریخی حیثیت سے بہت سے مصطلحات قرآنی حدیث سے معلوم ہوتے ہیں جیسے لغات و مصطلحات سے، تو یہ ہم جاہلوں کے لیے جو عرب نہیں، عربی زبان کے محتاج ہیں، نعمت عظمی ہیں، دوسرے اس زمانہ کے تمدن پر روشنی پڑتی ہے، بہتیرے واقعات تاریخی حیثیت سے بہ نسبت عام تاریخوں کے بہ ظن غالب زیادہ قریب بہ صحت ہیں'' (بلاغ الحق، ص: ۳۷)۔

اہلحدیث:

بہت خوب، مطلب آپ کا یہ ہے کہ کتب حدیث واقعات زمانہ نبوی کے بتانے کے لیے کتب تاریخ (ابن خلدون اور ابن اثیر وغیرہ) سے زیادہ معتبر ہیں، پس ہم زیادہ نہیں ایک ہی حدیث زمانہ رسالت کی پیش کرتے ہیں، جس کے الفاظ یہ ہیں:

''عن أبي هريرةَ وزيدِ ابن خالدٍ: أنَّ رَجُلَيْنِ اخْتَصَما إلى رَسولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عليه وسلَّمَ، فَقالَ أحَدُهُمَا: اقْضِ بيْنَنَا بكِتَابِ اللَّهِ، وقالَ الآخَرُ: أجَلْ يا رَسولَ اللَّهِ، فَاقْضِ بيْنَنَا بكِتَابِ اللَّهِ، وأْذَنْ لي أنْ أتكَلَّمَ، قالَ: تَكَلَّمْ، قالَ: إنَّ ابْنِي كانَ عَسِيفًا علَى هذا، فَزَنَى بامْرَأَتِهِ، فأخْبَرُوني أنَّ علَى ابْنِي الرَّجْمَ، فَافْتَدَيْتُ منه بمِائَةِ شَاةٍ وجَارِيَةٍ لِي، ثُمَّ إنِّي سَأَلْتُ أهْلَ العِلْمِ، فأخْبَرُوني أنَّ علَى ابْنِي جَلْدُ مِائَةٍ وتَغْرِيبُ عَامٍ، وإنَّما الرَّجْمُ علَى امْرَأَتِهِ، فَقالَ رَسولُ اللَّهِ ﷺ: أمَا والَّذي نَفْسِي بيَدِهِ، لَأَقْضِيَنَّ بيْنَكُما بكِتَابِ اللَّهِ، أمَّا غَنَمُكَ وجَارِيَتُكَ فَرَدٌّ عَلَيْكَ، وأمّا ابنُک فَعَلَيهِ

جَلَدُ مِائَةٍ وتَغرِيبُ عَامٍ، وأَمّا أَنْتَ يا أُنَيْسُ، فاغْدُ على امْرَأَةِ هذا، فَإِنِ اعْتَرَفَتْ فارْجُمْها، فَاعْتَرَفَتْ فَرَجَمَهَا." (متفق علیہ) (مشکاۃ، کتاب الحدود، ص:۳۰۹)[1]۔

ترجمہ:

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور زید بن خالد سے روایت ہے کہ دو آدمی مقدمہ لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان میں سے ایک نے عرض کیا حضور ہم میں کتاب اللہ کے ساتھ فیصلہ فرمایئے، دوسرے نے بھی کہا ہاں حضور ہم میں کتاب اللہ کے ساتھ فیصلہ فرمایئے۔ اور مجھے عرض کرنے کی اجازت دیجیے، فرمایا بول، اس نے کہا: میرا بیٹا اس کے ہاں مزدور تھا اس نے اس کی بیوی کے ساتھ بدکاری کی، لوگوں نے مجھے بتایا میرے بیٹے پر رجم (سنگ ساری) کی سزا ہے میں نے اس کی طرف سے سو بکری اور ایک لونڈی فدیہ میں دی، پھر میں نے اہل علم سے پوچھا انہوں نے مجھے بتایا میرے بیٹے پر سو دروں کی سزا اور سال بھر کی جلاوطنی ہے، کیوں کہ وہ کنوارا ہے، رجم کی سزا اس کی عورت پر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خدا کی قسم میں تم میں کتاب اللہ کے ساتھ فیصلہ کرتا ہوں، تیری سو بکریاں اور لونڈی تجھ پر واپس کرتا ہوں، یعنی فدیہ قبول نہیں، ہاں تیرے بیٹے پر سو بید کی سزا ہے اور سال بھر کی جلاوطنی ہے، اپنے خاص خادم (انس رضی اللہ عنہ) کو فرمایا اے انس! تو اس کی بیوی کے پاس جا (کیوں کہ وہ وہاں حاضر نہ تھی) اگر وہ اس بدکاری کا اعتراف کرلے تو اسے سنگ سار

---

① (۱۰۵۶/۲)، حدیث: ۳۵۵۵، اور دیکھیں: (صحیح بخاری): كتاب الايمان والنذور، باب كيف كانت يمين النبی ﷺ، حدیث: ۶۶۳۳۔۶۶۳۴، (صحیح مسلم): كتاب الحدود، باب من اعترف على نفسه بالزنى، حدیث: ۱۶۹۸۔۱۶۹۷۔

کرادے، پس اس عورت نے اعتراف کرلیا تو اسے سنگ سار کرادیا۔

حافظ صاحب!

یہ تاریخی واقعہ ہے جو بقول آپ کے صحیح ترین طریق سے ہم تک پہنچا ہے اس میں تین دفعہ کتاب اللہ کا لفظ آیا ہے، دونوں سائلوں نے کتاب اللہ کے ساتھ فیصلہ چاہا، اور خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ان کی درخواست کو حلف کے ساتھ قبول فرمایا ہے یعنی فرمایا کہ خدا کی قسم کہ میں کتاب اللہ کے ساتھ تم میں فیصلہ کروں گا، حالاں کہ کتاب اللہ (قرآن مجید) میں یہ سزا مذکور نہیں، پھر کیوں نہ فریقین مقدمہ نے یہ عرض کیا کہ عالی جاہ! یہ حکم کتاب اللہ میں نہیں ہے، بحالیکہ آپ کے ہم خیال دیگر منکرین حدیث کہتے ہیں کہ رسول کوئی حکم دے تو ہم اسے پوچھ سکتے ہیں یہ حکم کہاں ہے، مگر ان فریقین مقدمہ کو خاص کر مرجومہ کے خاوند کو یہ سوال کرنے کی جرأت نہ ہوئی، بلکہ بخوشی اس سزا کو برداشت کیا کیوں کہ ان کی مراد کتاب اللہ کے لفظ سے حکم اللہ تھی، یہی مراد آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تھی، پس آنحضرت کے حلفیہ وعدے کا ترجمہ یہ ہوا کہ میں تم میں حکم الٰہی کے ساتھ فیصلہ کروں گا، اس عمل نبوی سے ثابت ہوا کہ حکم الٰہی قرآن اور حدیث دونوں کو شامل ہے، حضرت عمر کا قول ''الرَّجْمَ فِي كِتَابِ اللّٰهِ حَقٌّ'' (بخاری ومسلم)[1] انہی معنی میں ہے بالفاظ دیگر کتاب اللہ قرآن ہی نہیں بلکہ حکم اللہ قرآن اور حدیث دونوں کو شامل ہے۔

---

[1] صحیح بخاری: كتاب المحاربين من اهل الكفر والردة، باب رجم الحبلى من الزنا اذا احصنت، حدیث: ۶۸۳۰، صحیح مسلم: كتاب الحدود، باب رجم الثيب فى الزنى۔ حدیث: ۱۶۹۱۔

قسط:۳

تصدیق الحدیث

''بیان الحق بجواب بلاغ الحق''

(۲۶/ جمادی الثانی ۱۳۵۶ھ = ۳/ستمبر ۱۹۳۷ء)

گذشتہ پرچہ میں مجمل جواب کے ضمن میں کتاب اللہ کے معنی حکم اللہ کے کئے گئے ہیں، جو قرآن وحدیث دونوں کو شامل ہیں، اس کے ساتھ ملا یئے۔

حافظ صاحب!

ہم نے جو عرض کیا ہے قرآن مجید میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے، بشرطیکہ قرآن مجید کو اخوان یوسف کے ہاتھوں میں نہ دیا جائے، پس توجہ سے سنیے۔ ارشاد ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥٓ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ ٱلْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾ [الاحزاب:۳۶]۔

ترجمہ: جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا حکم دے دیں تو کسی مؤمن مرد یا مومنہ عورت کو اس کام میں چوں و چرا کرنے کا اختیار نہیں۔

اس آیت کا مطلب صاف ہے کہ رسول کریم بحیثیت رسالت بھی حکم کر سکتے ہیں۔

حافظ صاحب!

حدیث مذکورہ جو آپ کی اصطلاح میں معتبر ترین تاریخ ہے، اس کا نتیجہ بحیثیت تاریخ ہی سہی یہ ہے کہ ہمارے سامنے دربار رسالت میں یہ واقعہ رونما ہوا ہے، اس دربار میں مَیں اور آپ دونوں موجود ہیں، حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما (جن کا قول

حسبنا کتاب اللہ، آپ اور آپ کی پارٹی پیش کیا کرتے ہیں) معہ دیگر صحابہ کرام کے موجود ہیں، مگر کوئی اف تک نہیں کرتا، اور بقول مولوی احمد الدین امرتسری کوئی بھی ذات رسالت سے یہ نہیں پوچھتا کہ حضور سائل کے سوال میں کتاب اللہ کا لفظ ہے اور حضور کے ارشاد میں بھی کتاب اللہ سے فیصلہ کرنے کا اقرار ہے، حضور فرماویں کہ یہ فیصلہ رجم کا کتاب اللہ میں کہاں ہے، معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام شرعی اصطلاحات آپ سے اور مجھ سے زیادہ جانتے تھے، اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ کتاب اللہ سے مراد حکم اللہ ہے جو قرآن اور حدیث دونوں کو شامل ہے، اس حدیثی (تاریخی) واقعہ کے بعد آپ کا بیان کیا وقعت رکھ سکتا ہے، جو درج ذیل ہے:

''خدا نے فرمایا: ﴿ٱلزَّانِيَةُ وَٱلزَّانِي فَٱجْلِدُوا۟ كُلَّ وَٰحِدٍ مِّنْهُمَا مِا۟ئَةَ جَلْدَةٍ﴾ [النور:۲] (زانیہ اور زانی کو سو سو درے مارو) خدا نے نہ محصن ومحصنہ کو مستثنیٰ کیا، نہ ان کے لیے کوئی خاص حکم الگ سے دیا، نہ کہیں سنگسار کا حکم دیا، سنگسار کا کوئی حکم کسی جرم کے لیے قرآن میں ہے نہیں، تم نے ظنیات سے قرآن مجید کی اصلاح کی اور اس کے کھوٹ کو دور کر کے سنگسار کا حکم اختراع کیا اور افسوس یہ کہ رسول کی طرف منسوب کر کے، حالاں کہ قرآن مجید کے خلاف آپ کا حکم دینا جس کی اتباع اور تبلیغ کے آپ مامور تھے محالات سے ہے، کیا آپ تبلیغ کچھ فرماتے تھے اور حکم اس کے خلاف دیتے تھے، سراسر آپ کے خلاف شان ہے، آپ کے سارے احکام دینی اور سارے اقوال وافعال دینی بلا کم وکاست قرآن مجید ہی تھے، حدود قرآنی کی توڑنے والی، یا بدلنے والی، یا کم وبیش کرنے والی حدیثیں حاشا رسول کی نہیں اور ہرگز مفسر قرآن نہیں، ان کو حدیث کی کتابوں سے خارج کر دو، رسول علیہ الصلاۃ والسلام قرآن کے اتباع اور قرآن سے حکم دینے کے مامور تھے، علی ہذا قوم بھی، اسی لیے قوم کو حکم ہوا: ﴿ٱتَّبِعُوا۟ مَآ أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا۟ مِن دُونِهِۦٓ أَوْلِيَآءَ﴾ [الاعراف:۳] ''قرآن مجید کا اتباع کرتے رہو اور کسی دوسرے رفیق کا

اتباع نہ کرنا''۔قرآن مجید کی خلاف ورزی ہے توبہ کرو اور اسلامی احکام کو اسلامی قانون سے خارج کردو، الا لہ الحکم (خبردار حکم خداہی کا)''(بلاغ الحق،ص:۵۶،۵۷)۔

اہلحدیث:

فرمایئے! یہ عذر جو آج آپ نے تراشا ہے اس وقت اس پاک جماعت میں سے بھی کسی نے پیش کیا تھا جس کی شان میں: ﴿وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ﴾ [الاعراف:۱۵۷] صریح ناطق ہے۔

اب آپ کے سامنے یہ دو راستے ہیں:

(۱) اس صحیح تاریخی واقعہ کا انکار کردیں جس کو صحیح ترین مان چکے ہیں۔

(۲) یا اپنے خیال اور عقیدے کو واپس لیں جس کو شائع کر چکے ہیں۔

ہمارا مشورہ:

ہمارا مشورہ اس بارے میں یہ ہے کہ جواب دینے اور راہ راست اختیار کرنے میں حافظ اسلم جیراجپوری سے بھی مشورہ کرلیں، جو اس امر میں آپ کے ہم خیال ہیں کہ حدیث ''صحیح تاریخ'' ہے تاکہ اس مصرع کی تصدیق ہوجائے: ع

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے فرزانے دو

جواب الجواب:

ہم نے آیت: ﴿إِذَا قَضَى اللَّهُ﴾ الآیہ، جو اوپر لکھی ہے اور حافظ محب الحق صاحب نے اس کے متعلق جو کچھ تحریر کیا ہے مناسب ہے کہ ناظرین کے سامنے اسے پیش کر کے دکھایا جائے کہ جماعت منکرۂ حدیث قرآن مجید کو کہاں تک اپنی رائے کے تابع کرتی ہے، حافظ صاحب لکھتے ہیں:

''جب اس آیت: ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ﴾ [الحشر:۷] نے بھی پناہ نہ

دی تو یہ آیت پیش کی گئی: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥٓ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ ٱلْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾ [الاحزاب:۳۶] (مومن اور مومنہ کے لیے یہ جائز نہیں کہ جب خدا اور رسول کسی امر میں فیصلہ کر دیں تو ان کو اپنے کام میں اختیار باقی رہے) ﴿إِذَا قَضَى ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥٓ﴾۔ پورا جملہ قابل توجہ ہے، قضی کا لفظ بتا رہا ہے کہ یہ حکم فیصلۂ خصومات کے متعلق ہے۔ دوسرے جس کا خدا اور رسول دونوں نے فیصلہ کیا ہو اور وہ فیصلہ قرآن کا ہے، آپ قرآن سے فیصلہ دینے کے مامور تھے: ﴿فَٱحْكُم بَيْنَهُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ﴾ [المائدۃ:۴۸] (قرآن سے حکم دیا کرو) اس لیے آپ قرآن سے حکم دیتے تھے، یہی قرآن کا حکم خدا کا بھیجا ہوا، رسول کا دیا ہوا، یہی فرض، یہی سنت، اسی کی اطاعت دونوں کی اطاعت ہے، یہی کتاب اللہ، یہی کامل اتباع کے سبب سنت رسول اللہ ہے، اس سے قرآن کی فرضیت ثابت ہوتی ہے، حدیث کا وحی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ قرآن کے فیصلہ کے بعد مسلمانوں کو اختیار اپنے کام میں باقی نہیں رہا، چاہے اس کو وہ کسی روایت سے اٹھاویں'' (بلاغ الحق، ص:۲۱)۔

اہلحدیث:

اول تو ''قضی'' کے لفظ کو فیصلۂ خصومات کے ساتھ سمجھنا غلطی ہے، ملاحظہ ہو آیت: ﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوٓا۟ إِلَّآ إِيَّاهُ﴾ [الاسرا:۲۳] فرمایئے! جتنے احکام اس قضی کے نیچے ہیں کیا وہ از قسم خصومات ہیں؟ ہرگز نہیں، بلکہ قضی کے معنی امر کے ہیں۔

دوم: آپ کا یہ قول کہ خدا اور رسول دونوں نے فیصلہ کیا ہو، جس کی تفصیل آپ نے یہ کی ہے کہ خدا کے اتارے ہوئے قرآن کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ کرنا یہی مراد ہے، یہ معنی دوسری آیت قرآنیہ کے خلاف ہیں، جس کے الفاظ بڑے خوفناک عذاب سے ڈراتے ہیں، آپ کو بھی اور مجھ کو بھی ڈرنا چاہیے، وہ آیت یہ ہے: ﴿فَلْيَحْذَرِ ٱلَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِۦٓ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ [النور:۶۳]۔

حافظ صاحب! آپ میرے سامنے ہوتے تو میں آپ سے اس آیت کا ترجمہ کرواتا ہوا صرف یہ پوچھتا کہ عن امرہ میں ضمیر (ہ) کدھر راجع ہے، ذرا سوچ کر جواب دیجیے، ترجمہ آیت کا یہ ہے:

جو لوگ اس (رسول) کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں ان کو ڈرنا چاہیے کہیں ان کو عذاب الیم نہ پہنچ جائے۔

حافظ صاحب!

میں اس سے بھی زیادہ خوفناک آیت پیش کرتا ہوں، واللہ آپ کی اور اپنی اور دیگر ابناء جنس کی کمزوری کا خیال کر کے بہت ہی ڈر لگتا ہے، مگر میں خود دیکھنا اور پبلک کو دکھانا چاہتا ہوں کہ برادران یوسف قرآن مجید کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے ہیں، ارشاد ہے: ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْاْ إِلَىٰ مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ وَإِلَى ٱلرَّسُولِ رَأَيْتَ ٱلْمُنَٰفِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا﴾ [النساء:٦١]۔

"جب ان کو کہا جاتا کہ آؤ اس کلام کی طرف جو خدا نے اتارا ہے اور آؤ رسول کی طرف تو منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ تم سے منہ پھیر جاتے ہیں"۔

بتائیے! اس آیت میں کلام اللہ اور رسول اللہ کی طرف بلانے کا جو ذکر ہے اس کا اجرا آج تک بھی ہے یا ختم ہو گیا، اگر ختم ہے تو قرآن کی آیت ہمارے حق میں بے کار اور اگر جاری ہے تو رسول کون ہے؟

(جلدی میں قادیان کا نام نہ لے لیجیے گا)۔

تتمہ:

اس مجمل جواب کے ماتحت ایک اور بات ذکر کرنے کا خیال آ گیا جو حلال حرام کے متعلق ہے، آپ نے (ص:١٤٨) پر حلال حرام کی بحث چھیڑی ہے اور جی کھول کر

لکھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حلال حرام کرنے والا خدا ہے جو بذریعہ قرآن مجید بتا چکا ہے، اس سے نہ کسی کو انکار ہے، نہ اس پر بحث ہے، نہ تکرار۔ سوال زیر بحث صرف یہ ہے کہ رسول بحیثیت رسالت کسی چیز کو حرام کرسکتا ہے یا نہیں، میں یہ عرض کردوں اور آپ کا حق ہے کہ کسی منطقی عالم سے بھی پوچھ لیں کہ میرا دعوی مشروط عامہ کا ہے، ضرور یہ مطلقہ کا نہیں، ایسا نہ ہو کہ آگے چل کر کسی موقع پر آپ میرے مقابلہ میں ضرور یہ مطلقہ پیش کردیں۔

پس سنیے! رسول کی شان میں بحیثیت رسالت یہ الفاظ وارد ہیں: ﴿وَيُحِلُّ لَهُمُ ٱلطَّيِّبَٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيۡهِمُ ٱلۡخَبَٰٓئِثَ﴾ [الاعراف:۱۵۷]۔

حافظ صاحب!

مہربانی کر کے قرآن شریف کو برادران یوسف کے ہاتھ میں نہ دیتے ہوئے آیت کا ترجمہ کیجیے، پھر بتائیے کہ ''یحل اور یحرم'' کی ضمیر کدھر پھرتی ہے اور اس کا فاعل کون ہے، جلدی کرنے کی ضرورت نہیں، آپ اور آپ کے دوست جیراجپوری تو حافظ ہی ہیں، آپ کے لیے نہیں ناظرین کے لیے میں ساری آیت نقل کئے دیتا ہوں۔

﴿ٱلَّذِينَ يَتَّبِعُونَ ٱلرَّسُولَ ٱلنَّبِيَّ ٱلۡأُمِّيَّ ٱلَّذِي يَجِدُونَهُۥ مَكۡتُوبًا عِندَهُمۡ فِي ٱلتَّوۡرَىٰةِ وَٱلۡإِنجِيلِ يَأۡمُرُهُم بِٱلۡمَعۡرُوفِ وَيَنۡهَىٰهُمۡ عَنِ ٱلۡمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ ٱلطَّيِّبَٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيۡهِمُ ٱلۡخَبَٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنۡهُمۡ إِصۡرَهُمۡ وَٱلۡأَغۡلَٰلَ ٱلَّتِي كَانَتۡ عَلَيۡهِمۡ﴾ (الآیہ) [الاعراف:۱۵۷]۔

مہربانی کر کے اس آیت کا لفظی ترجمہ کردیں، مگر اپنے سنہری اصول کو ملحوظ رکھ کر کہ قرآن مجید مفصل ومبین ہے، کہیں مولوی چکڑالوی کی طرح یعنی دریعنی نہ لگا دیں۔

ہم لفظی ترجمہ لکھ دیتے ہیں اور اجازت دیتے ہیں کہ اس میں سے ایک حرف بھی

غلط ہوتو اس پر لکیر کھینچ کر ہمیں اطلاع دیں، ہم آپ کے مشکور ہوں گے، ارشاد ہے:

''رحمت کے حقدار وہ لوگ ہیں جو رسول نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جس کو اپنے نزدیک تورات، انجیل میں لکھا پاتے ہیں وہ ان کو نیک کاموں کا حکم دیتا ہے اور برے کاموں سے روکتا ہے اور پاک چیزیں ان کے لیے حلال کرتا ہے اور پلید چیزیں حرام کرتا ہے اور ان سے بوجھ اور گلے کے طوق دور کرتا ہے''۔

قسط:۴

تصدیق الحدیث

''بیان الحق بجواب بلاغ الحق''

(۴/رجب ۱۳۵۶ھ = ۱۰/ستمبر ۱۹۳۷ء)

گذشتہ ہفتے چند آیات پیش کر کے ثابت کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بحیثیت رسول قرآن مجید کے علاوہ بھی دینی حکم دینے کے مجاز تھے، آج ناظرین آگے پڑھیں، نیز گذشتہ تمہیدی نوٹ میں فقرہ۔

''جوقرآن وحدیث والوں کو شامل ہیں''۔

کے بجائے جوقرآن وحدیث دونوں کو شامل ہیں، پڑھنا چاہیے (مدیر)

اخوان یوسف:

ہم علی وجہ البصیرت کہتے ہیں جس کا ثبوت ہمارے پاس قطعی ہے کہ منکرین حدیث

کی جماعتیں چاہے کہیں کی ہوں قرآن مجید کے ساتھ اخوان یوسف کا سا برتاؤ کرتی ہیں، یہ بات بھی ہم اپنے خیال میں سچ کہتے ہیں (گو ہمارے احباب میں سے کوئی صاحب ہمارے اس خیال کے مخالف ہوں) کہ منکرین کے حدیث نبوی کے انکار پر ہمیں اتنا رنج نہیں ہوتا جتنا ان کی تفاسیر قرآنیہ پر رنج ہوتا ہے کیوں کہ وہ ہمارے نزدیک تحریفات کے درجے تک پہنچی ہوئی ہیں، حافظ محب الحق صاحب جب امرتسر منکرین حدیث کے جلسہ پر آئے تھے تو عندالملاقات میں نے ان سے کہا تھا کہ ان لوگوں نے اپنی ایک آنکھ (حدیث) بالکل بند کر لی ہے، دوسری آنکھ میں لوہے کی سلائیاں پھیر رہے ہیں، یعنی حدیث کا بالکل انکار کر چکے ہیں اور قرآن کو اپنی آراء کے تابع بنا رہے ہیں، جس کا ذکر مولانا حالی کے اشعار میں ہے ؎

سدا اہل تحقیق کے دل میں بل ہے — حدیثوں پہ چلنے میں دیں کا خلل ہے
ہر ایک رائے قرآں کا نعم البدل ہے — فتاووں پہ بالکل مدار عمل ہے
قرآن اور سنت کا ہے نام باقی — خدا اور نبی سے نہیں کام باقی

آج ہم اس کی مثال حافظ محب الحق کی اسی کتاب سے دکھاتے ہیں کہ باوجود حافظ قرآن و محقق زماں اور اہل قرآن ہونے کے قرآن مجید کی تفسیر بلکہ ترجمہ کرتے ہوئے بھی ان کا قلم لغزشیں کرتا ہے، مثلا آیت مبارکہ: ﴿قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ ۖ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا ۖ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۖ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُم مِّنْ إِمْلَاقٍ ۖ نَّحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ۖ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۖ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾ [الانعام:۱۵۱]۔

حافظ صاحب اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

''یعنی کہہ دو کہ آؤ میں وہ چیزیں تم کو سناؤں جو تمہارے رب نے حرام کی ہیں۔

۱-﴿أَلَّا تُشْرِكُوا﴾ الآیہ (خدا کا) کسی کو شریک نہ کرنا، یہ شرک حرام کیا گیا ہے۔

۲-﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ﴾ الآیہ (والدین کے ساتھ باحسان پیش آؤ) والدین کے ساتھ باحسان پیش نہ آنا حرام قرار دیا گیا۔

۳-﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُم﴾ الآیہ، تنگدستی کے ڈر سے اولاد کو قتل نہ کرو کہ یہ حرام کیا گیا۔

۴-﴿وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ﴾ الآیہ، فحش اور بے حیائی کے قریب بھی نہ جاؤ ظاہر ہو یا باطن۔

۵-﴿وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ﴾ الآیہ، یتیم کے مال کے نزدیک بھی نہ جاؤ ہاں نیک نیتی سے کوئی مضائقہ نہیں، مال یتیم کھانا حرام کیا گیا۔

۶-﴿وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ﴾ الآیہ، ناپ اور تول میں انصاف کرو، ناپ اور تول میں بے انصافی حرام ہے۔

۷-﴿وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ﴾ الآیہ، بولو تو انصاف سے بولو گرچہ کوئی تمہارا قرابت مند ہی کیوں نہ ہو، ناحق بولنا حرام ہے۔

۸-﴿وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا﴾ الآیہ، اللہ کے عہد کو پورا کرتے رہو، یہ ہے خدا کا عہد جس کو توڑنا حرام کیا گیا ہے، وغیرہ۔

اہلحدیث:

ان سب نمبروں میں حرام کے لفظ سے ثابت ہوتا ہے کہ حافظ صاحب نے ان سب مقولات کو حرّم کا مفعول بہ بنایا ہے، بہت خوب! اب ہم پوچھتے ہیں کہ مفعول بہ ﴿أَلَّا تُشْرِكُوا﴾ ہے، اس طریق سے کہ اَنْ اپنے مدخول کو مفرد کے حکم میں لے آتا ہے

اور مفرد فاعل یا مفعول بن سکتا ہے، پس ﴿أَلَّا تُشْرِكُوا﴾ کی تقدیر عبارت نحوی قاعدہ سے عدم الشرک ہوگی، کیوں کہ لانہی اس میں داخل ہے، تو معنی یہ ہوئے کہ خدا نے تم پر عدم شرک حرام کیا ہے، جس چیز کا عدم حرام ہو اس کا اصل واجب یا کم از کم جائز ہوتا ہے، بقول آپ کے نتیجہ آیت کا یہ ہے کہ جو لوگ حافظ صاحب جیسے ساری عمر میں توحید کے پابند رہیں اور ایک ساعت بھی شرک نہ کریں ان کی بابت کہا جائے گا کہ انہوں نے حرام کا ارتکاب کیا، کیوں کہ عدم شرک ان پر حرام تھا اور ساری عمر عدم شرک کرتے رہے، لہذا وہ مرتکب حرام ہوئے اسی پر دوسرے مفعول احسانا کو عطف ڈالا گیا یعنی تم پر حرام کیا گیا ماں باپ سے احسان کرنا، لیکن لطف یہ ہے کہ حافظ صاحب ''لا تشرکوا'' میں ''لا'' کھا جاتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں کہ شرک حرام کیا گیا اور احسانا پر (گویا) لا ملا کر لکھتے ہیں کہ والدین سے احسان کے ساتھ پیش نہ آنا حرام قرار دیا گیا۔ اسی طرح باقی مقولات کو قیاس کر لیجیے، کیا قرآن مجید کے مفصل ومبین ہونے کے یہی معنی ہیں، ہم تو ایسے ترجمے یا تفسیر کو اس شعر کا مصداق سمجھتے ہیں ؎

لطف یہ لطف ہے املاء میں مرے یار کے یار

حائے حطی سے گدح لکھتا ہے اور ھوز سے ہمار

حافظ صاحب!

آپ کے دوست اور ہم خیال مولوی احمد الدین امرتسری کی تحریروں میں جب کبھی صرفی نحوی غلطیاں بتائی گئیں، وہ تو اپنی زندگی میں خاموش رہے مگر ان کے اتباع نے ان کی بے عملی کا شاعرانہ طریق پر کھلے لفظوں میں اعتراف کیا، چنانچہ لکھا ہے:

''خواجہ (احمد الدین) مرحوم خاصانِ بارگاہ کی طرح رسمی اکتساب وتعلم کے منت کش نہ تھے، ا سکول میں صرف انٹرنک تعلیم پائی تھی، باقی تمام فضائل ومعالی استعداد فطری مطالعہ ذاتی یا دوسرے

لفظوں میں براہِ راست استاد ازل کے فیضان خاص کا نتیجہ تھے‘‘ (بلاغ امرتسر بابت جنوری ۷۳ء، ص:۱۶۸)۔

شاعرانہ خیال ہم نے اس لیے کہا کہ یہ تحریر لکھنے والا شاعر ہے اور شاعروں کا اقرار اوراعتراف ناثروں جیسا نہیں ہوتا بلکہ اس میں بھی ایک خاص انداز ہوتا ہے۔

مثال:

کسی شہر میں ایک واعظ صاحب تھے جو شاعروں کی بہت ہجو کیا کرتے، عام لوگ ان کو ولی اللہ (فرشتہ سیرت) سمجھتے تھے، مگر کسی شاعر کی نظر میں وہ کھٹکتے تھے، اس لیے اس نے ایک شعر میں واعظ صاحب کے حق میں اپنا مافی الضمیر یوں ظاہر کیا: **ملاحظہ ہو:**

واعظ شہر کہ مردم ملکش مے خوانند
قول ما نیز ہمیں است کہ او مردم نیست

یعنی واعظ صاحب کو لوگ فرشتہ کہتے ہیں ہم بھی اس امر پر متفق ہیں کہ وہ آدمی نہیں۔

ٹھیک اسی طرح بلاغ کے مذکورہ مضمون نویس نے اس امر کا اعتراف کیا کہ خواجہ احمد الدین صاحب متوفی پڑھے لکھے آدمی نہ تھے، رہا یہ کہ وہ خاصان خدا سے تھے یا افلاطون کی جماعت اشراقیہ سے تھے، اس کی بابت ہم نہیں کہہ سکتے۔ ﴿عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي فِي كِتَابٍ لَّا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى﴾ [طہ:۵۲]۔

جناب حافظ محب الحق صاحب:

ہم نہیں جانتے کہ آپ یا آپ کے احباب اس قسم کی صرفی نحوی غلطیوں کے جواب میں وہی عذر کریں گے جو امرتسری معاصر کے احباب نے کیا ہے یا کچھ اور جواب دیں گے، بہر حال ہم منتظر ہیں کہ آپ جو جواب دیں گے ہم بھی اس کی تصدیق کر دیں گے۔

بقول امیر خسرو رحمہ اللہ ؎

بروز حشر گر پرسند خسرو را چرا کشتی

چہ خواہی گفت قربانت شوم تا من ہما گویم

اطلاع:

ناظرین میں سے کسی صاحب کو آیت زیر بحث: ﴿قُلۡ تَعَالَوۡاْ أَتۡلُ مَا حَرَّمَ﴾ (الآیۃ) [الانعام:۱۵۱]۔ کا صحیح مطلب معلوم کرنا ہو تو ''تفسیر القرآن بکلام الرحمن'' ملاحظہ کریں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حرم بمعنی قضی ہے۔(للہ الحمد)

مفصل جواب:

ناظرین کرام: مفصل جواب سے پہلے کتاب ''بلاغ الحق'' کی فہرست مضامین ملاحظہ فرمائیں۔

فہرست مضامین کتاب ''بلاغ الحق'':

قسط:۵

تصدیق الحدیث

''بیان الحق بجواب بلاغ الحق''

(۱۱ر رجب ۱۳۵۶ھ = ۱۷ر ستمبر ۱۹۳۷ء)

گذشتہ پرچہ میں کتاب ''بلاغ الحق'' کے مضامین کی فہرست دی گئی جس میں عرض حال وغیرہ ہے، جواب مع حاشیہ[1] ملاحظہ ہو:

① طلب شہادت اور شہادت: ''اہل حدیث'' مورخہ ۲۷ر اگست میں ہم نے مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری مرحوم اور جناب شاہ عین الحق قاسمی صاحب وغیرہ کی بابت مرحوموں کے تلامذہ سے درخواست کی تھی کہ ان کا عقیدہ متعلقہ حدیث بتاویں گے کہ وہ حدیث کو حجت شرعی جانتے تھے یا نہ؟ اس کے جواب میں دو معتبر شہادتیں درج ذیل ہیں: مولانا حافظ عبداللہ صاحب سے اخیر کتابیں معقول اور منقول کی میں نے پڑھ کر سند لی۔ اور پڑھنے کے زمانہ میں فتوی مَیں ہی لکھتا تھا۔ جس میں احادیث کا حوالہ دیتا تھا اور مولانا مرحوم اپنے دستخط سے جاری کرتے تھے۔ کتاب اللہ کو اور حدیث کو داخل فی الدین کہا کرتے تھے اور یہ لفظ ان کا مجھ کو یاد ہے۔ ''تركت فيكم أمرين لن تضلوا ما تمسكتم بهما كتاب الله وسنتي''۔ اہل قرآن کو گمراہ کہا کرتے تھے۔ مولانا شاہ عین الحق صاحب میرے پھوپھا مولانا شاہ علی نعمت کے شاگرد تھے۔ شاہ عین الحق صاحب کا مکان میرے مکان سے چند فرلانگ پر ہے اور مجھ سے غایت دوستی تھی، اخیر میں مدرسہ احمدیہ آرہ میں وہ مدرس اول تھے محض حدیث پڑھاتے تھے۔ اپنے مواعظ میں اہل قرآن کا رد کیا کرتے تھے۔ حدیث کو ستون دین فرمایا کرتے تھے۔ مولانا حافظ عبداللہ صاحب کے اکابر شاگردوں کو گواہ پیش کرسکتا ہوں۔ اپنے مضمون مذکور الصدر پر مولانا محمد اسحاق صاحب مدرس اول مدرسہ احمدیہ دربھنگہ۔ مولانا ابوبکر صاحب ومولانا فاروق صاحب جونپوری وغیرہ کو۔ یہ لوگ میرے ہم سبق تھے۔ حدیث پڑھتے تھے مولانا عبداللہ صاحب سے''۔ (المجیب حکیم محمد محسن (نمبر: ۲۲) زکریا اسٹریٹ کلکتہ، ۶ر ستمبر ۱۹۳۷ء)۔

....

شروع مقصود:

''عرض حال'' سے ہمیں مطلب نہیں دوسرا مضمون ''کلام اللہ'' کا ہے، اس میں قرآن کی تعریف اور پڑھنے پڑھانے کی ترغیب ہے جس پر کوئی اعتراض نہیں، تیسرا مضمون ''حدیث'' ہے، بس یہی کتاب کی جان اور روح رواں ہے، مصنف موصوف نے اس میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا بہت سا حصہ باصطلاح علم بیان حشو وزوائد اور باصطلاح شعرا محض بھرتی ہے، ناظرین ہمارے دعوی کو شاید مخالفانہ ادعا سمجھیں اس

.... دوسری اہل بیت کی شہادت: ''مولانا حافظ محمد عبداللہ غازی پوری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ کہنا کہ وہ حدیث کو داخل فی الدین نہیں سمجھتے تھے۔ صریح جھوٹ ہے اور افتراء''۔ (محمد فضل الرحمن باقی، (لیکچرار عربی کلکتہ یونیورسٹی)، نواسہ حافظ عبداللہ صاحب مرحوم، ۲۸ر جمادی الآخرۃ ۱۳۵۶ھ)۔

شہادت: (مطبوعہ شمارہ ۹، بتاریخ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۳۰ء) اخبار اہل حدیث ۱۷ر ستمبر ۱۹۳۰ء نظر سے گزرا۔ (اس جگہ پر غلطی سے ۱۷ر ستمبر کے بجائے ۷ر اگست چھپ گیا ہے، اس لئے ہم نے صحیح تاریخ درج کی ہے) بجواب استفسار (ص:۱۱)، کالم: ۳، گزارش ہے کہ حضرت العلامہ مولانا حافظ عبداللہ محدث غازی پوری نور اللہ مرقدہ حدیث نبوی کو داخل فی الدین سمجھتے تھے اور دم آخر تک وہ اسی خیال پر قائم رہے، جو لوگ اس عقیدہ کو کہ ''حدیث نبوی داخل فی الدین نہیں ہے''۔ آپ کی جانب منسوب کرتے ہیں ان کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ وہ کذاب اور مفتری ہیں۔ اور محض اپنا مطلب نکالنے کے لئے حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جانب سے اس عقیدے کا انتساب کرتے ہیں۔ میں اپنے پورے علم ویقین کی بنا پر کہتا ہوں کہ حافظ صاحب رحمہ اللہ کا ہرگز یہ عقیدہ نہیں تھا۔ والله على ما أقول وكيل۔

میں جانتا ہوں کہ حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عقیدے کے متعلق خود آپ کی کتاب ''ابراء أهل الحديث والقرآن مما فى جامع الشواهد من التهمة والبهتان'' سے وہ فقرہ نقل کرتا ہوں اس باب میں حجت قاطع ہے۔ (صفحہ: ۱۵) میں اپنے اصول مذہب کے بیان میں لکھتے ہیں:۔

''ہمارے مذہب کا اصل الاصول صرف کتاب وسنت ہے۔ اور ہر ایک مسئلہ میں کتاب وسنت ہی ہمارے مذہب کی کسوٹی ہے''۔ (خادم العلماء: ابوسعید محمد عبدالحفیظ فیضی (نواسہ ہمشیرہ حافظ صاحب رحمہ اللہ))۔

لیے ہم اس کو طلقاً طلقاً (ٹکڑے ٹکڑے) کر کے ناظرین کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ پس ناظرین کرام بھی ان کو بغور ملاحظہ فرمائیں:

''خدا نے فرمایا: ﴿قُلْ إِن كَانَ ءَابَآؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ وَإِخْوَٰنُكُمْ وَأَزْوَٰجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَٰلٌ ٱقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَٰرَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَجِهَادٍ فِى سَبِيلِهِۦ فَتَرَبَّصُوا۟ حَتَّىٰ يَأْتِىَ ٱللَّهُ بِأَمْرِهِۦ﴾ [التوبہ: ۲۴] (اے رسول اعلان کردو کہ اگر تمہارے باپ، بیٹے، بھائی، بیبیاں، خاندان، مال مخزونہ، تجارت جس کی کساد بازاری سے خائف رہتے ہو، اور گھر جو تم کو بہت مرغوب ہیں (یعنی دنیا کی کل چیزیں) اگر تم کو خدا اور رسول اور جہاد فی سبیل اللہ سے زیادہ محبوب ہیں تو عذاب خداوندی کے منتظر رہو) محبت خدا ورسول اور جہاد کو تو خدا نے نہایت مہتم بالشان صورت سے فرض کر دیا، اور اس کی خلاف ورزی پر تہدید بھی کی مگر قوم نے اس کی تعمیل کہاں تک کی وہ دیکھو، ان آیتوں کے محمل قرون اولی کے مسلمان تھے، قرآن ان کا نصب العین تھا، اٹھے تعمیل کی، اور تعمیل کا ثبوت جاں بازیوں کے ساتھ جان سے، مال سے، اقران واعزہ کو، زن وفرزند کو، بلکہ عزت وآبرو تک کو جو انہیں حاصل تھی خدا ورسول پر قربان کر کے دیا، وطن چھوڑا، گھر بار چھوڑا، زن وفرزند چھوڑا، اور سب کچھ چھوڑ کر رسول کے دامن میں پناہ لی، تو کامیابیوں نے اپنا چتر سنبھالا، اور جو کچھ چھوڑا تھا وہ اور اس سے زیادہ پایا اور دین ودنیا میں فائز المرام ہوئے۔ جب زمانہ بدلا اور رنگ آمیزیوں نے اپنا جلوہ دکھایا تو بعد کا رنگ بدلا، اور نوبت یہ پہنچی کہ: ﴿مَا قَدَرُوا۟ ٱللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِۦٓ﴾ [الحج: ۷۴] اسی طرح سمجھو ''ما قدروا الرسول حق قدرہ'' خدا ورسول کے فرمان یعنی قرآن کو منتر، چیستان اور معمہ بنا دیا، اور احبار ورہبان کے فرمان کو قول رسول۔ سلطنت نے حامی بھری، اور ماسوا کا ڈنکا بجا دیا گیا۔ خدا رسول کی محبت کا منہ بولا دعوی تو ہے مگر دلیل نہیں، اور دعوی بے دلیل باطل'' (بلاغ الحق، ص: ۱۴)۔

اہلحدیث:

ناظرین کرام ! اس اقتباس میں جو کچھ مصنف نے کہا ہے۔ مولانا شہید دہلوی (قدس سرہ) نے (تقوية الإيمان) [1] میں اس سے زیادہ لکھا ہے۔ پھر ہم اس کا جواب کیا دیں۔

''خدا ورسول کی محبت کا ثبوت رسول کے فرمان رسالت کی بہ اخلاص ومحبت اطاعت ہے، بلا آمیزش غیرے یہ آمین بالجہر اور رفع یدین میں جوتی پیزار کرنا ثبوت محبت نہیں، ثبوت نفسانیت ہے، اور نہ رسول کو خدا بنانا کہ ''احمد بے میم ہوتم'' رسول کی محبت ہے، یہ تو صریح ضلالت اور شرک ہے۔ اگر تم کو واقعی خدا اور رسول کی محبت ہے تو ''لا إله إلا الله'' ماسوا سے منہ پھیر واور محمد رسول اللہ رسالت محمدی یعنی قرآن کو اپنا نصب العین بناؤ، اور: ﴿إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝١٦٢ لَا شَرِيكَ لَهُ﴾[الانعام:۱۶۲] ''میری نماز اور میری عبادتیں اور میری حیات وموت تک خدا کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں''۔ یہی آپ کا قول، یہی آپ کا فعل، یہی آپ کا حال تھا، اور یہی آپ کا فرمان۔ تو اس کی تعمیل سے رسول کی محبت کا ثبوت دو کہ محبت رسول کا دعوی صحیح ہو اور تمہارا حال درست ہو جائے، اسی طرح کل ہدایات ربانی، سارے حقوق کی ادائیگی، سارے اخلاق کا برتاؤ، ساری قوتوں کا صحیح استعمال، اور سارے احکام وہدایات قرآنی جو عین رسالت اور تکمیل انسانی ہی کے لئے ہیں تعمیل کر کے خدا اور رسول کی محبت کا ثبوت دو۔ اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے آراستہ سینہ سپر رہو۔ یہ ہے خدا کا فرمان، یہ ہے رسول کی سنت، یہ ہے آپ کا اسوۂ حسنہ، تا کہ تم انسان کامل بنو، اور اپنے کو اسلام کا مجسم نمونہ بنا کے پیش کرو، اور یوں تبلیغ اسلام کی سنت اور خدمت ادا کرو، جیسا کہ اگلوں نے کیا، تو یہ دلیل ہوگی خدا اور رسول کے

---

[1] اس کا عربی ترجمہ مولانا عبدالوحید رحمانی رحمہ اللہ نے کیا تھا جو راقم کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ ریاض مملکت سعودی عرب سے طبع ہوا ہے۔

ساتھ تمہاری خالص محبت کی، ورنہ منافقانہ دعوی ہوگا جھوٹا اور رسول کے ساتھ استہزاء‘‘ (بلاغ الحق: ص:۱۵)۔

اہلحدیث:

ناظرین کرام! اس اقتباس کا مختصر مضمون صرف اتنا ہے کہ حضرت رسول اللہ (ﷺ) کی اطاعت محض تعلیم قرآن میں ہے اور بس، یعنی قرآن مجید کے سوا کوئی قول یا فعل نبوی واجب الاتباع نہیں ہے، واجب الاتباع قرآن مجید ہی ہے یہی مضمون رسالت ہے، کیوں کہ ’’مایوحی من اللہ‘‘ صرف قرآن ہے، حدیث نہیں۔ (بلاغ: ص: ۱۱۷)۔ بس یہی امر تنقیح ہے جو قائلین حدیث اور منکرین حدیث میں زیر بحث ہے۔ انصاف یہ ہے کہ اس میں مدعی ہم ہیں اس لئے ثبوت بھی ہمارے ذمہ ہے ثبوت بھی ایسا جو قرآن کے نصوص صریحہ سے ہو۔

ضروری امر:

’’حدیث شریف کے متعلق بحث دو طرح سے ہے (۱) ایک یہ کہ کیا سوائے قرآن مجید کے قول وفعل نبوی حجت شرعیہ ہے؟ (۲) دوسری بحث حدیث کی صحت اور اتصال کی ہے۔ حافظ محب الحق صاحب نے دوسری بحث سے ہمیں مستغنی کر دیا ہے، کیوں کہ آپ نے تسلیم فرمایا ہے کہ حدیث بحیثیت تنقید روایت تاریخ سے معتبر ترین ہے‘‘ (ملاحظہ ہو: بلاغ، ص: ۳۷)۔

پس بحث اول پر ناظرین توجہ فرمائیں۔ یعنی اس امر پر بحث پیش نظر ہے۔ جناب رسالت مآب ﷺ کے لئے خدا کی طرف سے ذریعہ حصول علم ایک ہی تھا جس کا نام وحی قرآن ہے یا اس کے علاوہ کچھ اور بھی تھا۔ وحی قرآن دونوں فریقوں میں مسلم ہے، اس لئے اس پر بحث کرنا بے ضرورت ہے۔ البتہ دوسرے ذریعہ کا ثبوت دینا ہم پر واجب ہے، جس کے لئے ہم مندرجہ ذیل آیت پیش کرتے ہیں:

﴿وَإِذۡ أَسَرَّ ٱلنَّبِيُّ إِلَىٰ بَعۡضِ أَزۡوَٰجِهِۦ حَدِيثٗا فَلَمَّا نَبَّأَتۡ بِهِۦ وَأَظۡهَرَهُ ٱللَّهُ عَلَيۡهِ عَرَّفَ بَعۡضَهُۥ وَأَعۡرَضَ عَنۢ بَعۡضٖۖ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِۦ قَالَتۡ مَنۡ أَنۢبَأَكَ هَٰذَاۖ قَالَ نَبَّأَنِيَ ٱلۡعَلِيمُ ٱلۡخَبِيرُ﴾[التحریم:۳]اس آیت کا ترجمہ ہی ہمارے مدعا کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے، جو یہ ہے:

''نبی نے اپنی بعض بیویوں کو ایک پوشیدہ بات بتائی اور اسے اس بیوی نے ظاہر کردیا اور اللہ تعالی نے اس کی اطلاع نبی کو کردی تو نبی نے اس میں سے بعض کو بات بتادی اور بعض سے منہ پھیرلیا۔ پھر جب نبی نے اس بیوی کو یہ بات بتائی، بیوی نے کہا آپ کو یہ کس نے بتائی ہے۔ نبی نے کہا مجھے خداعلیم خبیر نے بتائی ہے''۔

اس آیت میں آنحضرت کے اس مکالمے کا ذکر ہے جو اپنی بیوی سے خلوت میں ہوا تھا، بیوی نے اس کو دوسری بیویوں کے پاس ظاہر کردیا خدا نے بیوی کے اس فعل کی خبر پیغمبر صاحب کو کردی۔ اس کے بعد نبی علیہ السلام نے بیوی پر اس علم کا اظہار کیا تو بیوی نے کہا آپ کو یہ خبر کس نے بتائی ہے۔ نبی نے فرمایا خداعلیم خبیر نے۔

ہمارا استدلال اس آیت سے اس طرح ہے کہ ''أظهر'' کا فاعل اللہ ہے نیز ''نبأني'' کا فاعل علیم خبیر ہے۔ جو خدا ہی کے نام ہیں۔

چونکہ اس اطلاع کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے (اگر ہے تو کوئی اہل قرآن بتائیں) اس لئے ضروری ہے کہ یہ اطلاع دوسرے طریق پر آئی ہو جو ہمارا عین مدعا ہے، چونکہ وہ طریق وحی قرآن کے سوا مخفی ہے اس لئے ہماری اصطلاح میں اس کو وحی خفی کہتے ہیں۔ اس کی مثال آج کل بھی ہمیں ملتی ہے۔ ہمارے ملک میں خبر رسائی کے ذریعے کئی ایک ہیں۔ خطوط بذریعہ ڈاک۔ دوم بذریعہ تار برقی، سوم بذریعہ ٹیلیفون وغیرہ، اسی طرح قرآن مجید نے خدائی اطلاع کو تین اقسام بتایا، چنانچہ ارشاد ہے:﴿وَمَا

كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ ٱللَّهُ إِلَّا وَحۡيًا أَوۡ مِن وَرَآيِٕ حِجَابٍ أَوۡ يُرۡسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذۡنِهِۦ مَا يَشَآءُۚ إِنَّهُۥ عَلِيٌّ حَكِيمٌ ﴾ [الشوریٰ:۵۱]۔

یعنی خدا کی طرف سے حصول علم کے ذرائع تین ہیں (۱) ''وحیا'' (ذریعہ وحی) جس کو القاء فی القلب کہتے ہیں۔ (۲) پس پردہ، (۳) ذریعہ رسول (جبرئیل)۔ پہلی قسم کی مثال حضرت موسیٰ کی ماں کی اطلاع ہے: ﴿وَأَوۡحَيۡنَآ إِلَىٰٓ أُمِّ مُوسَىٰٓ﴾ [القصص:۷]، دوسری قسم کی مثال: ﴿وَكَلَّمَ ٱللَّهُ مُوسَىٰ تَكۡلِيمًا﴾ [النساء: ۱۶۴]، تیسری قسم کی مثال خود قرآن مجید ہے: ﴿نَزَلَ بِهِ ٱلرُّوحُ ٱلۡأَمِينُ﴾ [الشعراء: ۱۹۳]، چونکہ قرآن شریف بذریعہ رسول (جبرئیل) آنحضرت تک پہنچا ہے اس لئے: ﴿أَوۡ يُرۡسِلَ رَسُولًا﴾ [الشوریٰ:۵۱] کی قسم میں داخل ہے اور جس اطلاع کا ذکر قرآن مجید کی آیت مذکورہ میں ہے وہ دوسری دو قسموں میں ہے۔ نتیجہ صاف ہے کہ قرآن کی وحی اور حدیث کی اطلاع ایک ہی منبع فیض سے ہے۔ فرق طریقِ وصول میں ہے جیسے بادشاہ کی طرف سے چٹھی یا تار کے ذریعہ اطلاع کا پہنچنا ایک ہی حکم میں ہے، مگر طریق وصول الگ الگ ہے، ہمارے استدلال کا مختصر مضمون یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واسطے تحصیل علم الٰہی کے دو ذریعے تھے۔ ایک قرآن تھا جو بتوسط جبرئیل (رسول) کے تھا۔ دوسرا القاء فی القلب تھا جس کو: ﴿وَأَظۡهَرَهُ ٱللَّهُ﴾ [التحریم:۳] سے تعبیر کیا گیا۔

قسط:٦

تصدیق الحدیث

''بیان الحق بجواب بلاغ الحق''

(١٨/رجب ١٣٥٦ھ = ٢٤/ستمبر ١٩٣٧ء)

گذشتہ پرچے میں ہماری دلیل درج ہوئی ہے جس میں حدیث کے وحی خفی ہونے کا ثبوت دیا گیا ہے، آج اس کے متعلق حافظ محب الحق صاحب کا جواب مع جواب الجواب درج ہے۔

ناظرین کرام!

غور فرمائیں! ہمارا استدلال ایسی نص صریح سے ہے کہ اس کے برابر کوئی نص نہیں ہوسکتی، مگر حافظ صاحب کی بے دردی ملاحظہ کر کے داد دیجیے کہ برادران یوسف سے کم ہے یا زیادہ۔ آپ ہماری اس پیش کردہ دلیل کے متعلق فرماتے ہیں:

''جب وحی جلی اور وحی خفی کا لفظ بھی قرآن میں نہ ملا تو فرقہ پرستی کے زور میں متبعین کو دھوکا دینے کے لیے اضلہ اللہ علی علم کا مظاہرہ کیا گیا، اور یہ آیت پیش کی گئی: ﴿وَإِذْ أَسَرَّ ٱلنَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَٰجِهِۦ حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِۦ وَأَظْهَرَهُ ٱللَّهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُۥ وَأَعْرَضَ عَنۢ بَعْضٍ ۖ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِۦ قَالَتْ مَنْ أَنۢبَأَكَ هَٰذَا ۖ قَالَ نَبَّأَنِيَ ٱلْعَلِيمُ ٱلْخَبِيرُ﴾ [التحریم:٣] ''جب کہ نبی نے اپنی بعض بیبیوں سے ایک بات پوشیدہ کہی، تو جب اس بیوی نے اس بات کو ظاہر کر دیا اور اللہ نے بھی اس کو نبی پر ظاہر کر دیا تو مطلع کرنے والے سے نبی نے بعض بات کا اقرار کیا اور بعض سے اعراض کیا، پھر جب اس کو نبی نے بیوی سے پوچھا تو وہ کہنے لگیں کہ آپ کو کس نے مطلع کیا؟

فرمایا: خدائے علیم وخبیر نے"۔ ﴿نَبَّأَنِيَ ٱلۡعَلِيمُ ٱلۡخَبِيرُ﴾ سے حدیث کے وحی غیر متلو ہونے کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے کہ خدا کا مطلع کرنا جو قرآن میں کہیں نہیں ہے وحی غیر متلو کی کافی شہادت ہے۔ بس جس طرح خدا نے مطلع کیا وہی شان وحی غیر متلو کی ہے۔

میرے خیال میں یہ قرآن میں عدم تدبر کا نتیجہ ہے یا قوم کو دھوکا دینا ہے کیوں کہ ﴿نَبَّأَتۡ بِهِۦ﴾ بیوی نے تو ظاہر ہی کر دیا تو اب ظاہر ہوگئی، نبی کو جس نے مطلع کیا اس کے نام کی ستاری خدا نے کی اور فرمایا: ﴿وَأَظۡهَرَهُ ٱللَّهُ عَلَيۡهِ﴾ خدا نے نبی پر ظاہر کیا تو جس نے نبی کو مطلع کیا تھا نبی نے اس سے بعض بات کا اقرار کیا اور بعض سے اعراض، خدا سے نہیں وہ تو دانائے حال ہے تو جس نام کو ظاہر کرنے کی خدا نے ستاری کی، ہمارے رسول نے بھی اس نام کو ظاہر نہ کیا اور ستاری کی۔ جس طرح خدا نے: ﴿وَأَظۡهَرَهُ ٱللَّهُ عَلَيۡهِ﴾ فرمایا، نبی نے بھی: ﴿نَبَّأَنِيَ ٱلۡعَلِيمُ ٱلۡخَبِيرُ﴾ فرمایا۔ اس میں وحی غیر متلو کا کہیں پتہ نہیں، اگر: ﴿مِن وَرَآءِ حِجَابٍ﴾ فرمایا تو وہ وحی نہیں۔ حالاں کہ یہاں تو خود بیوی نے ظاہر کر دیا اور بات کھل گئی تھی۔

مطلع کرنے والے نے مطلع کیا اور اس کو خدا نے اپنے ساتھ منسوب کیا، تو یوں مجاز کی نسبت حقیقت کی طرف کرنی تو خدا کی شان اور قرآن کی روش ہے، مثلاً گمراہ ہونے والا تو خود گمراہ ہوا، خدا نے فرمایا: ﴿وَأَضَلَّهُ ٱللَّهُ عَلَىٰ عِلۡمٖ﴾ [الجاثیۃ: ۲۳] "خدا نے بر بنائے علم اس کو گمراہ کیا" کنکریاں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھینکی تھیں، خدا نے فرمایا: ﴿وَمَا رَمَيۡتَ إِذۡ رَمَيۡتَ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ رَمَىٰ﴾ [الانفال: ۱۷] "کنکریاں جو آپ نے پھینکی تھیں، یہ حقیقتاً آپ نے نہیں اللہ نے پھینکی تھیں"۔

کیا قرآن کی یہ روش ہر جگہ نظر نہیں آتی، آدمی پیدا ہوا والدین سے مگر خالق حقیقی خدا ہی ہے، رزق اُگی زمین سے اور مختلف ذرائع سے ہم تک پہنچی، مگر رزاق مطلق خدا ہی ہے، قرآن بھیجا خدا نے، ہم کو پہنچا نبی کی زبان مبارک سے مگر وہ اللہ ہی کا کلام ہے منزل، اسی طرح انجرے اٹھے،

گھٹا چھائی، مینہ برسا، غلہ اُگا، لوگوں کی رزق پہنچی، ذرائع اتنے مگران سب کا فعال مطلق خدا ہی ہے خدا ہی، بہار میں زلزلہ آیا زمین ہلی، مکانات گرے، تباہی آئی، مرنے والے مرے، جینے والے جیتے ہیں، اس کا سبب زمین کی حرارت کہو یا جو کچھ قرار دو مگر یہ سب کیا دھرا خدا ہی کا، اسی طرح جب بات کھل گئی اور مطلع کرنے والے نے نبی کو مطلع کیا خدا نے اس کے نام کی ستاری کی تو نبی نے بھی فرمایا کہ خدا نے مطلع کیا۔

اگر ﴿نَبَّأَنِيَ ٱلۡعَلِيمُ ٱلۡخَبِيرُ﴾ سے وحی غیر متلو ثابت کرتے ہو تو کیا ﴿قَدۡ نَبَّأَنَا ٱللَّهُ مِنۡ أَخۡبَارِكُمۡ﴾ [التوبۃ: ۹۴] سے اوروں پر بھی وحی غیر متلو کا آنا پیش کیا جائے گا'' (بلاغ الحق ۲۲، ۲۳، ۲۴)۔

اہلحدیث:

حافظ محب الحق کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ فعل اظہر کی نسبت خدا کی طرف مجازی ہے حقیقی نہیں، بقول حافظ صاحب یہ بات ظاہر کرنے والا کوئی رازداں تھا اس کے بتانے کو مجازاً اللہ کی طرف نسبت کر دیا، بہت خوب! اگر کوئی ملحد و زندیق یہ کہہ دے کہ قرآن بھی کسی انسان کا سکھایا ہوا ہے جس کو مجازاً اللہ کی طرف منسوب کر کے: ﴿تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ﴾ [الواقعہ: ۸۰] کہہ دیا تو آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

حضرات! یہ ہے نمونہ اخوان یوسف کی ہمدردی کا جنہوں نے کہا تھا: ﴿وَإِنَّا لَهُۥ لَحَٰفِظُونَ﴾۔

ناظرین کرام!

کیا یہی وہ صحیح ترجمہ ہے جس کی تمنا حافظ صاحب اپنے ایک مطبوعہ خط میں یوں کرتے ہیں کہ:

''جتنے مفسرین نے تفسیریں لکھیں اور انہیں کو ماخذ قرار دے کر جتنے مترجموں نے ترجمہ کیا سب

نے قرآن کو توڑ مروڑ کر اپنے فرقہ کی تائید کو مقدم سمجھا، اس لیے میری عرض یہ ہے کہ قرآن کا ترجمہ قرآن کے احاطہ کے اندر ہو جس میں انسانی راؤں کی جو غیر قطعی ہیں، آمیزش نہ ہو‘‘ (صراط مستقیم، لاہور ۱۰ ستمبر ۳۷ء)۔

اہلحدیث:

یہ قاعدہ مجوزہ اگر ہاتھی کے بیرونی دانتوں کی طرح نمائشی نہیں تو فرمایئے آپ کا ترجمہ اور تفسیر قواعد عربیہ کے موافق ہے؟ ان قواعد میں تو صاف لکھا ہے کہ مجاز کی طرف رجوع کرنا استحالۂ حقیقت اور قرینہ مجاز کے بغیر ہرگز جائز نہیں، کیوں کہ اس طرح تو ہر ایک ملحد وزندیق تمام قرآن میں ہر حقیقی نسبت کو مجاز پر محمول کر سکتا ہے، یہ اصول کہ حقیقی معنی کو بغیر استحالہ حقیقت کے چھوڑ دینا جائز نہیں اتنا زبردست ہے کہ تمام اہل علم کے نزدیک مسلم ہے بلکہ خود آپ اور آپ کے ہم خیال امرتسری منکرین حدیث بھی اسے مانتے ہیں۔

حافظ صاحب!

آپ نے یہ کیا فرما دیا کہ:

’’اگر ﴿مِن وَرَآءِ حِجَابٍ﴾ ہے تو وہ وحی نہیں حالاں کہ یہاں تو خود بیوی نے ظاہر کر دیا تھا، بات کھل گئی تھی‘‘۔

میں نہیں سمجھا اس سے آپ کا کیا مطلب، بیوی کا راز نبی پر ظاہر کرنا مخفی طور پر تھا اس مخفی امر پر اطلاع دینا اللہ کا فعل ہے، اس کی مثال سنیے!

منافقین رات کو مخفی مشورے کرتے تھے جس کا ذکر قرآن کے اس جملہ میں ہے: ﴿بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ﴾ [النساء:۸۱] اس خفیہ مشورے کی اطلاع نبی کو خدا کی طرف سے دی جاتی تھی کیا یہ دو فعل الگ الگ نہیں ہیں؟ اسی طرح آیت زیر بحث میں بیوی کا فعل الگ ہے جو مخفی ہے اور اللہ کا فعل الگ ہے جو اس مخفی فعل کا

اظہار ہے، ان دو فعلوں کو مخلوط کر کے استعجاب کرنا غالباً اناسی سالہ عمر کا اثر ہے ؎

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

ہاں آپ نے ﴿مِن وَرَآءِ حِجَابٍ﴾ کی قسم کو وحی سے الگ بتا کر ہمیں الزام دیا ہے، غالباً آپ کی نظر اس آیت پر ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ ٱللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِن وَرَآيِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِۦ مَا يَشَآءُ﴾ [الشوریٰ:۵۱] ہم تو اس اظہار اور جملہ احادیث کو پہلی قسم ﴿إِلَّا وَحْيًا﴾ میں داخل سمجھتے ہیں اور قرآن مجید کو تیسری قسم ﴿أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا﴾ میں داخل جانتے ہیں، فرمان خداوندی: ﴿فَإِنَّهُۥ نَزَّلَهُۥ عَلَىٰ قَلْبِكَ﴾ [البقرۃ:۹۷] ہمارے عقیدہ کی تائید کرتا ہے، کہیے اب کیا سوال؟

حافظ محب الحق صاحب نے اس آیت: ﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ﴾ الآیہ کا ترجمہ اور تفسیر جو اپنی کتاب ''شرعۃ الحق'' میں لکھی ہے وہ قابل دید وشنید ہے۔ فرماتے ہیں:

''انسان سے خدا اتنی ہی صورت سے کلام کرتا ہے جو اس نے خود فرمایا: ﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ ٱللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِن وَرَآيِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِۦ مَا يَشَآءُ﴾ کسی آدمی کی یہ تاب نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے مگر بذریعہ وحی یا پس پردہ (جسے الہام کہتے ہیں) یا رسول بھیج کر، تو اپنے حکم سے جو چاہتا ہے وحی بھیجتا ہے۔ بشر سے کلام کرنے کی خدا نے تین ہی صورتیں فرمائی ہیں، بذریعہ وحی جیسے رسولوں سے خدا نے بات کی ہے یا پس پردہ جسے الہام یا القاء رحمانی کہیے جیسے اولیاؤں سے خدا نے بات کی ہے، یا بذریعہ رسول کہ رسول بھیج کر عام خلق اللہ سے خدا نے بات کی ہے، احکام دیئے ہیں، ہدایتیں دی ہیں'' (شرعۃ الحق ص:۔۹۶۔۹۷)۔

اہلحدیث:

اس ترجمہ کی بنا حافظ محب الحق نے ظاہر نہیں کی، ہم بتاتے ہیں آپ بشر کو نکرہ عامہ سمجھ کر ابوبکر اور ابوجہل دونوں کو شامل کرتے ہیں، آپ کے خیال میں خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیج کر ان دونوں سے کلام کیا ہے، ایک نے مانا، دوسرے نے انکار کیا، ہم نے بشر کے معنی اتنے وسیع نہیں لیے نہ لے سکتے ہیں، بلکہ ہمارے نزدیک بشر سے مراد وہ انسان ہے جو خدا کا اصل مخاطب ہو، یعنی خدا اس سے حقیقۃً کلام کرنا چاہے، نہ ہر مومن و کافر کیوں کہ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَمَا كَانَ ٱللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى ٱلْغَيْبِ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ يَجْتَبِى مِن رُّسُلِهِۦ مَن يَشَآءُ﴾ [آل عمران:۱۷۹] یعنی یہ جائز نہیں ہے کہ خدا تم کو اپنے مخفیات علم پر اطلاع دے، لیکن رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے، پس تم اللہ اور رسولوں پر ایمان لاؤ۔

ہم نے جو لکھا ہے کہ قرآن بذریعہ جبریل (رسول) آیا تھا، آیت قرآنیہ بھی ہم نے اس کے ثبوت میں پیش کی ہے، مقام شکر ہے کہ حافظ محب الحق صاحب بھی ''شرعۃ الحق'' میں اس کی تصدیق فرما چکے ہیں، چنانچہ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

''رسول کی وحی بذریعہ فرشتہ اور محفوظ ہوتی ہے'' (شرعۃ الحق ص:۹۷)۔

پس ہمارا اور حافظ صاحب کا اس امر پر اتفاق ہو گیا کہ قرآن مجید بذریعہ رسول (فرشتہ) کے آیا ہے اسی لیے قرآن مجید آیت مرقومہ کی تیسری قسم ﴿أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا﴾ میں داخل ہے اور حدیث شریف آیت کی پہلی قسم ﴿إِلَّا وَحْيًا﴾ میں داخل ہے۔

شکر للہ کہ میان من داد صلح فتاد

❁ ❁ ❁

قسط:۷

تصدیق الحدیث

’’بیان الحق بجواب بلاغ الحق‘‘

(۲۴/رجب ۱۳۵۶ھ = یکم اکتوبر ۱۹۳۷ء)

گذشتہ پرچے میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نزول قرآن مجید بذریعہ فرشتہ ہوا ہے جو مکالمہ الٰہی کی تیسری قسم ہے، پہلی دوقسمیں قرآن کے سوا حدیث میں پائی جاتی ہیں۔ آج ناظرین آگے پڑھیں۔

تتمہ:

علم اصول اور معقول کا مسلمہ اصول ہے کہ اثبات دعوی کے لیے ایک دلیل ہو یا کئی ایک نتیجے کے لحاظ سے برابر ہیں، یہی طریق قرآن مجید کا ہے، چنانچہ نماز، روزہ دونوں یکساں فرض ہیں، حالاں کہ نماز کی فرضیت کے لیے کئی ایک آیات ہیں اور فرضیت روزہ کے لئے صرف ایک آیت مگر ان دونوں حکموں کی فرضیت کی مساوات میں کسی مؤمن کو کلام نہیں، اس بنا پر اگر ہم صرف ایک ہی دلیل پر کفایت کریں تو کر سکتے ہیں مگر حافظ محب الحق صاحب اور دیگر منکرین کی خاطر علاوہ ان دلائل کے جو اس خصوص پر ہماری تصنیفات (حدیث نبوی[1] وغیرہ کتب) میں درج ہیں، آج ہم ایک جدید دلیل باانصاف ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

[1] حدیث نبوی اور اتباع الرسول یہ کتاب مؤلف رحمہ اللہ نے عبداللہ چکڑالوی کے جواب میں تحریر فرمایا ہے ان شاء اللہ ہماری تحقیق کے ساتھ اس سلسلہ کے دوسرے حصہ میں شامل کتاب ہوگی۔

قرآنی شہادت:

قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَيَوْمَ يَعَضُّ ٱلظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ يَقُولُ يَٰلَيْتَنِي ٱتَّخَذْتُ مَعَ ٱلرَّسُولِ سَبِيلًا ﴿٢٧﴾ يَٰوَيْلَتَىٰ لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا ﴿٢٨﴾ لَّقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ ٱلذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَآءَنِي ۗ وَكَانَ ٱلشَّيْطَٰنُ لِلْإِنسَٰنِ خَذُولًا﴾ [الفرقان:۲۷-۲۹] (ترجمہ) قیامت کے روز ظالم اپنے ہاتھوں کو کاٹے گا، کہے گا: کاش میں نے رسول کے ساتھ ہوکر خدا کی راہ ہدایت کو اختیار کیا ہوتا ، افسوس! میں فلاں شخص کو دوست نہ بناتا اس نے مجھے نصیحت پہنچنے کے بعد گمراہ کردیا اور شیطان انسان کو ذلیل کرنے والا ہے۔ اور رسول علیہ السلام کہیں گے: اے میرے پروردگار! تحقیق میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔

مطلب اس آیت کا یہ ہے، ظالم اپنی گمراہی میں دو باتوں کا اعتراف کرے گا (۱) خدا کی راہ چھوڑنا۔ (۲) رسول کی معیت میں عمل نہ کرنا۔ اس آیت کا اشارہ اس طرف ہے کہ قرآن مجید پر عمل کرنا باتباع سنت رسول واجب ہے، اگر محض اپنی رائے سے قرآن پر عمل کرنا مقصود ہوتا تو مع الرسول کے لفظ کی ضرورت نہ ہوتی، اس میں شک نہیں کہ مع الرسول سے مراد معیت جسمانی یا زمانی نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو قرآن کا مفہوم زمانہ رسالت تک ہی محدود رہ جاتا، اس کے بعد آج تک اور آج سے قیامت تک اس کا شمول نہ ہوتا، اب فرمایئے قرآن مجید کے احکام کی تعمیل میں معیت رسول کس طرح داخل ہوسکتی ہے، ہم تو اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ مثلاً: ﴿وَأَقِيمُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ﴾ [البقرۃ:۴۳] حکم قرآنی ہے اور حضرت رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کے سامنے نماز پڑھ کر فرمایا: ''صَلُّوا كما رَأَيْتُمُوني أُصَلِّي''[1]، یعنی تم

① صحیح بخاری: کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر، حدیث ۶۳۱۔

اسی طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے، تاکہ تم پر ایسا وقت نہ آئے کہ تم بھی اسی ظالم کی طرح ہاتھ کاٹو اور کہنے لگو: کاش! ہم نے قرآن مجید کی ہدایت پر رسول کی معیت میں عمل کیا ہوتا۔

حافظ صاحب!

یہی معنی اسوۂ حسنہ رسول (پیروی رسول) کے ہیں، اس کے مقابلے میں آپ جو کہتے ہیں وہ بھی قابل غور ہے۔

''مسلمانو! قرآن مجید کی آیتوں سے جو بیان ہوئیں تم نے سمجھا ہوگا کہ اطاعت خدا اور رسول دو اطاعت نہیں ایک ہی اطاعت ''ما اُرسل'' کی، یعنی قرآن مجید کی ہے، جس کو خدا نے نازل فرمایا آنحضرت علیہ الصلاۃ والسلام اس کی اطاعت اور اس کی تبلیغ کے مامور ہوئے، آپ نے اس کی کما حقہ اطاعت، اور تبلیغ فرمائی، تو یہی قرآن فرض، یہی سنت، اور یہی آپ کا اسوۂ حسنہ ہوا'' (بلاغ الحق، ص: ۴۰)۔

اہلحدیث:

آپ کا یہ قول بے دلیل جو وقعت رکھتا ہے اہل علم اور اہل انصاف سے مخفی نہیں، ہم آپ سے پوچھتے ہیں اور آپ کے ذریعے جملہ منکرین حدیث تک یہ سوال پہنچاتے ہیں کہ کیا نجات کے لیے قرآن پر عمل کرنا حافظ محب الحق یا کسی اور منکر حدیث کے ساتھ ہو کر ضروری ہے؟ اس کا جواب یقیناً یہی ہوگا کہ نہیں، بلکہ ہر شخص قرآن مجید پر براہ راست عمل کرسکتا ہے، یہ جواب جماعت منکرہ کے اصول سے بالکل صحیح ہے، لیکن آیت مذکورہ کے ماتحت رسول کے ساتھ معیت کیوں ضروری ہے اس کا جواب دینا ہر منکر حدیث کا فرض ہے، پس فرمان خداوندی سنیے! ﴿فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُواْ لَكُمْ فَٱعْلَمُوٓاْ أَنَّمَآ أُنزِلَ بِعِلْمِ ٱللَّهِ﴾ [ھود: ۱۴]۔

حافظ صاحب کی سینہ زوری:

ہم بہت دفعہ شکایت کر چکے ہیں کہ جماعت منکرہ قرآن کی تفسیر کرنے میں سینہ زوری سے کام لیتی ہے، مطلب کے لیے ہر جگہ نیا اصول گھڑ لیتی ہے پھر خود ہی دوسری جگہ اس اصول کو توڑ دیتی ہے، ایک موقعہ پر یہ کہتے ہیں کہ قرآن کے عام کو خاص کرنا تحریف ہے، حافظ صاحب کے الفاظ اس بارے میں یہ ہیں:

''قرآن مجید کے عام کو خاص اور خاص کو عام کرنے کا اگر چہ کوئی مجاز نہیں مگر مسلمانوں کا یہ شیوہ ہو گیا ہے اور تجاوز عن الحد قرآن مجید کی اصلاح ہے اور ایک طریقے کی تحریف'' (بلاغ الحق، ص: ۴۳)۔

دوسری جگہ خود توڑ دیتے ہیں اس کی مثال اسوۂ حسنہ رسول (علی صاحبها الصلاة والتحية) ہے، ناظرین اس بارے میں حافظ صاحب کے الفاظ غور سے سنیں، فرماتے ہیں:

''سورہ احزاب میں نبی آخر الزماں کے اسوۂ حسنہ کی ہدایت کی گئی، فرمان ہوا: ﴿لَّقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ ''تمہارے لیے رسول کی پیروی بہتر تھی'' یعنی جن لوگوں نے جہاد سے منہ موڑا ان کو منہ موڑنا نہ تھا بلکہ جہاد میں رسول کی پیروی اور جاں بازی دکھانی تھی'' (بلاغ الحق: ۴۱)۔

اہلحدیث:

مطلب آپ کا یہ ہے کہ اسوۂ حسنہ جو اس آیت میں مذکور ہے اس سے ہر شرعی فعل میں حضور کا اتباع کرنا مراد نہیں، جیسا کہ ہم نے آیت: ﴿مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلًا﴾ سے ثابت کیا ہے، حالاں کہ الفاظ قرآن مجید کے عام ہیں، ناظرین کے سامنے الفاظ قرآنیہ رکھ دیتے ہیں، خود غور فرما لیں، ارشاد ہے: ﴿لَّقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ

حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُواْ ٱللَّهَ وَٱلْيَوْمَ ٱلْءَاخِرَ وَذَكَرَ ٱللَّهَ كَثِيرًا ﴾[الاحزاب: ۲۱]، یعنی رسول اللہ کے افعال میں اچھا نمونہ ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کا ذکر بہت بہت کرتے ہیں۔

ناظرین کرام:

اس آیت کا پورا مضمون سمجھانے کے لیے ایک اور آیت بطور نظیر کے پیش کرتا ہوں، حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے: ﴿طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِينَ وَٱلْعَٰكِفِينَ وَٱلرُّكَّعِ ٱلسُّجُودِ ﴾[البقرۃ:۱۲۵]، یعنی طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں، رکوع اور سجود کرنے والوں کے لیے بیت اللہ کو پاک رکھو۔

جس طرح اس آیت میں تطہیر بیت اللہ ان اوصاف کے لوگوں کے لیے ہے، اسی طرح اسوہ حسنہ رسولیہ مومنین باللہ اور ذاکرین کے لیے ہے، مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے جمیع افعال شرعیہ میں امت مؤمنہ کے واسطے اچھا نمونہ ہیں، شیخ سعدی رحمہ اللہ نے کیا ہی خوب کہا ؎

مپندار سعدی کہ راہ صفا
تواں رفت جز در پئے مصطفی

حافظ محب الحق صاحب نے اسوۂ حسنہ کی تشریح میں جو کرتب دکھائے ہیں وہ قابل داد ہیں، اول یہ کہ: آپ نے اس اسوۂ حسنہ رسولیہ کو جہاد کے ساتھ مخصوص کر دیا۔ دوسرا: اس کے ترجمے میں **تھا یا تھی** کا لفظ بڑھایا، چنانچہ آپ کے الفاظ اس بارے میں مکرر درج کئے جاتے ہیں:

''سورہ احزاب میں نبی آخرالزماں کے اسوۂ حسنہ کی ہدایت کی گئی، فرمان ہوا ﴿لَّقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ ٱللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾(تمہارے لیے رسول کی پیروی بہتر تھی) یعنی جن لوگوں نے

جہاد سے منہ موڑا ان کو منہ موڑ نا نہ تھا بلکہ جہاد میں رسول کی پیروی اور جاں بازی دکھانی تھی'' (بلاغ الحق، ص: ۴۱)۔

اہلحدیث:

ان دونوں کرتبوں کا جواب اب ہم حافظ صاحب ہی کے کلام سے پیش کرتے ہیں کہ:

''قرآن کے عام کو خاص کرنا تحریف ہے'' (بلاغ الحق، ص: ۴۳)۔

کرتب دوم:

کا جواب یہ ہے کہ یہاں ''کان'' بمعنی ''ہست'' ہے نہ بمعنی ''بوذ''، اس کو نحوی اصطلاح میں کان ممتنع الانقطاع کہتے ہیں، ہمارے اس دعوی کا ثبوت کہ کان بمعنی ہست ہے حافظ صاحب کے کلام میں اسی جگہ موجود ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں یہ لفظ اسوۂ حسنہ دو دفعہ آیا ہے اور اسی طرح کان وہاں بھی ہے، چنانچہ ان آیات کے الفاظ یہ ہیں (۱) ﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ﴾ [الممتحنۃ: ۴] (۲) ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ [الممتحنۃ: ٦] پہلی آیت کا ترجمہ حافظ صاحب نے یوں کیا ہے:

''تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے صحابہ کے اتباع میں اسوۂ حسنہ ہے'' (ص: ۴۰)۔

دوسری آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے:

''البتہ تمہارے لیے ابراہیموں کے اس طریقے میں اسوۂ حسنہ ہے'' (ص: ۴۱)۔

حافظ صاحب!

یہ ''قسمت ضیزی'' (کافی تقسیم) کیوں؟ پہلی دو آیتوں میں ترجمہ (ہے) سے کیا اور تیسری میں جو ہماری طرف سے دلیل ہے اس کا ترجمہ (تھی) سے کر دیا، حالاں کہ

قرین انصاف یہ تھا کہ سب جگہ ترجمہ ایک ہی قسم کا ہوتا اور اگر فرق کرنا تھا تو قرین قیاس یہ تھا کہ ابراہیمی اسوہ کے ساتھ تھا کا لفظ لکھتے جو زمانہ صحابہ سے ماضی بعید تھا اور اسوۂ محمدیہ کے ساتھ ہے کا لفظ لکھتے ہیں جو زمانہ حال کا واقعہ تھا مگر آپ نے جو کیا وہ اپنی غرض کے ماتحت کیا۔

عجیب مشابہت:

پنڈت لیکھ رام آریہ نے کتاب ''ثبوت تناسخ'' میں قرآن شریف کی چند آیات سے تناسخ کا ثبوت دیا ہے، ان میں سے ایک آیت یہ ہے: ﴿وَلَا طَآئِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّآ أُمَمٌ أَمْثَالُكُم﴾ [الانعام:۳۸] مطلب آیت کا صاف ہے: ''اڑنے والے جانور بھی تم انسانوں کی طرح مختلف انواع ہیں''، اس ترجمے سے اس کا مطلب پورا نہ ہوتا تھا اس لیے اس نے یوں ترجمہ کیا:

کہ: ''اڑنے والے جانور تمہاری طرح امتیں تھیں''، اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ بقاعدہ تناسخ وہ انسانوں سے جانور بن گئے ہیں، یہی طریقہ حافظ محب الحق صاحب نے برتا ہے۔

حافظ صاحب:

ہم اس مشابہت پر آپ کو مبارک باد کہیں یا کیا ع:

ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

قسط:۸

تصدیق الحدیث①

”بیان الحق بجواب بلاغ الحق“

(۲/شعبان ۱۳۵۶ھ = ۸/اکتوبر ۱۹۳۷ء)

فیصلہ کی آسان صورت:

ناظرین یہ تو ہم نہیں کہتے کہ حافظ صاحب پر کبرسنی کی وجہ سے نسیان یا ذھول غالب آ گیا ہے بلکہ ہمارا یقین ہے کہ آپ پر قدرت کا دستِ تصرف کام کرتا ہے، دیکھیے اسوۂ ابراہیمی والی آیت کا ترجمہ آپ یوں کرتے ہیں:

”تمہارے لیے ابراہیم اوران کے صحابہ کے اتباع میں اسوۂ حسنہ ہے“۔

---

① **جواب استفسار:** ”تصدیق الحدیث“ (۲) مندرجہ اخبار اہل حدیث، بابت ۲۷/اگست ۱۹۳۷ء کے ضمن میں استفسار کیا گیا کہ ”کیا مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری مع دونوں حضرات کے حدیث نبوی کو داخل فی الدین نہیں سمجھتے تھے“؟

اس کے جواب میں حافظ صاحب ممدوح کے ایک طویل فتوی سے بقدر ضرورت اقتباس نقل کرتا ہوں، ملاحظہ ہو:

”اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ حدیثیں جو فی الواقع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہوئی ہیں جو متعلق بہ تبلیغ رسالت ہیں وہ داخل وحی ہیں، کیوں کہ اللہ تعالی فرماتا ہے: ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ ٱلْهَوَىٰٓ ۝٣ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾“۔ (حافظ صاحب ممدوح کے فتاوی کی نقل شیخنا ومولانا محمد عبدالرحمن صاحب مبارکپوری مرحوم کے کتب خانہ میں موجود ہے)۔ علاوہ اس کے حافظ عبداللہ صاحب رحمہ اللہ کے اکثر فتاوی آیات کریمہ اوراحادیث نبویہ سے مدلل ومبرہن ہیں۔

راقم: (حکیم) ابوالصمصام عبدالسلام عفی عنہ از مبارک پور، ضلع اعظم گڈھ، ۱۲/رجب ۱۳۵۶ھ۔

اس میں آپ نے اتباع کا لفظ بڑھایا ہے جو بہت صحیح ہے مگر اسوۂ حسنہ محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والتحیہ کے متعلق آپ یہ لکھتے ہیں:

''مسلمانو! قرآن مجید کی آیتوں سے جو بیان ہوئیں تم نے سمجھا ہوگا کہ اطاعت خدا اور رسول دو (۲) اطاعت نہیں ایک ہی اطاعت ''ما اُرسل'' کی، یعنی قرآن مجید کی ہے، جس کو خدا نے نازل فرمایا، آنحضرت علیہ الصلاۃ والسلام اس کی اطاعت اور اس کی تبلیغ کے مامور ہوئے، آپ نے اس کی کما حقہ اطاعت اور تبلیغ فرمائی تو یہی قرآن فرض، یہی سنت اور یہی آپ کا اسوۂ حسنہ ہوا'' (بلاغ الحق، ص: ۴۰)۔

حافظ صاحب!

ابراہیمی اسوہ میں آپ نے لفظ اتباع بڑھایا ہے مگر اسوۂ محمدی میں یہ لفظ چھوڑ گئے۔

سنیے! اتباع اپنے مضاف الیہ کے اقوال افعال کا مظہر ہوتا ہے، قرآن حکم نامہ ہے افعال نبویہ نہیں، ہمارا اور آپ کا اس امر پر اتفاق ہوگیا کہ حضرت ابراہیم اور حضرت محمد رسول اللہ علیہم السلام کا اتباع ضروری ہے، حضرت ابراہیم کا قول اور فعل تو قرآن مجید نے بتادیا کہ انہوں نے مشرکوں کو کہا تھا: ﴿إِنَّا بُرَءَٰٓؤُاْ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ﴾ [الممتحنۃ: ۴] یہ ان کے فعل کی حکایت ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فعل کی حکایت نہیں بتائی گئی، اس کی تلاش کہاں کریں، آپ بار بار کیوں یہ کہنے کی تکلیف فرماتے ہیں کہ یہی قرآن سنت یہی اسوہ حسنہ ہے، مگر اس امر پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے کہ قرآن تو ہدایت نامہ ہے اعمال نامہ نہیں ہے، ہمیں ضرورت اعمال نامہ کی بھی ہے تاکہ ہم ہدایت نامہ کے مطابق اس پر عمل کریں، جس کی تفصیل ہم نے: ﴿ٱتَّخَذْتُ مَعَ ٱلرَّسُولِ سَبِيلًا﴾ کے ماتحت کردی ہے، کیا مزے کی بات

ہے، جو آپ لکھتے ہیں کہ:

''آمین بالجہر کرو یا بالخفا، رفع یدین کرو نہ کرو'' (بلاغ الحق، ص:۱۲۱)۔

ہم آپ کا عقیدہ نہیں پوچھتے، ہم یہ پوچھتے ہیں کہ اسوۂ حسنہ کے اتباع کے لیے اس امر کی تلاش ضروری ہے یا نہیں ہے کہ آمین بالجہر ہو یا بالخفاء، رفع یدین ہو یا نہ ہو، کیوں کہ مسلمانوں کے فرقوں میں ان دونوں فعلوں کی بابت اختلاف ہے، اس لیے ہر وہ شخص جو اتباع اسوۂ حسنہ کرنا چاہے اس کا فرض ہے کہ معلوم کرے کہ صلاۃ نبوی کی کیا صورت تھی کیوں کہ اسے ڈر ہے کہ روز جزا میں اس بری جماعت میں داخل نہ ہو جاؤں جو کہیں گے: ﴿يَٰلَيۡتَنِي ٱتَّخَذۡتُ مَعَ ٱلرَّسُولِ سَبِيلٗا﴾ (الآیۃ)۔

حافظ صاحب!

آپ معاف فرمایئے، قرآن فہمی میں آپ کو بڑی ٹھوکریں لگتی ہیں، کیوں کہ آپ یا تو علوم آلیہ سے واقف نہیں یا اخوان یوسف کی صحبت میں بھول گئے ہیں یا دانستہ تجاہل کرتے ہیں، اس کی مثال آپ کے وہ استدلالات ہیں جو: ﴿وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا ٱلۡقُرۡءَانُ﴾ وغیرہ آیات سے آپ بارہا پیش کر چکے ہیں، اس میں غلطی آپ کو یہ لگتی ہے کہ آپ بیان واقعہ اور بیان حصر میں فرق نہیں کرتے، قرآن مجید کی بابت جہاں جہاں ''أوحي'' یا ''أوحینا'' وغیرہ الفاظ ارشاد ہوئے ہیں وہاں بیان واقعہ مقصود ہے بیان حصر نہیں، کیوں کہ حصر کے لیے الفاظ ''إنما'' یا ''ما مع إلا'' ہوتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ ہم اور آپ دونوں متفق ہیں قرآن مجید منزل من اللہ ہے اور اس کا نزول بواسطہ فرشتہ ہے، جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور حدیث شریف وحی خفی ہے، جس کا ثبوت ہم آیت: ﴿وَإِذۡ أَسَرَّ ٱلنَّبِيُّ﴾ [التحریم:۳] سے دے چکے ہیں اور آپ اسی کتاب کے صفحہ (۱۹) پر ایسے عقیدے کو بدعتی عقیدہ قرار دیتے ہیں، پس ہمارا آپ کا

اصلی اختلاف اس امر میں ہے کہ قرآن مجید وحی کے سوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے کوئی اور بھی ذریعہ علم الٰہی کا تھا یا نہیں۔ ہم بتا چکے ہیں کہ ضرور تھا، آپ ہمارے دلائل کو توڑ نہیں سکتے۔

(مزید ثبوت کے لیے ہمارا رسالہ ''حدیث نبوی'' ملاحظہ ہو)

حافظ صاحب!

آپ کی یہ بات بھی کیسی کمزور اور بودی ہے کہ:

''حدیث سے فرقہ بندی ہوئی'' (بلاغ الحق، ص: ۳۰)۔

حضرت مسیح علیہ السلام کا قول انجیل میں مذکور ہے کہ ظالم کو دوسرے کی آنکھ کا تنکا نظر آتا ہے اور اپنی آنکھ کا شہتیر بھی نظر نہیں آتا، آپ نے ''فرقہ بندی'' کو حدیثوں پر مبنی بتایا ہے، کیا اہل قرآن کے فرقے آپ سے مخفی ہیں؟ ذرا غور سے سنیے!

ایک گروہ اہل قرآن کا پانچ نمازوں کا قائل ہے اور قرآن ہی سے ثبوت دیتا ہے، غالباً آپ بھی انہی میں سے ہوں گے، ایک گروہ (ساکنان گوجرانوالہ) تین نمازوں کا قائل ہے، آپ کے امرتسری دوست دو ہی نمازوں کو فرض جانتے ہیں، گجرات (پنجاب) کے اہل قرآن الگ ہیں، ڈیرہ اسماعیل خاں کے الگ، لاہور کے الگ، رکعتوں میں اختلاف، وظائف اور اوراد میں اختلاف، الغرض مثال مشہور:

''نو قنوجی گیارہ چولہے'' ان پر صادق آتی ہے، حالاں کہ ان کی پیدائش جمعہ جمعہ آٹھ روز کی ہے۔ ع

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

حافظ صاحب!

میں یہ نہیں سمجھا کہ آپ نے قائلین حدیث کو طعنہ دیتے ہوئے یہ فقرہ کیوں لکھ دیا:

''دین میں امامت کا قصہ کھڑا کیا گیا بر بنائے قرآن نہیں بر بنائے حدیث حالاں کہ امامت کوئی منصب رسالت یا جزو رسالت نہیں، نہ خدا ورسول کا قائم کردہ کوئی منصب، امام تو کتاب مبین ہے'' (بلاغ الحق، ص:۲۹)۔

اس عبارت کو دیکھ کر اور آپ کی بالغ نظری کے ادعا کو ملحوظ رکھ کر گمان ہوتا ہے کہ یہ عبارت کسی غیر مصنف کی طرف سے مدخل ہے، کیوں کہ امامت رسالت کا جھگڑا تو ہم نے کھڑا نہیں کیا، ہاں امامت حکومت میں شیعہ سنی کی نزاع ضرور موجود ہے، وہ مصداق میں ہے نہ اصل مفہوم میں، اس امامت کا ثبوت حدیث کے علاوہ قرآن میں بھی موجود ہے، بنی اسرائل کا قصہ پڑھیے: ﴿إِذْ قَالُوا۟ لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ٱبْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَٰتِلْ فِی سَبِیلِ ٱللَّهِ﴾ [البقرۃ:۲۴۶] یہ ملک جس کے ہمراہ ہو کر بنی اسرائیل جہاد کرنے کی خواہش کرتے ہیں امام خلافت ہی تھے، جس کی بابت حدیث میں الفاظ وارد ہوئے ہیں، ''الإمامُ جُنَّةٌ، يُقاتَلُ مِن ورائِهِ''[1] اسی امام کو خلیفہ کہا جاتا ہے جس کی بابت ارشاد خداوندی: ﴿لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ﴾ موجود ہے، یہی امیر المومنین ہے جس کی شان میں: ﴿وَأُو۟لِی ٱلْأَمْرِ مِنكُمْ﴾ وارد ہوا ہے، پھر ہم نہیں سمجھتے کہ آپ ایسے امام کے لیے قرآن سے زیادہ کیا ثبوت چاہتے ہیں؟

بھلا حافظ صاحب! آپ سے کوئی پوچھے قرآن کے حق میں امام مبین کہاں وارد ہے تو آپ کیا ثبوت دیں گے، قیاس ہم نہیں سنیں گے، آپ سے الفاظ صریحہ طلب کریں گے، یہ خوب ہے کہ آپ جو چاہیں کہہ دیں وہ تو نص قرآن اور ہم جو پیش کریں وہ ہو القاء شیطان یا ہذیان۔ کیا سچ ہے ؎

---

[1] صحیح بخاری: کتاب الجهاد، حدیث:۲۹۵۷، صحیح مسلم: کتاب الامارة، باب فی الامام اذا امر بتقوی الله وعدل کان له أجر، حدیث:۱۸۴۱۔

شیخ چپ ہو تو توکل ٹھہرے
ہم جو چپ ہوں تو مسٹری کہلائیں

ناظرین:

حافظ صاحب نے محدثین کرام کے قواعد کا ذکر کرتے ہوئے اپنے خیالات اور اپنے اصولوں کو ان سے برتر بتایا ہے، اس لیے کتاب ''بلاغ الحق'' کے دو حصے ہیں، ایک حصے میں تو یہ بحث ہے کہ نبی علیہ السلام کی وحی سوائے قرآن کے بھی تھی یا نہیں، اس سے تو ہم فارغ ہو گئے، دوسرا حصہ کتاب کا تنقید احادیث کے متعلق ہے جس کی بابت حافظ محب الحق صاحب نے یوں بحث شروع کی ہے:

''(۱) مصنفین احادیث نے حدیث کی جانچ کے جو شرائط مقرر کئے ہیں ہر چند وہ نیک نیتی پر مبنی ہیں، مگر ''مَا یُوحٰی'' نہیں ہیں، اور مبنی برعقیدت ہیں، راوی کے ظاہر کو اپنے وہم وگمان کے مطابق دیکھ سکتے ہو، باطن کو نہیں دیکھ سکتے، پھر ہزاروں راویوں کے حالات جو جانچے نہیں جا سکتے مبنی بر شہرت ہوں ان پر دین کی بنا قائم کرنا ہندوؤں کی تقلید ہے کہ اسی بنا پر ان کے لاکھوں دیوتا ہوئے تم ان کے تذکروں سے فائدے اٹھا سکتے ہو مگر ان پر دین کی بنا قائم کرنا مزار پرستی سے کیا کم ہے، اس لیے ان شرائط سے جو قطعی نہیں شخصی ہیں اختلاف کا حق ہر مسلمان کو ہے، وہی مجھ کو بھی ہے، مجھے ان شرائط سے اختلاف ہے'' (بلاغ الحق، ص: ۳۴۔۳۵)۔

اہلحدیث:

ہم آپ کا حق نہیں چھینتے، مگر بحکم: ﴿فَسْـَٔلْ بِهِۦ خَبِيرًا﴾ [الفرقان:۵۹] علم اور معرفت سے بات کیجیے: ﴿رَجْمًۢا بِٱلْغَيْبِ﴾ [الکھف:۲۲] نہ کیجیے ورنہ ہم نہ سنیں گے، محدثین نے جن راویوں کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا ہے آپ کو ان کے خلاف کچھ علم ہو تو پیش کیجیے اور جن راویوں کو کم درجہ بتایا ہے آپ اپنے علم سے ان کو اعلیٰ درجہ دیجیے، مگر علم

سے دیجیے محض خیال اور قیاس کے طور پر نہ کہیے، آپ ان راویوں کی بھی فہرست دیجیے جن کے حالات جانچے نہیں جا سکتے، میں آپ کو بتا دوں کی محدثین کرام ایسے راویوں کو مجہول الحال کہا کرتے ہیں ان کی روایت منفردہ صحیح نہیں سمجھتے، پھر آپ کیوں فرماتے ہیں کہ ان پر دین کی بنا قائم کرنا ہندوؤں کی تقلید ہے، ہندوؤں کی تقلید تو کوئی نہیں کہے گا کیوں کہ ان کی روایت ہی معتبر نہیں، البتہ خطرہ ہے کہ آپ کے دعوی کو اہل اعلم آیت مندرجہ ذیل کا مصداق سمجھیں گے: ﴿إِنَّمَا يَفْتَرِي ٱلْكَذِبَ ٱلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِـَٔايَـٰتِ ٱللَّهِ﴾ [النحل:۱۰۵] جو لوگ اللہ کی آیتوں کو نہیں مانتے وہی جھوٹ کا افترا کرتے ہیں۔

محدثین کرام آپ کے اس مقولے کو سن کر کہتے ہوں گے ؎

کس روز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کئے

قسط:۹

تصدیق الحدیث

''بیان الحق بجواب بلاغ الحق''

(۹ر شعبان ۱۳۵۶ھ = ۱۵/ اکتوبر ۱۹۳۷ء)

گذشتہ نمبر میں ''بلاغ الحق'' کے (ص: ۴۳) تک جواب ہو چکا ہے، آج ناظرین اس سے آگے پڑھیں، آگے چلئے آپ فرماتے ہیں:

''ہم کو دکھانا یہ ہے کہ حق و باطل کے جانچنے کی کون سی ترازو ہمارے پاس خدا کی دی ہوئی ہے، ایک تو عقل ہے کہ اسی کے بل بوتے پر ہماری ساری زندگی کے کاروبار جاری ہیں اور اسی ترازو پر ہم ہر برے بھلے کو جانچا کرتے ہیں، مگر اس میں ایک عیب بھی ہے کہ عقل کی بیشی و کمی یا اس کی رفتار میں صحت اور غلطی سے ہم جانچ میں غلطی بھی کر جاتے ہیں اور دھوکے بھی کھاتے ہیں، چوں کہ عقل اپنے ماحول سے متاثر رہتی ہے اور کبھی خاندان کے اثر سے، کبھی صحبت کے اثر سے، کبھی فرقہ پرستی کے تعصب سے، کبھی نفسیات کی دیوانگی سے ٹھوکریں کھاتی رہتی ہے، اس لیے یہ کامل بھروسہ کی چیز نہیں، پھر بھی یہ ناگزیر ہے کہ اس سے گریز بھی ناممکن'' (بلاغ الحق، ص: ۴۵)۔

اہلحدیث:

یہ اقتباس آپ کا من وعن ہمیں منظور ہے۔ ع

ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی

آگے آپ فرماتے ہیں:

''دوسری ترازو حق و باطل کی جانچ کی جو خدا نے دی ہے وہ قطعی اور وہ کلام اللہ ہے: ﴿اَللّٰہُ

ٱلَّذِيٓ أَنزَلَ ٱلۡكِتَٰبَ بِٱلۡحَقِّ وَٱلۡمِيزَانَ ﴾[الشوریٰ:۱۷] [1] ''وہ خدا ہی ہے جس نے قرآن نازل فرمایا جو حق ہے اور حق و باطل کی ترازو ہے''، یہی خدا کی دی ہوئی ترازو ہے اسی ترازو پر حدیثوں کو جانچنا تھا، جو تول میں اتر جائیں اور قرآن کے احاطہ کے اندر آجائیں تو وہ ایسی قطعی ہوں گی کہ ان کا منکر قرآن کا منکر، رسالت کا منکر اور کافر ہوگا'' (بلاغ الحق،ص:۳۵)۔

اہلحدیث:

یہ ترازو بھی منظور ہے''آمَنّا وَصَدّقنا فَاكْتُبْنا مَعَ الشّاهِدِينَ''۔ اس سے آگے آپ فرماتے ہیں:

''اس لیے ہماری حدیثوں کو بغیر اس کے کہ راوی کو جانچیں، روایت کو جانچیں، اسماورجال کی کتابوں کو قرآن کے بدلے ترازو بنائیں اور ہزاروں راویوں کی نسبت اپنی تحقیقات کو عقیدتاً قطعی سمجھیں اور اس پر ایمان لانے اور منوانے کے لیے کوششیں کریں، قرآن پر کیوں نہ پرکھ لیں'' (بلاغ الحق،ص:۳۵)۔

اہلحدیث:

بس یہی مبحث اصلی ہے اور یہی آپ کے لیے مزلۃ الاَقدام ہے، معاف فرمایئے آپ نے اس میں اس امر پر غور نہیں فرمایا، آپ جس ترازو کو میزان حق و باطل قرار دے چکے ہیں خود اسی ترازو کو توڑ رہے ہیں، راویوں کے جانچنے کے بغیر حدیث کو جانچنا اس کی صورت کیا ہے؟

سنیے! قرآن مجید نے راویوں کے جانچنے کی خود تعلیم دی ہے، ارشاد ہے: ﴿ إِن جَآءَكُمۡ فَاسِقُۢ بِنَبَإٖ فَتَبَيَّنُوٓاْ ﴾[الحجرات:۶] [2] اس ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ مخبر صالح کی

---

[1] اصل نسخہ میں اس آیت کی ابتداء:''هو الذی انزل---'' سے ہے جو واضح طباعتی غلطی ہے۔

[2] کوئی بے دین آدمی تمہیں کوئی خبر بتائے تو اس کی تحقیق کرلیا کرو، بے تحقیق نہ مانا کرو۔ (مؤلف)۔

خبر کو صحیح سمجھو اور غیر صالح کی خبر کو جانچو، کیا یہ راویوں کی تنقید نہیں اور سنیے:
﴿وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنكُمْ﴾ [الطلاق:۲] میں (دو مرد صالح گواہ کرلیا کرو) یہ مرد صالح جب گواہی دیں گے تو قاضی ان کی گواہی کو قبول کرے گا، کیوں؟ اس لیے کہ یہ مرد صالح ہیں، اور سنیے!

﴿فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ﴾ [البقرة: ۲۸۲] [1]

محدثین کرام نے جو اصول تنقید روایت کے لیے بنائے ہیں وہ قرآن مجید کی ان آیات اور ان جیسی اور آیات سے مستنبط کئے ہیں، مگر حافظ صاحب مع اخوان یوسف ان سب اصولوں کو بے ضرورت قرار دیتے ہیں، اس پر ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیں ؎

اے کہ آگاہ نۂ عالم درویشاں را
تو چہ دانی کہ چہ سودائے سراست ایشاں را

کس قدر دور از صداقت یہ مقولہ ہے کہ ''اسماء الرجال کی کتابوں کو قرآن کے بدلے ترازو نہ بنائیں''۔

ناظرین:

ہم نے بتادیا ہے کہ محدثین نے جو قواعد بنائے وہ قرآن مجید کی ہدایت کے ماتحت بنائے اور حافظ صاحب ان کو قرآن کے بدلے قرار دیتے ہیں، ع:

ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا

---

[1] اگر دو مرد گواہ نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بناؤ، جن کو تم دین داری کی وجہ سے پسند کرو، دو عورتیں اس لئے کہ ایک ان میں کی بھول جائے تو دوسری یاد دلائے۔ (مؤلف)۔

آگے چلئے۔آپ فرماتے ہیں:

’’حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ ہم نے بیس ہزار (۲۰۰۰۰) عورت ومرد سے روایت کی ہے اتنے راویوں کا جانچنا دشوار ہی نہیں بلکہ محال ہے، میں بیس برس تک ایک شخص کو بہت ہی سچا سمجھتا رہا، اس سے ہمیشہ صحبتیں رہیں، اس کے بعد معلوم ہوا کہ یہ اول درجہ کا جھوٹا ہے، آج ریل کی سہولت کے باوجود تم ایک آدمی کی نسبت بھی دعویٰ نہیں کر سکتے کہ اس کی نسبت میری رائے قطعاً صحیح ہے، اس لیے حدیث کے جانچنے کے لیے قرآن کے سوا اور کوئی ترازو نہیں، یہی ترازو رسول نے بھی بتائی ہے، جس کو میں آخر میں لکھوں گا‘‘ (بلاغ الحق، ص:۳۵، ۳۶)۔

اہلحدیث:

حافظ صاحب !اپنے اس اقتباس کو سامنے رکھ کر ہماری پیش کردہ آیات: ﴿وَأَشْهِدُواْ ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنكُمْ﴾ اور ﴿مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ ٱلشُّهَدَآءِ﴾ پر عمل کرنے کی صورت بتائیے، کیا جن دو شخصوں کو آپ ﴿ذَوَىْ عَدْلٍ﴾ اور ﴿تَرْضَوْنَ مِنَ ٱلشُّهَدَآءِ﴾ کے ماتحت گواہ بتائیں گے تو تھوڑے دنوں بعد ان کا غیر ذوی عدل ہونا محال ہے، پس جو جواب آپ کا ہوگا وہی ہمارا۔

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

مگر محدثین پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوسکتا کیوں کہ انہوں نے یہ لازم نہیں قرار دیا کہ جس کو مثلاً ۱۷۶ھ سنہ میں ثقہ قرار دیا جائے، اس کا انتہا عمر تک ثقہ ہی رہنا لازمی ہو، بلکہ بہت سے راوی ایسے ہیں جن کی نسبت محدثین کی تصریحات ملتی ہیں کہ اخیر عمر میں ان پر نسیان غالب آ گیا تھا یا صحبت غیر صالحہ سے متاثر ہو گئے تھے وغیرہ وغیرہ، اس لیے محدثین کا یہ اصول ہے کہ جرح مفصل توثیق پر مقدم ہے اور اگر کوئی محدث کسی راوی کی نسبت عیوب کی نفی کرے اور متاخر یا اس کا ہم عصر اسی کا عیب ثابت کرے

جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے تو محدثین کا قاعدہ یہ ہے:۔

’’الْمُثْبِتُ مُقَدَّمٌ عَلى النَّافِي‘‘(بخاری)①۔

آگے چلئے، آپ لکھتے ہیں:

’’آپ بشیر ونذیر تھے تو انذار بھی آپ قرآن مجید ہی سے کرنے کے مامور تھے:﴿وَأَنذِرْ بِهِ ٱلَّذِينَ يَخَافُونَ أَن يُحْشَرُوٓا۟ إِلَىٰ رَبِّهِمْ﴾[الانعام:۵۱] (جو ایک دن خدا کے حضور میں حاضر ہونے سے ڈرتے ہیں ان کو قرآن مجید سے انذار کرتے رہو) اس لیے قرآن سے فاضل انذار بھی رسول کا انذار نہیں، خدا کو ڈراؤنا نہ بنادو کہ اس کی رحمت پر اس کی قہاریت سبقت لے جائے، جزاوسزا تو اپنے اعمال کا نتیجہ ہے، اس کو رحیم سمجھو اور اس پر محبت کے پھول نچھاور کرو کہ وہ اسی کے لائق ہے، خدا ہر قوم پر عذاب دینے کو کھڑا نہیں ہے بلکہ ساری دنیا پر تو ہر حال میں اس کی رحمت ہی برس رہی ہے‘‘(بلاغ الحق، ص:۳۶)۔

ناظرین!

حافظ محب الحق صاحب کے معیار قرآنی کو ملاحظہ کر کے کوئی صاحب ہمیں بتائیں کہ اس کو معیار سے کیا تعلق، حافظ صاحب نے اتنا بھی غور نہیں فرمایا کہ معیار اور ذی معیار میں اثنینیت (دوئی) ہوتی ہے، اس اصول سے آپ کا فرض تھا کہ کوئی حدیث ایسی پیش کرتے جو انذار قرآنی سے تناقض یا تضاد رکھتی تا کہ معلوم ہوسکتا کہ یہ حدیث ترازو قرآن پر پوری نہیں، اس لیے صحیح نہیں۔

حافظ صاحب:

موافقت اور مخالفت باب مفاعلۃ ہے جو دو میں ہوا کرتا ہے، آئندہ اس اصول کو ملحوظ رکھئے گا۔اور آگے چلیے:

---

① جزء رفع الیدین۔

’’اسی طرح عقل کے خلاف اور آپ کی منزلت کے خلاف بھی حدیث صحیح نہیں ہوسکتی جیسے کدو کا ذبح کرنا، یا عملیات وغیرہ کی حدیثیں چاہے جن ہو یا موکل کے تابع کرنے کو ہوں یا خدا کو مسخر کرنے کو، یا طبابت کا مطب کھولنا کہ یہ سب آپ کے مقدس مسلک سے باہر ہے یا مردہ کی سننے کی حدیثیں، یا مرنے کے بعد ایمان لانے کی حدیثیں جو قرآن کے خلاف ہیں، عقل کے بھی خلاف ہیں، رسول ﷺ کی نہیں ہوسکتیں، آپ مجسم عقل اور سراپا قرآن مجید تھے‘‘ (بلاغ الحق، ص:۳۶)۔

اہلحدیث:

اس اقتباس سے معلوم نہیں ہوتا کہ آپ کا روئے سخن کس جماعت کی طرف ہے، کون کدو ذبح کرتا ہے، کون موکلوں کو تابع کرتا ہے، کون مردوں کے سننے کا قائل ہے، یہاں کسی شخص یا فرقے کی بحث نہیں بلکہ بحث ایک اصول کی ہے، آپ کو چاہیے تھا ایسی حدیثیں صحیح سند کے ساتھ پیش کر کے جواب طلب کرتے، مگر آپ نے ایسا نہیں کیا اور اپنے منصب (ادعا) سے الگ ہو کر بھول بھلیاں میں پڑ گئے ؎

ہم بھی قائل تیری نیرنگی کے ہیں یاد رہے
او زمانے کی طرح رنگ بدلنے والے

ناظرین کرام!

حافظ صاحب کا نسیان ملاحظہ ہو۔ آپ نے اقتباس نمبر اول میں عقل کو ترازو بنانے سے انکار کیا اور اس اقتباس میں عقل ہی کو معیار اول بتایا، غالباً حافظ صاحب نے فطری طور پر ارشاد خداوندی کی تصدیق فرمائی: ﴿لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا﴾ [الحج:۵] بوڑھوں پر نسیان غالب ہوجاتا ہے۔

قسط:۱۰

تصدیق الحدیث

''بیان الحق بجواب بلاغ الحق''

(۱۶/شعبان ۱۳۵۶ھ = ۲۲/اکتوبر ۱۹۳۷ء)

گذشتہ پرچہ میں کتاب ''بلاغ الحق'' کے (ص:۳۶) کے ایک حصہ کا جواب درج ہوا ہے، آج باقی کا جواب معروض ہے۔

آگے چل کر حافظ صاحب فرماتے ہیں:

''ہاں جو حدیثیں قرآن کے مطابق ہیں اور ایسی بھی بہت ہیں مگر قوم کو فرقہ پرستی سے فرصت کہاں کہ ادھر توجہ کرے، ایسی حدیثوں کو چن لو کہ ایسی حدیثوں کی نسبت راوی وروایت سے بحث نہ رہے گی''۔

''قرآن کی شہادت کافی ہوگی اور وہ قطعی ہوگی گویا ظنی نہ رہے گی'' (بلاغ الحق، ص:۳۶، ۳۷)۔

اہلحدیث:

اس ترازو کو سمجھنا ہر ایک اہل علم کا فرض ہے ہم اس قسم کے فقرات منکرہ حدیث پارٹی سے ہمیشہ سنتے ہیں اور سن کر ہنس دیتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ ایسے قول کے قائل اگر علم حدیث کا انکار کریں تو تعجب نہیں، بھلا اس میں کسی معیار کی تعریف یا حقیقت معلوم ہوسکتی ہے، ایک لفظ ہے جو ان لوگوں کی زبان پر بطور مشق کے چڑھا ہوا ہے کہ ''جو حدیث قرآن کے مطابق ہو''۔

حافظ صاحب! مطابق کے معنی دو ہیں ایک یہ کہ جوحکم قرآن بتائے وہی حدیث بتائے اس کوتو آپ حدیث رسول سمجھنے میں تأمل نہیں کریں گے، یہ تعریف گلستاں بوستاں وغیرہ اخلاقی کتابوں پر بھی صادق آئے گی۔ مثلاً شیخ سعدی کہتے ہیں ؎

چوں ردمے نہ گردد خدنگ قضا

سپر نیست مر بندہ را جز رضا

کہ کیا اس کو بھی آپ حدیث رسول سمجھیں گے؟

اس قسم کے مقولات اخلاقیہ کواحادیث رسول بتانا حقیقت میں ان لوگوں کا کام ہے جن کی شان میں یہ ارشاد خداوندی وارد ہے: ﴿أَمْ لَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ فَهُمْ لَهُ مُنكِرُونَ﴾ [المومنون:٦٩] [1]۔

دوسرے معنی مطابق کے ''غیرمخالف'' ہیں، یعنی ایسی حدیثیں آپ کے نزدیک صحیح ہیں جوقرآن مجید کی تعلیم سے تناقض یا تضاد نہ رکھتی ہوں، ہم اس کو مانتے ہیں مگر یہ نہیں کہ محض عدم تناقض یا عدم تضاد اس قول کوحدیث رسول بنانے کے لیے کافی ہو،نہیں ہرگزنہیں، بلکہ ہرحدیث کے لیے اسناد کا ہونا ضروری ہے یہ اسناد (معرفت راویان حدیث) ہی ایک چیز ہے جس کی وجہ سے آپ نے علم حدیث کوعلم تاریخ سے برترتسلیم کیا ہے۔

اس کے سوا مطابق یا غیر مطابق کے معنی کچھ اور ہوں تو آپ کے بیان اور ایسی حدیثوں کی فہرست کا انتظار ہے آپ اپنے اعوان وانصار کوجمع کرکے ایسی حدیثوں کی مکمل فہرست ہمیں پہنچادیں ہم آپ کے شکرگذار ہوں گے، سردست ہم اتنا عرض کرتے ہیں: ﴿فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا تُنظِرُونِ﴾ [یونس:۷۱]۔

[1] کیا انہوں نے رسول کو پہچانا نہیں ہے کہ اس کے منکر ہو رہے ہیں)۔(مؤلف)۔

ہاں تامل دم ناوک فگنی خوب نہیں
میری چھاتی ابھی تیروں سے چھنی خوب نہیں

ہاں آپ کی یہ شکایت بھی بے معنی ہے کہ:

''قوم کو فرقہ پرستی سے فرصت کہاں کہ ایسی حدیثوں کو چن لے''۔

صاحب من! محدثین نے ایسی حدیثوں کی فہرست پیش کردی ہے، صحاح، حسان، ضعاف، موضوعات، مبہمات، مجملات وغیرہ وغیرہ اقسام جمع کررکھی ہیں، مگر آپ اور آپ کی پارٹی ان کی صحبت سے دور اور کتب سے ناواقف ہونے کی وجہ سے جو چاہیں سو کہیں ہم اس کے جواب میں یہی عرض کریں گے ؎

بیاد بزم رنداں تا بہ بینی عالمے دیگر
بہشتے دیگر وابلیسے دیگر آدمے دیگر

آگے چل کر قرآن وحدیث کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حدیثیں چوں کہ قرآن مجید کی قطعی معیار پر نہیں جانچی گئیں جو خدا کی دی ہوئی ترازو ہے، اس لیے ان کو تاریخ اسلام کہو، مگر بلحاظ تحقیقات تاریخ سے اعلی وارفع، تاریخ میں چھان بین کا وہ حق بھی نہیں ادا کیا گیا ہے جس کو ایک حد تک حدیث نے ادا کیا ہے اس لئے حدیث کی کتابیں اگرچہ تاریخ ہیں مگر ان کی حیثیت تاریخ سے بلند ہے اس پر بھی بلحاظ تواتر وقطعیت قرآن کے مقابلہ میں نہیں آسکتیں اس لیے حدیث کو قرآن سے نہ ٹکراؤ، بہ ایں نگہداشت حدیث سے جو فوائد تم حاصل کرسکتے ہو کرو کون منع کرسکتا ہے'' (بلاغ الحق، ص:۳۷)۔

اہلحدیث:

اس اقتباس کو ہم مجمل جواب میں نقل کرکے مفصل بحث کرچکے ہیں، یہاں پر صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ ہم اس فقرے کو تشنہ تشریح سمجھتے ہیں جو یہ ہے کہ حدیثیں قرآن مجید

کی قطعی معیار پر نہیں جانچی گئیں، ہمارا تو یقین ہے کہ معیار قرآنی پر جانچی گئی ہیں وہ معیار ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں، اب دوبارہ عرض کرتے ہیں، ایک معیار یہ ہے: ﴿إِن جَآءَكُمۡ فَاسِقُۢ بِنَبَإٖ فَتَبَيَّنُوٓاْ أَن تُصِيبُواْ﴾ [الحجرات:٦] فاسق بے دین کاذب اور بدعمل شخص کی روایت معتبر نہ سمجھی جائے، چنانچہ محدثین کی تصریحات اس بارہ میں موجود ہیں۔

دوسرا معیار یہ ہے:

﴿وَجَآءَ رَجُلٞ مِّنۡ أَقۡصَا ٱلۡمَدِينَةِ يَسۡعَىٰ﴾ [القصص:٢٠]۔

''شہر کی انتہا سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا''۔

اس معیار کے ماتحت مرد صالح کی خبر معتبر سمجھی جائے، اس کو خبر واحد کہتے ہیں، اس کے سوا کوئی اور معیار قرآنی آپ کے ذہن میں ہو تو کھلے لفظوں میں اسے بیان کیجیے دل میں رکھنے سے کیا فائدہ۔

اے منکران حدیث!

ہم نے آپ لوگوں کی بہت سی باتیں سنیں اور غالباً آئندہ بھی سنیں گے، اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اس بحث کو ایک مرکز پر لے آئیں جو یہ ہے:

اول: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ذریعہ علم الٰہی قرآن مجید کے سوا کوئی اور بھی تھا۔

دوم: اگر تھا تو ہم تک پہنچنے کا ذریعہ حسب روایت کیا ہونا چاہیے۔

آؤ! بس انہی دونوں باتوں پر ہم سر جوڑ کر بیٹھیں اور سوچیں اور درمیان میں قرآن مجید رکھ لیں کہ جس بات کی قرآن مجید ہدایت کرے وہ اختیار کریں، مگر قرآن کے ساتھ برادران یوسف کا سا برتاؤ نہ کریں کہ کسی اہل دل ثالث کو یہ کہنے کا موقعہ ملے ؎

گر تو قرآں بریں نمط خوانی
ببری رونقِ مسلمانی

حافظ صاحب!

ہم نے آپ کا یہ فقرہ بھی نہیں سمجھا جو مذکورہ اقتباس میں ہے کہ:

''حدیثیں بلحاظ تواتر وقطعیت قرآن کے مقابلے میں نہیں آسکتیں''۔

ہم نے کب کہا کہ حدیثیں متواتر یا قطعیت کے درجے تک پہنچتی ہیں، یہ آپ نے کیوں لکھا یا یونہی ایک لفظ زبان پر جاری ہے جو موقعہ بے موقعہ نکلتا رہتا ہے؟ ایسا ہی آپ کا دوسرا فقرہ بھی ہم جیسوں کی سمجھ سے باہر ہے۔

''حدیث کو قرآن سے نہ ٹکراؤ''۔

کون ٹکراتا ہے؟ حافظ صاحب! آپ نے اس فقرہ کے معنی کچھ سمجھے بھی؟ آخر اردو فقرہ ہے، ''حدیث کو قرآن سے ٹکرانا''، ہم تو اس ٹکرانے کے معنی یہی سمجھتے ہیں کہ قرآن کے مقابلے میں مخالف حدیث کو پیش کرنا، مقام مسرت ہے کہ ہم ایسا نہیں کرتے، ہاں کسی حدیث کو جو بظاہر قرآن کے مخالف معلوم ہوتی ہے تطبیق دے کر قرآن کے موافق کرتے ہیں جیسے کہ آیاتِ متخالفہ کو متوافق بنانے کی کوشش کرتے ہیں، غالباً آپ چونک پڑے ہوں گے کہ آیات بھی متخالف ہیں، اس لیے میں آپ کو ایک دو مثالیں سنا دوں:

۱۔ ﴿يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ أَيۡدِيهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ﴾ [البقرۃ:۲۵۵]۔

یہ آیت خدا تعالیٰ کے عالم کل ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔

۲۔ ﴿لِّيَعۡلَمَ أَن قَدۡ أَبۡلَغُواْ رِسَٰلَٰتِ رَبِّهِمۡ﴾ [الجن:۲۸]۔

اس آیت سے علم باری کے حدوث کا ثبوت ملتا ہے۔

(وغیر ذلک من الآیات الکثیرۃ)

جس طرح آپ اور ہم ایسے تخالف کو رفع کرکے توافق پیدا کرتے ہیں اسی طرح

حدیثوں کے تخالف کو ہم رفع کیا کرتے ہیں۔

شکریہ!

ہم حافظ صاحب کے شکر گذار ہیں کہ آپ نے ہم کو اجازت دی ہے کہ:

''بایں نگہداشت حدیث سے جو فوائد تم حاصل کر سکتے ہو کرو کون منع کرتا ہے''۔

حافظ صاحب! ہم آپ کی اجازت کے بڑے شکر گزار ہیں، لیجیے ہم ان فوائد میں سے ایک فائدہ یہ حاصل کرتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''تركتُ فيكم أَمْرَيْنِ لن تَضِلُّوا ما تَمَسَّكْتُمْ بهما: كتابَ اللهِ وسُنَّتي''[1]،[2] ۔

حافظ صاحب!

میں اس وقت آپ کی پیرانہ سالی اور موہنی صورت سامنے رکھ کر بھرے دل سے عرض کرتا ہوں کہ آیئے ہم دونوں مل کر اس حدیث پر عمل کریں دنیا کو بتا دیں کہ۔

ماقصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم

از ما جز حکایت مہر و وفا مپرس

حافظ صاحب!

آپ کے اقتباس مندرجہ ذیل نے آپ کی نسبت بہت سا حسن ظن پیدا کر دیا، ناظرین کی خاطر ہم اسے پورا نقل کرتے ہیں، حدیثوں سے جن فوائد کے حاصل کرنے کی آپ نے اجازت دی ہے ان کی تمثیلات آپ نے بیان فرمائی ہیں:

''مثلاً تاریخی حیثیت سے بہت سے (۱) مصطلحات قرآنی حدیث سے معلوم ہوتے ہیں، جیسے

---

① ارشاد ہے: میں تم میں دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں جب تک تم ان سے تمسک کرتے رہو گے گمراہ نہ ہو گے، اللہ کی کتاب اور اپنی سنت (طریقہ عمل)۔ (مؤلف)۔

② مؤطا امام مالک: (۸۹۹/۲)، حدیث: ٦٧٨۔

لغات مصطلحات سے،تو یہ ہم جاہلوں کے لیے جوعرب نہیں،عربی زبان کے محتاج ہیں،نعمت عظمیٰ ہیں،(۲) دوسرے اس زمانہ کے تمدن پر روشنی پڑتی ہے۔(۳) بہتیرے واقعات تاریخی حیثیت سے بہ نسبت عام تاریخوں کے بہ ظن غالب زیادہ قریب بہ صحت ہیں۔

(۴) چوتھے بہت سے مقولات فلسفہ ہیں،ممکن ہے راوی نے نفع رسانی خلق کے خیال سے آپ کی طرف نیک نیتی سے منسوب کر دیا ہو،(۵) یا بلحاظ تکمیل بشریت آپ نے فرمایا بھی ہو،(۶) بالخصوص وہ واقعات اور صفات جو تعمیل ہدایت ربانی میں آپ سے ظہور میں آئے وہ تو قرآن سے باہر نہیں،(۷) اگر وہ قرآن مجید کے بالکل مطابق ہیں تو بلاشبہ وہ موجب فیوض و برکات ہیں،بہرحال خدا اور رسول کی عظمت وجلالت اور فرق مراتب کی نگہداشت کرتے ہوئے تم فائدہ اٹھا سکتے ہو تو اٹھاؤ''۔(بلاغ الحق،ص:۷۳)

اہلحدیث:

نمبر اول: مصطلحات قرآنی سے مراد آپ کی نماز، روزہ، حج، وغیرہ ہے،مگر یہ یاد رہے کہ سب مصطلحات اصل معنی کے لحاظ سے خاص ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عموم قرآنی کی تخصیص حدیث کے ساتھ کرنا آپ کے نزدیک جائز ہے، ورنہ ایسی مصطلحات جو بے تخصیص مستعمل ہوں ہمیں بتائیے۔

دوم: اس زمانے کے تمدن کا ثبوت خود قرآن مجید سے ملتا ہے اس کی تفصیل حدیثوں میں آتی ہے۔

سوم: واقعات تاریخی حیثیت سے قریب بصحت ہیں،مثلاً واقعہ رجم ماعز اسلمی، واقعہ انعقاد خلافت،عدم توریث نبی وغیرہ۔

قسط:۱۱

تصدیق الحدیث

''بیان الحق بجواب بلاغ الحق''

(یکم رمضان ۱۳۵۶ھ = ۵ر نومبر ۱۹۳۷ء)

گذشتہ پرچے میں ''بلاغ الحق'' (ص: ۳۷) سے سات نمبر نقل ہوئے ہیں جن میں سے تین نمبروں کے جوابات دیئے گئے ہیں، آج چوتھے نمبر سے جواب درج کیا جاتا ہے، ناظرین ۲۲ را کتوبر کا پرچہ سامنے رکھ کر یہ قسط مطالعہ فرمائیں:

چہارم کی مثال ہمیں معلوم نہیں آپ بتائیے۔

پنجم: تکمیل بشریت کرنے کے لیے قرآن مجید کافی تھا جس نے: ﴿أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾ [المائدة: ۳] کہہ کر تکمیل بشریت کا فرض جو اپنے ذمے لیا تھا ادا کر دینے کا اعلان کیا، ہاں آپ کی مراد مزید تکمیل ہو تو ہم بھی مانتے ہیں مثلاً فرائض کے ساتھ سنتیں اور نوافل پڑھنا اور رمضان میں تراویح کا پڑھنا، مزید تکمیل بشریت ہے، کیا آپ بھی اس کے قائل ہیں؟ اگر ہیں تو مبارک!

ششم: تعمیل ہدایت میں جو باتیں ظہور میں آئیں وہ قرآن سے باہر نہیں، مرحبا! جزاک اللہ!! ہم نے آپ کے اس فقرہ سے جو سمجھا وہ یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمان خداوندی: ﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ﴾ کی تعمیل کس طرح کی اس میں آمین، رفع یدین اگر کی تھی تو وہ نماز مع ان افعال کے قرآن کے اندر سمجھی جائے، ان کے علاوہ جو کچھ بھی نماز کے اندر کیا تکبیر تحریمہ سے لے کر سلام تک وہ سب قرآن میں داخل اور

قرآن کی تعمیل ہے۔

پھرآپ ایسی بے پرواہی کیوں فرماتے ہیں کہ:

''آمین بالجہر کرے نہ کرے، رفع یدین کرے نہ کرے'' (بلاغ الحق،ص:۱۲۱)۔

کیاایسے افعال کی نسبت جوبقول آپ کے قرآن کے اندر ہیں ایسی بے اعتنائی ؎

اللہ رے ایسے حسن پہ یہ بے نیازیاں
بندہ نواز آپ کسی کے خدا نہیں

ہفتم: نمبرہفتم نمبرششم کے خلاف ہے، کیوں کہ نمبرششم کوآپ نے قرآن سے باہر نہیں فرمایا، جب وہ قرآن سے باہرنہیں توعین قرآن ہوا۔ پھراس پر یہ تشکیک پیدا کرنا کہ اگر وہ قرآن کے بالکل مطابق نہیں تو........

حافظ صاحب!

اگر یہ ذہول (نسیان) نہیں تو آپ فرمایئے کہ جو چیز قرآن کے اندر ہے اس سے باہر نہیں اس پر بھی قرآن مجید کے مطابق یا غیر مطابق کا سوال ہوسکتا ہے، پھر یہ آپ نے کیا کہہ دیا؟۔

حافظ صاحب! آئندہ تصنیف کرتے ہوئے کسی ایسے عالم کواپنا مشیر بنالیا کریں جو علم اصول ومعقول سے واقف ہو، ورنہ یادرکھیے ''اہلحدث'' کا نوٹس ہے کہ:

سنبھل کے رکھیو قدم دشت خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

بہرحال! آپ کے ہم شکر گذار ہیں کہ آپ نے اتباع سنت نبویہ کوموجب فیوض و برکات تسلیم فرمایا: ع:

اے وقت توخوش باد کہ وقت ماخوش کردی

حافظ صاحب کی روایت:

حافظ محب الحق صاحب نے شاید سنے سنائے یہ روایت لکھ دی ہے کہ:

''ستكثر الأحاديث بعدي فإذا روى لكم حديث عني فأعرضوا على كتاب الله فما وافقه فاقبلوه وما خالفه فردوه''یعنی عنقریب ہمارے بعد بہت حدیثیں روایت کی جائیں گی، جب کوئی حدیث روایت کی جائے کہ ہم نے یہ کہا تو اس کو کتاب اللہ کے آگے پیش کرو اگر موافق ہو قبول کرو ورنہ رد کردو، بخاری میں بھی یہ حدیث موجود ہے جیسا کہ ''توضیح تلویح'' میں لکھا ہے'' (ص:۳۹)۔

حافظ صاحب!

توضیح تلویح[1] کے مصنف تو ہمارے سامنے نہیں ہیں البتہ آپ ہیں، اس لیے آپ ''صحیح بخاری'' میں اس حدیث کا مکمل پتہ دیجیے ہم آپ کو منہ مانگا انعام دیں گے ورنہ ہمیں اجازت دیجیے کہ ہم محدثین کرام کے مشہور اصول کے ماتحت (کہ جس راوی کا ایک دفعہ کذب ثابت ہو جائے اس کی کوئی روایت معتبر نہیں) آپ کے ساتھ برتاؤ کریں۔

اعیان اخوان!

ہم بطور گلہ نہیں کہتے بلکہ امر واقعہ کا اظہار کرتے ہیں کہ آج کل کے منکرین حدیث چاہے کسی لباس میں ہوں ان کی روایت کی تنقید اور تحقیق کر لینی چاہیے اور یہ کوئی نئی بات بھی نہیں، محدثین کرام نے اس کے متعلق بڑے بڑے قواعد بنائے اور احادیث کی جانچ پڑتال کر کے صحاح، ضعاف اور موضوعات کو الگ الگ کر دیا، مولانا حالی مرحوم نے محدثین کی مساعی جمیلہ کی بابت سچ کہا ہے ؎

---

[1] حافظ محب الحق صاحب نے ''توضیح تلویح'' کو ایک ہی کتاب سمجھا ہے جو آپ کے تبحر علمی کی دلیل ہے۔(مؤلف)۔

طلسم ورع ہر مقدس کا توڑا
نہ صوفی کو چھوڑا نہ ملا کو چھوڑا

اس خام بنیاد پر آپ نے جو عمارت قائم کی ہے اس کا اندازہ ناظرین خود ہی کرلیں، آپ لکھتے ہیں:

''آنحضرت علیہ الصلاۃ والسلام نے بتادیا تھا کہ حدیث کی صحت کی معیار قرآن ہی ہے تم لگے حدیث سے قرآن ہی کو منسوخ کرنے، میں بھی تو یہی کہتا ہوں کہ معیار حق نہ بنایا، اور راوی اور روایتوں ہی کے پیچھے پڑے اور اس حدیث کو بھی بھول گئے، میرے کہے پر تو فتویٰ لگاؤ گے مگر اس حدیث کو کیا کہو گے سوائے اس کے کہ یہ صحیح نہیں'' (بلاغ الحق، ص:۳۹)۔

اہلحدیث:

باوجودیکہ آپ کی بنیاد خام ہے بلکہ ریگ پر ہے تاہم آپ کے اس خیالی اصول کو مانتے ہیں کہ صحت حدیث کے لیے معیار قرآن ہے، پس آپ اپنے دیگر اخوان یوسف کو ملا کر ان احادیث نبویہ کی (جو بقاعدہ محدثین صحیح ہوں اور بقول اخوان یوسف قرآن کے مخالف ہوں) ایک مکمل فہرست تیار کریں، ہم اس کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھیں گے، ممکن ہوا تو جواب دیں گے ورنہ قبول کریں گے۔

حافظ صاحب!

یہ کس نے کہا کہ حدیث سے قرآن منسوخ ہوجاتا ہے، سنی سنائی باتوں کو پیش کرنا محقق کی شان نہیں ہے، آئندہ قلم اٹھانے سے پہلے سمجھ لیا کریں کہ آپ کا مخاطب اول ''دفتر اہلحدیث'' ہے جس کا قول ہے:

سمجھ کے رکھیو قدم دشت خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

''بلاغ الحق'' (ص: ۴۰) پر'' اسوۂ حسنہ'' کی سرخی لکھی ہے اس کے متعلق پہلے مفصل لکھا گیا، (صفحہ ۴۴) پر مسلمانوں کے حال پر ایک نظر، اس میں بھی کوئی بات قابل جواب نہیں، مثلاً آپ کا یہ فقرہ کہ:

''قوم کی ساری تباہی قرآن چھوڑنے سے آئی ہے ، اسلام غائب ہوا قرآن چھوڑنے سے، ایمان کھویا گیا قرآن چھوڑنے سے، وغیرہ وغیرہ'' (ص: ۴۸)۔

یہ وعظ سونے سے لکھنے کے قابل ہے کیوں کہ ہم جماعت اہل حدیث ہر خطبہ کے شروع میں یہ حدیث پڑھا کرتے ہیں (۱) ''خيرُ الْحديثِ كتابُ اللهِ''[①] (۲)''وخيرُ الهَدْيِ هَديُ رسولِ اللهِ ﷺ''[②] اس حدیث کے دوسرے فقرے پر آپ کی ترچھی نظر پڑے تو آپ اپنا قول کہ:

''اتباع عمل رسول بلاشبہ موجب فیوض وبرکات ہے'' (ص: ۷۳)۔

ملاحظہ فرمالیں اور اس اصول میں ہمارے ساتھ شریک ہوجائیں کہ اتباع سنت نبویہ چھوڑنے سے ظلمت (بے برکتی) پیدا ہوتی ہے۔ (صفحہ ۴۹) پر یہ سرخی ہے:

''قرآن مجید کے ساتھ مسلمانوں کا سلوک'' اس سرخی کے ماتحت آپ نے مسلمانوں کی چند شکایتیں لکھی ہیں جن میں سے بعض کا جواب پہلے ہوچکا اور بعض کا ابھی باقی ہے، مثلاً:

۱۔ قرآن ہی وحی کیا گیا (جواب ہوچکا)

۲۔ دوسری شکایت یہ کہ وحی کو وحی جلی اور وحی خفی کی تقسیم سے دو ٹکڑے کرنا بلا دلیل ہے۔ (جواب ہوچکا)

۳۔ مسلمانوں پر الزام دھرا ہے کہ قرآن مسلمانوں کے سمجھنے کے لیے تو نازل ہوا

---

①-② صحیح مسلم: كتاب الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة۔ حدیث: ۸٦٧۔

نہیں، رسول کے سمجھنے کے لیے نازل ہوا ہے۔(ص:۵۰)غالباً پٹنہ کے کسی گاؤں کے لوگ ایسا کہتے ہوں گے، ایسا ہے تو ان کو سمجھانا چاہیے۔

۴۔ زنا کی سزا میں ﴿فَٱجۡلِدُواْ﴾ {فَاجْلِدُوا} منسوخ ہوا، اب آپ محصن ومحصنہ پر رجم کریں۔(جواب بصورت مجمل ہو چکا ہے)

مزید وضاحت یہ ہے کہ حکم رجم آیت: {فاجلدوھا} کی تخصیص ہے نسخ نہیں، تخصیص کو نسخ کہنا علم اصول سے ناواقفیت کا اقرار کرنا ہے، ہاں تمثیل اس کی اگر مفید ہو تو سنیے آیت کریمہ: ﴿إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَوٰةِ مِن يَوۡمِ ٱلۡجُمُعَةِ فَٱسۡعَوۡاْ إِلَىٰ ذِكۡرِ ٱللَّهِ وَذَرُواْ ٱلۡبَيۡعَ﴾ [الجمعۃ:۹] اس آیت میں: ﴿نُودِيَ لِلصَّلَوٰةِ﴾ عام ہے اور حدیث نے اس کو ظہر کے وقت سے مخصوص کر دیا، اہل قرآن کے جملے فرقے بھی اس کو مخصوص سمجھ کر نماز جمعہ ظہر ہی کے وقت پڑھتے ہیں، آپ کا بھی غالباً یہی عمل ہوگا۔

دوسری مثال:

قرآن مجید میں حکم ہے: ﴿إِذَا قُمۡتُمۡ إِلَى ٱلصَّلَوٰةِ فَٱغۡسِلُواْ وُجُوهَكُمۡ﴾ [المائدۃ:۶] اس آیت میں حکم ہے کہ جب کبھی نماز کے لیے کھڑے ہوا کرو تو وضو کر لیا کرو اور یہ عام ہے، حدیث میں آیا ہے، اگر پہلا وضو ہو تو دوسری نماز کے لیے وضو کرنا ضروری نہیں، یہ تخصیص ہے، حافظ صاحب اس قسم کی تخصیصات جیسی {فاجلدوا} میں کی گئی ہے ماہرین شریعت سے مخفی نہیں۔ [1]

---

[1] امرتسر کے منکر حدیث مفسر قرآن مولوی احمد الدین متوفی نے بھی رجم محصنہ کو آیت قرآنی کے خلاف سمجھا ہے، مگر وہ اس کی وجہ کچھ اور لکھتے ہیں، چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں:

''اگر خاوند والیوں کو سنگسار کرنا جائز ہوتا تو اس کا نصف محال ہے (بیان للناس منزل اول، ص:۵۰۷، طبع دوم، ص: ۵۷۶) مطلب آپ کا یہ ہے کہ قرآن مجید میں منکوحہ لونڈی کی بدکاری پر ارشاد ہے کہ محصنات کی نسبت ان کو ....

.... نصف سزا دی جائے، محصنہ کو زنا پر اگر رجم کی سزا ہوتی تو اس کا نصف کیسے ہوسکتا"۔

جواب! مصنف مذکور نے اپنے خیال کی تائید کرنے میں جلدی سے کام لیا ہے آپ نے غور نہیں کیا کہ قرآن شریف میں محصنہ کا لفظ تین معانی میں آیا ہے:۔

اول:۔ بمعنی شادی شدہ عورت، اس کی مثال یہ آیت ہے ﴿وَٱلۡمُحۡصَنَٰتُ مِنَ ٱلنِّسَآءِ إِلَّا مَا مَلَكَتۡ أَيۡمَٰنُكُمۡ﴾، یعنی شادی شدہ عورتیں تم پر حرام ہیں، وغیرہ۔

دوم:۔ بمعنی آزاد عورت جیسے اس آیت میں ﴿وَمَن لَّمۡ يَسۡتَطِعۡ مِنكُمۡ طَوۡلًا أَن يَنكِحَ ٱلۡمُحۡصَنَٰتِ ٱلۡمُؤۡمِنَٰتِ﴾، یعنی تم میں سے جو شخص آزاد مومنہ عورت سے نکاح کرنے کا مقدور نہ رکھتا ہو وہ لونڈی ہی سے نکاح کرے۔

سوم:۔ بمعنی پاک دامن عورت اس کی مثال میں آیت ملاحظہ ہو: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ يَرۡمُونَ ٱلۡمُحۡصَنَٰتِ ٱلۡغَٰفِلَٰتِ﴾ یعنی جو لوگ پاک دامن بےخبر مومنہ عورتوں پر بدکاری کا الزام لگاتے ہیں، وغیرہ۔

ناظرین! امرتسری معاصر کو یہ غلطی لگی ہے کہ آپ نے آیہ کریمہ: ﴿فَإِذَآ أُحۡصِنَّ فَإِنۡ أَتَيۡنَ بِفَٰحِشَةٍ فَعَلَيۡهِنَّ نِصۡفُ مَا عَلَى ٱلۡمُحۡصَنَٰتِ مِنَ ٱلۡعَذَابِ﴾، میں محصنات سے شادی شدہ عورت مراد لی ہے، حالاں کہ یہ غلط ہے بلکہ یہاں اس سے مراد آزاد عورت ہے۔

مطلب آیت کا یہ ہے کہ لونڈیاں جب عقد نکاح میں آجائیں تو ان پر زنا کی سزا آزاد (کنواری) عورت کی نسبت نصف ہے، ہمارے معنی کی صحت پر یہ دلیل ہے اس آیت میں لونڈی اور آزاد عورت کی سزائے زنا میں فرق بتایا گیا ہے، نیز یہ کہ اس آیت میں لونڈیوں کے منکوحہ ہونے کے بعد ان کی سزا کا ذکر بطور تنصیف کے ہے، اگر لفظ محصنات (جو اس آیت میں آیا ہے) سے مراد بھی منکوحہ عورت ہو تو یہ تنصیف غیر موزوں ہو جاتی ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھو کہ زید جب نکاح کرے تو اس کے فرائض عمر کی نسبت نصف ہوں، جب تک ان کی حیثیتوں میں فرق نہ ہو فرائض میں فرق کرنا مناسب نہیں)۔

قسط: ۱۲

تصدیق الحدیث

''بیان الحق بجواب بلاغ الحق''

(۷؍رمضان ۱۳۵۶ھ = ۱۲؍نومبر ۱۹۳۷ء)

گذشتہ ہفتے بتایا گیا ہے کہ شادی شدہ اور کنوارے مرد وعورت کی سزائے زنا میں فرق ہے جس سے حافظ صاحب انکاری ہیں آج ناظرین آگے مطالعہ کریں۔ (مدیر)

حافظ محب الحق صاحب (صفحہ ۵۰۔۵۱) میں فرماتے ہیں:

''وصیت کا حکم منسوخ ہوا، آپ ترکہ کی آیت پر عمل کریں اور اس میں بھی اصلاح فرماویں کہ ثلث میں وصیت جائز، خدا کی آیت کو منسوخ کرنے یا مٹانے کے لیے تو کوئی مجاز نہ تھا بہ ایں ضرورت وحی خفی قائم کی گئی اور: ﴿وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا ٱلْقُرْءَانُ﴾ [الانعام:۱۹] کی صحت کی گئی کہ: ﴿هَٰذَا ٱلْقُرْءَانُ﴾ میں حدیث بھی داخل ہے، افسوس افسوس اے بھائیو! کیا کلام الٰہی انہیں طبع آزمائیوں کا مستحق ہے'' (بلاغ الحق)۔

حافظ صاحب!

مذہبی گفتگو میں تیور بدل کر بولنا اچھا نہیں، بحکم: ﴿وَجَٰدِلْهُم بِٱلَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ [النحل:۱۲۵] خوش کلامی سے کام لیجیے، وصیت کو ہم نے منسوخ نہیں کیا بلکہ ابھی تک جاری ہے لیکن آپ نے وصیت کے معنی غلط سمجھے ہیں، پہلے وصت کی آیت سنئے! ارشاد ہے: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ ٱلْمَوْتُ إِن تَرَكَ خَيْرًا ٱلْوَصِيَّةُ لِلْوَٰلِدَيْنِ وَٱلْأَقْرَبِينَ بِٱلْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى ٱلْمُتَّقِينَ﴾ [البقرۃ:

۱۸۰] اس آیت میں دو لفظ قابل غور ہیں: اول: الوصیت اور دوسرا: بالمعروف، بالمعروف کے معنی بالشریعت ہیں اس کا ثبوت سنیے: ﴿وَلَا يَعۡصِينَكَ فِي مَعۡرُوفٖ﴾ [الممتحنۃ: ۱۲]، یعنی بیعت کرنے والی عورتیں دینی امور میں تیری (رسول کی) نافرمانی نہ کریں، اس آیت کی تفسیر کرنے کے لیے مندرجہ ذیل آیت کو سامنے رکھنا ضروری ہے جس کا شروع الفاظ: ﴿يُوصِيكُمُ ٱللَّهُ فِيٓ أَوۡلَٰدِكُمۡ﴾ [النساء:۱۱] سے ہوتا ہے، اس آیت میں جملہ ذوالفروض کے حصے مذکور ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حصص کی تعیین کر کے خدا نے سب اختیار اپنے قبضے میں کر لیا ہے، اسی لیے فرمایا: ﴿فَرِيضَةٗ مِّنَ ٱللَّهِ﴾ [النساء:۱۱] یعنی یہ وصیت ہے (بصورت یوصیکم) اختیاری نہیں بلکہ فرض ہے۔

یہاں ثلث تک وصیت کو محدود کرنے پر اعتراض کرنا بھی قرآن مجید پر عدم تدبر کا نتیجہ ہے قرآن شریف میں وصیت کے ساتھ غیر مضار کا لفظ بھی موجود ہے اس غیر مضار کی تفسیر ہر ایک شخص اپنے منشاء کے مطابق کر لیتا ہے اس لیے حدیث شریف نے اس کو ثلث تک محدود کر دیا تو کیا اعتراض ہے، آخر میں آپ کے افسوس میں ہم بھی شریک ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ اے اخوان یوسف قرآن شریف کو اپنی رائے کے ماتحت نہ بناؤ بلکہ قرآن مجید پر عمل کرنے کے لیے رسول علیہ السلام کی معیت کو ضروری سمجھو ایسا نہ ہو کہ عاقبت میں کف افسوس ملتے ہوئے: ﴿يَٰلَيۡتَنِي ٱتَّخَذۡتُ مَعَ ٱلرَّسُولِ سَبِيلٗا﴾ [الفرقان: ۲۷] منہ سے نکلے اور ادھر سے جواب ملے: ﴿كَلَّآۚ إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا﴾ [المومنون: ۱۰۰]۔

حافظ صاحب نے مسئلہ وراثت میں عجیب موشگافی کی ہے جو انہوں نے غالبا امرتسری معاصر کی تحریروں سے اخذ کی ہوگی اس لیے ہم اپنے جواب میں ان سب کو مخاطب کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

نوٹ! کل علمائے اسلام کا فتوی ہے کہ زید کے دو بیٹے ہوں ایک بیٹا اس کی زندگی میں مرجائے اور اولاد چھوڑ جائے دوسرا بیٹا زید کے بعد زندہ رہے تو زید کے ترکے میں سے متوفی بیٹے کی اولاد کو کچھ نہیں پہنچے گا، حقیقی زندہ بیٹا سب کا مالک ہوگا، اس صورت میں متوفی بیٹے کی اولاد کو اصطلاح میں محروم کہا جاتا ہے۔

دوسری مثال:

زید مرگیا اس کا دادا زندہ ہے اور اولاد بھی ہے اس صورت میں دادا کو چھٹا حصہ ملے گا اور اگر زید متوفی کا باپ بھی ہے تو دادا کو کچھ نہ ملے گا اس کو اصطلاح میں محجوب کہتے ہیں۔

حافظ محب الحق صاحب ان دونوں مسئلوں پر اعتراض کرتے ہیں، آپ کے الفاظ یہ ہیں:

''محجوب کا لفظ بدعتی ہے کہیں قرآن میں نہیں، مثلاً پوتا، پوتی یتیم و بے کس، سرپرست باپ کا سایہ سر سے اٹھا ہر طرح مجبور، ہر طرح قابل رحم، ہر طرح قابل اعانت ودستگیری ہے، وہ بے قصور، بے جرم ترکہ سے محروم کئے گئے، محجوب کیے گئے، حالاں کہ ولد میں داخل اور باپ کے ترکہ کے باپ کی جگہ پر مستحق ہیں، اور ذریہ میں بھی داخل ہیں جو اوپر کی آیت میں خدا نے فرمایا۔ یتیموں کی ہزار طرح خبر لینے والے خدا نے، جس نے یتیموں کی نسبت کیا کیا کچھ نہ فرمایا ہے، کیا یتیموں کو اس نے محجوب کر کے ان پر ظلم کیا ہے، حاشا وکلا نہیں، یتیم علماء کے مظلوم ہیں'' (بلاغ الحق، ص:٦٠)۔

اہلحدیث:

دہلی میں ایک صاحب حافظ محمد اکبر واعظ تھے وہ کہا کرتے تھے کہ نماز کا حکم ہے، فرض نہیں ہے، کیوں کہ نماز کے لیے فرض کا لفظ نہیں آیا، فرض قرآن پڑھنا ہے بحکم: ﴿إِنَّ ٱلَّذِى فَرَضَ عَلَيۡكَ ٱلۡقُرۡءَانَ﴾ (الآیہ) [القصص:٨٥] حافظ محب الحق صاحب ان سے دوسرے نمبر پر ہیں جو اصطلاحات کے لیے پورے الفاظ کی تلاش

کرتے ہیں۔اچھا جناب محجوب کا لفظ بدعتی سہی، صورت مذکورہ میں دادا کو آپ کیا کہیں گے؟ وارث تو کہہ نہیں سکتے، اس کا جو نام آپ رکھیں گے ہم بھی وہی منظور کرلیں گے، ہاں پوتے کا مسئلہ اور پوتے کو ولد میں داخل کر کے علماء پر اعتراض کرنا نقل وعقل دونوں کے خلاف ہے۔

سنیے صاحب!

زید کی مندرجہ ذیل اولاد ہے، دو بیٹے عبداللہ، عبدالرحمن، عبدالرحمن کے دو بیٹے ہیں بقول آپ کے یہ چار کس کس کی اولاد ہیں؟ اس کے ترکہ کی تقسیم کیسے ہوگی؟ عبداللہ، عبدالرحمن کو چار چار آنے اور پوتوں کو بھی چار چار آنے، کیا یہ تقسیم صحیح ہوگی؟ (کیوں کہ پوتا اولاد میں داخل ہے) اگر باوجود اولاد ہونے کے آپ ان کو حصہ نہیں دلاتے تو ان کا نام (محروم یا محجوب) کیا رکھیں گے؟

حافظ صاحب! خدا کے لیے انصاف کیجیے، پوتا پیدا ہوتے ہی دادا کا ولد یا باپ کے مرنے سے ولد بنتا ہے، بات تو موٹی ہے، دیکھیں اخوان یوسف اس کا کیا جواب دیتے ہیں، ولد اور والد میں نسبت تضائف ہے، پٹنے کے کسی عالم سے پوچھ لیجئے، کیا ہمارا یہ دعوی غلط ہے کہ نسبت تضائف ابتداء سے انتہاء تک رہتی ہے، پس پوتا پیدا ہوتے ہی دادے کا ولد ہونے سے: ﴿يُوصِيكُمُ ٱللَّهُ فِيٓ أَوۡلَٰدِكُمۡ﴾ میں داخل ہے۔پس آپ اور آپ کے ہم خیال (امرتسری ہوں یا لاہوری) صورت مرقومہ کا جواب دیں۔

حافظ صاحب! آپ نے یہ دورنگی کیسے اختیار کی جو آپ لکھتے ہیں:

’’پوتا ولد میں داخل ہے اور باپ کے ترکہ کا باپ کی جگہ کے مستحق ہے‘‘۔

یہ باپ کی جگہ کے کیا معنی ہیں، اگر دادے کا ولد ہے تو کیا باپ کے ہوتے بھی ولد ہے، اگر باپ کے ہوتے ولد نہیں ہے تو آپ اس کو ولد میں کیوں داخل کرتے ہیں اور

اگر داخل کربھی لیں تو یہ داخلہ حقیقی ہے یا مجازی، اگر حقیقی ہے تو صورت مرقومہ میں اس کو حقیقی رکھئے اگر مجازی ہے تو دوسرے بیٹے کے ساتھ جو حقیقی ولد ہے اس کو برابر نہ کیجیے، اب میں ایک دوسری طرح آپ کو آپ کے خیال کی غلطی بتاتا ہوں آپ کا ایک بیٹا ہے اس کی ایک بیٹی ہے جو بقول آپ کے آپ کی ولد ہے، مہربانی کرکے بتایئے اس لڑکی کی ولایت نکاح آپ کو حاصل ہوگی یا آپ کے بیٹے کو؟ میرا سوال اس صورت پر ہے جب آپ دونوں (باپ، بیٹے) میں اختلاف رائے ہو تو کس کی رائے کو ترجیح ہوگی؟ یقیناً باپ کی رائے کو، اب میں منطقی اصطلاح میں آپ سے گفتگو کرتا ہوں آپ کو تکلیف نہ ہوگی؟

اہل منطق کا متفقہ اصول ہے کہ علت بعیدہ کا اثر معلول بعید پر نہیں پہنچتا (قطبی)

اس کے بعد حافظ صاحب علماء کو کوستے ہوئے لکھتے ہیں:

''خدا نے فرمایا: ﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِۦ ۖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ أَن رَّءَا بُرْهَـٰنَ رَبِّهِۦ﴾ [یوسف: ۲۴] (اس عورت نے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف رغبت کی، اگر یہ برہانِ رب نہ دیکھے ہوتے تو یہ بھی رغبت کرتے، مگر حضرت یوسف علیہ السلام تھے پیغمبر، برہان رب دیکھے ہوئے تھے عباد مخلصین میں تھے جن کے پاس شیطان کا گزر ہی نہیں، وہ کس طرح اس عورت کی طرف راغب ہو سکتے تھے، محفوظ رہے، بعد کی آیت میں خدا نے واضح بھی کر دیا ہے اس میں کچھ جائے گفتگو نہیں، مگر قوم نے کیا کہا، تفسیروں کو اٹھا کر دیکھو، بے باکانہ لکھتے ہیں کہ آپ نے بھی رغبت کی، بلکہ ازار تک کھولا، اور برہان رب یوں دکھائے گئے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی تصویر سامنے آگئی اور آپ یہ تصویر دیکھ کر گناہ سے بچ گئے'' (بلاغ الحق، ص: ۲۰)۔

اہلحدیث:

ناظرین! ان اخوان یوسف کی عادت ہوگئی ہے کہ ہر ایک بات میں اپنے استعلا

اور ادعاء فقاہت وعلم کے ساتھ مفسرین کی جہالت دکھایا کرتے ہیں، جو لوگ ان کے حالات اور مقالات سے واقف ہیں وہ شہادت دے سکتے ہیں کہ مضمون کے لکھنے سے پہلے علماء اسلام پر برس پڑتے ہیں اور اس برسنے اور کوسنے ہی کو اپنی صداقت کا نشان جانتے ہیں، غالباً اسی لیے مولانا حالی مرحوم نے ایسے لوگوں کے حق میں کہا ہے ؎

اوروں کی برائی ہی پہ ہے فخر وہاں
خوبی کوئی باقی نہیں جس امت میں

ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ مرقومہ بالا اقتباس میں حافظ صاحب کا یہ فقرہ کہ تفسیروں کو اٹھا کر دیکھو۔ الخ

کیسا جامع فقرہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے حافظ صاحب اور دیگر اخوان یوسف کے سب مفسرین سابقین غلط کہتے چلے گئے، ہم حافظ صاحب کے اس کلیہ کی نقیض موجبہ جزئیہ کی شکل میں دکھانے کو صرف ایک تفسیر کا حوالہ دیتے ہیں، وہ ایسی تفسیر ہے کہ ہر معقول پسند اسے مطالعہ میں رکھتا ہے، یعنی ''تفسیر کبیر''، حافظ صاحب اسے دیکھتے تو یہ دعویٰ نہ کرتے، جو انہوں نے اس مقولے میں کیا ہے ؎

چوں ندانند حقیقت رہ افسانہ زدند

اخیر میں ہم آپ کے ایک فقرے کو صحیح جان کر نقل کرتے ہیں جو یہ ہے کہ: ''ایسے مدعیان علم سے کون بچا رہا''۔ (ص ٦:١) سچ ہے ؎

کس روز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کئے

❁ ❁ ❁

قسط: ۱۳

تصدیق الحدیث

''بیان الحق بجواب بلاغ الحق''

(۲۱؍رمضان ۱۳۵۶ھ = ۲۶؍نومبر ۱۹۳۷ء)

اہلحدیث مؤرخہ ۱۲؍نومبر میں باپ کی وفات کے بعد دادا کی موجودگی میں پوتا، پوتی کے محروم الارث ہونے کی بحث ہو چکی ہے، اس کے بعد ۱۹؍نومبر کے پرچے میں بوجہ حادثہ معلومہ کے متعلق ضروری مضامین درج ہو جانے کے اس سلسلے کی قسط مجبورا ملتوی کرنی پڑی، قسط ہذا ناظرین ۱۲؍نومبر کے پرچے میں درج شدہ مضمون کے ساتھ ملا کر پڑھیں۔ (مدیر)

نوٹ! سورہ احزاب کی آیت: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ﴾ الآیہ [الاحزاب: ۳۶] کو ہم استدلال میں نقل کر چکے ہیں، حافظ محب الحق صاحب اس آیت پر بحث کرتے ہیں، اس بارے میں آپ کے الفاظ یہ ہیں:

''خدا نے فرمایا: ﴿وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِيٓ أَنْعَمَ ٱللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَٱتَّقِ ٱللَّهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا ٱللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى ٱلنَّاسَ وَٱللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَىٰهُ﴾ [الاحزاب: ۳۷] (اور جب تم اس شخص کو جس پر خدا نے بھی انعام کیا تھا اور تم نے بھی، کہہ رہے تھے کہ نمبر (۱) بیوی کو طلاق نہ دو، نمبر (۲) خدا سے ڈرو، نمبر (۳) تم دل میں چھپاتے ہو جس کو خدا ظاہر ہی کرے گا، نمبر (۴) تم لوگوں سے ڈرتے ہو اور اس کا مستحق خدا ہے کہ تم اس سے ڈرو) حضرت زید کا نام اس کے بعد ہی موجود ہے، یہ چاروں باتیں (میں نے نمبر

دے دیا ہے) آنحضرت ﷺ نے حضرت زید سے فرمائیں، جب حضرت زید آپ کے پاس حضرت زینب کے معاملہ میں شکایت کرنے آئے اور دل میں نیت تھی طلاق دینے کی، جس کو لوگوں کے ڈر سے کہ برا بھلا کہیں گے کہ یہ آزاد غلام ہونے کے باوجود خاندان نبوت سے نہ نباہ سکے دل میں چھپاتے تھے، آپ نے ان کی نیت کو سمجھا، اور طلاق دینے سے روکا اور منع فرمایا، حضرت زید نے نہ مانا اور آخر طلاق دے دی، **دین کے سوا باتوں میں صحابہ رسول اللہ ﷺ کی کل باتوں کو حکم خدا نہیں سمجھتے تھے**، حضرت زید نے بھی آپ کے فرمانے کو مشورہ سمجھا اور طلاق دے دی۔

حضرت زید کافر نہ ہوئے، نہ کافر سمجھے گئے، اسی لیے سیاست پیغمبری کارفرما نہ ہوئی، حضرت زید کے طلاق کے بعد خدا نے رسول کو حکم دیا کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے شادی کرلیں تاکہ لے پالک کی مطلقہ سے نکاح کرنا جو بہو سے نکاح کرنے کے برابر سمجھا جاتا تھا اور جو اک مذموم رسم تھی کہ آپ ہی کے توڑے ٹوٹ سکتی تھی وہ توڑی جائے، جب اسلام نے لے پالک لینا ہی مٹا دیا تو لے پالک کی مطلقہ سے نکاح کو جائز قرار دینا ضرور تھا، اس کے بعد ہی کی آیت میں اس کی تصریح موجود ہے'' (بلاغ الحق، ص:۶۱)۔

اہلحدیث:

اس اقتباس میں آپ کا یہ فقرہ کہ دین کے سوا باتوں میں صحابہ رسول اللہ ﷺ کی کل باتوں کو حکم خدا نہیں سمجھتے تھے قابل تصدیق ہے نہ قابل انکار، بے شک صحابہ کرام کو جناب رسالت مآب نے خود فرما دیا کہ میں جس کام کا بحیثیت دین حکم دوں اس میں اطاعت کرو، دنیا کے کام تم خود مجھ سے بہتر جانتے ہو''أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأُمُورِ دُنْيَاكُمْ'' (الحدیث)[1]۔ باقی اس اقتباس میں کوئی بات قابل جواب نہیں، ہاں اس

---

[1] صحیح مسلم:كتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ما قاله شرعا، دون ماذكره ﷺ من معايش الدنيا،حدیث:۲۳۶۳۔

سے اگلا اقتباس قابل دید وشنید ہے۔

حافظ صاحب لکھتے ہیں:

''حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا معاملہ جو قرآن سے بیان کیا گیا بہت صاف اور واضح ہے، جس پر کسی اعتراض کی گنجائش نہیں، مگر قوم نے روایت پرستیوں کے جوش میں راویوں کی امت بن کر اس آیت کو الٹی چھری سے ذبح کیا اور نہایت مذموم اور قابل شرم طرح پر روایت بیان کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت زینب سے نکاح کا دل میں ارادہ رکھتے تھے، تو راویوں کی صحت کے لئے قرآن کے توڑ مروڑ کی ضرورت پیش آئی، اس لیے: ﴿وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ﴾ جو اس آیت میں ہے دل میں چھپانے کا مخاطب رسول کو قرار دیا، بے وجہ، بے دلیل، خلاف سیاق وسباق، صریح تحریف قرآن، کیا یہ ممکن ہے کہ رسول جو فرما رہے ہیں کہ طلاق نہ دو یہ ظاہراً تھا، اور دل میں چھپا ہوا تھا کہ اگر زید طلاق دے دیں تو ہم نکاح کر لیں گے، اے اللہ تری پناہ، زمیں کیوں نہیں دھنس جاتی، آسمان کیوں نہیں پھٹ جاتا، واقعی تیرے حلم کی تھاہ نہیں، خدا کی طرف سے یہ سخت ترین ناپاک الزام برگزیدہ اور خاتم رسل کے سر تھوپا جاتا ہے، محض بے بنیاد کہ آپ دوسرے کی بیوی سے نکاح کی نیت رکھتے تھے اور اس کو دل میں چھپا کر نعوذ باللہ منافقانہ فرما رہے تھے کہ طلاق نہ دو تو خدا رسول کو دھمکاتا ہے کہ تم لوگوں سے ڈرتے ہو خدا سے ڈرو، مسلمانو! کیا تمہارا یہی ایمان ہے، تمہارے فرقہ کے علاموں نے کیا تمہیں یہی پڑھایا ہے، اے امتیان محمدی! کیا امتی ہونے کا حق یہی تم نے ادا کیا، انہیں روایت پرستیوں کے جھپٹ میں مفسروں نے باوجود ادیب اور علامہ ہونے کے تفسیروں میں بلاخوف خدا ورسول اس کو لکھ مارا اور قرآن پر طبع آزمائی سے ذرا نہ ڈرے، حالاں کہ اس کے بعد ہی کی آیت میں خدا فرماتا ہے: ﴿ٱلَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَٰلَٰتِ ٱللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُۥ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا ٱللَّهَ﴾ [الاحزاب:۳۹] (جو لوگ تبلیغ رسالت کرتے ہیں وہ خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے) آپ بلا شبہ رسول تھے، مصیبتیں جھیل جھیل کر تا زیست تبلیغ

رسالت فرماتے رہے، آپ خدا کے سوا کب کسی سے ڈرتے تھے، یہ تو رسول کی شان ہی نہیں، پھر خدا کا یہ کہنا کہ تم لوگوں سے ڈرتے ہو، کیا خدا کی یہ شان ہو سکتی ہے کہ خود کہے کہ تم لوگوں سے ڈرتے ہو اور خود کہے کہ رسول کی یہ شان ہی نہیں کہ ماسوا سے ڈرے، اس لیے نہ ﴿وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ﴾ کے رسول مخاطب، نہ ﴿وَتَخْشَى ٱلنَّاسَ﴾ کے رسول مخاطب، بلکہ ﴿تَقُولُ لِلَّذِيٓ﴾ سے صاف ظاہر ہے کہ ان چاروں باتوں کے جن پر میں نے نمبر بھی دے دیا ہے رسول متکلم ہیں اور حضرت زید مخاطب، اس آیت کو جو اوپر لکھی ہے پھر سے پڑھ لو" (بلاغ الحق، ص: ۶۱-۶۴)۔

اہلحدیث:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل میں یہ بات تھی کہ اگر زید نے باوجود سمجھانے بجھانے کے میرا کہا نہ مانا اور طلاق دے دی تو میں اس کی تلافی یوں کروں گا کہ زینب سے خود نکاح کروں گا یہ جملہ دراصل شرطیہ ہے، جس کو آپ نے حملیہ بنا کر ان الفاظ سے ظاہر کیا ہے کہ دل میں زینب سے نکاح کا ارادہ رکھتے تھے۔

آپ کی اس تغییر سے کلام الٰہی متغیر نہیں ہوا، البتہ اس سے آپ کے اخلاق و دیانت پر دھبہ ضرور آتا ہے جس غصے اور جوش سے آپ نے علمائے کرام کو کوسا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے، اگر کوئی اور شخص میری جگہ آپ کے مدمقابل ہوتا تو آپ کو بہت کچھ سناتا میں صرف اتنا ہی عرض کرتا ہوں۔

عارف کہ برنجد تنک آبست ہنوز

اس کی مثال سنیے!

ایک آدمی اپنے بیٹے کو اپنی یتیم بھتیجی سے بیاہتا ہے ان دونوں کی ان بن رہتی ہے، باپ اپنے بیٹے کو بہت سمجھاتا ہے کہ حسن سلوک سے رہو مگر وہ نہیں مانتا تو اس کے باپ

کے دل میں خیال بھی آتا ہے کہ اچھا اگر یہ میری بات نہیں مانے گا اور اپنی بیوی کو چھوڑ دے گا تو میں اپنے دوسرے بیٹے سے اس کا نکاح کردوں گا، بتائیے اس پر کیا اعتراض؟ اس کا سمجھنا بھی ٹھیک ہے اور نیت بھی ٹھیک ہے۔

چوں بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطا است
سخن شناس نۂ دلبر اخطا ایں جا است

ناظرین کرام:

ان اخوان یوسف کا پہلا اصول ہی یہ ہے کہ اپنی بات بیان کرنے سے پہلے علمائے کرام کو خوب کوس لیتے ہیں، گویا ایسا کئے بغیر ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا، حافظ محب الحق کی نسبت ہم ایسا گمان نہ رکھتے تھے مگر آخر معلوم ہوا کہ آپ بھی اخوان یوسف کے رنگ میں رنگین ہیں، بندہ خدا! ﴿ٱلَّذِينَ سَبَقُونَا بِٱلْإِيمَٰنِ﴾ [الحشر:١٠] کے حق میں بجائے دعائے استغفار کے برا بھلا کہنا کہاں کی تعلیم اسلام ہے، یہ تمام جدت پسند لوگ اسی اصول پر ہیں خدا ان کو سمجھ دے اور ہدایت کرے، ہم ان لوگوں کو اس سے منع نہیں کرتے کہ اپنا مافی الضمیر جن الفاظ میں چاہیں ادا کریں لیکن خدارا سلف صالحین کو تو برا بھلا نہ کہا کریں جو اپنی عمر بھر قرآن کریم کی خدمت میں مصروف رہے ورنہ آپ بھی اپنے اخلاف سے یہی بدلہ پائیں گے۔

ہے یہ گنبد کی سزا جیسی کہے ویسی سنے

ناظرین! حافظ صاحب اور علمائے کرام کا اختلاف جن کو آپ روایت پرست محرف کہتے ہیں، صرف اس امر میں ہے کہ آیت مذکورہ میں ''تخفی'' کا عطف کس لفظ پر ہے، مفسرین کے نزدیک اس کا

عطف تقول پر ہے اور آپ کے نزدیک ''اتق اللہ'' پر ہے، علماء کے دعوی کا قرینہ دو

نوں فعلوں کا ہم جنس ہونا ہے، یعنی فعل مضارع ہونا ہے اور آپ کے عندیہ کے مطابق معطوف معطوف علیہ ایک جنس کے فعل نہیں رہتے کیوں کہ تخفی فعل مضارع ہے، جملہ خبریہ ہے اور اتق اللہ فعل امر جملہ انشائیہ ہے، جہاں تک ہو سکے عطف کے لیے معطوف معطوف علیہ کی ہم جنسیت اولی ہے، پس آیت کے معنی حسب تفسیر علمائے سابقین یہ ہیں کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس وقت آپ زید کو کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو طلاق نہ دے اور دل میں چھپاتے تھے وہ بات جس کو اللہ ظاہر کرنے والا ہے اور لوگوں سے ڈرتے تھے، مگر آپ کے عندیہ کے مطابق ترجمہ یہ ہوا کہ اے زید اللہ سے ڈر اور تو چھپاتا ہے دل میں وہ بات جس کو اللہ ظاہر کرنے والا ہے اور تو لوگوں سے ڈرتا ہے۔

علمائے ادب:

للہ غور فرمایئے کیا یہ عطف جو حافظ صاحب نے بتایا ہے موزوں ہے؟ ہاں آپ نے ہماری نحوی ترکیب کی تردید کے لیے آیت: ﴿وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا ٱللَّهَ﴾ پیش کی ہے ہم اس کی قدر کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی اس کے آپ کو قرآن کی تفسیر قرآن ہی سے بتاتے ہیں، مگر پہلے اس سے کہ ہم صحیح تفسیر بتائیں ایک نکتہ بتانا مفید سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ آیت: ﴿وَتَخْشَى ٱلنَّاسَ﴾ میں مخاطب ایک ذات ہے جس سے قضیہ مخصوصہ بنتا ہے اور دوسری آیت: ﴿وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا﴾ عام ہے، یہ بات اہل علم سے مخفی نہیں کہ عام اور خاص میں اختلاف ہو تو اتنا شدید نہیں ہوتا جتنا دوسرے قضایا مخصوصہ میں خاص کر جب کہ دونوں کا موضوع ایک ہی ہو۔ پس سنیے!

اول: حضرت موسی علیہ السلام کا وہ واقعہ ہے جو وادی مقدس میں پیش آیا، اس میں حضرت ممدوح کو حکم ہوا: ﴿لَا تَخَفْ﴾ [النمل:۱۰]۔

دوسرا واقعہ: جس سے حضرت موسی علیہ السلام کا ڈرنا ثابت ہے فرعونی جادوگروں

کے مقابلے میں مذکور ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: ﴿فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُّوسَىٰ﴾ [طہ:٦٧] حضرت موسی علیہ السلام نے جادوگروں کی رسیوں کو حرکت کرتے ہوئے دیکھ کر اپنے دل میں خوف پایا۔

بتائیے! حضرت موسیٰ ﴿ٱلَّذِينَ يُبَلِّغُونَ﴾ میں داخل ہیں یا نہیں؟ پھر یہ خوف کیسا، جس درجے کا یہ خوف ہے اس درجے کی زینب کے قصے میں خشیت ہے، اپنے مندرجہ ذیل فقرہ کو سامنے رکھ کر بتائیے کہ حضرت موسی باوجود ﴿ٱلَّذِينَ يُبَلِّغُونَ﴾ میں داخل ہونے کے کیوں ڈرے؟ مَا هُوَ جوابُكم فَهُوَ جَوَابُنَا۔ ''خدا رسول کو دھمکا تا ہے کہ تم لوگوں سے ڈرتے ہو خدا سے ڈرو، مسلمانو! کیا تمہارا یہی ایمان ہے'' (بلاغ الحق، ص: ٦٢) ہمارے دو حوالے متعلقہ حضرت موسی علیہ السلام دیکھیے اور بتائیے کہ ان میں بھی کوئی تاویل ہوسکتی ہے۔ ہم آپ کو اس امر کی اجازت دیتے ہیں کہ آپ پٹنہ، دہلی، اور امرتسر کے اخوان یوسف سے مشورہ کر کے بھی جواب دے سکتے ہیں، ہمارا مطالبہ پھر سن لیجیے، ﴿وَتَخْشَى ٱلنَّاسَ﴾ اور ﴿لَا تَخَفْ﴾ اور ﴿فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُّوسَىٰ﴾ [طہ:٦٧] میں کیا فرق ہے، مہربانی کر کے اس کے ساتھ ہی یہ آیت بھی ملاحظہ کر لیجیے جو قانون کلی کی صورت میں حضرت موسی کے ذکر میں وارد ہے: ﴿إِنِّي لَا يَخَافُ لَدَيَّ ٱلْمُرْسَلُونَ﴾ [النمل:١٠] یعنی میرے حضور میں پیغمبر نہیں ڈرا کرتے۔

❁ ❁ ❁

قسط: ۱۴

تصدیق الحدیث

''بیان الحق بجواب بلاغ الحق''

(۲۸ رمضان ۱۳۵۶ھ = ۱۰ دسمبر ۱۹۳۷ء)

گذشتہ ہفتے سے یہ بحث شروع ہے کہ انبیاء علیہم السلام بھی بعض دفعہ غیر اللہ سے خوف کھا جاتے ہیں اور ایسا ہونا فطری تقاضا ہے، آج اس کا بقیہ درج ہو کر بحث آگے چلے گی۔ (مدیر)

جناب حافظ صاحب:

آپ نے اخبار ''صراط مستقیم'' لاہور مؤرخہ ۱۰ ستمبر ۳۷ء میں شائع کرایا ہے کہ میں چالیس سال سے قرآن کا مطالعہ اور تدبر کر رہا ہوں، ضرور کیا ہوگا۔ اس طویل زمانے میں آیات مذکورہ پر بھی کافی تدبر کیا ہوگا، مہربانی کر کے بتایئے کہ: ﴿وَتَخْشَى ٱلنَّاسَ﴾ اگر مبلغین کے منصب کے خلاف ہے تو متحرک رسیوں سے ڈرنا بھی مرسلین کی شان کے خلاف ہونا چاہیے، اگر کچھ فرق ہے تو واضح کیجیے، ہم سے (پوچھئے تو سنئے)! خوف اور خشیت دو قسم ہے جیسے استعانت دو صنف ہے، ایک ادنی درجے میں ہے اور یک اعلی درجے میں، پہلے استعانت کی تشریح سنیے۔

جو امور انسانی طاقت میں ہیں ان میں انسانوں سے استعانت جائز ہے بحکم: ﴿وَتَعَاوَنُواْ عَلَى ٱلْبِرِّ وَٱلتَّقْوَىٰ﴾ [المائدۃ:۲] جو انسانی اختیارات سے بالاتر ہیں ان میں استعانت کسی بشر سے جائز نہیں، لقولہ تعالیٰ: ﴿وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾

[فاتحہ: ۴] ٹھیک اسی طرح خشیت اور خوف کا حکم ہے، سانپ اور شیر سے ڈر کر الگ ہو جانا فطرت انسانی میں داخل ہے، شرع میں اس کی اجازت ہے، بیماری میں مسئلہ تیمم آپ کو بھی یاد ہوگا وہ بھی اسی بنا پر ہے، مضرات سے بچنا ان کی بری تاثیر سے خوف کرنے پر مبنی ہے، کیا ایسا خوف کرنا بھی آپ کے نزدیک مبلغین کی شان کے خلاف ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں جو ﴿وَتَخْشَى ٱلنَّاسَ﴾ اور جناب موسی علیہ السلام کے حق میں ﴿فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِۦ خِيفَةً مُّوسَىٰ﴾ الفاظ آئے ہیں وہ انسانی فطرت پر مبنی ہے، اس لیے اس کے معنی ایسے کرنے چاہئیں جن کا تعلق اس درجے تک رہے جس درجے تک تیمم میں مضرات کا خیال رکھا گیا ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جس وجہ سے لوگوں سے خشیت کا خیال تھا وہ کفار کی شورش کا خطرہ تھا کہ وہ کہیں گے کہ اپنے متبنی کی مطلقہ سے نکاح کرلیا، جو اس زمانے کی رسم کے بالکل خلاف تھا جس کے دو نتیجے پیدا ہونے ممکن تھے، ایک تبلیغ میں رکاوٹ کرنا، اور دوسرے ذات اقدس کو نقصان پہنچانا۔ حضور پہلی قسم کو ملحوظ رکھ کر رکتے تھے۔ یعنی حضور کے قلب مبارک میں یہ خیال تھا کہ میرے ایسا کرنے سے کفار کو تبلیغ رسالت میں روڑے اٹکانے کا موقعہ ملے گا۔ خدا تعالی کی طرف سے ارشاد ہوا: ﴿فَٱللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَوْهُ﴾ مطلب اس کا یہ ہے کہ خدا کی قدرت کے سامنے ان کا ایجی ٹیشن کچھ نہیں کر سکتا۔ میں آپ کو اہل قرآن سمجھ کر آپ کے سامنے ہر دعوی پر آیات قرآنیہ پیش کرتا آیا ہوں تاکہ آپ کو انکار اور تردد کا موقعہ نہ رہے۔ یہاں بھی آیت مرقومہ کے علاوہ ایک اور آیت پیش کرتا ہوں، چنانچہ ارشاد ہے: ﴿وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّآ إِذَا تَمَنَّىٰٓ أَلْقَى ٱلشَّيْطَٰنُ فِيٓ أُمْنِيَّتِهِۦ فَيَنسَخُ ٱللَّهُ مَا يُلْقِي

ٱلشَّيۡطَٰنُ ثُمَّ يُحۡكِمُ ٱللَّهُ ءَايَٰتِهِۦۗ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٞ ﴿٥٢﴾ لِّيَجۡعَلَ مَا يُلۡقِي ٱلشَّيۡطَٰنُ﴾ الآیۃ[الحج:۵۲-۵۳]۔

یہ آیت بھی کفار کے ایجی ٹیشن (شورش) کی طرف اشارہ کررہی ہے۔

حافظ صاحب!

قرآن کے معانی قرآن ہی سے سمجھنے کی کوشش کیا کریں۔ اخوان یوسف کی طرح اپنی رائے سے نہ سمجھا کریں۔ بلکہ اپنی رائے کو ماتحت قرآن کیا کریں آپ ان آیات پر خوب غور کریں، جو مطلب ان آیات کا ہے وہی مضمون آیت ﴿وَتَخۡشَى ٱلنَّاسَ﴾ کا بنتا ہے۔ دونوں آیات کو قانون قدرت کے ماتحت سمجھنے کی کوشش کیجئے اور امرتسری ''بلاغ'' کے حق گوئی روش نہ اختیار کیجئے، جو قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے۔

حافظ صاحب!

آپ اعیان اہل حدیث کی صحبت میں رہے ہیں جن کے علم وفضل کا آپ کو بھی اعتراف ہے۔ کیا آپ شہادت دے سکتے ہیں کہ ان اعیان کے دل میں قرآن مجید کی عظمت اتنی بھی نہ تھی جتنی اخوان یوسف کے دل میں ہے۔ ان کی خدمات دینی اور تعلیم قرآنی پر لحاظ کریں۔ جو عالم ارواح سے آپ کو بلند آہنگی سے کہہ رہے ہیں کہ ؎

مجھ سا مشتاق جہاں میں کہیں پاؤ گے نہیں
گرچہ ڈھونڈو گے چراغ رخ زیبا لے کر

اطلاع! کتاب ''بلاغ الحق'' کا اصل مضمون انکار حدیث ہے۔ یعنی اس بات کا ثابت کرنا کہ سوائے قرآن مجید کے کوئی کلام نبوی شرعی حجت نہیں۔ اس کے متعلق کافی بحث ہو چکی ہے۔ حافظ صاحب کے دلائل سب ذکر ہو چکے ہیں۔ ہماری معروضات بھی پبلک کے سامنے آ چکی ہیں۔ گویا کتاب کی روح نکل چکی ہے۔ اب زیادہ قال اقول میں

فائدہ نہیں۔ ہاں صرف ایک مضمون قابل ذکر ہے۔جس کا عنوان انہوں نے ''حلال حرام'' رکھا ہے۔اس عنوان کے ماتحت بھی حافظ صاحب نے جو قلابازیاں کھائی ہیں۔اہل علم کے قابل دیدوشنید ہیں۔آپ کے الفاظ اس بارے میں یہ ہیں:

''جب آنحضرت علیہ الصلاۃ والسلام سے لوگوں نے کسی چیز کی حرمت دریافت کی تو فرمان خداوندی صادر ہوا: ﴿قُل لَّآ أَجِدُ فِي مَآ أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُۥٓ إِلَّآ أَن يَكُونَ مَيْتَةً ﴾ الخ[الانعام:۱۴۵] (اے رسول کہہ دو کہ ہم پر خدا نے وحی کی ہے اس میں تو ہم فلاں فلاں چیزوں کے سوا (جو اوپر بیان ہوئیں) کسی کھانے والے پر کچھ کھا رہا ہو حرام نہیں پاتے)،آپ حرمت قرآن مجید میں تلاش فرماتے تھے اور اپنے جی سے حکم نہ دیتے تھے، پھر کوئی دوسرا احرام کرنے کا کیوں کر مجاز ہوسکتا ہے، ﴿لَّآ أَجِدُ﴾ سے صاف ظاہر ہے کہ وحی خداوندی قرآن مجید ہی ہے، جس میں حکم تلاش فرماتے تھے، اپنے اقوال وافعال ماسوائے قرآن یعنی وحی خفی میں تلاش نہ فرماتے تھے۔ ﴿عَلَىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُۥٓ﴾ بھی قابل توجہ ہے، یعنی حرمت رزق میں ہے جو لوگ کھاتے پیتے ہیں، جو بالعموم انسان نہیں کھاتے وہ رزق نہیں، فرمان ہے: ﴿كُلُواْ مِن طَيِّبَٰتِ مَا رَزَقْنَٰكُمْ ﴾[البقرۃ:۱۷۲] ، خدا کے دیئے ہوئے رزق میں طیب اور سنہری چیزیں کھاؤ۔ اور جو رزق نہیں اور طیب نہیں وہ نہ کھاؤ۔مثلا: درندے، کتے ، بلی ،حشرات الارض، کہ یہ رزق نہیں اور طیب بھی نہیں'' (بلاغ الحق:ص:۱۴۸)۔

اہلحدیث:

آپ کا یہ فقرہ کہ

''﴿لَّآ أَجِدُ﴾ سے ظاہر ہے کہ وحی خداوندی قرآن مجید ہی ہے''۔

یہ ایک پرانی رٹ ہے، جیسے بھوکوں کے حق میں مثل ہے: ''دو اور دو چار روٹیاں''۔ وحی جلی اور خفی کی بحث پہلے ہوچکی ہے۔ ناظرین اسے اپنے موقع پر

ملاحظہ فرمائیں۔ حافظ صاحب کی کمال دور اندیشی کی ہم داد دیتے ہیں، یہ دور اندیشی مولوی عبداللہ چکڑالوی سے بھی نہیں ہوسکی، ان پر سوال ہوا کرتا تھا کہ کتے، بلے کی حرمت قرآن سے دکھاؤ ورنہ کھاؤ، تو وہ کہتے تھے، کتے کی حرمت کا ذکر قرآن میں آیا ہے، ''الخنزیر'' کا لفظ اپنے دعوی کے ثبوت میں پیش کرتے اور تفصیل اس کی یوں کرتے کہ خنزیر سے مراد سؤر اور ''ال'' سے مراد کتا، جس پر طلباء مدارس ہنسی اڑاتے، مگر حافظ محب الحق صاحب نے اس جواب کو کافی نہیں سمجھا اور کس لطافت سے قرآن فہمی کی داد دی ہے کہ کتا، بلا اور حشرات الارض وغیرہ رزق نہیں ہیں اور طیب بھی نہیں، مگر جناب نے یہ خیال نہیں فرمایا کہ ہمارے اس دعوے کی دلیل کیا ہے، کیا ہم مسلمانوں کے حق میں رزق طیب نہیں ہے یا چینیوں اور جاپانیوں کے حق میں بھی طیب نہیں جو ہر قسم کا گوشت کھا جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو بے شک ان چیزوں سے نفرت ہے لیکن یہ نفرت فطری اور طبعی نہیں بلکہ مذہبی تعلیم کے ماتحت ہے تو یہ الگ بات ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان سؤر کے گوشت کو طیب نہیں سمجھتے، بلکہ اس سے نفرت کرتے ہیں [1]۔ حالانکہ دوسری ہمسایہ قوموں کے افراد فرمائشیں دے کر ہوٹلوں میں پکواتے ہیں، اعتبار نہ ہو تو کسی بڑے ریلوے اسٹیشن کے ''ریفرشمنٹ روم'' میں چلے جائیے اور معلوم کر کے ہمارے بیان کی تصدیق کیجئے۔

حافظ صاحب:

آپ بحکم خداوندی: ﴿وَأْتُوا۟ ٱلْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَٰبِهَا﴾ [البقرۃ:۱۸۹]، سیدھے رستے سے آئیں، یا تو اپنے دعوے کے مطابق کتے بلے اور حشرات الارض وغیرہ کی حرمت قرآن شریف سے دکھایئے یا ان کو نوش جاں فرمایئے اور اگر آپ کو نوش

① باستثناء ان مسلمانوں کے جو ہوٹلوں میں سب کچھ کھا آتے ہیں۔ (مؤلف)۔

جان کرنے میں طبعی کراہت ہو تو اپنے ماتحتوں کی نوش کرنے کی اجازت دیجئے، یہ دورنگی ٹھیک نہیں ؎

سراسر موم ہو یا سنگ ہو جا

اس سے آگے آپ نے آیت: ﴿أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ﴾ [الانعام:۱۵۱] لکھ کر اس کے معنی بیان کئے ہیں، جس کے متعلق مفصل بحث پہلے آ چکی ہے۔

آگے چل کر آپ نے سونے چاندی کی حرمت پر بھی غیض وغضب کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

''پھر جب بغیر خدا کے حرام کئے ہوئے کوئی چیز حرام نہیں ہو سکتی تو زینت کو حرام کس نے کیا، اس نے تو حرام نہ کیا جس نے سونے چاندی اور ریشم کو مردوں کے لئے حرام کیا ہے، کیوں کہ ان چیزوں کی حرمت تو قرآن مجید میں نہیں آئی، پھر جب خدا نے حرام نہ کیا تو ہرگز ہرگز رسول اللہ ﷺ نے بھی حرام نہ کیا، کیوں کہ حرام کرنے کا خدا کے سوا کوئی بھی مجاز نہیں، پھر کیا ان کی حرمت افترا علی اللہ ہے'' (بلاغ الحق:ص:۱۵۴)۔

اہلحدیث:

ہاں جناب ہم آپ کو صاف بتائیں کہ ان چیزوں کو اسی ذات ستودہ صفات نے حرام بتایا ہے جس کی شان میں: ﴿وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ ٱلْخَبَٰٓئِثَ﴾ [الاعراف: ۱۵۷] وارد ہے، آپ سمجھے ہوں گے کہ ﴿وَيُحَرِّمُ﴾ کا فاعل کون ہے، خطرہ ہے کہ آپ کہیں جلدی میں اس کا فاعل خدا نہ بتا دیں، اس لئے ساری آیت مکرر نقل کرتے ہیں، پس سنئے:

نوٹ:۔ ۳ ستمبر کے ''اہلحدیث'' میں بھی پہلے یہ آیت نقل ہو چکی ہے، آج مکرر پڑھیے:

﴿ٱلَّذِينَ يَتَّبِعُونَ ٱلرَّسُولَ ٱلنَّبِيَّ ٱلْأُمِّيَّ ٱلَّذِي يَجِدُونَهُۥ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي ٱلتَّوْرَىٰةِ وَٱلْإِنجِيلِ يَأْمُرُهُم بِٱلْمَعْرُوفِ وَيَنْهَىٰهُمْ عَنِ ٱلْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ ٱلطَّيِّبَٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ ٱلْخَبَٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَٱلْأَغْلَٰلَ ٱلَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ (الآیہ)[الاعراف:۱۵۷]۔

ترجمہ بھی آپ کی خاطر دوبارہ نقل کرتے ہیں، جو یہ ہے: ''رحمت کے حق دار وہ لوگ ہیں جو رسول نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جس کو اپنے نزدیک تورات، انجیل میں لکھا پاتے ہیں وہ ان کو نیک کاموں کا حکم دیتا ہے اور برے کاموں سے روکتا ہے اور پاک چیزیں ان کے لئے حلال کرتا ہے اور پلید چیزیں حرام کرتا ہے اور ان سے بوجھ اور گلے کے طوق دور کرتا ہے'' (اہل حدیث ۳/ستمبر ۳۷ء)۔

پس حافظ صاحب بتایئے! اس میں کوئی شک رہا کہ ''وَيُحِلُّ'' اور ''وَيُحَرِّمُ'' کا فاعل رسول اللہ ہیں، دیگر ہیچ۔ مگر نہ ذات خاص کی حیثیت سے بلکہ بوصف رسالت، یعنی باصطلاح منطق مشروطہ عامہ ہے۔ پس جو کچھ رسول اللہ ﷺ دین میں از قسم حرام یا حلال فرما گئے۔ بذریعہ قرآن یا بذریعہ حدیث وہ اس آیت کے ماتحت ہے۔

ازالۂ شبہ: شاید آپ کو یا آپ کے کسی ہم خیال کو شبہ ہو کہ اگر رسول اللہ ﷺ بھی کسی چیز کے محرّم (حرام کرنے والے) ہوتے تو دوسری جگہ یہ ارشاد کیوں نازل ہوتا: ﴿لِمَ تُحَرِّمُ مَآ أَحَلَّ ٱللَّهُ لَكَ﴾ [التحریم:۱] کیوں حرام کرتا ہے تو اس چیز کو جسے اللہ نے تیرے لئے حلال کیا۔

اس شبہ کا جواب بطریق منطق یہ ہے کہ قضیہ ضروریہ مطلقہ اور مشروطہ عامہ میں تناقض نہیں ہوتا۔ یعنی (تحرم) میں آنحضرت کی ذات فاعل بحیثیت ذات ہے اور (یحرم) میں ذات محمد ﷺ بوصف رسالت فاعل ہے۔ (فَافْهَمْ وَلَا تَعْجَلْ)

خاتمہ ناظرین کرام!

ہمارا اور اہل قرآن کا اختلافی مرکز یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے خدا کی طرف سے سوائے قرآن کے کوئی اور ذریعہ علم بھی تھا یا نہ؟ ہم (قائلین حدیث) اس کے قائل ہیں اور اہل قرآن (بِجَمِیعِ أَصْنَافِهِمْ) اس سے منکر ہیں، ہم نے اپنا دعوی اس مضمون میں ثابت کر دیا ہے۔ اور حافظ محب الحق صاحب اور دیگر اخوان یوسف کے دلائل کا جواب دے دیا ہے۔ تاہم کسی صاحب کو حافظ صاحب کی کتاب ''بلاغ الحق'' میں کوئی بات قابل جواب نظر آئے جس کا جواب ہماری تحریر میں ان کو نہ ملے، نہ نصاً، نہ اشارۃً، نہ دلالۃً، نہ اقتضاءً تو وہ ہمیں اطلاع دیں۔

پس حافظ صاحب ؎

اب تو چلتے ہیں میکدہ سے میر!
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

اطلاع: سلسلہ ہذا کے دوسرے حصے کا ذکر اس مضمون کے جواب میں ہوگا جو رسالہ ''ترجمان القرآن'' حیدرآباد دکن میں بعنوان ''شخصیت پرستی'' ماہ صفر سنہ رواں میں نکلا ہے۔ جس کا ذکر ''اہلحدیث'' ۱۲؍اگست میں ہو چکا ہے۔ ناظرین دعا کریں کہ خدا اس کو بھی پایہ تکمیل تک پہنچائے۔

قسط:۱۵

تصدیق الحدیث

''تتمہ بجواب بلاغ الحق''

(۱۳رشوال ۱۳۵۶ھ = ۱۷ردسمبر ۱۹۳۷ء)

گزشتہ پرچے میں ہم کتاب ''بلاغ الحق'' کا جواب ختم کر چکے ہیں۔اس کے بعد رسالہ ''بلاغ'' امرتسر دیکھنے میں آیا،جس میں حافظ محب الحق صاحب نے اپنی کتاب (بلاغ الحق) کی تائید میں کچھ خامہ فرسائی فرمائی ہے۔تو ان کا حق ہے، اس سے ان کو کون روک سکتا ہے۔مگر ہم پر جو اظہار ناراضگی کیا ہے وہ بے جا ہے۔جس شکایت کا جواب ہم ''بیان الحق'' میں مفصل دے چکے ہیں آپ نے اسی شکایت کو پھر دہرایا ہے۔چنانچہ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

''دفتر اہل حدیث سے چند اوراق میرے پاس پہنچے۔اس کا نام ''بیان الحق'' ہے جو ''بلاغ الحق'' کے جواب میں لکھا گیا ہے۔میں نے اس کو دیکھا یہ بھی ''کلمۃ الحق''[1] ہی کا فوٹو ہے جو ''شرعۃ الحق'' کے جواب میں مولانا ثناء اللہ صاحب نے اہل حدیث کے پرچوں میں شائع فرمایا تھا''۔

''شرعۃ الحق'' میں پندرہ سولہ سوالات ہیں جو نمبروار قرآن مجید ہی کی صریح آیتوں سے حل کئے گئے ہیں۔ ''کلمۃ الحق'' میں مولانا نے کسی ایک نمبر کو بھی باطل نہ کیا، پھر اس کو جواب کہو تو جواب کیا ہوا۔ہاں جگہ بہ جگہ عبارت نقل کی گئی اور جستہ جستہ جملوں پر طبع آزمائی

---

① شرعۃ الحق کا جواب جو ہماری طرف سے شائع ہوا تھا اس کا اصل نام ''حکمۃ الحق'' ہے۔مگر حافظ محب الحق صاحب غصے میں کتاب کا نام بھی بھول گئے۔(اہل حدیث)۔

کی گئی، ان سوالوں کے جوابوں سے جو صرف قرآن مجید ہی کی صریح آیتوں سے میں نے دیئے ہیں حافظ عبداللہ صاحب علیہ الرحمۃ غازی پوری کلیتاً متفق تھے۔ ﴿وَكَفَىٰ بِٱللَّهِ شَهِيدًا﴾ [النساء:۷۹] فرقہ بازوں کی گواہی فرقہ بندی کے سلسلہ میں معتبر نہیں [1] اس کا فیصلہ خدا کے حضور میں ہو رہے گا۔ مگر مجھے کسی کے اتفاق و اختلاف سے بحث نہیں، کیوں کہ وہ معیار حق نہیں، میرے لکھنے کا مطلب صرف اس قدر تھا کہ وہ ان کے لئے جو قرآن کی آیتوں کا انکار یا اس سے اعراض اور چشم پوشی کرتے اور فرقہ پرستی یا انسان پرستی میں مبتلا ہیں شاید سند اور موجب ہدایت ہو۔ غرض نہ ''کلمۃ الحق'' میں ''شرعۃ الحق'' کا کوئی نمبر باطل کیا گیا نہ ''بیان الحق'' میں بجز [2] قرآن کو حدیث مفروضہ سے باطل کرنے اور علماء کی عقیدت مندی سے قرآن کو اٹھانے کے ''بلاغ الحق'' کے مضمون کا بھی بطلان نہیں کیا گیا۔ چند اعتراضات کئے گئے وہ شاعرانہ، اور چند اتہامات لگائے گئے وہ بے بنیاد۔

''کلمۃ الحق'' کا میں نے جواب دیا نہیں کہ بحث مباحثہ میرا مسلک نہیں، کیوں کہ بحث ومباحثہ تو {أَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ} (الجاثیۃ: ۲۳) کا جلوس اور ماسوی کی جے کا نعرہ لگانا ہے [3] مگر ''بیان الحق'' میں انسان پرستی اور راویوں کے غلو محبت میں کہ، ع:

---

① اہل حدیث کے پرچہائے مؤرخہ ۱۷ / ستمبر ۳۲ء، ۸۔ ۱۵ / اکتوبر ۳۲ء میں شہادات درج ہو چکی ہیں کہ مولانا عبداللہ صاحب مرحوم غازی پوری حدیث نبوی کو حجت شرعیہ جانتے تھے۔ آپ کا بیان مدعیانہ ہے، شہادت نہیں۔ (اہل حدیث)۔

② ہم اہل حدیث مؤرخہ ۲۰ / اگست میں بتا چکے ہیں کہ ہم سلسلہ ''حکمۃ الحق بجواب شرعۃ الحق'' میں ان پندرہ نمبروں کے جواب سے فارغ ہو چکے ہیں۔ اس کا ذکر حافظ صاحب نے نہیں کیا مگر انکار کرتے جاتے ہیں ؎

ہٹ چھوڑیئے اب سر انصاف آیئے
انکار ہی رہے گا مری جان کب تلک (اہل حدیث)۔

③ کیا یہ مضمون نویسی مناظرہ نہیں تو مجادلہ ہے؟ (اہل حدیث)۔

بلائیں زلف جاناں کی اگر لیں گے تو ہم لیں گے

قرآن باطل کیا گیا اور اس میں تحریف کی گئی [1] تو کوئی زلف کے پھندوں میں پھنسا رہے تو رہے مگر تحریف قرآن کو دیکھ کر سنۃ اللہ یعنی روش قرآنی کے اتباع کی حقیقت سے آپ کے لیے نہیں تو باطناً منکرین قرآن کے لیے تبلیغاً اعلان حق کی ضرورت محسوس ہوئی کہ قرآن پر غلط روایتوں کی جو خاک اچھالی گئی ہے اور یوں ہمارے مقدس رسول ﷺ متہم بنائے گئے ہیں اور آپ کی تبلیغ ناقص اور بے کار قرار دی گئی ہے اور ڈنکے کی چوٹ حملہ کیا گیا ہے کہ آپ خلاف حکم خداوندی یعنی قرآن مجید کے خلاف بھی حکم دیتے تھے، العیاذ باللہ [2]۔

دعوی کیا گیا کہ آپ نے ایسے احکام دیے اور اس کی تبلیغ نہ فرمائی اور اپنی ناقص تبلیغ قرآن وقوم کی گمراہی کے لیے چھوڑ گئے، نہ قرآن میں ضمیمہ لگایا، نہ حاشیہ چڑھایا، نہ حفاظ کو یاد کرنے کی ہدایت فرمائی، الامان، الامان، میں نے چاہا کہ قرآن کے چہرہ سے معشوقان مجازی کی زلفوں کو الگ کردوں کہ خدا کے کلام اور رسول کی رسالت کا نور ضوافشاں رہے، [3] معبود حقیقی کی تجلی جلوہ آرہ ہو کہ معبود مجازی کی چنگاریاں دھیمی پڑ جائیں، یہی غرض کتابوں کی تصنیف سے ہے اور گویا یہی غرض ان چند سطروں کی تحریر سے ہے۔

''بیان الحق'' میں مجھے پنڈت محب الحق کا خطاب دیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ بیان

---

① اخوان یوسف کے یہ مجادلانہ فقرات بہت پرانے ہیں۔ (اہلحدیث)۔

② ہم ''بیان الحق'' میں ثابت کر آئے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے پاس تحصیل علم الٰہی کے دو ذریعے تھے ایک قرآن مجید اور دوسرا وحی خفی۔ جب واقعہ یہ ہے تو پھر قرآن کے خلاف حکم کے کیا معنی؟ (اہلحدیث)۔

③ اہل قرآن کی طرف سے حفاظت و ہمدردی قرآن کا ادعا ایسا ہی ہے جیسے اخوان یوسف نے حضرت یوسف کے حق میں کہا تھا ﴿وَإِنَّا لَهُۥ لَحَـٰفِظُونَ﴾ اسی لئے ہم ان لوگوں کو اخوان یوسف کہا کرتے ہیں۔ (اہل حدیث)۔

کی گئی ہے کہ یہ میرے جملہ کا جواب ہے جو ''بلاغ الحق'' سے نقل کیا گیا ہے کہ تم نے سمجھا کہ قرآن مسلمان پنڈتوں کے سوا کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا (ص:۵۰)

وہی پرانی عادت کے مطابق میرا ایک جملہ نقل کر دیا گیا، اگر پورا مضمون نقل فرما دیا ہوتا تو ظاہر ہو جاتا کہ:

''جو عالم مسلمانوں کو قرآن پڑھنے سمجھنے اور اس میں تدبر کرنے سے روکتے ہیں کہ یہ معمہ ہے، چیستاں ہے، ہمارے علوم کا مخزن ہے، مگر یہ دین ناقص ہے، اس سے بہتر تو حدیث کو یاد کرنا اور حدیث کی تلاوت ہے کہ یہ مفصل ہے۔

ثواب رسانی یا عملیات کے لیے پڑھ سکتے ہو مگر احکام و ہدایات سمجھ نہیں سکتے، کیا نہیں جانتے کہ جو ناسخ و منسوخ کے رموز سے واقف نہیں اس کو قرآن پڑھنا اور اس پر عمل کرنا جائز نہیں، میں ان کو ﴿يَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ﴾ [الاعراف:۴۵] سمجھتا ہوں، اور یہی شان پنڈتوں کی تھی: ﴿سُنَّةَ ٱللَّهِ ٱلَّتِي قَدۡ خَلَتۡ مِن قَبۡلُ﴾ [الفتح:۲۳] کہ انہوں نے وید کا پڑھنا پنڈتوں کے سوا کسی کے لیے جائز نہ رکھا تھا اس لیے میں نے ان کو مسلمان پنڈت لکھا، میں نے ان کو تو لکھا نہیں جو پنڈت کی روش کے نہیں، نہ میں نے کسی کا نام لے کر شخصی طور پر لکھا، آپ نے مجھے شخصی طور پر پنڈت کا خطاب دیا تو اس کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس خطاب پر اس لیے ناز کرتا ہوں کہ یہ تو ہمارے مقدس رسول علیہ الصلاۃ والسلام کی مقدس سنت ہے کہ آپ شاعر کہے گئے، کاہن کہے گئے، آپ نے سن لیا، مجھے بھی شاعر، پنڈت اور کیا کیا کہا گیا، مجھے بھی اسی اتباع سے سن لینا چاہیے[1] وہ الحمد للہ میں نے بھی سن لیا، تبلیغ کی راہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سخت ترین حملے ہوئے

[1] یہ تمثیل بالکل غلط ہے کیوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کو مکروہ لقب سے یاد نہیں کیا تھا جیسے آپ نے کیا ہے، سابقہ عنایات کے علاوہ جدید عنایات دیکھیے کہ آپ نے اسی مضمون میں قائلین حدیث کو منکرین قرآن لکھا ہے (ص: ۱۴)۔(اہلحدیث)۔

آپ ﷺ نے صبر فرمایا، میں چوں کہ بلا شرکت غیرے خاص آپ کی امت میں ہوں خالص مسلمان، اس لیے مجھے پنڈت، جاہل اور جھوٹا کہنا تو اسی کی ایک چھینٹ ہے جو مجھ پر ڈالی گئی ہے، الحمدللہ مجھ سا ناچیز بھی اس لائق ہوا کہ تیرہ سو برس کے بعد اسی تبلیغ کی راہ میں وہی خاک مجھ پر اچھالی گئی جو اس پاک ہستی پر اچھالی گئی تھی تو اس پر تو مجھے صوفیانہ حال کرنے کو جی چاہتا ہے'' (بلاغ امرتسر بابت دسمبر ۳۳ء، ص:۱۱-۱۰-۹)۔

اہلحدیث:

ناظرین! یہ نمونہ ہے حافظ صاحب کی شکایات کا جن کا ازالہ ہم ''بیان الحق'' کے سلسلے میں کافی کر چکے ہیں، آپ لوگ حافظ صاحب کو شکایت کرنے میں معذور خیال فرمائیں، اگر حافظ صاحب اس موضوع پر کچھ اور لکھیں گے تو ہمیں حاضر پائیں گے، ان شاء اللہ۔

کیوں کہ ہمیں حافظ صاحب کے ساتھ بوجہ تعلق مولانا عبداللہ غازی پوری رحمہ اللہ کے خاص محبت ہے۔

مجھ سا مشتاق جہاں میں کہیں پاؤ گے نہیں
گر چہ ڈھونڈھو گے چراغِ رخِ زیبا لے کر

تصدیق الحدیث (حصہ دوم)

حقیقت پسندی بجواب شخصیت پرستی

مؤلفہ

مناظرِ اسلام علامۂ عصر مولانا ابوالوفاء ثناءاللہ امرتسری

ان مضامین میں چوہدری غلام احمد صاحب پرویز کے ایک مضمون جو ''ترجمان القرآن'' مجریہ ماہ صفر ۱۳۵۶ھ میں شائع ہوا تھا کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، جو قسط وار (۴ قسطوں میں) ''اخبار اہل حدیث'' امرتسر میں ۱۸/ذی قعدہ ۱۳۵۶ھ (تا) ۱۰/ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ ۲۱/جنوری ۱۹۳۸ء (تا) ۱۱/فروری ۱۹۳۸ء تک شائع ہوا۔

تحقیق و تعلیق

عبدالاحد احسن جمیل آل عبدالرحمن

قسط:۱

تصدیق الحدیث (حصہ دوم)

حقیقت پسندی بجواب شخصیت پرستی

(۱۸/ذی قعدہ ۱۳۵۶ھ = ۲۱/جنوری ۱۹۳۸ء)

نوٹ! نمبر اول میں بعض اغلاط کتابت کی وجہ سے نیز ورق سالم رکھنے کی وجہ سے گزشتہ نمبر کے مضمون کو بھی اس نمبر میں ملا کر یک جا کیا گیا ہے۔ ناظرین اس سلسلہ کو الگ محفوظ رکھنا چاہیں تو یہ ورق محفوظ رکھیں۔

آج ہم اس مضمون پر توجہ کرتے ہیں جو رسالہ ''ترجمان القرآن'' حیدرآباد مجریہ ماہ صفر ۱۳۵۶ھ میں بقلم چوہدری غلام احمد صاحب پرویز شائع ہوا ہے، اس مضمون کے جواب دینے کا ذکر میں نے اہلحدیث مؤرخہ ۲۰/اگست ۳۷ء میں کیا تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ حافظ محب الحق صاحب کا جواب ختم ہوتے ہی اس مضمون کا جواب درج ہو جاتا، مگر میری علالت کی وجہ سے اس میں تاخیر ہوئی، آج بحولہ وقوتہ اس پر قلم اٹھاتا ہوں، اللہ تعالی میری مدد کرے، آمین۔

چوہدری صاحب کا مضمون مذکور دیکھنے سے باوجود مخالف ہونے کے ان کی خوش کلامی کی داد دینے کو جی چاہتا ہے، اس امر کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ خاکسار راقم کو ہر قسم کے مضمون نگاروں سے پالا پڑا ہے، سوامی دیانند اور مصنف رنگیلا رسول جیسے دل آزار مضمون نویسوں کو بھی دیکھا، مرزا صاحب قادیانی کی تحریرات بھی پڑھیں، ان کی شیریں کلام الہامی زبان سے اور بدذات فرقہ مولویاں (انجام آتھم) بھی سنی۔ منکرین

حدیث میں سے مولوی عبداللہ چکڑالوی امرتسری جماعت منکرہ اور حافظ محب الحق کی تحریرات بھی پڑھیں، غرض یہ کہنا بالکل صحیح ہے۔ع ؎

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

ان سب میں ہم چوہدری صاحب کو سرسید احمد خان علی گڑھی مرحوم کے بعد خوش کلام پاتے ہیں، مگر یہ کہنے سے بھی باز نہیں رہ سکتے کہ دونوں صاحب باوجود خوش کلام ہونے کے کبھی کبھی تقاضا بشریت سے مغلوب بھی نظر آتے ہیں، ایک زمانہ گزرا ہے کہ سرسید مرحوم سے ہمارا ان کی زندگی میں تخاطب تھا، اس وقت ہم ان کی تحریرات میں یہ بات پاتے تھے کہ اکثر تو نفس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں مگر گاہے گاہے بشریت کے تقاضے سے اپنے مخاطبوں کو خشک صوفی اور شہوت پرست زاہد بھی کہہ دیا جاتا ہے، اور بہشت کو چکلہ خواہشات اور شراب طہور کی نہروں کا نام خرابات رکھتے ہیں، اسی طرح چوہدری پرویز صاحب باوجود خوش کلامی کے سہو ونسیان سے خالی نہیں ہیں، چنانچہ آپ کے مضمون کی سرخی ''شخصیت پرستی'' ہی شدت وکراہت کا اظہار کررہی ہے، عفی اللہ عنا۔

اصل مضمون:

مولوی عبداللہ چکڑالوی اور حافظ محب الحق منکرین حدیث وغیرہ تو حدیث پر اس حیثیت سے بحث کرتے ہیں کہ وہ ثابت کریں کہ حدیث حجیت شرعیہ نہیں ہے، چنانچہ ان کی منقولہ تحریرات سابقہ پرچوں میں ناظرین پڑھ چکے ہیں، وہ کھلے لفظوں میں کہتے ہیں کہ قرآن مجید کے سوا پیغمبر علیہ السلام کی کوئی حدیث حجت نہیں ہے، مگر چوہدری پرویز صاحب کی نظر میں حدیث نبوی بزمانۂ رسالت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منہ سے سنی گئی ہو حجت شرعی ہے، لیکن سلسلہ روایت کی وجہ سے وہ حجت نہیں رہی۔

اسی لیے وہ اپنے مضمون کا نام ''شخصیت پرستی'' رکھتے ہیں غرضیکہ دونوں صاحبوں (حافظ محب الحق اور پرویز صاحب کا مسلک جدا جدا ہے)۔

چوہدری صاحب حدیث متواتر اور اسوہ حسنہ کو سند مانتے ہیں، احادیث آحاد تک ان کی بحث محصور ہے، اسی لیے وہ اپنے مضمون کا نام شخصیت پرستی رکھتے ہیں، کیوں کہ ان کے نزدیک ایک دو آدمیوں کے کہنے پر عمل کرنا شخصیت پرستی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک، دو آدمی کسی بات کو بیان کریں تو امکان کذب باقی رہتا ہے، پھر یہ کیوں کر صحیح ہوسکتا ہے کہ ایک دو راویوں کی راویت پر ہم اعتماد کر کے اس کو دین میں داخل سمجھیں، یہ ہے ان کی ساری تحریر کا ملخص۔

مختصر جواب:

ہم فریقین بلکہ جملہ فرقہ ہائے اسلام میں قرآن شریف حجت شرعیہ ہے جس امر کی طرف قرآن شریف رہنمائی کرے وہ یقیناً صحیح ہے، اہل قرآن یا بالفاظ دیگر منکرین حجیت حدیث تو اس اصول کو بہ مسرت قلبی قبول کرتے ہیں پس آپ غور فرمائیں کہ ہر مقدمہ دیوانی اور فوجداری میں سوائے زنا کے ارشاد عام ہے: ﴿وَأَشْهِدُوا۟ ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنكُمْ﴾ [الطلاق:۲]۔

یعنی دو بھلے آدمی ہر معاملہ میں گواہ کرلیا کرو، انہیں دو گواہوں کی شہادت سے جس طرح نکاح کا ثبوت ہوگا اسی طرح قتل کا بھی ثبوت ہوگا، نکاح کا ثبوت ہونے کے بعد مرد عورت کا دائمی ملاپ اور اس کے نتائج سب صحیح سمجھے جائیں گے، اسی طرح دوسرے جرائم (قتل، ڈکیتی، چوری، وغیرہ) بھی دو گواہوں سے ثابت ہوجاویں گے جن کی سزا بھی قرآن مجید میں مذکور ہے کہ مرتکب ان جرائم کا یا تو بالکل دنیا سے فنا کیا جاتا ہے یا نیم مردہ کردیا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے!

کیاان دوگواہوں کے بیان میں امکان کذب نہیں ہے؟ یہ امر پرویز صاحب کے قابل غور ہے۔

اس حکم کے ساتھ دوسری آیت کومنضم کیجئے۔جس میں ارشاد ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِن جَآءَكُمْ فَاسِقُۢ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوٓاْ﴾ [الحجرات:٦] اگرکوئی بدکار تمہیں کوئی خبر بتائے توتحقیق کرلیا کرو۔

اس آیت سے مستنبط ہوتا ہے کہ اگرکوئی متقی پرہیز گار جو فاسق کی ضد ہے خبر بتائے تو اس کی تصدیق کرلینا، تعلیم قرآنی کا مقتضا ہے۔محدثین کرام ان آیات کے ماتحت راویان حدیث کی روایت کوقبول کرتے ہیں۔جس کا نام پرویز صاحب شخصیت پرستی رکھتے ہیں۔کیا مقدمات دیوانی اورفوجداری میں شاہدان عدل کی شہادت کوقبول کر کے فیصلہ کرنے کا نام شخصیت پرستی رکھیں گے یا اسے حق پسندی کہیں گے۔دیدہ باید!۔

ناظرین کرام! یہ ہے مختصر جرم محدثین کا جس پر ان کو منکرین حدیث کی طرف سے مختلف القاب ملتے ہیں۔جس کے جواب میں ہماری طرف سے مندرجہ ذیل التماس پیش ہے ؎

مکش بہ تیغ ستم والہان سنت را نہ کردہ اند بجز پاس حق گناہ دگر

رفع بدگمانی:

چودھری صاحب اپنی ذات سے عرفی اہل قرآن ہونے کا الزام دفع کرتے ہیں۔ آپ کے الفاظ اس بارے میں یہ ہیں:

''میں یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔تصریحات بالا سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں اس گروہ کے مسلک کی تائید کررہا ہوں جسے عام طور پر منکرین حدیث یا اہل قرآن کہا

جاتا ہے، میں اس سے پیشتر اپنے متعدد مضامین میں اس حقیقت کو بے نقاب کر چکا ہوں کہ اس فرقہ کو رسول کی حیثیت کی تعیین میں سخت ٹھوکر لگی ہے۔ وہ اس امر سے چشم پوشی کر رہے ہیں کہ قرآن کریم میں کیوں حصر کے ساتھ ارشاد ہے کہ ہم نے انسانوں ہی کو رسول بنایا۔ ان کے نزدیک اگر قرآن کعبے کی چھت سے لٹکا دیا جاتا یا کسی چٹان پر منقوش مل جاتا تو بھی ایسا ہی تھا جیسا رسول عربی کی وساطت سے دنیا کو ملا۔ رسول کی حیثیت ان کے نزدیک آلۂ ابلاغ سے زیادہ نہیں۔ متشدد فی الحدیث طبقہ اگر اس افراط کی طرف چلا گیا کہ ہر قول منسوب الی الرسول کو قول رسول قرار دے کر واجب الاتباع تسلیم کرنے لگا تو دوسری طرف یہ اہل قرآن ہونے کے مدعی اس تفریط میں جا گرے کہ عمل رسول کو جوامت کے لئے اسوۂ حسنہ ہے، ایک بے کار محض شئ سمجھ کر قرآن کریم کو اپنی ذہنی قیاس آرائیوں کی جولان گاہ بنانے لگا'' (ترجمان القرآن، ص: ۷۳)۔

اہلحدیث:

اس بیان میں چوہدری پرویز صاحب نے اپنی حیثیت صاف الفاظ میں ظاہر کر دی ہے کہ وہ عرفی اہل قرآن نہیں بلکہ وہ ایسے لوگوں کو جو حدیث رسول کو حجت شرعیہ تسلیم نہیں کرتے۔ غلطی خوردہ یعنی گمراہ سمجھتے ہیں، باقی رہا چوہدری صاحب کا یہ قول کہ:

''متشدد فی الحدیث طبقہ جو ہر قول منسوب الی الرسول کو قول رسول قرار دے کر واجب الاتباع تسلیم کرتا ہے''۔

ہم چوہدری صاحب کو اطلاع دیتے ہیں کہ زمانۂ رسالت سے لے کر آج تک کوئی ایسا طبقہ نہ دیکھا گیا نہ سنا گیا جو ہر قول منسوب الی الرسول کو واجب الاتباع سمجھتا ہو۔ ایسا ہوتا تو احادیث موضوعہ اور ضعاف کا ذخیرہ نہ پایا جاتا۔ بلکہ محدثین کرام اس حدیث منسوب الی الرسول کو مانتے ہیں جو ثقات رواۃ سے متصل اسناد کے ساتھ پہنچے۔ اس بیان کی پوری تفصیل کے لئے مقدمہ صحیح مسلم ملاحظہ ہو۔

معذرت واعلان! میں بذات خود اپنے قصور علم کا اعتراف کر کے اعلان کرتا ہوں کہ جن اہل علم کو میرے جوابات نا کافی معلوم ہوں وہ رسالہ ''ترجمان القرآن'' نمبر ۲، جلد ۱۰ بالا ستیعاب مطالعہ کریں اور اپنی طرف سے معقول جواب (بغیر طعن وتشنیع) لکھ کر دفتر ہذا میں بھیج دیں تو شائع کر دیا جائے گا۔ کیوں کہ یہ کام جماعت کا مشترکہ ہے۔ کسی کا ذاتی نہیں۔

چوہدری صاحب فرماتے ہیں:

(۱) ''دین نام ہے قرآن اور اسوۂ حسنہ کا۔

(۲) اسوۂ حسنہ ایک محسوس شئ تھا، جو قرناً بعد قرن متواتر چلا آیا ہے۔ یہ دونوں یقینی ہیں''۔

اہلحدیث:

الحمد للہ کہ اب محل نزاع بہت مختصر رہ گیا، کیوں کہ نماز، روزہ، حج، زکاۃ مع اپنی تفصیلات کے اسوۂ حسنہ متواترہ ہونے کی وجہ سے بے غل وغش قابل قبول ہیں، باقی رہیں وہ احادیث جو ان افعال متواترہ کے علاوہ ہیں ان کا ثبوت کچھ تو مختصر جواب میں مذکور ہو چکا ہے۔ باقی درج ذیل ہے:

چوہدری صاحب کا یہ مقولہ کہ:

''ان کے علاوہ حضور کے جو اقوال، افعال اور اس عہد مبارک کے جو حالات ہم تک بروایت احادیث پہنچیں گے وہ یقینی نہ ہوں گے، ظنی ہوں گے۔ احادیث کا مجموعہ اسی شق میں داخل ہے''[①] (رسالہ مذکور، ص: ۱۵)۔

اہلحدیث!

اس اقتباس میں زیر خط فقرہ چوہدری صاحب کے پہلے مقولہ کے خلاف ہے۔ جس

① اس فقرہ میں اصل میں کوئی خط نہیں کھینچا ہے اس لئے ہم نے بھی بلا خط چھوڑ دیا ہے۔

میں انہوں نے اسوۂ حسنہ کے افعال کو متواتر اور یقینی مانا ہے۔ حالانکہ وہ بھی مجموعہ کتب احادیث میں درج ہے پھر اس مجموعہ پر حکم ظنی لگانا کیوں کر صحیح ہوسکتا ہے۔ جس صورت میں اکثر حصہ مجموعہ کتب احادیث کا اسوۂ حسنہ متواترہ ہے جو آپ کے نزدیک بھی یقینی ہے۔

ظنی کی تحقیق منکرین حدیث کی طرف سے عموماً ظن کے لفظ پر بحث کی جاتی ہے اور اس سے عوام میں کتب حدیث کے متعلق بدگمانی پھیلائی جاتی ہے کہ حدیث ظنی ہے اس لئے واجب العمل نہیں۔ کبھی کبھی ترقی کر کے اس دعوی (عدم اعتبار حدیث) پر قرآنی آیت بھی پیش کی جاتی ہے: ﴿إِنَّ ٱلظَّنَّ لَا يُغۡنِي مِنَ ٱلۡحَقِّ شَيۡـًٔا﴾ [یونس: ۳۶] اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ظن کام نہیں آتا۔ نتیجہ یہ نکالا جاتا ہے کہ ''حدیث شریف'' کام کی چیز نہیں ہے۔

جواب! ہم سمجھتے ہیں کہ اس بیان میں تعصب یا عدم فہم قرآن کو بہت دخل ہے۔ قرآن مجید میں بعض جگہ ظن موجب عذاب اور بعض جگہ موجب نجات بھی آیا ہے۔ ملاحظہ ہو: ﴿ذَٰلِكَ ظَنُّ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْۚ فَوَيۡلٞ لِّلَّذِينَ كَفَرُواْ مِنَ ٱلنَّارِ﴾ [ص:۲۷] یہ کافروں کا ظن ہے اور کافروں کے لئے عذاب جہنم ہے۔ دوسری بات کا ثبوت سنئے: ﴿وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى ٱلۡخَٰشِعِينَ ۝٤٥ ٱلَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَٰقُواْ رَبِّهِمۡ وَأَنَّهُمۡ إِلَيۡهِ رَٰجِعُونَ﴾ [البقرۃ: ۴۵-۴۶]۔ یعنی جو لوگ اس بات کا ظن رکھتے ہیں کہ وہ خدا سے ملنے والے ہیں وہ خاشعین ہیں ان کو خوشخبری سنادو۔

قسط:۲

تصدیق الحدیث (حصہ دوم)

حقیقت پسندی بجواب شخصیت پرستی

(۲۵/ذی قعدہ ۱۳۵۶ھ = ۲۸/جنوری ۱۹۳۸ء)

مرقومہ آیت میں فعل ''یظنون''، ''ظن'' سے ماخوذ ہے جو موجب بشارت اور سبب نجات ہے، کیا یہ بیان قرآن میں تناقض اور تخالف ہے؟

ہرگز نہیں، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جہاں ظن کو موجب بشارت فرمایا ہے، وہاں تو اس کے معنی ''غالب گمان'' کے ہیں۔ چونکہ خدا کی ملاقات کا پورا یقین رکھنا ہر انسان کا کام نہیں، اس لئے از راہِ مہربانی ''غالب گمان'' پر وعدۂ انعام فرمایا۔ اور جہاں ظن موجب عذاب ہے وہاں اس کے معنی ''جانب باطل'' کے ہیں۔ خواہ اس پر جہل مرکب کی صورت میں یقین بھی ہو۔ ان معنی کا قرینہ خود آیت کے الفاظ میں موجود ہے:

﴿إِنَّ ٱلظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ ٱلْحَقِّ شَيْـًٔا﴾ [یونس: ۳۶] ظن حق کی جگہ کام نہیں آتا۔ حالانکہ آیت: ﴿إِلَّا عَلَى ٱلْخَٰشِعِينَ﴾ [البقرۃ: ۴۵]، میں ''ظن''، ''حق'' کی جگہ کام آیا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اس جگہ ظن کے معنی خلاف واقعہ غلط عقیدہ کے ہیں۔ خواہ کلام مؤکد بحرف تاکید ہی ہو جیسے کوئی آیت کریمہ: ﴿إِنَّا قَتَلْنَا ٱلْمَسِيحَ عِيسَى ٱبْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ ٱللَّهِ﴾ [النساء: ۱۵۷] کے الفاظ سے کلام کرے اور اس پر پختہ یقین کرکے: ﴿إِنَّكَ لَرَسُولُهُۥ وَٱللَّهُ﴾ [المنافقون: ۱] کہے تو بھی خیال خام اور کلام بے مرام ہے۔

پس ظن کے لفظ سے پریشان ہوکر ہر ایک ظنی بات کو چھوڑ دینا ظن ثانی (وہم) کے معنی میں ہے۔ پرویز صاحب کی ساری طویل تقریر کا خلاصہ انہی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

''مؤرخین نے عام تاریخ کی چھان بین اپنی بساط احتیاط کے مطابق کی۔ جامعین احادیث (علیہم الرحمۃ) نے احادیث کی ان سے بھی زیادہ تحقیق اور احتیاط سے تدوین کی، کہ یہ محبوب اور ہادی کی باتیں تھیں۔ ان کی جمع وتدوین میں محبت وعقیدت کا جذبہ بھی ساتھ شامل تھا۔ مزید احتیاط یہ بھی کہ جن جن واسطوں سے کسی قول یا فعل منسوب الی الرسول کو انہوں نے لیا تھا، وہ واسطے بھی محفوظ کر لئے۔ فجزاهم الله أحسن الجزاء ۔لیکن احادیث کے ان مجموعوں کی چھان بین اس نہج سے کی گئی کہ جس جس راوی سے کوئی حدیث ملی تھی اس کے متعلق حتی الامکان یہ تحقیق کر لیا گیا کہ وہ ثقہ تھا۔ صحیح الحفظ تھا، پرہیز گار تھا، متقی تھا، عام طور پر جھوٹ نہیں بولتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ اب اس سلسلہ میں دیکھئے کہ کس قدر انسان راستہ میں آگئے:

(۱) لاکھوں رواۃ حدیث۔

(۲) علماء جرح وتعدیل۔

(۳) جامعین احادیث۔

اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہ مجموعے تمام تر انسانی کاوش احتیاط کے رہین منت ہیں اور ہر چند تاریخ کی دیگر کتب سے زیادہ قابل اعتماد ہیں ۔لیکن بالآخر ہیں تو انسانی کارنامے ہی۔ خدا کی حفاظت کی ذمہ داری تو ان کے ساتھ نہیں'' (ترجمان القرآن: ص:۹۶)۔

اہلحدیث!

یہ عبارت گویا حافظ اسلم صاحب کے قلم کی رہین منت ہے یا مضمون کے لحاظ سے پرویز صاحب کا توارد ہے۔ بہرحال اب امر متنازع یہ رہ گیا کہ محدثین کی مساعی جمیلہ

قابل قبول ہیں یا نہیں؟ پرویز صاحب کا مسلک ان مساعی کے حق میں امکان غلطی تسلیم کرنا ہے۔

سواس کا جواب ہم پہلے دے چکے ہیں کہ وہ شاہدانِ عدل کی شہادت سے سرقہ میں قطع ید اور قصاص میں قتل کیا جاتا ہے۔حالانکہ ان کے بیان میں غلطی کا امکان راویان حدیث کی نسبت زیادہ ہے۔ پھر وہ تو معتبر ہوں اور یہ نہ ہوں تو کہا جائے گا: ﴿ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ ﴾ [النجم:۲۲] اس کے بعد پرویز صاحب کا یہ قول بھی قابل شنید ہے،جس کے الفاظ یہ ہیں:

''ان جامعین احادیث اور علماء جرح وتعدیل کو تنقید سے بالاتر سمجھ لینا اور ان کی ہر بات کو جوں کا توں تسلیم کر لینا ان کو بشریت کی سطح سے اوپر لے جانا ہے اور حضرات رواۃ کے متعلق خواہ وہ کتنے ہی ثقہ اور عدول ہوں، یہ عقیدہ رکھنا کہ ان سے غلط بیانی یا مفہوم کو غلط سمجھنے یا غلط ادا کرنے کا امکان ہی نہ تھا ان کو معصوم اور منزہ عن الخطا قرار دینا ہے جو صرف حضرات انبیاء کرام کا ہی حصہ ہے'' (ترجمان القرآن ص:۹۶)۔

اہلحدیث:

کسی ثقہ راوی کو معصوم اور منزہ عن الخطا قرار دینا اور بات ہے اس کی روایت کو مان لینا اور بات ہے، حافظ صاحب جیراجپوری بتا سکتے ہیں کہ معصوم اور منزہ عن الخطا قضیہ ضروریہ مطلقہ کا مادہ ہے اور اعتبار کرنا دائمہ مطلقہ کا،جس میں امکان نقیض داخل ہے، قرآن مجید سے اس کی تائید لینا چاہیں تو لیجیے اور غور کیجیے ارشاد ہے: ﴿ إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا ﴾ [الحجرات:٦]۔

اگر کوئی بدکار مخبر تمہیں خبر سنائے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو۔اس ارشاد کا مفہوم مخالف آپ کے علاوہ ہر ایک اہل فہم سمجھ سکتا ہے کہ یہ ارشاد مخبر صالح وثقہ کے واسطے نہیں ہے۔

اس کی تائید میں ایک اور آیت پیش کرتا ہوں جو پاک دامنوں کو تہمت لگانے والوں کے حق میں ہے ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا﴾ [النور: ۴] ۔ ان لوگوں کی شہادت کبھی قبول نہ کرنا۔

یہ آیت بھی ہمارے دعوی کی تائید کرتی ہے کیوں کہ ان لوگوں کے قاذف ہونے سے پہلی حالت پر یہ حکم نہیں ہے۔

لطیف مقابلہ:

پنجاب کے اول منکر حدیث مولوی عبداللہ چکڑالوی متوفی صلوات خمسہ کی فرض رکعات تعداد میں مثل قائلین حدیث کے پڑھا کرتے تھے، یعنی دو چار تین وغیرہ ان پر سوال ہوا کہ یہ تعداد قرآن شریف سے دکھاؤ کیوں کہ حدیث نبوی تو تمہارے نزدیک سند نہیں ہے، انہوں نے اپنے دعویٰ متعلق تعداد رکعات (دو، تین، چار) کے ثبوت میں آیت: ﴿جَاعِلِ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا أُولِي أَجْنِحَةٍ مَثْنَى وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ﴾ [فاطر:۱]، پیش فرمائی اس آیت کا صحیح ترجمہ تو یہ ہے کہ ''خدا فرشتوں کو رسول بناتا ہے جو دودو، تین تین، چار چار بازوؤں والے ہیں''۔

اس آیت میں لفظ مثنی سے آپ نے دو رکعتیں بتائیں ثلاث سے تین رکعتیں اور رباع سے چار رکعتیں۔ اسی طرح امرتسری جماعت منکرہ کے پیشوا نے نماز کے لیے وضو کی ضرورت سے انکار کیا، یعنی بے وضو نماز پڑھنا بھی جائز بتایا، جب ان پر اعتراض ہوا کہ وضو کا حکم، تو قرآن شریف کی آیت: ﴿إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ﴾ [المائدہ:۶] میں صراحۃً موجود ہے، تو انہوں نے کمال حوصلے سے کہا کہ یہ حکم جماعت کی صورت میں ہے، منفرد نمازی کی نماز بے وضو بھی جائز ہے۔

کیا اچھا ترجمہ اور عمدہ تفسیر ہے، ناظرین غور کریں کہ ان لوگوں کے قرآنی

استنباطات صحیح ہیں یا ہمارے؟ حالاں کہ اپنے مقابلے میں ہمیں روایت پرست کہتے ہیں اور آپ اپنا نام حق پرست رکھتے ہیں۔ سچ ہے ؎

ناز ہے عمل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق
اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

استثناء:

مگر حافظ اسلم صاحب جیراجپوری اور چوہدری پرویز صاحب ایسے نہیں ہیں، حاشاہم اللہ تعالیٰ۔

اسی ضمن میں چوہدری پرویز صاحب نے ایک عجیب بات کہہ دی جو آپ جیسے باریک بیں شخص سے بہت بعید ہے۔ آپ کے اصل الفاظ یہ ہیں:

''قرآن سے پیشتر کی تمام کتب سماوی کو جو قرآن کریم نے ظنی اور ناقابل اعتبار قرار دیا ہے، اس کی وجہ یہی تو تھی کہ ان کی حفاظت بالالفاظ نہیں ہوئی تھی، اصل صحائف کے ضائع ہوجانے کے بعد ان کے جامعین نے ان صحائف کو اسی طرح سے مرتب کیا تھا جس طرح احادیث کے مجموعے ایک مدت کے بعد مرتب ہوئے، چنانچہ جس طرح ان میں تحریف، وضع، الحاق، ترمیم، نسیان کی گنجائش تھی اسی طرح احادیث کے مجموعوں میں بھی'' (ترجمان القرآن، ص: ۹۷)۔

اہلحدیث:

اس عبارت کو دیکھ کر ہم تو نہیں کہہ سکتے کیوں کہ ہمیں تو حسن ظن ہے مگر ناواقف حال لوگ ضرور کہیں گے کہ اس عبارت کے لکھنے والے نے کتب سابقہ کے مجموعے (بائیبل) کا شاید مطالعہ نہیں کیا ورنہ وہ مجموعہ بائیبل کو مجموعہ احادیث کے ساتھ تشبیہ نہ دیتے۔

چوہدری صاحب کی خاطر ہم دونوں مجموعوں (مجموعہ بائبل اور مجموعہ کتب احادیث)

سے دومثالیں پیش کرتے ہیں۔ مجموعہ بائبل میں کسی صحیفہ کی سند مذکور نہیں۔ ہاں ''لوقا'' مصنف انجیل نے اپنی سند کا ذکر کیا ہے۔ جو قابل دید وشنید ہے، ملاحظہ ہو:

''چونکہ بہتوں نے کمر باندھی کہ ان کاموں کا جو فی الواقعہ ہمارے درمیان انجام ہوئے بیان کریں، جس طرح سے انہوں نے جو شروع سے خود دیکھنے والے اور کلام کی خدمت خود کرنے والے تھے ہم سے روایت کی۔ میں بھی مناسب جانا کہ سب کو سرے سے صحیح طور سے دریافت کر کے تیرے لئے اے بزرگ ''تھیوفلس'' بترتیب لکھوں تا کہ تو ان باتوں کی حقیقت کو جن کی تو نے تعلیم پائی جانے'' (انجیل لوقا شروع)۔

کیا چوہدری پرویز صاحب ہمیں بتادیں گے کہ اس کلام میں کوئی سند یا کسی راوی کا نام ہے؟ لفظ ''دریافت'' ملحوظ رکھ کر حدیث سے مثال سنئے!

حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِيُّ، قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ، قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ الْأَنْصَارِيُّ، قَالَ: أَخْبَرَنِي مُحَمَّدُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ التَّيْمِيُّ: أَنَّهُ سَمِعَ عَلْقَمَةَ بْنَ وَقَّاصٍ اللَّيْثِيَّ ، يَقُولُ: سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَلَى الْمِنْبَرِ يقولُ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ ، يَقُولُ: إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، الحديث'' (بخاری شروع باب اول)[1]۔

دیکھئے حدیث کے ایک ہی فقرے کی خاطر کتنا سلسلہ روایت جمع کیا اور ان سب راویوں کو معرض وجود میں لا کر سامنے کھڑا کر دیا۔

چوہدری صاحب:

---

[1] صحیح بخاری: باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ؟ حدیث:۱، صحیح مسلم: کتاب الامارۃ، باب قولہ ﷺ: انما الاعمال بالنیۃ، حدیث:۱۹۰۷۔

أُولَئِكَ آبائِي فَجِئْني بِمِثْلِهِمْ
إذا جَمَعَتْنا يا جَرِيرُ المجامِعُ

نیز آپ کا یہ مقولہ بھی اہل بصیرت کے نزدیک کچھ وزن نہیں رکھتا۔ جس کے الفاظ یہ ہیں:

''اگر کتب سابقہ کا کوئی نسخہ یقینی طور پر ان رسولوں کا قول قرار نہیں دیا جا سکتا تو احادیث کا کوئی مجموعہ کس طرح یقینی طور پر حضور کے ارشادات گرامی کا مجموعہ قرار دیا جا سکتا ہے'' (ص: ۹۷، سطر: ۱۷)۔

یہ بھی اسی غلط اصول پر مبنی ہے جس کا جواب پہلے ہو چکا ہے۔ تعجب ہے کہ چوہدری صاحب متواتر احادیث اور اسوۂ حسنہ کو تو سند کہیں اور اس مجموعہ بائبل پر نکتہ چینی کریں۔ یہودی اور مسیحی اگر اس مجموعہ کو متواتر کی شکل میں پیش کر کے جواب طلب کریں تو چوہدری صاحب کیا جواب دیں گے۔ ہم تو ان کتب سابقہ کو ان کے جامعین کی تصنیف مانتے ہیں۔ کیوں کہ ان میں بھی تواتر ہے۔ وللتفصيلِ مقامٌ آخر۔

قسط:۳

تصدیق الحدیث (حصہ دوم)

حقیقت پسندی بجواب شخصیت پرستی

(۲رذی الحجۃ ۱۳۵۶ھ = ۴رفروری ۱۹۳۸ء)

چوہدری صاحب! کا اگلا مقولہ بڑا تعجب خیز ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں:

''اتباع حدیث میں آپ بزعم خویش اطاعت رسول کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن غور فرمایئے کہ ایک حدیث کو جزو دین ماننے کے لئے آپ کتنے انسانوں کو معصوم عن الخطا اور منزہ عن الخطا ماننے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ مقلدین نے تو زیادہ سے زیادہ چار انسانوں کو منزہ عن الخطا قرار دیا تھا مگر یہ اپنے آپ کو تقلید کے پھندے سے آزاد سمجھتے ہوئے لاکھوں انسانوں کو منزہ عن الخطا قرار دے رہے ہیں اور خوش ہیں کہ ہم آزاد ہوگئے'' (ترجمان القرآن، ص:۹۸)۔

جواب! شبہ ہوتا ہے کہ چوہدری صاحب نے بھی مقلدین کی طرح مسئلہ تقلید پر غور نہیں کیا۔ مقلدین اہل حدیث کو کہا کرتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہ صاحب کے مقلد ہیں تو آپ لوگ بخاری وغیرہ ائمہ حدیث کے۔ ان کے جواب میں تو ہم یہی کہتے آئے ہیں ؎

سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست

مگر چوہدری صاحب اور ان کے شریک کار کی عزت ہمیں ایسا کہنے سے مانع ہے۔ اس لئے اس مصرع کے بجائے ان کی خدمت میں یہ شعر عرض ہے ؎

مست مے الست ہوں تو بدگمان نہ ہو
اے شیخ مری شورش مستانہ دیکھ کر

تقلیداورقبول روایت میں بڑا فرق ہے۔روایت درجہ حکایت کا ہوتا ہے جس کا محکی عنہ خارج میں ملے تو روایت (حکایت) صحیح،ورنہ غلط۔تقلید قبول فہم کا نام ہے،یعنی کسی شخص کے استنباط کو مان لینا۔چوہدری صاحب کی خاطر میں اس کو قانونی اصطلاح میں بیان کرتا ہوں،قانون شہادت کی رو سے گواہ کا بیان متعلقہ وقوعہ معتبر ہے۔مگراس کا یہ کہنا کہ میں یہ سمجھتا ہوں شہادت نہیں ہے۔اسی طرح قبول روایت بمنزلہ قبول شہادت واقعہ کے ہے۔اس لئے مقلدین جوایک امام کی تقلید پر معتکف ہورہے ہیں وہ بھی ہر محدث کی روایت قبول کر لیتے ہیں،حنفی امام ابوحنیفہ کے مقلد ہوکر،امام شافعی،امام احمد،امام مالک وغیرہ کی مرویات کو بھی مانتے ہیں۔ان کے ماننے میں ان کو تقلید مانع نہیں ہوتی۔کیا آپ نے کبھی سنا کہ کوئی مقلد جامد بھی (صحیح بخاری) کی روایت کو اس بنا پر نہ مانتا ہو کہ میں امام ابوحنیفہ کا مقلد ہوں،بخاری کا نہیں۔کبھی ایسا نہیں کہتا نہ کسی نے کہا،نہ کوئی کہے گا۔

پس ثابت ہوا کہ تقلید کا متعلق بہ استنباط مجتہد ہے اور قبول روایت کا متعلق بہ حکایت صادقہ ہے،ان دونوں میں فرق نہ کرنے والا مہربانی کر کے تھوڑا سا وقت قانون شہادت پڑھنے پر لگائے ورنہ کہا جائے گا''مَنْ جَهِلَ شَيْئًا عَادَاهُ''مقلدین ایسا کہنے میں ایک حد تک معذور ہیں کیوں کہ ان کا نام مقلد ہی انکی معذوری کا اظہار کرنے کو کافی ہے،لیکن جو شخص ان سب مراتب سے ترقی کر کے اوران سب قیودات سے آزاد ہوکر لابشرط شیٔ کے درجے میں بلکہ بمذہب میرزاہدلا،لابشرط شیٔ کے درجے میں پہنچ کر پوری حریت کا دعویدار ہو اس سے ایسے مقولے کا سرزد ہونا تعجب انگیز اوراہل

حدیث کے حق میں حیرت افزا ہے، اس لیے چوہدری صاحب جیسے آزادخیال کا مقولہ سن کر بے ساختہ ہمارے قلم سے نکلتا ہے ؎

ہوا تھا کبھی سر قلم قاصدوں کا
یہ تیرے زمانے میں دستور نکلا

چوہدری صاحب کا یہ مقولہ سونے سے لکھنے کے قابل ہے:

''حقیقت یہ ہے کہ احادیث کی تنقید میں اسناد سے بڑھ کر معیار قرآنی کو اہمیت دینی چاہیے تھی، ہمارے پاس قرآن ایک مستند ضابطہ دین موجود ہے، ظاہر ہے کہ نبی اکرم کا کوئی ارشاد اصول قرآنی کے خلاف قطعاً نہیں ہوسکتا، لہٰذا ظنی شئ کو یقینی شئے سے پرکھ لیجیے، معاملہ طے ہو جائے گا، اسناد کو مدار صحت قرار دینے میں یہ خرابی ہے کہ جب آپ نے ایک سلسلہ رواۃ کے متعلق یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ ثقہ ہیں تو اب جو بات بھی ان کی وساطت سے آپ تک پہنچے گی اسے لازمی طور پر ''قول رسول'' ماننا پڑے گا، خواہ اس کی حیثیت قرآنی میزان میں کچھ ہی کیوں نہ اترے حالاں کہ یہ بدیہیات میں سے ہے کہ ایک شخص کا متقی و پرہیزگار ہونا اس بات کے لیے بھی مستلزم نہیں کہ اس کی یادداشت درست ہو، اور اگر یادداشت بھی درست ہوتو یہ ضروری نہیں کہ اس میں معانی وحقائق کے سمجھنے کی استعداد اور پھر انہیں اصل اسپرٹ اور موقع ومحل کی فقیہیا نہ جزئیات کو ملحوظ رکھ کر آگے منتقل کرنے کی صلاحیت بھی بہ درجۂ اتم پائی جائے یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جسے کوئی عقیدہ جھٹلا نہیں سکتا، اس قسم کی روایت پرستی نے ہمیں اصل دین سے اس قدر دور پھینک دیا ہے جس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا'' (ترجمان القرآن، ص: ۹۸، سطر: ۱۸)۔

اہلحدیث:

یہ اقتباس چوہدری صاحب کا اس قابل ہے کہ اس کو قانونی اصطلاح میں امر تنقیح قرار دیا جائے، ہمیں مدعی کہا جائے اور چوہدری صاحب کو سائل اور شہادت کے لیے ایسے بزرگ کو طلب کیا جائے جو گو تسلیم حجیت حدیث سے علیحدہ ہو گئے ہیں، لیکن محدثین کے قواعد وضوابط سے واقف ہیں، ان سے میری مراد مولانا حافظ اسلم جیراجپوری ہیں، مہربانی کر کے وہ اپنا بیان شائع کریں کہ محدثین نے ان سب شروط اور قیود کی پابندی کی ہے کہ نہیں، تکلیف فرما کر شرح نخبہ، مقدمہ ابن صلاح، اور اصول حدیث کی دوسری کتابیں ملاحظہ کریں، محدثین کرام نے متقی سیئ الحفظ کو بتصریح ضعفاء میں شمار کیا ہے، ایسا ہی روایت بالمعنی کرنے کے لیے وہی شرط لگائی ہے جو پرویز صاحب نے بتائی ہے، ہاں چوہدری صاحب کا یہ فقرہ کہ:

''اس قسم کی روایت پرستی نے ہمیں اصل دین سے اس قدر دور پھینک دیا ہے جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا'' (حوالہ مذکور)۔

اس کی اصلاح یوں کی جائے۔

اس قسم کی شہادت حقہ کے چھوڑنے والے اصل دین سے بہت دور ہو گئے۔

کیوں؟

اصل دین آمد کلام اللہ معظم داشتن
پس حدیث مصطفی برجاں مسلم داشتن

لطیفہ:

قرآن مجید کی صداقت کہیے اور محدثین کی کرامت کہ چوہدری صاحب نے اپنی شروط میں پہلی شرط یہ لگائی ہے کہ حدیث اصول قرآنی کے خلاف نہ ہو، پھر خود ہی لکھا ہے کہ:

’’اس میں شبہ نہیں کہ اصول حدیث میں یہ بات بھی داخل ہے کہ صحیح حدیث وہ ہے جو اصول قرآنی کے خلاف نہ ہو، لیکن احادیث کے مجموعوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قاعدہ کی رعایت میں بہت سہل نگاری برتی گئی ہے‘‘۔(ترجمان القرآن،ص:۹۸)

ناظرین کرام:

ان دونوں عبارتوں کو ملا کر سامنے رکھئے، پھر سورہ یوسف سے زلیخا کے دو فقرے یک جا کیجیے، جو یہ ہیں:

(۱) ﴿مَا جَزَآءُ مَنۡ أَرَادَ بِأَهۡلِكَ سُوٓءًا إِلَّآ أَن يُسۡجَنَ أَوۡ عَذَابٌ أَلِيمٞ﴾ [یوسف:۲۵]۔

(۲)﴿وَلَقَدۡ رَٰوَدتُّهُۥ عَن نَّفۡسِهِۦ فَٱسۡتَعۡصَمَ﴾[یوسف:۳۲]۔

زلیخا نے اپنے پہلے فقرے میں حضرت یوسف کو مجرم بتایا مگر دوسر فقرے میں اس جرم سے بری ٹھہرایا۔

ٹھیک اسی طرح چوہدری صاحب نے پہلے فقرہ میں محدثین کو اشارۃً ملزم بتایا اور دوسرے فقرہ میں اپنی طرف سے خود ہی ان کی براءت ظاہر کردی، اس کے شکریہ میں ان کی خدمت میں یہ شعر عرض ہے ؎

ہوا ہے مدعی کا فیصلہ اچھا میرے حق میں
زلیخا نے کیا خود پاک دامن ماہ کنعاں کا

ہاں چوہدری صاحب نے اقتباس مذکور میں لفظ لیکن سے اخیر تک مجموعہ کتب حدیث میں جس امر کی شکایت کی ہے اس کا جواب ہم اس وقت تک ملتوی رکھتے ہیں جب تک چوہدری صاحب ہمیں ان حدیثوں کی فہرست نہ بتادیں، جن میں قرآنی اصول سے بے پرواہی برتی گئی ہو۔

شکایت:

چوہدری صاحب نے غالباً سنے سنائے قائلین حدیث کی شکایت یوں کی ہے کہ:

''اگر آج یہ اعتراض کیا جائے کہ فلاں حدیث قرآن کریم کے خلاف پڑتی ہے تو اس کا جواب فوراً یہ دے دیا جاتا ہے کہ یہ تمہارے فہم قرآن کا نقص ہے، قرآن جیسا ائمہ متقدمین سمجھ گئے ہیں آج کون ویسا سمجھ سکتا ہے، لہٰذا آپ کو ماننا ہوگا کہ یہ ظاہری تعارض دراصل تعارض نہیں ہے خواہ اس کے ماننے میں آپ کی بصیرت بغاوت کرے، خود قرآن کریم کی کھلی تعلیم اس کی تردید کر رہی ہو۔

حیرت ہے کہ جب یہی دلیل اہل فقہ، فقہ کے وجوب میں لائیں تو یہ پائے چوبیں قرار دی جائے، لیکن جب اپنے دعوی کا اثبات مقصود ہو تو اس کو حصن حصین سمجھ لیا جائے'' (ترجمان القرآن:۹۹)۔

جواب:

چوہدری صاحب جس طرح آپ کو قائلین حدیث کی طرف سے یہ جواب ملا ہوگا ہم نے قرآن کے ماننے والوں، پڑھنے والوں، بلکہ پڑھانے والوں سے بھی ایسی باتیں سنی ہوئی ہیں، تو کیا قرآن کی تعلیم کو غلط سمجھیں یا ان کے طریق عمل کی اصلاح کریں۔

غالبا دوسری صورت آپ اختیار کریں گے، ایسے لوگوں کی اصلاح کے خیال میں ہم اور آپ دونوں شریک ہیں ؎

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

جناب چوہدری صاحب کو محدثین کی تصریحات دیکھنے کا موقع غالباً بہت کم ملا ہے اسی لیے وہ محدثین کی طرف بعض ایسے گناہ منسوب کر جاتے ہیں جن کے جواب میں انہیں مجبوراً کہنا پڑتا ہے ؎

قَدْ أصبَحَتْ أُمُّ سُليمٍ تَدَّعِي

عَلَيَّ ذَنْبًا كُلّهُ لَمْ أصنَع

یعنی محدثین کہتے ہیں کہ چوہدری پرویز صاحب ہم پر وہ الزام لگاتے ہیں جنکے ہم مرتکب نہیں ہوئے، بڑے سے بڑا الزم جو چوہدری صاحب کو ملا ہے، وہ یہ ہے کہ سنی، شیعہ ایک دوسرے کی روایات کو معتبر نہیں جانتے، حالاں کہ دونوں کے راوی ثقہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

''یہ حضرات (کم از کم سنی حضرات) تو یہ تصور میں بھی نہیں لاسکتے کہ جو بزرگان دین ان احادیث کے راوی ہیں، جو شیعہ حضرات کے مجموعوں میں ہیں وہ نعوذ باللہ سب جھوٹے اور غیر معتبر تھے، ان کو بھی لامحالہ ثقہ ماننا پڑے گا، اب صورت معاملہ یوں ہوئی کہ ثقہ راوی کی جماعت سے وہ احادیث امت کو ملیں جو سنی حضرات کے ہاں صحیح ہیں اور ثقہ رواۃ ہی کی ایک دوسری جماعت سے وہ احادیث ملیں جو شیعہ حضرات کے ہاں صحیح ہیں اور دونوں آپس میں ٹھہریں متناقض، رواۃ کی جہت سے احادیث پرکھنے کے اصول پر آپ کو لازماً ان دونوں قسم کی احادیث کو اقوال رسول ماننا پڑے گا، اور یہ دونوں مجموعے واجب الاتباع ہوجائیں گے، اب فرمایئے کہ احادیث کو دینی حجت (یقین) سے نہ ماننے والوں کے خلاف آپ جو معصیت رسول کا الزام عائد کرتے ہیں اگر وہی اعتراض شیعہ حضرات آپ پر وارد کریں (اور وہ ایسے اعتراضات اکثر و بیشتر کرتے رہتے ہیں) تو آپ کے پاس کیا جواب ہے؟'' (ترجمان القرآن ص: ۱۰۰)۔

اہلحدیث:

محدثین کرام نے بتصریح تام شیعہ، معتزلہ ثقہ راویوں کی روایت کو قبول کیا ہے (ملاحظہ ہو شرح نخبہ وغیرہ) کتب حدیث کی چوٹی کی کتاب ''صحیح بخاری'' میں بھی ایسے راوی بکثرت ملتے ہیں۔ اسی طرح کتب حدیث شیعہ میں بھی اہل سنت رایوں کی

احادیث موجود ہیں، جن کو وہ احادیث عامہ کہتے ہیں، ہمارے ناقص علم میں اس سے دو نوں فریق کے محدثین کی دریا دلی کا ثبوت ملتا ہے، ہم کسی متاخر متصلب کی رائے یا عمل کے ذمے دار نہیں ہیں، آپ ازراہ مہربانی شیعہ حضرات سے ایسی احادیث کی فہرست لے کر شائع کر دیں جن کا جواب آپ نے اسی اقتباس کے اخیر میں طلب فرمایا ہے، پھر دیکھیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے، ہاں ہم اس کی ذمہ داری نہیں لے سکتے کہ ہمارے جوابات کو شیعہ حضرات بھی تسلیم کر لیں گے، بقول استاد غالب مرحوم ؎

غالب ترا احوال سنائیں گے ہم انکو
وہ سن کے بلالیں یہ اجارا نہیں کرتے

قسط:۴

تصدیق الحدیث (حصہ دوم)

حقیقت پسندی بجواب شخصیت پرستی

(۹رذی الحجۃ ۱۳۵۶ھ=۱۱رفروری ۱۹۳۸ء)

گذشتہ پرچے میں اصل مضمون تو ختم ہو گیا، مگر گذشتہ جوابوں کو دیکھ کر چوہدری پرویز صاحب کا کوئی مقولہ جواب طلب معلوم نہیں ہوتا، ہاں ایک بات انہوں نے بڑی تنبیہ کے ساتھ لکھی ہے جس کا جواب گو ہماری پہلی تحریر میں آچکا ہے، لیکن چوں کہ انہوں نے اس کو بڑے امتیاز کے ساتھ لکھا ہے اس لیے ہم بھی حسب منشا چوہدری صاحب اس کا جواب امتیاز ہی سے دیتے ہیں، آپ فرماتے ہیں:

''پھر ایک چیز اور بھی ہے، یہ تو سب کو تسلیم ہے کہ حضور کے بعض ارشادات بہ منصب رسالت ہوتے تھے، اور بعض بالکل ذاتی حیثیت سے''۔

میں اس کی تفصیل میں نہیں الجھنا چاہتا کہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے اور اس کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے ہیں، اب ظاہر ہے کہ احادیث کے موجودہ مجموعوں میں جس قدر حضور کے اقوال واعمال درج ہیں ان میں یہ تخصیص تو کہیں نہیں کی گئی کہ حضور نے کس حیثیت سے ایسا کیا یا ایسا فرمایا اور اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ امت کے لئے اطاعت اسی کی واجب ہے جو حضور نے بہ منصب رسالت فرمایا ہو، ذاتی حیثیت کے متعلق تو خود حضور کے ارشادات موجود ہیں کہ وہ واجب الاتباع نہیں، اب ہم ان احادیث میں سے کسے واجب الاتباع قرار دیں اور کسے نہ قرار دیں؟ ظاہر ہے کہ جس

چیز کا پہلے قول رسول ہونا ظنی ہو اور پھر یہ بھی یقینی نہ ہو کہ اسے حضور نے کس حیثیت سے فرمایا تھا اسے دین قرار دے دینا کس قدر زیادتی ہے'' (ترجمان القرآن: ۱۰۱)۔

اہلحدیث:

شعراء کے بعض قصائد میں یہ خاص التزام ہوتا ہے کہ ایک مصرعہ دعوی ہوتا ہے اور دوسرا دلیل، چنانچہ غنی کاشمیری مرحوم کا ایک شعر مثال میں پیش کرتا ہوں ؂

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو
کہ در پرواز و ارد گوشہ گیری نام عنقا را

شیخ سعدی کا یہ شعر بھی اسی قسم سے ہے ؂

کریما بہ بخشائے برحال ما | کہ ہستم اسیر کمند ہوا

مگر یہ صنعت نہ کبھی دیکھی گئی، نہ کبھی سنی گئی کہ ایک ہی بیت میں ایک مصرعہ دوسرے کی تردید ہو، البتہ یہ صنعت ہمیں چوہدری صاحب کے اس اقتباس میں ملتی ہے، آپ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ کے احکام اور افعال میں ذاتی اور منصبی کے لحاظ سے تمیز کرنے کی ضرورت ہے، یعنی بقول اہل منطق قضیہ مشروط عامہ میں ذات اور صفات کا امتیاز ضروری ہے''۔

لاریب صحیح ہے اور لاشک صادق ہے، مگر آپ خود ہی فرماتے ہیں کہ اس کی مثالیں بکثرت ہمارے پاس ہیں، ایک دو مثالیں میں بھی آپ کی خدمت میں پیش کر کے آپ کی معلومات میں اضافہ کرسکوں تو لیجیے بریرہ اور مغیث کے قصے میں اس دانا عورت نے صاف پوچھ لیا کہ آپ کا ارشاد مغیث کے ساتھ نکاح رکھنے کا بمنصب رسالت ہے یا بمشورہ، ارشاد ہوا کہ مشورہ ہے، عرض کرتی ہے کہ معافی کی خواستگار ہوں، مگر جب تک سرکار نے قضیہ مشروطہ عامہ کو تحلیل کر کے اپنے ارشاد کو ذات سے متعلق نہیں کیا وہ از خود

نہیں کرسکی، اسی طرح قصہ تابیر خرما کا ہے جس میں ارشاد ہوا تھا کھجوروں کو پیوند نہ لگاؤ تو کیا حرج ہے، جب نقصان ہوا تو اس حکم کو منصب رسالت سے الگ کر کے ذاتی مشورہ کی ذیل میں داخل ہونا اظہار فرمایا، لیکن صحابہ کرام نے از خود اس میں کوئی تمیز نہیں کی۔

میرا بھی حق ہے کہ میں بھی قرآن مجید کے ایسے احکام سے سوال کروں جو بظاہر وجوب اور جواز میں ہم شکل نظر آتے ہیں، مثلاً: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ﴾ [الجمعہ:۹]، (اذان سنتے ہی نماز کے لیے جلدی آؤ) یہ حکم سب کے نزدیک وجوب کے لیے ہے، غالباً آپ بھی ایسا ہی جانتے ہوں گے، اسی کے ساتھ دوسرا ارشاد: ﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ﴾ [الجمعہ:۱۰] نماز جمعہ ہو چکے تو چلے جاؤ اور رزق تلاش کرو۔

یہ دوسرا ارشاد پہلے ارشاد کے متصل ہی ہے کیا یہ بھی وجوب کے لیے ہے؟ اگر وجوب کے لیے ہے تو آپ اپنے ہم خیال علماء سے فتویٰ لے دیجیے کہ نماز جمعہ کے ختم ہونے کے بعد مسجد میں وعظ ونصیحت کے لیے بیٹھنا حرام ہے بحکم اصول "الوجوب يقتضي حرمة ضده"۔

اور اگر جواز کے لیے ہے تو کیوں؟ اسی ذیل میں یہ تیسرا ارشاد بھی داخل کر لیجئے: ﴿وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا﴾ [المائدہ:۲]

آخر آپ کے پاس کیا معیار ہے کہ قرآن کے بعض احکام فرض واجب اور بعض صرف جائز ہیں، جس اصول سے آپ ان احکام میں امتیاز کریں گے اسی اصول سے ہم ان حدیثوں کو پرکھ لیں گے، اگر آپ یا آپ کے ہم خیال اس اصول کو قرآن ہی سے مخصوص کریں اور ہمیں اس کو استعمال کرنے کی حدیثوں میں اجازت نہ دیں تو مہربانی

کر کے اس آیت کے معنی بتایئے: ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۝ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ﴾ [المطففین:۱-۳]، یعنی ناپ تول میں دو قسم کے پیمانے رکھنے والوں کے لیے افسوس ہے۔

اس وقت میرے مخاطب مولانا اسلم جیراجپوری ہوتے تو میں ان کی خدمت میں ایک شعر پیش کرتا، کیوں کہ وہ شعر مذاق ہیں اور آپ کی نسبت مجھے علم نہیں ؎

مشکل بہت پڑے گی برابر کی چوٹ ہے
آئینہ دیکھیے گا ذرا دیکھ بھال کر

مختصر یہ ہے کہ ہم قرآن وحدیث کے احکام کو جانچنے کے لیے اصول منطقیہ کو ملحوظ رکھا کرتے ہیں، احکام رسالت کو جو احادیث کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں ہم قضیہ مشروطہ عامہ سمجھتے ہیں، جس میں ذات اور صفت علیحدہ نظر آتی ہے آپ کو تکلیف نہ ہو تو حافظ صاحب جیراجپوری سے پوچھ لیجیے کہ قضیہ ضروریہ مطلقہ اور مشروطہ عامہ میں فرق ہوتا ہے یا نہیں ہم حدیثی احکام کو مشروطہ عامہ جانتے ہیں ضروریہ مطلقہ نہیں جانتے اس لیے ہم پر یہ سوال کرنا جو آپ نے کیا ہے کہ حدیثوں میں ذاتی حیثیت اور منصب رسالت میں امتیاز کرنا ضروری ہے۔

اور اس کو ایک مشکل کام آپ نے بتایا، ہم آپ کا شکریہ ادا کر کے اطلاع دیتے ہیں کہ محدثین کرام پہلے ہی سے ایسا کرتے چلے آئے ہیں اور آج بھی خدا کے فضل سے ان کی روش کو جاننے والے موجود ہیں اگر کوئی نہ جانے تو اس کا قصور، اس کے ذمہ دار محدثین نہیں ہو سکتے، اس لیے ہم ڈنکے کی چوٹ سے کہتے ہیں کہ ؎

عشق کی راہ کٹھن ہے کوئی ہم سے پوچھے
خضر (قیس) کیا جانے غریب اگلے زمانہ والا

اخیر میں ہم چوہدری صاحب کی خدمت میں التماس کرتے ہیں کہ وہ ازراہ مہربانی ایسی احادیث کی فہرست شائع کردیں، جو ان کے نزدیک ذات اور منصب رسالت کے لحاظ سے مشتبہ ہوں تاکہ ہم ان کی نسبت اپنے معروضات پیش کریں ؎

مٹا نہ رہنے دے جھگڑے کو یار تو باقی
رکے نہ ہاتھ ابھی ہے رگِ گلو باقی

تتمہ! چوہدری صاحب کے مضمون کا ذکر ختم ہو چکا مگر اخیر میں آپ نے ایک بات ایسی کہہ دی ہے جس کو پڑھنے سے ہمیں بھی ان کے حال پر رحم آیا۔ لیکن اگر وہ زیادہ نہیں صرف اہل حدیث کے امام المتأخرین مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی سوانح عمری دیکھ لیتے تو اتنے خائف نہ ہوتے جتنے کہ ہوئے۔ آپ لکھتے ہیں:

''لیکن سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ان حضرات کی خدمت میں جب کبھی ایسی بات پیش کیجئے۔ وہ عوام کے جذبات کو فوراً یہ کہہ کر مشتعل کر دیتے ہیں کہ لو بھئی! دیکھو یہ کہتا ہے کہ (نعوذ باللہ) سب صحابہ رضی اللہ عنہم جھوٹے تھے۔ اور رسول اللہ کی سب باتیں (معاذ اللہ) رطب و یابس ہیں۔ توبہ توبہ استغفر اللہ! اتنا کہہ کر وہ خوش ہو جاتے ہیں کہ بس اب خدائی فوج اس ملحد و زندیق کو زندہ نہ چھوڑے گی۔ لیکن وہ یقین مانیں کہ ان ملاحدہ و زنادقہ کے استیصال کے بعد بھی قرآن زندہ رہے گا، اور ہر اس چیز کو مٹا کر چھوڑے گا جو اس کے خلاف پڑے گی، خواہ اسے آپ ائمہ سلف کی طرف منسوب کر دیجئے، خواہ خود نبی اکرم کی ذات مقدس کی طرف، اور اس کے بعد یا تو قرآن باقی رہے گا یا عمل متواتر (اسوۂ حسنہ) جو یقینی دین ہے۔ لہٰذا ڈرنا چاہئے اس وقت سے جب یہ پوچھا جائے گا کہ کیا تمہارے پاس میزان کے یہ دو پلڑے موجود نہ تھے کہ تم حق و باطل میں تمیز کر سکتے'' (ترجمان القرآن: (ص: ۱۰۲)، سطر: ۲۲)۔

اہلحدیث:

چوہدری صاحب! آپ ایسے ملحد گروں اور کافر سازوں سے کیوں ڈر گئے؟ سنیے:

آپ کو جب ایسے لوگ ملحد، زندیق کہیں تو آپ مولانا حالی مرحوم کا یہ شعر سنا دیا کریں ؎

اب تو تکفیر سے ڈرتا نہیں واعظ ! حالی
پہلے کہہ دیتے تو لے دے کے منایا جاتا

مگر اس کا یہ نتیجہ نہ ہونا چاہئے کہ آپ خواہ مخواہ ملحدین کی تائید کرنے بیٹھ جائیں۔ نہیں بلکہ آپ الحاد اور زندقہ سے دور رہیں۔ جیسا کہ میرا گمان ہے کہ آپ دور ہیں۔ تو پھر کسی کا آپ کو ملحد و زندیق کہنا اس آیت کے ذیل میں آجائے گا:

﴿لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ [المائدہ:۱۰۵]، بس آپ قرآن اور اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے جائیں اور اس مظاہرے کا خوف رکھیں جو ظالموں کے فعل کا قرآن مجید میں بتایا گیا ہے:

﴿وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلًا﴾ [الفرقان:۲۷]، اس کا مطلب شیخ سعدی رحمہ اللہ نے اپنے شعر میں یوں بتایا ہے: ؎

مپندار سعدی کہ راہِ صفا
تو اں رفت جز در پئے مصطفی

چوہدری صاحب! میں آپ کے اوقات گرامی کا لحاظ کر کے اسی پر بس کرتا ہوں۔

ورنہ

با تو ماجراہا داشتیم

نوٹ! آئندہ نمبر میں فاضل ایڈیٹر ترجمان کے مقولے پر توجہ کی جائے گی۔ ان شاء اللہ۔

❁ ❁ ❁

تصدیق الحدیث (حصہ سوم)

محدث اور فقیہ

مؤلفہ

مناظرِ اسلام علامۂ عصر مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری

ان مضامین میں ایڈیٹر رسالہ ((ترجمان القرآن)) کے مقولہ کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، جو قسط وار (۲ قسطوں میں) ''اخبار اہل حدیث'' امرتسر میں ۱/محرم الحرام ۱۳۵۷ھ (تا) ۸/محرم الحرام ۱۳۵۷ھ = ۴/مارچ ۱۹۳۸ء (تا) ۱۱/مارچ ۱۹۳۸ء تک شائع ہوا۔

تحقیق وتعلیق

عبدالاحد احسن جمیل آل عبدالرحمن

قسط:۱

تصدیق الحدیث (حصہ سوم)

محدث اور فقیہ

(یکم محرم الحرام ۱۳۵۷ھ = ۴/مارچ ۱۹۳۸ء)

یہ سلسلہ مضمون ۲۰/اگست ۳۷ءکو جاری ہوا جس کے پہلے حصے میں حافظ محب الحق پٹنوی سے روئے سخن تھا، اس کے بعد حصہ دوم میں چوہدری غلام احمد صاحب پرویز دہلوی سے خطاب ہوا، آج خود اڈیٹر صاحب رسالہ ترجمان کا ذکر خیر کیا جاتا ہے۔

چوہدری صاحب کے مضمون متعلقہ حدیث پر اڈیٹر صاحب رسالہ ترجمان القرآن نے جو کچھ لکھا ہے اس کا موضوع انکار یا تنقید حدیث نہیں ہے، بلکہ حدیث کے دو خادموں (محدثین اور فقہاء) کی خدمات میں سے ایک گروہ (فقہاء) کی خدمات کو ترجیح دینا ہے، ہمارا مسلک اور عقیدہ تو یہ ہے کہ جس طرح قرآن کے ماننے والے مسلمان گروہوں نے اپنے مذاق کے مطابق قرآن مجید کی خدمت کی ہے اسی طرح حدیث کے ماننے والے مسلمان فرقوں نے حدیث کی خدمت کی ہے، (شکراللہ سعیھم)۔مگر فاضل ''اڈیٹر ترجمان'' نے جس پیرائے میں اس بحث کو لیا ہے وہ قابل نظر ہے، مقام شکر ہے کہ مبحث بتانے میں ہمیں اپنے الفاظ کی ضرورت نہیں، بلکہ فاضل موصوف کے الفاظ ہی کافی ہیں، جو ہم ناظرین کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔آپ فرماتے ہیں:

''ہم نے اوپر عرض کیا محدثین رحمہم اللہ کا خاص موضوع اخبار وآثار کی تحقیق بلحاظ روایت کرنا تھا، اس لیے ان پر اخباری نقطۂ نظر غالب ہوگیا تھا اور وہ روایات کو معتبر یا غیر معتبر قرار دینے میں

زیادہ ترصرف اسی چیز کالحاظ فرماتے تھے کہ اسناد اور رجال کے لحاظ سے وہ کیسی ہیں، رہا فقیہانہ نقطۂ نظر تو وہ ان کے موضوعِ خاص سے ایک حد تک غیر متعلق تھا، اس لیے اکثر وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوجاتا تھا اور وہ روایات پر اس حیثیت سے کم ہی نگاہ ڈالتے تھے، اسی وجہ سے اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک روایت کو انہوں نے صحیح قرار دیا ہے، حالاں کہ معنی کے لحاظ سے وہ زیادہ اعتبار کے قابل نہیں اور ایک دوسری روایت کو وہ قلیل الاعتبار قرار دے گئے ہیں، حالاں کہ معناً وہ صحیح معلوم ہوتی ہے، یہاں اس کا موقع نہیں کہ مثالیں دے کر تفصیل کے ساتھ اس پہلو کی توضیح کی جائے، مگر جو لوگ علوم شریعت میں نظر رکھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ محدثانہ نقطۂ نظر کثیر مواقع پر فقیہانہ نقطۂ نظر سے ٹکرا گیا ہے اور محدثین کرام صحیح احادیث سے بھی احکام ومسائل کے استنباط میں وہ توازن اور اعتدال ملحوظ نہیں رکھ سکے ہیں جو فقہاء مجتہدین نے ملحوظ رکھا ہے'' (ترجمان القرآن: ص:۱۱۲)۔

اہلحدیث:

پس یہ منشائے نزاع اور یہی مبحث جس پر آج ہم کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ سب سے پہلے ہمیں اس بات پر افسوس ہی نہیں بلکہ صدمہ ہے کہ اتنے بڑے ادق مضمون کے لیے ممدوح نے نہ صرف زبانی دعوی پر اکتفا کیا۔ کتب اصول اور فقہ کی ورق گردانی کر کے امثلہ پیش نہ کیں، بہت اچھا! اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو ہم آپ کی نیابت میں کئے دیتے ہیں۔ مقام شکر ہے کہ آپ نے محدثین کی خدمت کا حقیقی معنی میں اعتراف کیا، کیوں کہ آپ نے یہ تسلیم کیا ہے کہ محدثین نے حدیث کی خدمت بلحاظ روایت کے کی ہے، یہ کون نہیں جانتا کہ واقعات ماضیہ کی تحقیق کے لیے سب سے اول نظر سلسلہ روایت ہی پر پڑتی ہے کیوں کہ سلسلہ روایت ہی مخبر عنہ (قائل کلام) تک پہنچانے کا ذریعہ ہوتا ہے، پس محدثین نے جو خدمت کی اس کا خاص ثمرہ یہ ہے کہ وہ ہمیں سلسلہ

روایت کے ذریعے دربارِ رسالت تک پہنچا آئے ،جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہم الفاظ حدیث کو گویا حاشیہ نشینان دربارِ رسالت کی طرح سن رہے ہیں۔عرب کا ایک شاعر اپنی محبوبہ سے اتصال روایت کرنے کو کس خوبی سے بیان کرتا ہے۔شاعر خود پہاڑ کے ایک طرف بیٹھا ہے اور کبوتر پہاڑ کی چوٹی پر ہے اور اس کی محبوبہ دوسری طرف بیٹھی ہے جہاں شاعر اس کو نہیں دیکھ سکتا مگر وہ چاہتا ہے کہ میں اس کے وصال سے کسی قدر لطف حاصل کروں اس غرض کے پیش نظر وہ کبوتر کو ذریعہ مقصود بنا کر کہتا ہے ؎

حَمامَةَ جَرْعى حَوْمَةِ الجَنْدَلِ اسْجَعِي

فَأَنْتَ بِمَرْأى مِن سُعادَ ومَسْمَعِ

اے بلندی پر بیٹھے ہوئے کبوتر ذرا گا تو سہی، تو ایسی جگہ ہے کہ محبوبہ (سعاد) کو تو دیکھتا ہے اور اس کی باتیں سنتا ہے۔

کیا ہی لطیف سلسلۂ روایت ہے، استاد غالبؔ مرحوم نے بھی اس سلسلہ روایت کا ذکر کیا ہے، چنانچہ لکھا ہے:

قاصد کے آتے آتے میں خط اور لکھ رکھوں

میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

ہاں جناب موصوف کا یہ فرمانا محل تنقید ہے، نہ قابل تصدیق:

’’رہا فقیہانہ نقطۂ نظر تو وہ ان محدثین کے موضوع خاص سے ایک حد تک غیر متعلق تھا‘‘۔

ہم اس کی تصدیق نہیں کر سکتے بلکہ ہم یہ کہنے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ ہر شخص بخاری کو بنظر غور پڑھنے والا اس فقرے کی تصدیق نہیں کر سکتا، فقیہانہ نقطۂ نظر سے مراد آپ کی خدا جانے کیا ہے، ظاہر کر دیتے تو ہم شکریہ ادا کرتے ، اس لیے آپ کے مافی الضمیر (نقطہ فقیہانہ) سے درگذر کر کے کتب اصول فقہ سے ہم خود ہی

نقطہ فقیہانہ پیش کرتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ علمائے اصول فقہ اپنی مسلمہ فقہ کی تائید کے لیے ایک اصول بناتے ہیں، پھر اس اصول کے ماتحت جتنی بھی حدیثیں ہوں ان کو بالکلیہ متروک یا ماوّل قرار دے دیتے ہیں، مثلاً لفظ خاص کی تعریف یوں کی گئی ہے:

''الخاصُ لفظٌ وُضِعَ لِمَعْنَى مَعْلُومٍ أوْ لِمُسَمًّى مَعلُومٍ على الانْفِرادِ'' (شاشی)[1]، یعنی خاص وہ لفظ ہے جو معنی معلوم یا مسمی معلوم کے لیے مقرر کیا گیا ہو، اس کا حکم (اثر مرتب) یوں بیان کیا ہے:۔

''وحكمُ الخاصِ مِن الكتابِ وجوب العَمَل بِهِ لا محالة فَإن قابَلَهُ خبرُ الواحِد أو القياسُ فَإنْ أمكنَ الجمعُ بَينهما بِدُونِ تَغْيِيرٍ فِي حكمِ الخاصِ يُعْملُ بهما، وإلّا يُعْمَلُ بِالكتابِ ويُتْرَكُ مَا يُقابلُه''[2]، یعنی جو خاص لفظ قرآن میں ہو اس کے مقابلے میں حدیث متروک کی جائے گی۔

اب اس اصول کی تفریع میں سنئے کیا ہی لطیف ہے: ''قوله تعالىٰ: ﴿حَتَّىٰ تَنكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُۥ﴾[البقرة:٢٣٠]، خاصٌ في وجودِ النِّكاحِ مِنَ الْمَرأةِ، فَلا يُترَكُ العملُ بِه بِما رُوِيَ عَنِ النبي ﷺ: ''أيُّما امرأةٍ نَكَحَت نَفْسَها بغيرِ إذْنِ وَلِيِّها فنِكاحُها باطلٌ، باطلٌ، باطلٌ''[3]۔

یعنی نکاح ایک لفظ خاص ہے بمعنی عقد شرعی اور آیت کریمہ میں ''تنکح'' کی ضمیر فاعل عورت کی طرف پڑتی ہے جس سے معلوم ہوا کہ عورت اپنا نکاح خود کرسکتی ہے اس لیے جس حدیث میں نکاح کے لیے ولی کی اجازت بطور شرط کے آئی ہے وہ حدیث متروک ہے۔

لیکن جب ان کے دوسرے مسلمہ پر اعتراض ہوا تو پہلو بدل کر کچھ اور ہی کہہ گئے،

---

[1] اصول الشاشی: ص:١٧۔ [2] ایضا: ص:١٨۔ [3] اصول الشاشی: ص:٢١۔

جس کی تفصیل یہ ہے کہ:

عورت مغلظہ بطلاق ثلاثہ کی بابت اسی آیت میں ارشاد خداوندی ہے کہ طلاق دہندہ خاوند سے اس کا نکاح اس امر پر موقوف ہے کہ پہلے وہ کسی اور خاوند سے نکاح کر لے۔ مگر صرف نکاح ہی کافی نہیں بلکہ حدیث عسیلہ کے تحت خاوند کا ملاپ بھی ضروری ہے، محدثین کے ساتھ حنفیہ اس کو ضروری سمجھتے ہیں، اس پر اعتراض وارد ہوا کہ آپ فقہاء کا اصول ہے کہ قرآن کے خاص پر حدیث کے ساتھ زیادتی جائز نہیں، قرآن شریف میں انتہائے حرمت نکاح ثانی کو قرار دیا ہے، پھر آپ ملاپ کو شرط کیوں قرار دیتے ہیں؟

صورت متنازعہ کی ایک مثال ہم پیش کرتے ہیں مسمات ہندہ کو تین طلاقیں واقع ہوگئیں، اب وہ اس آیت کے ماتحت آ گئی:

﴿فَلَا تَحِلُّ لَهُۥ مِنۢ بَعۡدُ حَتَّىٰ تَنكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهُۥ﴾ [البقرۃ:۲۳۰] نکاح ثانی ہوتے ہی خاوند ثانی نے بلا ملاپ طلاق دے دی، چونکہ عدم حلت کی انتہا نکاح ثانی کو قرار دیا گیا ہے، اس کا مقتضی یہ ہونا چاہیے تھا کہ ہند مذکور پہلے خاوند (طلاق دہندہ) سے نکاح کر سکے، حالاں کہ محدثین اور فقہا دونوں متفق ہیں کہ صرف نکاح ہی کافی نہیں بلکہ ملاپ کی بھی ضرورت ہے (لحدیث عسیلہ)[①]۔

محدثین پر تو اعتراض نہیں ہوسکتا کیوں کہ ان کا اصول ہے کہ حدیث صحیح کے ساتھ احکام قرآنیہ پر کسی قسم کا تقید ہوسکتا ہے جو بمنزلہ تشریح کے ہوتا ہے (کیوں کہ فریقین کا متفقہ عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صاحب الوحی تھے آپ کا ارشاد یا تشریح خدا کے

① دیکھیں: صحیح بخاری: کتاب الشهادات، باب شهادة المختبئ، حدیث: ۲۶۳۹، صحیح مسلم: کتاب النكاح، باب لا تحل المطلقة ثلاثا لمطلقها حتى تنكح، حدیث: ۱۴۳۳۔

بتانے سے تھی، اس لیے آپ احکام قرآنی کی تشریح کر سکتے تھے)، مگر فقہائے حنفیہ کا یہ اصول نہیں جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے، اس لیے ان پر اعتراض ہوا کہ آپ لوگ نکاح پر ملاپ کو کیوں ضروری قرار دیتے ہیں، اس کا جواب ان کی طرف سے کیا ہی سہل انگاری سے دیا گیا، جس کے الفاظ یہ ہیں: ''أمّا قیدُ الدُّخولِ، فَقَدْ قَالَ البعضُ: إنَّ النِّكاحَ فِي النَّصِ حُمِلَ على الوَطْئِ إذْ العَقْدُ مُسْتَفَادٌ مِنْ لَفظِ الزوجِ''(شاشی)[1]۔

یعنی آیت مذکورہ میں دو لفظ نکاح اور زوج قابل غور ہیں، زوج کا لقب مرد کو اس وقت حاصل ہوتا ہے جب نکاح ہو چکے، پھر جو فرمایا: ﴿تَنكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهُۥ﴾ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عورت مرد سے (جو اس کا خاوند ہو چکا ہے) ملاپ کرے، پس ملاپ کی شرط خود نص قرآنی سے ثابت ہوگئی، نہ کہ حدیث سے مصنف ''شاشی'' اس جواب پر بہت خوش ہے، اور خوشی کا اظہار ان لفظوں میں کرتا ہے:۔

''بِهَذا يَزُولُ السُؤالُ''[2]۔

یعنی یہ جواب ایسا ہے کہ اس سے اعتراض جڑ سے اکھڑ جاتا ہے۔

ناظرین کرام:

غور فرمائیں کہ وہی ''تنکح'' کا لفظ ہے جس کو بمعنی خاص بتا کر اتنا قوی دکھایا تھا کہ حدیث ولی کو بھی متروک قرار دیا اب وہی لفظ ''تنکح'' ہے کہ اپنی ضرورت کے لیے اس کو بمعنی جماع لے کر حدیث عسیلہ کو قبول کر لیا، کیا ہی سچ ہے ؎

أكرِمْ بِها خُلّةً، لو أنّها صَدَقَتْ
مَوْعُودَها أو لو انّ النصْحَ مَقْبُول

---

① شاشی: ص: ۳۴۔ ② شاشی: ص: ۳۴۔

لَكِنّها خُلّةٌ قد سِيطَ مِن دَمِها
فَجْعٌ، ووَلْعٌ، وإخلافٌ، وتَبْدِيل

(سعاد)

ان اشعار کا مضمون اردو میں یوں ادا کیا گیا ہے ؎

کیوں کر مجھے باور ہو کہ ایفا ہی کریں گے
کیا وعدہ انہیں کر کے مکرنا نہیں آتا

ہمارا سوال:

یہ فقیہانہ نکتہ پیش کر کے ہم فاضل مدیر ترجمان سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ ''تنکح'' کے معنی اگر جماع کے ہیں تو قطع نظر اس سے کہ زبان کے محاورہ میں جماع کو عورت کی طرف منسوب نہیں کیا جاتا بلکہ یہ فعل مرد کی طرف منسوب ہوتا ہے، ہم پوچھتے ہیں کہ چوں کہ عقد نکاح اور جماع دو فعل الگ الگ ہیں اور آیت ''حتی تنکح'' بقول علمائے اصول فقہ جماع کے معنی میں ہے، اس لیے عقد نکاح میں ولی کی اجازت کا شرط ہونا آیت سے تقابل نہیں رکھتا کیوں کہ حدیث مذکور عقد نکاح سے متعلق ہے اور فعل ''تنکح'' بمعنی جماع بعد العقد ہے جس میں علمائے اصول نے حدیث عسیلہ کو منظور بھی کیا ہوا ہے، اب سوال یہ ہے کہ آپ کے خیال میں محدثین اور فقہاء میں موافقت ہوئی یا نہیں ؎

شکر للہ کہ میان من داد صلح فتاد
صلح جویاں بخوشی سجدہ شکرانہ زدند

❁ ❁ ❁

قسط: ۲

تصدیق الحدیث (حصہ سوم)

محدث اور فقیہ

(۸ / محرم ۱۳۵۷ھ = ۱۱ / مارچ ۱۹۳۸ء)

گذشتہ پرچے میں بجواب ترجمان القرآن ہم نے فقیہانہ نکتے کی ایک مثال پیش کی تھی آج مزید مثالیں پیش کرتے ہیں:

دوسری مثال:

علماء اصول نے عام کی تعریف یوں کی ہے:

''مایجمع جمیع أفرادہ'' یعنی جو لفظ اپنے سارے افراد کو شامل ہو۔

اس کی تائید میں یہ مثال پیش کی جاتی ہے کہ مالک اپنی لونڈی کو کہے: ''إنْ كانَ ما فِي بَطْنِكِ غلامًا فأنتِ حُرٌّ فَولدَتْ غُلامًا وَجَارِيَةً، لَمْ يُعْتِقْ''[1]، یعنی مالک اپنی حاملہ لونڈی سے کہے کہ جو کچھ تیرے پیٹ میں ہے اگر یہ لڑکا ہے تو تو آزاد ہے۔

وہ لونڈی ایک لڑکا اور لڑکی جنے تو آزاد نہ ہوگی کیوں کہ ما کا لفظ جمیع مواد تولد کو شامل ہے چوں کہ اس میں سے ایک لڑکی پیدا ہوگئی اس لیے وہ حاملہ لونڈی آزاد نہ ہوگی اس پر فقیہانہ نکتہ سنیے جو یہ ہے لونڈی مذکورہ کی مثال دے کر مصنف (شاشی) لکھتے ہیں:

''وبمثله نقول في قوله تعالى: ﴿فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْءَانِ﴾

① اصول شاشی: ص: ۲۴۔

[المزمل:۲۰]فإنه عام في جميع ما تيسر من القرآن، ومن ضرورته عدم توقف الجواز على قراءة الفاتحة، وجاء في الخبر: أنه لا صلاة إلا بفاتحة الكتاب"[1]۔

یعنی حدیث جو بغیر فاتحہ کے نماز سلب کلی کرتی ہے قرآن مجید کے خلاف ہے کیوں کہ قرآن میں فاتحہ توقف نہیں ہے اس لیے ہم بھی توقف نہیں سمجھیں گے۔(بہت خوب)

آیئے اب ہم بھی اس کو فقیہانہ نظر سے دیکھیں، ایک شخص کو سورہ اخلاص یاد ہے اور دوسرے کو سورہ نباء اور تیسرے کو سورہ بقرہ اور ان تینوں کے حق میں تینوں سورتیں ما تیسر میں داخل ہیں تو کیا ان تینوں سورتوں کی قراءت ان تینوں پر فرض ہے مذکورہ لونڈی کی مثال پر نظر کر کے جواب دیجیے، کیوں کہ ارشاد خداوندی "فَاقْرَؤُوا" صیغہ امر ہے، جو فرضیت کو مقتضی ہے اور ما تیسر اس کا مفعول بہ ہے، اگر آپ حسب قول فقہاء تین آیات کو فرض اور باقی کو مستحب قرار دیں گے تو حاملہ لونڈی کی مثال ایسا کرنے سے آپ کو مانع ہوگی، پس یا تو ان تینوں شخصوں کے حق میں ان تین سورتوں کی قراءت کو فرض قرار دیجیے یا اس فقیہانہ اصول کو بعزت واحترام واپس لیجیے۔

ایک اور فقیہانہ نقطہ:

مرقومہ بالا نکتہ مفعول بہ (ما تیسر) کی حیثیت سے تھا مگر مندرجہ ذیل نقطہ فاعل کی حیثیت سے ہے علمائے اصول کے نزدیک آیت فاقرأوا امام اور مقتدی دونوں کو شامل ہے، یعنی اس آیت میں امام اور مقتدی دونوں کو قراءت کا حکم ہے، مگر یہ عموم ان کی نظر میں آیت: ﴿إِذَا قُرِءَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ﴾ کے خلاف ہے اس لیے بقول ان کے یہ دونوں آیتیں استدلال سے ساقط ہیں ان کے سقوط کے بعد انہوں نے اس

[1] اصول شاشی: ص: ۲۴۔

حدیث کی طرف رجوع کیا ہے جس میں ذکر ہے کہ امام کی قراءت مقتدی کی قراءت ہے۔ چنانچہ (نورالانوار) کے الفاظ ذیل میں پیش کرتے ہیں:

مثاله قوله تعالى: ﴿فَٱقۡرَءُواْ مَا تَيَسَّرَ مِنَ ٱلۡقُرۡءَانِ﴾ مع قوله تعالى: ﴿وَإِذَا قُرِئَ ٱلۡقُرۡءَانُ فَٱسۡتَمِعُواْ لَهُۥ وَأَنصِتُواْ لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُونَ﴾، فإن الأول بعمومه يوجب القراء ة على المقتدي، والثاني بخصوصه بنفيه، وقد ورد في الصلاة جميعا فتساقطا، فيصار إلى حديث بعده، وهو قوله عليه السلام: "من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة" (نورالانوار: (ص: ۱۹۴)، مطبوعہ انوارمحمدی لکھنؤ)[1]۔

فاضل مدیر:

یہ نکتہ فقیہانہ ہے یا جرأت علی کلام الشاشی ہے، اصول فقہ سے ایک اصل پیش کر کے سوال کرنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ کوئی شخص اپنی انگوٹھی کے متعلق وصیت کرے کہ فلاں شخص کو دینا ہے، دوسری وصیت میں کہے کہ اس کا نگینہ فلاں کو (دوسرے) کو دینا ہے، یہ دونوں صورتیں فقہاء کے نزدیک متضاد نہیں، بلکہ عام مخصوص البعض کی قسم سے ہیں۔ (ملاحظہ ہو (نورالانوار)، (شاشی) وغیرہ)۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ ان فقہاء نے اس اصل کو مذکورہ آیات اور حدیث میں کیوں جاری نہیں کیا، یوں کہتے کہ پہلی آیت میں (نظراً الی المفعول بہ) ما تیسر سے مراد سورہ فاتحہ ہے، جو بمنزلہ انگوٹھی کے نگینے کے ہے اور آیت ''فاستمعوا لہ'' میں قرآن ماسوائے سورہ فاتحہ مراد ہے، کون سا امر ایسا کرنے سے مانع ہے۔ ایسا کرنے میں دونوں آیتیں بھی اپنی اپنی جگہ بحال رہتی ہیں، جیسے موصی (وصیت کنندہ) کی دونوں

---

[1] ۱/ ۵۵۳، فصل فی التعارض، بیان وقوع التعارض بین الكتاب والسنة۔

وصیتیں بحال رکھی گئی ہیں اسی طرح حدیث ’’لاصلاةَ إلا بِفَاتِحَةِ الْكتابِ‘‘ (بصورت مخصوصہ) بمنزلہ نگینہ کے ہیں اور حدیث ’’قراءت الامام‘‘ میں قراءت سے قرآن ماسواء فاتحہ کے مراد ہے۔ بتایئے! ایسا کرنے سے کون امر مانع ہے، مگر فقہاء کا مذہب قراءت فاتحہ خلف الامام نہیں ہے، اس کو ثابت کرنے کے لئے ساری کوشش کی گئی ہے، ورنہ اگر اپنے خیالات اور عقائد سے الگ ہوکر کلام اللہ اور کلام رسول میں تطبیق دینے کی کوشش کرتے تو مشکل پیش نہ آتی۔

تیسری مثال:

مطلق اور مقید کی بحث میں حدیث تغریب کو حد شرعی سے نکال دیا گیا ہے۔ چنانچہ الفاظ ((شاشی)) کے یہ ہیں:

’’قلنا في قوله تعالى: ﴿ٱلزَّانِيَةُ وَٱلزَّانِي فَٱجۡلِدُواْ كُلَّ وَٰحِدٖ مِّنۡهُمَا مِاْئَةَ جَلۡدَةٖۖ﴾ أن الكتاب جعل جلد المائة حدا للزنا فلا يزاد عليه التغريب حدا لقوله عليه السلام "البكر بالبكر جلد مائة وتغريب عام"، بل يعمل بالخبر على وجه لا يتغير به حكم الكتاب ، فيكون الجلد حدا شرعيا بحكم الكتاب، والتغريب مشروعا سياسة بحكم الخبر‘‘(شاشی)[1]۔

مطلب یہ ہے کہ حدیث میں جوزانی کے لئے جلاوطنی کا حکم بھی آیا ہے وہ شرعی حد میں داخل نہیں بلکہ سیاسی حکم ہے جو قاضی (حاکم) کی رائے پر موقوف ہے۔ ہمارے باریک بین فقہاء نے سزائے جلاوطنی کو قرآن کے مقابل ہونے کی وجہ سے یہاں تو حد شرعی سے خارج کر دیا، لیکن رجم (سنگسار زانی) کو حد شرعی میں داخل کرلیا۔ چنانچہ فقہاء

---

① اصول الشاشی:ص:۲۹۔

کا فتوی یہ ہے:

’’ إذا وجَبَ الحَدُّ وكانَ الزّانِي مُحْصَنًا رَجَمَهُ بِالحِجارَةِ حَتّى يَمُوتَ؛ لأنه عليه السلام رَجَمَ مَاعزًا، وَقَدْ أَحْصَنَ‘‘(ہدایہ)[1]۔یعنی زانی ناکح (شادی شدہ) ہوتو سنگ سار کیا جائے کیوں کہ آنحضرت نے ماعز کو سنگسار کیا تھا جو شادی شدہ تھے۔

اڈیٹر صاحب ترجمان! آپ کی فقیہانہ نظر میں فقہاء کے اس رویہ میں کچھ اختلاف نظر آتا ہے یا نہیں کہ زانی کے لئے جلاوطنی تو حد شرعی نہ ہو کیوں کہ وہ قرآن کے مقابل حدیث کا حکم ہے لیکن رجم باوجود حدیثی حکم ہونے کے حد شرعی ہو۔ ﴿تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ﴾[النجم:۲۲] ؎

هم جو چپ ہوں تو مسٹری کہلائیں
شیخ چپ ہو تو توکل ٹھہرے

ناظرین! ہم نے یہ دو تین مثالیں بطور نمونہ پیش کی ہیں ورنہ کتب اصول فقہ میں ایسی مثالیں بے شمار ہیں۔جن میں اپنے مذہب کی پشتی بانی کے لئے حدیثوں کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ بلکہ اصول ہی ایسے بنائے گئے ہیں جن سے اپنا مذہب قوی ثابت ہو اور حدیثیں متروک قرار پائیں۔

فاضل ایڈیٹر صاحب!اگر اس بحث کو آگے چلائیں گے تو ہم بھی آہستہ آہستہ مثالیں پیش کرتے رہیں گے،سردست اتنا کافی ہے ؎

گفتگو آئین درویشی نہ بود
ورنہ باتو ماجرا ہا داشتیم

[1] الھدایہ ازمرغینانی:۳۴۱/۲۔

جواب الجواب:

ترجمان کے مذکورہ استدراک پر مولوی جانباز محمد خان صاحب محمدی حیدرآبادی نے ترجمان میں اپنا مراسلہ درج کرایا جس میں بحوالہ ملل والنحل شہرستانی وغیرہ طریق محدثین اور طریق اہل الرائے میں فرق بتلایا۔ اس کے جواب میں مدیر صاحب ترجمان یوں گویا ہوئے کہ:

''ہم یہ بتانا چاہتے تھے کہ جولوگ آج اتباع حدیث کے علم بردار بنے ہوئے ہیں اور اپنے آپ کوطریق محدثین کا متبع کہتے ہیں وہ دراصل محدثین کی تقلید میں مبتلا ہو گئے ہیں وہ تقلید کو مٹانے کے لیے اٹھے تھے مگر ایک طرح کی تقلید کو چھوڑ کر خود ہی ایک دوسری طرح کی تقلید میں گرفتار ہو گئے اور اب مزید بدقسمتی یہ ہے ان میں سے اکثر حضرات کو یہ احساس بھی نہیں رہا ہے کہ اتباع حدیث اور طریق محدثین کے اتباع اور محدثین کی تقلید میں کیا فرق ہے'' (ترجمان القرآن، ص: ۲۹۷)۔

اہلحدیث:

واقعی یہ تینوں مضامین امتیاز کے قابل ہیں جیسے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ کا تقویٰ و طہارت۔فن روایت وفقاہت اوران کی تقلید یہ تینوں مفاہیم الگ الگ ہیں، عام طور پر ان کی تقلید کے ثبوت میں ان کے تقویٰ اور طہارت کو یا بعض وقت ان کی فقاہت کو بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے، گمان ہی نہیں بلکہ یقین کامل ہے کہ مدیر صاحب ترجمان مقلدین کے فعل کو اسی طرح مکروہ سمجھتے ہوں گے جس طرح مذکورہ مزعومہ اہل حدیث کے طریق عمل کو۔ ہم شکرگزار ہیں کہ مدیر صاحب نے ان تینوں مفاہیم کو الگ الگ بالوضاحت پیش کر دیا ہے، حدیث کا اتباع یہ ہے کہ جو خبر تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہنچے اس کو روایت اور درایت کے اصول پر جانچ کر دیکھو، جب یہ اطمینان ہو جائے کہ وہ صحیح ہے یا اس کی صحت کا ظن غالب ہے، تو اس کی پیروی کرو، اس میں کوئی قباحت

نہیں، اس کے بعد طریق محدثین کا اتباع یہ ہے کہ جس حدیث کی صحت کا تمہیں اطمینان ہوگیا اس سے احکام کا استنباط اس طریقہ پر کرو جس کو اہل حدیث نے اختیار کیا تھا اور اس طریقہ سے اجتناب کرو جسے اہل الرائے پسند کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریق بھی اہل حق کا طریق ہے۔ اور اگر کسی شخص کا رجحان اس کی طرف ہے تو اسے حق حاصل ہے کہ اس کا اتباع کرے۔ ہم کو اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں'' (ترجمان القرآن، ص:۲۹۸)۔

اہلحدیث:

خاکسار مدیر اہل حدیث مع اپنے احباب کرام اور دوسرے روشن خیال اہل حدیثوں کے مدیر ترجمان القرآن کو اطلاع دیتے ہیں کہ ہم خدام اہل حدیث کا طریق عمل یہی ہے جو آپ نے ذکر کیا ہے، کیوں کہ مذہب اہل حدیث کا طغرا ہی یہ ہے ؎

اصل دین آمد کلام اللہ معظم داشتن
پس حدیث مصطفی برجاں مسلم داشتن

پس آپ کا محل اعتراض مقولہ (جو درج ذیل ہے) وہ ہم پر وارد نہیں ہوسکتا ہے۔

''قابل اعتراض جو چیز ہے وہ محدثین کی تقلید ہے اور ان کی تقلید یہ ہے کہ تم روایت اور درایت اور استنباط احکام میں بالکل محدثین پر اعتماد کرلو اور تحقیق صرف اس چیز کا نام رکھ دو کہ کتب حدیث کی چھان بین اور اقوال محدثین کی تلاش وجستجو کی جائے اور جو چیز وہاں جس صورت میں مل جائے اسی صورت میں اسے لے لیا جائے، یہ اگر تقلید نہیں تو اور کیا ہے؟ آخر اصول کے اعتبار سے اس طریقہ اور ائمہ اربعہ کی تقلید کرنے والوں کے طریقہ میں کیا فرق ہے؟ وہ اپنے ائمہ کی باتیں آنکھیں بند کرکے قبول کرتے ہیں اور تم اپنے ائمہ کی۔ فرق جو کچھ بھی ہے، اشخاص کا ہے۔ باقی رہی تقلید شخصی تو وہ دونوں جگہ یکساں ہے'' (ترجمان القرآن: (ص:۲۹۸))۔

اہلحدیث:

ہم کہہ چکے ہیں کہ ہمارا طریق عمل یہ نہیں ہے، ہاں مدیر صاحب موصوف کو ایسے لوگ اگر ملے ہوں تو وہ ہمیں بتائیں۔ ہم موصوف کی ہمراہی میں ان کو سمجھائیں گے کہ ؎

ہوتے ہوئے مصطفی کی گفتار — مت دیکھ کسی کا قول وکردار
جب اصل ملے تو نقل کیا ہے — یاں وہم وگماں کا دخل کیا ہے

ہم ان کو یہ بھی بتلائیں گے کہ کلمہ طیبہ کے دو ہی اجزاء واجب الاتباع ہیں، تیسرا کوئی جزء نہیں جو واجب الاتباع ہو۔ اخیر میں ہم فاضل ''ایڈیٹر ترجمان'' اوران کے احباب، اور'' اہل حدیث'' کے ناظرین وغیرہم کو مولانا ذوالفقار علی صاحب مرحوم دیوبندی (والد ماجد مولانا محمود الحسن دیوبندی) رحمۃ اللہ علیہما کا ایک شعر سنا کر اپنے مضمون کو ختم کرتے ہیں ؎

العِلْمُ مَا كانَ فِيهِ قالَ حَدَّثَنا
وما سِوى ذاكَ وسْواسُ الشَّياطِينِ

اسی شعر کے مضمون کی تائید میں ایک شعر شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم دہلوی کا پیش کرتے ہیں ؎

علمے کہ نہ ماخوذ زمشکاۃ نبی است
واللہ کہ سیرابی ازاں تشنہ لبی است

نوٹ: مضمون تصدیق الحدیث ابتداء سے انتہاء تک بصورت سیٹ بھی مل سکتا ہے۔ شائقین طلب کر سکتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

صلاۃ المؤمنین

بجواب

رسالہ صلاۃ المرسلین

مؤلفہ

مناظرِ اسلام علامہ عصر مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری

ان مضامین میں میاں محمد فاضل مسلم حنیف اہل الذکر والقرآن چکوال ضلع جہلم کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، جو قسط وار (۸ قسطوں میں) ''اخبار اہل حدیث'' امرتسر میں ۱۴/ربیع الاول ۱۳۵۸ھ (تا) ۲۷/ربیع الثانی ۱۳۵۸ھ = ۵/مئی ۱۹۳۹ء (تا) ۱۶/جون ۱۹۳۹ء شائع ہوا۔

تحقیق وتعلیق

عبدالاحد احسن جمیل آل عبدالرحمن

قسط:۱

صلاۃ المؤمنین بجواب رسالہ صلاۃ المرسلین

(۱۴؍ربیع الاول ۱۳۵۸ھ = ۵؍مئی ۱۹۳۹ء)

اہل قرآن کا جدید حملہ حدیث اور اہل حدیث پر۔

رسالہ زیرعنوان جو بدایوں میں طبع ہوا ہے چند روز ہوئے ہمارے پاس پہنچا ہے، یہ میاں محمد فاضل مسلم حنیف اہل الذکر والقرآن چکوال ضلع جہلم کا تالیف کردہ ہے اس میں مروجہ نماز پر بڑی تنقید کر کے اہل قرآن کی نماز قرآن سے بتائی گئی ہے، ہمارے علم میں یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے، سب سے پہلے مولوی عبداللہ چکڑالوی نے قرآنی نماز موسومہ ''برہان القرآن'' شائع کی جس کے جواب میں ہم نے ایک رسالہ ''دلیل الفرقان بجواب برہان القرآن''[1] لکھا جو عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے۔

یہ مسلم حنیف صاحب اسلحہ سے مسلح ہو کر آئے ہیں لیکن یہ اسلحہ اہل علم کی نظر میں کچھ کارآمد نہیں ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے سارا رسالہ ''من جهل شيئا عاداه'' کا مصداق ہے، آج نمونہ کے طور پر ہم رسالہ سے اللہ اکبر کی بحث ناظرین کو دکھاتے ہیں، مصنف مذکور نماز میں اللہ اکبر کہنے کو ناجائز کہتا ہے، بے شک کہے کون روک سکتا ہے مگر اس کی دلیل عجیب ہے، وہ سمجھا ہے کہ اللہ اکبر کے معنی ہیں اللہ بہت بڑا معبود ہے، قرآن مجید سے آیات صفات نقل کر کے لکھتا ہے:

''ان کل صفات الہیہ پر غور کرو، سوچو کیا کوئی دوسرا ہے جس میں یہ صفات پائی جاتی ہوں یا اللہ

[1] دفاع سنت کی دوسرے سلسلہ میں یہ رسالہ ہماری تحقیق وتعلیق کے ساتھ شامل کتاب ہوگا، ان شاءاللہ۔

تعالیٰ کا کوئی ہم جنس ہوسکتا ہے ہرگز نہیں، ہرگز نہیں صرف ومحض اللہ تعالیٰ ہی ان صفات سے متصف ہے اور بس۔

پس یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس زبردست اللہ تعالیٰ کا کوئی ہم جنس یا اس سے نسبت رکھنے والا کوئی چھوٹا اللہ بھی موجود ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اکبر صفت لگانے سے پایا جاتا ہے، کیوں کہ اکبر اسم تفضیل ہے اور اسم تفضیل کی تعریف یہ ہے کہ وہ اپنے ہم جنس کے مقابلے پر نسبتاً بڑائی رکھنے پر بولا جاتا ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ یہ میز بہت بڑی ہے اس فقرے سے ہر ذی عقل سمجھ سکتا ہے کہ میز کی بڑائی کسی مکان کے مقابلہ پر نہیں بلکہ اور میزیں دنیا میں موجود ہیں ان سے یہ میز بڑی ہے اسی طرح بمبئی شہر بہت بڑا ہے سمجھ میں آجائے گا کہ اور شہروں سے بڑا ہے، یہ نہیں کہ بڑائی کسی سمندر کے مقابلہ پر سمجھی جائے، نیز اسم تفضیل کی یہ تعریف بھی ہے کہ وہ صفت حصولی ہو، ذاتی نہ ہو، جیسے فلاں علامہ بہت بڑے عالم ہیں، یہ علم کا ہونا ذاتی نہیں بلکہ حصولی ہے، اسی طرح اب جملہ اللہ اکبر پر غور کرنا چاہیے جس کے معنی ہیں اللہ بہت بڑا ہے، یعنی دنیا میں بہت سے اللہ یا الٰہ موجود ہیں جن میں بہت بڑا بھی ہے اور چھوٹا بھی اور یہ بڑائی ہر اللہ کی حصولی ہے ذاتی نہیں، نہ معلوم مسلمانوں کے علماء کس اسکول کے تعلیم یافتہ ہیں جنہوں نے اب تک اس مفہوم ہی کو نہ سمجھا کیا انہوں نے اسم تفضیل کو نہیں پڑھا؟ پڑھا اور ضرور پڑھا پھر انہیں اللہ کی صفت اکبر مقرر کرتے ہوئے کیوں احساس نہیں ہوتا کہ ہم توحید کے پجاری اللہ اکبر کا وظیفہ کرکے سینکڑوں الہوں کا اقرار کئے لیتے ہیں'' (صلاۃ المرسلین ص:۷)۔

اہلحدیث:

فاضل مصنف منطق میں اگر زیادہ نہیں صرف قطبی تک مطالعہ کئے ہوتے تو ان کو معلوم ہوجاتا کہ موضوع (مبتدا) کی جانب ذات ہوتی ہے اور محکوم بہ (خبر) کی جانب محض صفت بلالحاظ ذات ہوتی ہے، مصنف کو یہ غلطی لگی ہے کہ وہ محکوم بہ میں محکوم علیہ کی

ذات بھی ماخوذ کرتا ہے اسی لیے دھوکا کھاتا ہے، چنانچہ فریب خوردہ ہو کر کہتا ہے کہ:

’’قرآن مجید میں لفظ اکبر چوبیس مقام پر آیا ہے لیکن کوئی مقام ایسا نہیں جہاں وہ جنسیت کو نہ چاہتا ہو یا اس کے مقابل لفظاً یا مفہوماً اصغر موجود نہ ہو یعنی ہر جگہ مقابلہ پر ہی بولا گیا ہے‘‘ (صلاۃ المرسلین ص:۸)۔

اس غلطی میں مبتلا ہو کر وہ کہتا ہے کہ اللہ اکبر کو کہنے میں چھوٹے اللہ بھی ثابت ہوں گے مگر وہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ جیسے اکبر اسم تفضیل ہے ویسے ہی اعلم بھی ہے، چنانچہ ارشاد ہے: ﴿ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ﴾ [الانعام:۱۲۴] اگر اللہ اکبر کہنے میں، اللہ کبیر بھی ثابت ہوتے ہیں تو اللہ اعلم کہنے میں کئی الٰہ علیم ثابت ہوں گے کیوں کہ جیسے اکبر میں مصنف نے ذات موضوع ماخوذ کی ہے اسی طرح اللہ اعلم کہنے میں بھی ذات موضوع داخل ہو کر مفضل علیہ اس کا آلہہ علیم نکلے گا اور ایسا ماننا کفر ہے، پس مصنف کا یہ نتیجہ پیدا کرنا کہ:

’’یہ بات ثابت ہوگئی کہ اللہ اکبر کہنے والے حضرات سینکڑوں چھوٹے چھوٹے الٰہوں کا بھی اقرار کرتے ہیں، اس کی کوئی دلیل اور سند ان کے پاس نہیں‘‘ (صفحہ:۱۰)۔

ہم کہتے ہیں کہ ایک دلیل اور سند کیا چیز ہے، اگر کہا جائے کہ آپ کے ادعا کے خلاف دلائل موجود ہیں تو بالکل صحیح ہے، پس جس طرح آپ نے اللہ اکبر کہنے والوں پر اظہار غضب کیا اور غضب کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اکبر کا مفضل علیہ الٰہ کبیر ثابت ہوتا ہے، ٹھیک اسی اصول پر اللہ اعلم کا مفضل علیہ آپ کو الٰہ علیم ضرور ماننا پڑے گا اور یہ صریح شرک ہے یہ غلطی دراصل آپ کو ہمارا پیش کردہ اصول نہ سمجھنے سے لگی ہے۔

وہ اصول ہم مکرر ذکر کیے دیتے ہیں کہ ’’محکوم علیہ میں ذات ماخوذ ہوتی ہے اور محکوم بہ میں صفت بلا لحاظ ذات مقصود ہوتی ہے‘‘۔

پس اس غلطی کے اظہار کے بعد ہم آپ کی ایک لن ترانی بھی ناظرین کے سامنے رکھتے ہیں، جو آپ ہی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

''ہماری رائے میں یہ ہزاروں رایوں اور ملاءوں کی تقلید ہی کا ادنی کرشمہ ہے جو ہمارے علماء کو قرآن اور قواعد عربیہ پر غور وفکر کا موقع نہیں دیتی کاش اب بھی قرآن حکیم کی پیروی کی جائے اور صرف ومحض اسی میں غور وخوض کیا جائے اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے'' (ص:۸)۔

ہم اس دعا پر آمین ثم آمین بلکہ بکثرت آمین کہتے ہیں، خدا آپ کو بھی توفیق دے کہ آپ بھی قرآن مجید پر غور کریں اور قواعد عربیت ملحوظ رکھ کر غور کریں۔

جیسا غور وخوض اب تک آپ نے کیا ہے ایسا نہ کریں، ورنہ ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیں ؎

گر تو قرآن بریں نمط خوانی
ببری رونق مسلمانی

قسط:۲

صلاۃ المؤمنین بجواب رسالہ صلاۃ المرسلین

(۲۱ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ = ۱۲ مئی ۱۹۳۹ء)

گذشتہ پرچے میں اس سلسلے کا پہلا نمبر درج ہو چکا ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ اہل قرآن (منکرین حدیث) کی طرف سے حدیث اور اہل حدیث پر یہ جدید حملہ ہے جو صلاۃ کے عنوان سے کیا گیا، اس کا جواب دینا اہلحدیث کا اولین فرض ہے اسی لیے اس کا جواب سلسلہ وار شروع ہوا ہے، گذشتہ پرچے میں اللہ اکبر کی بحث آ چکی ہے، آج اس کا بقیہ درج کر کے آگے جواب دیا جاتا ہے۔

مصنف رسالہ قائلین حدیث کو جس سختی اور دشنام دہی سے یاد کرتا ہے اس کے برابر مذہبی اصطلاح میں کوئی گالی یا سخت کلامی نہیں ہو سکتی اس کے الفاظ یہ ہیں:

''اسی طرح دشمنان اسلام نے لفظ ''اللہ'' جو کہ قرآن میں تعلیم کیا گیا تھا بدل کر ''اللہ اکبر'' بنا دیا حالاں کہ اللہ تعالیٰ کی صفت اکبر قرآن مجید میں کہیں بیان نہیں ہوئی نہ جملہ ''اللہ اکبر'' کسی جگہ قرآن مجید میں پایا جاتا ہے'' (صلاۃ المرسلین، ص:۱۱)۔

اہلحدیث:

قائلین حدیث کو دشمنان اسلام اور محرفین قرآن کہہ کر مصنف اپنا اندرونی جوش نکال لے، مگر ہم قرآنی تعلیم کے پابند اور اصل معنی میں اہل قرآن ہیں اس لیے ہم ارشاد قرآنی: ﴿وَقُل لِّعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ [الاسراء:۵۳] کے خلاف سخت کلامی نہیں کریں گے کیوں کہ اسی آیت میں سخت کلامی کا نتیجہ ہمیں بتایا گیا ہے:

﴿إِنَّ ٱلشَّيۡطَٰنَ يَنزَغُ بَيۡنَهُمۡ﴾[الاسراء:۵۳] یعنی شیطان سخت کلامی کے ذریعہ آپس میں لڑوا دیتا ہے۔

لفظ اکبر پر آپ کے جو اعتراضات تھے ان کا جواب ہم پہلے نمبر میں بالتفصیل دے چکے ہیں، اس کے متعلق آج بھی بالاجمال کچھ عرض کرتے ہیں۔

قرآن مجید نے خدا کی صفات کوالحسنیٰ سے موصوف بتایا ہے جو کہ اسم تفضیل کا صیغہ ہے، غور سے پڑھیے: ﴿فَلَهُ ٱلۡأَسۡمَآءُ ٱلۡحُسۡنَىٰ﴾[الاسراء:۱۱۰] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر ایک نام دراصل اسم تفضیل ہے کبھی صیغہ تفضیل لفظوں میں ظاہر ہوتا ہے اور کبھی معنی میں، بہر حال اس کو اسم تفضیل کہنا منشا قرآنی کے عین مطابق ہے۔

قرآن مجید کی آیت ناطق ہے کہ انسانی طبقے میں بعض انسانوں کی صفت کبیر آئی ہے جیسے ارشاد ہے: ﴿رَبَّنَآ إِنَّآ أَطَعۡنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَأَضَلُّونَا ٱلسَّبِيلَا۠﴾ [الاحزاب:۶۷][1]، جب بعض انسان کبیر ہوئے جس کی جمع کبراء ہے تو اللہ کو اکبر کہنا حسب منشاء آیت: ﴿فَلَهُ ٱلۡأَسۡمَآءُ ٱلۡحُسۡنَىٰ﴾[الاسراء:۱۱۰] قطعاً صحیح ہے، جیسے: ﴿أَرۡحَمُ ٱلرَّٰحِمِينَ﴾[یوسف:۶۴] اور ﴿أَحۡسَنُ ٱلۡخَٰلِقِينَ﴾[المومنون: ۱۴]، وغیرہ۔ فافهم ولا تكن من القاصرين۔

آپ کا دوسرا فقرہ بھی غالباً غفلت میں لکھا گیا ہے جو یہ ہے: ''قرآن شریف میں ''لا إله إلا الله'' تھا لیکن محرفین نے تحریف کر کے ''لا إله غيرك'' بنا دیا ''سبح اسم ربك العظيم'' سے ''سبحان رب العظيم'' کر دیا، ﴿سَبِّحِ ٱسۡمَ رَبِّكَ ٱلۡأَعۡلَى﴾[الاعلی:۱] کے بجائے ''سبحان ربی الاعلی'' بنا دیا'' (صلاۃ المرسلین

[1] ترجمہ: مجرم کہیں گے اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے رئیسوں اور کبیروں کی پیروی کی جنہوں نے ہمیں گمراہ کر دیا۔ (مؤلف)۔

ص:۱۲)۔

معلوم نہیں ان حضرات کو باوجود قرآن سے اتنی دوری کے اہل قرآن کہلانے کا شوق کیوں ہے؟

''لا إله غيرک'' کا ثبوت سنیے!

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱذْكُرُوا۟ نِعْمَتَ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ ۚ هَلْ مِنْ خَـٰلِقٍ غَيْرُ ٱللَّهِ يَرْزُقُكُم مِّنَ ٱلسَّمَآءِ وَٱلْأَرْضِ ۚ لَآ إِلَـٰهَ إِلَّا هُوَ﴾ [الفاطر:۳] یہاں غیر کے لفظ کو ملاحظہ کیجیے کہ وہ اللہ کی طرف مضاف ہے اور محل استفہام انکاری بھی ہے جس کو بصورت خطاب ''لا إله غيرک'' کہنا جائز ہے اب آپ بھی بتائیے کہ آپ نے دو آیتیں کیوں پیش کی ہیں:

۱۔ سَبِّحِ ٱسْمَ رَبِّكَ العظیم۔

۲۔ سَبِّحِ ٱسْمَ رَبِّكَ ٱلْأَعْلَى ۔

کیا آپ کا منشا ہے کہ ان احکام پر عمل کرنے کے لیے ہم یہی الفاظ پڑھ دیا کریں یعنی رکوع میں جھک کر: سَبِّحِ ٱسْمَ رَبِّكَ ٱلْأَعْلَى پڑھا کریں اور سجدے میں جا کر ﴿سَبِّحِ ٱسْمَ رَبِّكَ ٱلْأَعْلَى﴾۔

ہمیں تو تعمیل ارشاد میں عذر نہ ہوگا، مگر کوئی معقول شخص ہم سے پوچھ بیٹھے کہ ﴿سَبِّحِ﴾ تو امر کا صیغہ ہے اور تم لوگ رکوع، سجود میں یہ لفظ کہہ کر کس کو تسبیح پڑھنے کا حکم دیتے ہو، حکم تو تم (نمازیوں) کو ہوا تھا کہ اپنے رب کے نام کی تسبیح پڑھا کرو، تم نے اس پر یوں عمل کیا کہ سبح کہہ کر کسی نامعلوم شخص کی طرف یہ حکم منتقل کر دیا، اس کی مثال تو یہ ہوئی کہ کوئی آقا اپنے نوکر سے کہے کہ پانی لاؤ اور نوکر اس کے منہ کی طرف پیٹھ کر کہے پانی لاؤ، کیا خوب تعمیل ارشاد ہے۔

ناظرین کرام: پہلی آیت ''سبح اسم ربک العظیم'' میں ہمیں حکم ہوا ہے کہ اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح پڑھا کرو، اس کے متعلق اول مفسر قرآن علیہ السلام نے حکم دیا ''اجْعَلُوهَا فِي الرُّكُوعِ'' یعنی رکوع میں اس حکم کی تعمیل کرو، اسی لیے ہم رکوع میں ''سبحان ربی العظیم'' کہتے ہیں جو اس حکم کی تعمیل ہے، دوسری آیت ''سَبِّحِ ٱسۡمَ رَبِّكَ ٱلۡأَعۡلَى'' کی بابت حضور نے فرمایا ''اجْعَلُوهَا فِي السُّجُودِ'' یعنی سجدے میں اس حکم کی تعمیل کرو، اسی لیے ہم سجدے میں سبحان ربی الاعلی کہا کرتے ہیں۔

بتایئے ایسا کرنے میں ہماری کیا غلطی ہے۔

حضرات!

اس ظلم اور نافہمی کے باوجود مصنف کا ادعا قابل ملاحظہ ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

''غرض یہ محرفین قرآن جب اپنی مصنوعی عبارتیں قرآن مجید میں داخل نہ کر سکے تو قرآنی صلاۃ وغیرہ اعمال قرآنی ہی کو مسخ کرنا شروع کر دیا اور آخر کار قرآنی ہر عمل کی شکل وصورت اور عبارت کو بگاڑ کر رکھ دیا، جن کا غلط ہونا دلائل عقلی اور نقلی سے ثابت و بین ہے۔

ناظرین:

''اس کتاب میں ہم نے قرآنی عمل صلاۃ اور مروجہ نماز کی حقیقیت کو کھول کر رکھ دیا ہے اس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ ہمارا دعویٰ کہاں تک صحیح ہے'' (ص: ۱۲)۔

اہلحدیث:

اس کے جواب میں ہم صرف استاد ذوق کا یہ شعر نذر کئے دیتے ہیں ؎

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق
اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

اس سے آگے مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس قابل ہے کی ناظرین اسے غور سے پڑھیں اور ایسے لوگوں کے حق میں دعائے ہدایت کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اتباع اسوۂ حسنہ سے بہرہ ور کرے۔

مصنف کے الفاظ متعلق قعدہ نماز یہ ہیں:

''مروجہ نماز کے قعدے میں عموماً مسلمان التحیات اور درود شریف کی تلاوت کرتے ہیں ان ہر دو کی عبارتیں غیر قرآنی ہیں، یہی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ حضرت رسول کریم سلامٌ علیہ نے اس کی تلاوت کبھی نہیں کی، لیکن ہم اسی پر بس نہیں کریں گے، بلکہ قواعد عربیہ اور قرآنی و عقلی دلائل سے ان کی حقیقیت بھی ناظرین کے روبرو پیش کئے دیتے ہیں۔

۱۔ التَّحيّاتُ للّٰہِ والصَّلواتُ الطَّيِّباتُ، التحيات جمع ہے تحية کی لغت میں اس کے معنی بھلائی کی دعائیں ہیں یا سلامتی کی دعائیں ہیں اور قرآن کی رو سے اس کے معنی دعائے سلام کے ہیں، ملاحظہ ہو آیات ذیل:

۱- ﴿تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ﴾[ابراہیم:۲۳] جنت میں جنتیوں کا تحیہ سلام ہوگا۔

۲- ﴿دَعْوَاهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ﴾[یونس:۱۰] جنتی جنت میں ''سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ'' پکاریں گے اور تحیہ ان کا سلام اس میں ہوگا۔

۳- ﴿تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ سَلَامٌ﴾[الاحزاب:۴۴] جس دن میں جنتی ملیں گے تحیہ ان کا سلام ہوگا۔

اب لیجیے: ﴿الطَّيِّبَاتُ﴾ کو قرآن مجید میں یہ لفظ اٹھارہ جگہ آیا ہے، ان میں سے سولہ جگہ رزق پر بولا گیا ہے ملاحظہ ہو حوالہ جات پ۱، ٦ (البقرة:۵۷) و پ ۲، ۵ (البقرة:

۱۷۲) وپ ٦، ۲ (النساء: ۱٦۰)، پ ٦، ۵ (المائدہ: ۵) پ ۷، ۲ (المائدہ: ۸۷)، پ ۸، ۱۱ (الاعراف: ۳۲)، پ ۹، ۹ (الاعراف: ۱۵۷)، پ: ۱۰ (الاعراف: ۱٦۰)، پ: ۱۰ (الانفال: ۲٦)، پ ۱٦، ۱۰ (طٰہٰ: ۸۱) وپ ۱۱، ۱۵ (یونس: ۹۳) وپ ۱۴، ۱٦ (النحل: ۷۲)، وپ ۱۵، ۷ (الاسراء: ۷۰)، وپ ۱۸، ۴ (المؤمنون: ۵۱) وپ ۲۴، ۱۲ (غافر: ٦۴) وپ ۲۵، ۱۸ (الجاثیہ: ۱٦)، اور ایک جگہ پ ۳، ۵ (البقرۃ: ۲٦۷) میں کسب پر بولا گیا ہے اور اٹھارویں جگہ پ ۱۸، ۹ (النور: ۲٦) میں: ﴿وَٱلطَّيِّبَٰتُ لِلطَّيِّبِينَ وَٱلطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَٰتِ﴾ آیا ہے جس کا ترجمہ جملہ اہل الروایات نے یوں کیا ہے۔

''اور پاک عورتیں واسطے پاک مردوں کے ہیں اور پاک مرد واسطے پاک عورتوں کے ہیں''۔

لہٰذا طیبات کے معنی پاک رزق، پاک کسب اور پاک عورتیں ثابت ہیں اور جو معنی عبارت زیر بحث کے اہل الروایات پیش کرتے ہیں غلط ہیں، صحیح ترجمہ حسب ذیل ہوا:

''سب بھلائی کی دعائیں یا سب سلامتی کی دعائیں واسطے اللہ کے اور نماز واسطے اللہ کے اور پاک رزق یا پاک کسب یا پاک عورتیں واسطے اللہ کے''۔

گو یا اللہ تعالیٰ بھی کوئی انسان یا مجسم ہستی ہے جو ہر وقت برائیوں اور بیماریوں کا شکار ہوسکتا ہے اور اس کو مجسم ہونے کے سبب سے رزق، کسب اور عورتوں کی ضرورت بھی ہوتی ہے، اسی وجہ سے ہمارے مسلمان بھائی عبارت مذکورہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو فائدہ پہنچاتے رہتے ہیں، ہم ان کو اس نیک کام پر مبارک باد پیش کرتے ہیں'' (صلاۃ المرسلین، ص: ۱۳ تا ۱۴)۔

اہلحدیث:

اس اقتباس میں تحیہ کے جس معنی پر ہم نے خط ڈال دیا ہے وہی ہماری مراد ہے یعنی بھلائی اور سلامتی کی دعائیں، مطلب یہ ہے کہ ایسی دعائیں اللہ کی ذات سے

مخصوص ہیں ، مانگنے والا اسی سے مانگے کسی اور سے نہیں ، طیبات کے معنی کے متعلق آپ نے اپنی قرآن سے ناواقفی یا اخفائے حق کا ثبوت دیا ہے، ہمیں افسوس ہے کہ آپ نے اس آیت کا ذکر تک نہیں کیا جو یہاں پورے طور پر منطبق ہوتی ہے یعنی آیت کریمہ: ﴿ضَرَبَ ٱللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً﴾ [ابراہیم:۲۴] [1] اس آیت میں كَلِمَةً طَيِّبَةً کی صفت ہے جو جمع کی حالت میں بصورت (کلمات) طیبات آئے گی اور عربی زبان میں مرکب توصیفی میں سے موصوف کو حذف کرنا جائز ہے، ملاحظہ ہو: ﴿وَٱلصَّٰٓفَّٰتِ صَفًّا ۝١ فَٱلزَّٰجِرَٰتِ زَجْرًا ۝٢ فَٱلتَّٰلِيَٰتِ ذِكْرًا﴾ [الصافات:۱-۳]۔

امرأالقیس اپنے گھوڑے کی تعریف میں کہتا ہے ؎

مِسَحٍّ إذا ما السّابِحاتُ على الوَنى

ان سب حوالہ جات میں موصوف حذف کیا گیا ہے اور صفت کا صیغہ اس کی جگہ رکھا گیا ہے اسی طرح نماز کے تشہد میں الطیبات سے مراد کلمات طیبات ہیں اور قرآن مجید میں بصورت مفرد کلمۃ طیبۃ آیا ہے، دوسری جگہ: ﴿إِلَيْهِ يَصْعَدُ ٱلْكَلِمُ ٱلطَّيِّبُ﴾ [فاطر:۱۰] مرکب توصیفی معرف باللام کی شکل میں آیا ہے۔

باقی آپ کا یہ کہنا کہ پاک رزق یا پاک عورتیں وغیرہ یہ محض تحکم اور نص قرآنی کے خلاف ہے ، ملاحظہ ہو آیت: ﴿أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُۥ وَلَدٌ وَلَمْ تَكُن لَّهُۥ صَٰحِبَةٌ﴾ [الانعام:۱۰۱] پس قرینہ مقام کے لحاظ سے جو معنی مناسب ہوں وہی لئے جاتے ہیں ، متعدد معانی میں سے جو معنی کسی خاص جگہ محال ہو اسی کو امر ٹھہرانا مجادل کا کام ہے مناظر

[1] مطبوع نسخہ میں رکوع ۱۵ ہی ہے اس لئے ہم نے اس کو باقی رکھا ہے ورنہ یہاں رکوع سولہ ہونا چاہئے، واللہ اعلم۔

کانہیں، پس الفاظ تشہد کے معنی یہ ہوئے کہ ہر قسم کی بھلائی اور سلامتی کی دعا اور صلاۃ (عبادت) اور ہر قسم کے پاکیزہ کلمات ہم خدا ہی کے سامنے عرض کرتے ہیں، کیوں کہ اس کا ارشاد ہے: ﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ [الانعام:۱۶۲] [1] ۔قعدہ کی دعائیں اسی آیت کے ماتحت ہیں۔

اہل قرآن پارٹی کے ممبرو! قرآن مجید کی تبلیغ کرو ہزار شوق سے کرو، خدارا ہماری نصیحت یادرکھو کہ قرآن مجید کی تبلیغ کرنے میں ذاتی تعصب اور ضد سے کام نہ لیا کرو ورنہ ادھر بھی آپ کو کوئی ایسا ہی مل جائے گا جس کا قول ہوگا ؎

محتسب خم شکست ومن سراد

السِنُّ بِالسِنِّ والجُرُوحُ قِصاصٌ

[1] ترجمہ: کہہ دیجئے کہ میری نماز، میری قربانی اور میری زندگی اور موت اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔(مؤلف)۔

قسط:۳

صلاۃ المؤمنین بجواب رسالہ صلاۃ المرسلین

(۲۸؍ربیع الاول ۵۸ ۱۳ء=۱۹؍مئی ۱۹۳۹ء)

اس سلسلہ کے دونمبر پہلے دو پرچوں میں درج ہو چکے ہیں آج تیسرا نمبر درج ذیل ہے، راقم رسالہ نے (ص: ۱۴) پر علمائے حدیث سے ایک استفسار کیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

''روایات کی کتاب (ترمذی) اور (بخاری) میں تحریر ہے کہ پیشتر مسلمان نماز کے قعدہ میں السلام علی اللہ کہا کرتے تھے، ایسا کہنے سے روکا گیا اور التحیات للہ کہنے کا حکم دیا گیا، شاید یہ تبدیلی اس لیے عمل میں لائی گئی کہ پہلی دعا میں اللہ تعالیٰ کے بیماری سے بچنے کی التجا تو تھی لیکن برائی سے بچنے کی کوئی التجا شامل نہ تھی، دوسری عبارت میں یہ دونوں باتیں شامل تھیں، لیکن سوال یہ ہے کہ موجدین نے اس دعا کو قبول کرنے والا کسے ٹھہرایا تھا اور یہ کہ جو خدا بیماری اور برائی سے مبرا نہ ہو وہ خدا ہونے کے لائق بھی ہے یا نہیں، کیا علماء اہل الروایات اس مسئلہ پر غور فرما کر کوئی تسلی بخش جواب مرحمت فرمائیں گے؟'' (صلاۃ المرسلین ص: ۱۴)۔

جواب:

عربی کی مثل ''بِناءُ فاسِدٍ علَى الفاسِدِ'' مصنف پر صادق آتی ہے، السلام علی اللہ کہنا کسی طرح بھی جائز نہیں اسی لیے آپ نے اس سے منع فرمایا مگر اس کی جگہ التحیات رکھا جو اظہار عبودیت کے لیے ہے نہ کہ ان اغراض فاسدہ کے لیے جو آپ نے بیان کی ہیں، اس کی تفصیل ہم پہلے نمبر میں لکھ چکے ہیں۔

تمثیل:

ایک پادری صاحب سے میری گفتگو تثلیث کے مسئلہ پر ہو رہی تھی (تثلیث کے معنی تین ہستیوں کو خدا ماننا) پادری صاحب نے کہا آپ تو یوں ہی انکار کرتے ہیں، قرآن کی پہلی ہی آیت میں تثلیث کا ثبوت ملتا ہے، میرے دریافت کرنے پر فرمایا پڑھیے: ﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ﴾۔ یہی تین ہیں جن کو ہم باپ بیٹا اور روح القدس کہتے ہیں، قرآن شریف سے ایسا استدلال کرنے والے یا از خود باتیں بنانے والے علمی دنیا میں کچھ عزت کے مستحق نہیں ہوتے ہیں، ان کے حق میں اتنا ہی کہنا کافی ہے ؎

جفا کے تو بھی ہو قابل خدا وہ دن تو کرے

درود شریف:

اس عنوان کے ماتحت اہل قرآن مصنف نے خوب گل کھلائے ہیں، آپ لکھتے ہیں:

''درود شریف کا قرآنی مفہوم تو ان شاء اللہ تعالیٰ ہم سلام کے بیان میں پیش کریں گے، یہاں صرف مروجہ درود شریف کو مع اس کے کھلے ہوئے مفہوم کے قرآن حکیم کی روشنی میں واضح کیا جائے گا تاکہ ناظرین کو اس کی حقیقت بھی ظاہر ہو جائے کہ مذہب اسلام سے اس کا کس قدر تعلق ہے، اس مقصد کو سمجھانے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کریم کا وہ حکم جس کی تعمیل میں درود شریف مروجہ کا اجرا بتلایا جاتا ہے، درود شریف کے مقابل تحریر کریں، پس ایک طرف حکم الٰہی اور دوسری طرف تعمیل حکم معہ ترجمہ پیش کیا جاتا ہے، اس کے بعد دلائل تنقید ناظرین کے روبرو ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کا حکم:

﴿إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ [الاحزاب:۵۶]۔

ترجمہ: تحقیق اللہ اور فرشتے اس کے درود بھیجتے ہیں اوپر نبی کے اے لوگو! جو ایمان لائے ہو

درود بھیجو او پر اس کے اور سلام بھیجو، سلام بھیجنا۔ ترجمہ شاہ رفیع الدین صاحب۔

تعمیل حکم:

اللَّهُمَّ صَلِّ على مُحَمَّدٍ وعلَى آلِ مُحَمَّدٍ، كما صَلَّيْتَ على إبْرَاهِيمَ وعلَى آلِ إبْرَاهِيمَ؛ إنَّكَ حَمِيدٌ مَجِيدٌ، اللَّهُمَّ بَارِكْ على مُحَمَّدٍ وعلَى آلِ مُحَمَّدٍ، كما بَارَكْتَ علَى إبْرَاهِيمَ وعلَى آلِ إبْرَاهِيمَ؛ إنَّكَ حَمِيدٌ مَجِيدٌ.

ترجمہ: اے اللہ درود بھیج محمد پر اور آل محمد پر جیسا کہ تو نے درود بھیجا تھا ابراہیم اور آل ابراہیم پر، تو ہی حمد کیا ہوا بزرگ ہے، اے اللہ برکت بھیج محمد اور آل محمد پر جیسا کہ تو نے برکت بھیجی تھی ابراہیم اور آل ابراہیم پر تو ہی حمد کیا ہوا بزرگ ہے۔

ناظرین:

اللہ تعالیٰ کا حکم جس کی وجہ سے اہل الروایات نے درود شریف پڑھنا شروع کی اور درود شریف دونوں آپ کے سامنے ہیں، اب ذرا ہماری تنقید بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔

اول یہ کہ حکم اور اس کی تعمیل جو صدر میں درج ہے اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسا کہ حسب ذیل احکام خداوندی کی تعمیل اس کے مقابل میں درج ہے۔

حکم خداوندی:

(الف) ﴿وَأَقِيمُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتُواْ ٱلزَّكَوٰةَ﴾[البقرة:۴۳]۔

اے ایمان والو! قائم کرو نماز اور دو زکاۃ۔

(ب) ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُتِبَ عَلَيۡكُمُ ٱلصِّيَامُ﴾[البقرة:۱۸۳]۔

اے ایمان والو! فرض کئے گئے تم پر روزے۔

تعمیل حکم:

(الف)''اللهم أقِمِ الصلاةَ وآتِ الزّكاةَ''۔

اے اللہ تو قائم کر نماز اور دے زکاۃ۔

(ب)''اللھمَّ کُتِبَ علیکمْ الصِّیامُ''۔

اے اللہ! تجھ پر فرض کئے گئے ہیں روزے۔

واقعی اگر احکام الٰہی کی اسی طرح تعمیل ہوا کرے تو مسلمانوں کا مذہب بہت ہی آسان ہو جائے اور ہر طرف سے سمٹ کر صرف زبان پر باقی رہ جائے پھر کسی مذہب کو ہرگز ہرگز لڑائی جھگڑے کا موقع نہیں مل سکتا اب ذرا اردو کی ایک مثال بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔

اگر کوئی آقا اپنے غلام یا ملازم کو حکم دے کہ اے ملازم ذرا حقہ بھر لا، ملازم صاحب اس کی یوں تعمیل کریں کے اے آقا صاحب آپ حقہ بھر لائیے، بلاشک ملازم کی یہ تعمیل اپنے آقا کو خوش کرنے کا باعث نہیں ہوسکتی، پس اللہ تعالیٰ کے حکم کہ ''اے مومنوں! درود بھیجو نبی پر'' اس کی یہ تعمیل کہ ''اے اللہ تو درود بھیج محمد پر کسی طرح درست نہیں ہوسکتی'' (رسالہ مذکور ص:۱۵، تا ص:۱۷)۔

اہلحدیث:

راقم مضمون نے اگر علم صرف کی کتابوں میں خواص ابواب پڑھے ہوتے یا ان کو یاد ہوتے تو یہ اعتراض کرنے کی جرأت کبھی نہ کرتے، باب تفعیل کے خواص میں دو خاصے ایجاد فعل اور الباس ماخذ مشہور ہیں۔ صلوا باب تفعیل سے امر کا صیغہ ہے، جب اس کے مخاطب مومنین ہوں تو اس وقت اس سے مراد ہوتی ہے ایجاد فعل صلاۃ (دعا کرنا) یعنی نبی علیہ السلام کی ترقی درجات کے لیے دعا کرنا مقصود ہوتا ہے، ہاں جب مخاطب خود خدا ہو جیسے اللھم صل میں تو اس وقت اس کے معنی خاصہ الباس ماخذ کے ماتحت یوں ہوں گے کہ اے خدا نبی علیہ السلام کو اپنی رحمت سے ڈھانپ لے یعنی ان کو اپنی رحمت سے پورا حصہ عنایت کر۔

اس کی ایک مثال ہم آپ کے لیے باب تفعیل کا ایک اور مصدر پیش کرتے ہیں،

سنیے اور غور سے سنیے اور اپنی ساری جماعت سے مل کر اس کا جواب سوچئے۔ ارشاد ہے: ﴿قَدۡ أَفۡلَحَ مَن زَكَّىٰهَا﴾ [الشمس:۹] (جس نے اپنے نفس کو پاک کرلیا وہ نجات پا جائے گا) ادھر یہ بھی ارشاد ہے: ﴿فَلَا تُزَكُّوٓاْ أَنفُسَكُمۡ﴾ [النجم:۳۲]۔ دوسری آیت کے معنی پہلی کے لحاظ سے یہ ہوں گے کہ اپنے نفسوں کو پاک نہ کرو یعنی نجات کا ذریعہ (تزکیہ نفس حاصل نہ کرو)۔

مسلم صاحب:

کیا یہ معنی آپ کو منظور ہیں یا کچھ اور مطلب ہے؟ سچ ہے قرآن کو جاننے کے لیے قرآن کے خادم علوم کی بھی ضرورت ہے۔

پس آپ کا سارا اشکال دور ہوگیا۔ اسی طرح آپ کا نتیجہ میں: ﴿وَأَقِيمُواْ ٱلصَّلَوٰةَ﴾ [البقرۃ:۴۳] کی تعمیل ''اللھم أقم الصلاۃ'' بتانا لڑکپن کی سی بات ہے اس آیت میں ''اُقیموا'' اور ''آتوا'' سے مردا صلاۃ اور زکاۃ کا فعل بندوں سے مطلوب جیسے: ﴿أَنفِقُواْ مِمَّا رَزَقۡنَٰكُم﴾ [البقرۃ:۲۵۴] میں نفقہ مطلوب ہے۔

یہ نہیں کہ اسی لفظ کو مقلوب کر کے خدا ہی کو اس کا مخاطب بنالیں مثلاً خدا فرمائے: ﴿فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ﴾ [الطلاق:۱] تو اس کی تعمیل میں اہل قرآن خدا کو مخاطب کر کے کہیں کہ اے خدا جب تو طلاق دیا کرے تو عدت کے اندر دیا کر۔ سچ ہے ؎

جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

اسی طرح یہ نتیجہ بھی غلط ہے جو ﴿كُتِبَ عَلَيۡكُمُ ٱلصِّيَامُ﴾ [البقرۃ:۱۸۳] کی تعمیل کا بتایا ہے، ''اللھمَّ کُتِبَ علیکَ الصِیامُ''۔

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگوں کو اتنی جلدی کیا ضرورت پڑی کہ اوچھے ہتھیاروں سے حدیث کے مضبوط قلعے پر حملہ آور ہوئے ہیں جس کے جواب میں ہم

گھبراتے نہیں بلکہ یہ شعر نذر کرتے ہیں۔

ہاں تامل دم ناوک فگنی خوب نہیں
میری چھاتی ابھی تیروں سے چھنی خوب نہیں

''دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ حاکم اور بندہ ہر طرح محکوم ہے لیکن درود شریف مذکورہ کی عبارت نے اللہ تعالیٰ کو محکوم اور بندے کو حاکم قرار دے دیا ہے جو ہر طرح نامناسب ہے'' (رسالہ مذکور ص: ۱۷)۔

اہلحدیث:

کیا ہمارا جواب سن کر بھی آپ یہی کہیں گے، غالباً آپ کو ایسا کہنے کا حوصلہ نہیں پڑے گا کیوں کہ اس کی تفصیل ہم بتا چکے ہیں کہ **فعل منسوب الی الناس** کے معنی اور ہوتے ہیں اور **فعل منسوب الی اللہ** کے اور، اس کی مثال **علم معانی** میں ''بنی الأمیر المدینہ''وغیرہ ملتی ہے۔

''تیسرے یہ کہ: ﴿عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُواْ تَعْلَمُونَ﴾ [البقرۃ:۲۳۹]، ﴿ٱلرَّحْمَٰنُ ۝ عَلَّمَ ٱلْقُرْءَانَ﴾ [الرحمن:۱-۲] ان سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ معلم اور استاذ ہے لیکن درود شریف کی عبارت ''كما صَلَّيْتَ علَى إبْرَاهِيمَ'' اور ''كما بَارَكْتَ علَى إبْرَاهِيمَ'' سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بندہ معلم اور استاد ہے اور اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ شاگرد ہے، اگر ایسا نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ کو درود بھیجنے کی ترکیب کیوں بتائی جا رہی ہے'' (ص:۱۷)۔

اہلحدیث:

اس سوال سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے قرآن مجید کو سمجھنے پر پورا تو کیا ادھورا غور بھی نہیں کیا، ہاں صاحب ''کما'' کے لفظ سے آپ نے جو نتیجہ نکالا ہے کہ بندہ خدا کا استاد بن جائے گا اس کے جواب میں، میں ایک آیت پیش کرتا ہوں جس کی تلاوت آپ نے

بلکہ آپ کے استادوں اور باپ دادوں نے بھی کئی مرتبہ کی ہوگی اور اب تک کرتے ہوں گے، وہ آیت یہ ہے: ﴿رَّبِّ ٱرۡحَمۡهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرٗا﴾ [الاسراء:۲۴]

کیااس کا یہ ترجمہ ٹھیک ہے:

اے خدا! میرے ماں باپ پر رحم کر جیسے انہوں نے مجھے بچپن میں پرورش کیا۔

اب ایمان سے بتائیے کہ اس آیت کو تلاوت کر کے آپ لوگوں میں کتنے خدا کے استاد بن گئے ہیں، ہم اگر ''کما صَلَّيْتَ '' پڑھنے سے خدا کے استاد بن گئے ہیں تو آپ لوگ قرآن مجید کی آیت: ﴿كَمَا رَبَّيَانِي﴾ تلاوت کر کے کیوں خدا کے استاد نہیں بن سکتے، بحالیکہ لفظ کما دونوں جگہ موجود ہے۔

ناظرین کرام!

یہ ہے ان لوگوں کی قرآن دانی کا نمونہ۔

''چوتھے یہ کہ درود شریف کی عبارت ''کما صلیت وکما بارکت'' سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ ابراہیم اور آل ابراہیم پر درود اور برکت ان کی زندگی ہی میں نازل فرما چکا تھا لیکن حضرت محمد سلام علیہ پر ابھی تک درود اور برکتیں نازل نہیں فرمائیں حالاں کہ آیت مندرجہ صدر میں اللہ تعالیٰ خود درود بھیجنے کا اقراری ہے'' (ص:۱۷)۔

اہلحدیث:

یہ اعتراض بھی دراصل علوم صرف ونحو نہ جاننے کی بنا پر ہے، عربی زبان میں فعل امر کا صیغہ اکثر تو ایجاد فعل کے لئے ہوتا ہے اور کبھی استمرار فعل کے لیے بھی آتا ہے، ان دونوں کی مثالیں سنیے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ أُوتُواْ ٱلۡكِتَٰبَ ءَامِنُواْ بِمَا نَزَّلۡنَا﴾ [النساء:۴۷]۔

اے اہل کتاب! ایمان لاؤ اس کلام پر جو ہم نے نازل کیا۔

دوسری آیت اس کے ساتھ ملایئے، ارشاد ہے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ ءَامِنُواْ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ﴾ [النساء:۱۳۶] اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ اے ایمان والو! ایمان پر ہمیشہ قائم رہو۔

پہلی آیت میں امر کا صیغہ ایجادِ فعل کے لیے ہے اور دوسری آیت میں استمرارِ فعل کے لئے، پس اس قاعدے کے ماتحت آپ کے حسب منشاء آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اے خدا! نبی علیہ السلام کو اپنی رحمت کے دامن سے ہمیشہ ڈھانپے رکھ، کہیے اس پر کیا اعتراض ہے؟

''پانچویں یہ کہ عبارت درود شریف مروجہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آل محمد اور ابراہیم اور آل ابراہیم کے لیے مخصوص ہے، بقیہ مومنین اور مرسلین درود اور برکت سے محروم کر دیے گئے ہیں حالاں کہ: ﴿هُوَ ٱلَّذِي يُصَلِّي عَلَيۡكُمۡ﴾ [الاحزاب:۴۳] سے ظاہر ہے کہ کوئی مومن تک اللہ تعالیٰ کی درود سے محروم نہیں رہا'' (ص:۱۷۔۱۸)۔

اہلحدیث:

یہ اعتراض بھی جلد بازی پر مبنی ہے آل محمد اور آل ابراہیم علیہما السلام سے ان کے اتباع مراد ہیں، نسلی آل مراد نہیں، اس تفصیل کو (نیل الاوطار)[1] مصنفہ امام شوکانی میں دیکھئے تو آپ کا سوال ھباءً منثورا ہو جائے گا۔

''چھٹے یہ کہ نحو کا قاعدہ ہے جب ایک ہی فعل کے لیے کئی فاعل ہوں تو اس فعل کا مفہوم اور معنی ایک ہی ہوگا جداگانہ نہیں ہو سکتے، لہٰذا آیت مذکور الصدر میں اللہ اور ملائکہ اور مومنین سب کی درود ایک ہی ہوگی اور مسلمانوں کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ درود شریف مروجہ کا وظیفہ چوبیس گھنٹہ یعنی دن رات کرتا رہتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ خود کہتا ہے کہ اے اللہ تو درود بھیج محمد

① ۲/ ۲۳۷۔۲۳۵۔

پراورآل محمد پرتویہ کون سے اللہ کومتوجہ کرتا ہے،کیااللہ کا بھی کوئی اللہ ہے‘‘(ص:۱۸)۔

اہلحدیث:

ہم بہت مشکور ہوں گے اگر ہمیں یہ قاعدہ علم نحو کی کسی کتاب سے دکھایا جائے ورنہ اعتراف کرنا چاہیے کہ ہم نے سنے سنائے ایسا لکھ دیا ہے، ایسا ہی یہ بھی ایک بے تکی بات ہانک دی ہے کہ اللہ تعالیٰ درود شریف کا وظیفہ چوبیس گھنٹے کرتا ہے،اے جناب ہم سے تو ہر ایک بات کا ثبوت قرآن سے مانگا جائے اور آپ خود ہم کو عوام الناس کے خیالات کا پابند کریں۔آپ خود ہی بتائیں کہ یہ انصاف ہے یا ظلم؟ ہم ایک قاعدہ بتاتے ہیں،غور سے سنئے!

علم اصول کا مسئلہ ہے کہ ایک فعل کے دو فاعل مختلف حیثیتوں کے ہوں تو وہاں عموم مجاز مراد لیا جاتا ہے،اسی لیے علم اصول کی کتاب (تلویح)[1] میں آیہ کریمہ:{إِنَّ اللّٰهَ وَمَلائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ}کے معنی کئے يَعْتَنُونَ بِشَأْنِهِ علیه السلامُ یعنی آپ کی شان کا احترام کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنی حیثیت کے مطابق اور فرشتے اپنی حیثیت کے مطابق۔

اسی طرح آیت:﴿هُوَ ٱلَّذِي يُصَلِّي عَلَيۡكُمۡ﴾[الاحزاب:۴۳] کے معنی بھی يَعْتَنُونَ بِشَأْنِكُم ہی ہیں،یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق تمہارا احترام کرتے ہیں، چنانچہ اسی احترام کے اظہار کرنے کو دوسری جگہ فرمایا ہے:

﴿وَلِلَّهِ ٱلۡعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِۦ وَلِلۡمُؤۡمِنِينَ﴾[المنافقون:۸] یعنی عزت اللہ، اس کے رسول اور مومنوں کے لیے ہے۔

---

① ص:۵۔

تعجب:

مسلم اہل قرآن کی جرأت یا خوف ملاحظہ ہو کہ آپ نے آیت: ﴿هُوَ ٱلَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ﴾ [الاحزاب:۴۳] کئی دفعہ پیش کی ہے مگر اس کا ترجمہ نہیں کیا جس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ آپ کے مزعومہ قاعدہ کے مطابق (جسے آپ نے نحویوں کے سر تھوپا ہے) آیت کا ترجمہ کیا ہے، بہر حال اس خاموشی کی بھی کوئی وجہ ہے۔ سچ ہے ؎

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

''ساتویں یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ اس مروجہ درود شریف کا ورد نہیں کرتا بلکہ کچھ اور عبارت پڑھتا رہتا ہے تو کتب روایات میں تلاش کر کے اللہ تعالیٰ کی خود استعمال شدہ درود شریف بتلائی جائے تا کہ اس درود کو یاد کر کے مسلمان بھی نجات حاصل کر سکیں'' (ص:۱۸)۔

اہلحدیث:

ہم تو اوپر اپنا جواب دے آئے ہیں جہاں باب تفعیل کا خاصہ بتایا ہے اب آپ کا فرض باقی ہے کہ آپ اس آیت کا ترجمہ اور تشریح کریں کہ خدا تعالیٰ کون سا درود پڑھتا ہے۔

یا درکھو شکاری بھی کبھی شکار ہو جایا کرتے ہیں۔

''آٹھویں یہ کہ جب اللہ تعالیٰ چوبیس گھنٹہ دن رات رسول کریم پر درود شریف بھیجتا رہتا ہے تو اور کام کس وقت کرتا ہے خصوصا مومنین کے درود بھیجنا ہوتا ہے جیسا کہ آیت: ﴿هُوَ ٱلَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ﴾ سے ثابت ہے تعجب ہے کہ درود بھیجنے کا اقرار مومنین اور رسول کریم دونوں کے لیے یکساں ہے پھر رسول کریم پر دن رات درود بھیجنے پر مومنین کے لیے دو گھنٹے بھی درود نہیں بھیجی جاتی'' (ص:۱۸)۔

اہلحدیث:

یہ نمبر اس قابل نہ تھا کہ ہم اس کو نقل کرتے کیوں کہ اس کا جواب پہلے نمبروں میں

آ چکا ہے مگر ان حضرت کی جرأت اور مخالفت کا اظہار کرنے کے لیے ہم نے یہ نمبر نقل کیا ہے تاکہ ناظرین کے لیے اچھا خاصہ تفریح کا سامان ہو جائے۔

اہل قرآن کے ممبرو!

کیا تم لوگ ان بوسیدہ ہتھیاروں سے حدیثی قلعہ کو فتح کر لو گے، سچ ہے ؎

نہ عارض نہ زلف نہ دتہ دیکھتے ہیں

خدا جانے ہم ان میں کیا دیکھتے ہیں

''نویں یہ کہ آیت زیر بحث میں صلاۃ بمعنی نماز اس لیے نہیں ہو سکتے کہ نبی کریم کے لیے کوئی نماز نہیں پڑھی جاتی بلکہ ساری نمازیں اللہ تعالیٰ کے واسطے ہیں اور صلاۃ یعنی بمعنی رحمت اس لیے نہیں ہو سکتے کہ یہ فعل سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا اور صلاۃ دعا اس لیے نہیں ہو سکتے کہ اللہ تعالیٰ محتاج الی الغیر ہے [1]، وہ کسی سے دعا نہیں کرتا صلاۃ کے ایسے معنی ہو سکتے ہیں جو اللہ، ملائکہ، مومنین تینوں کا فعل ہو سکے جیسا کہ نحو کی رو سے واضح ہے، اب علماء بتائیں کہ درود ہے کیا چیز جسے نہ وہ خود بھیجتے ہیں اور نہ اللہ تعالیٰ اور ملائکہ بھیجتے ہیں، ہر طرف سے یہی ٹال مٹول جاری ہے کہ وہ کہتے ہیں تو درود بھیج اور وہ کہتا ہے تم درود بھیجو اور مطابق روایات کے ساڑھے تیرہ سو برس سے یہی کشمکش جاری ہے اور کسی کو درود کے معنی سمجھنے اور بھیجنے کا بھی خیال پیدا نہیں ہوتا'' (ص:۱۹)۔

اہلحدیث:

یہ نمبر پہلے نمبروں سے بھی مضحکہ خیز ہے باوجود اس اقرار کے کہ صلاۃ کے معنی یہ بھی نہیں ہو سکتے آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آخر ہو کیا سکتے ہیں، بھلے آدمی کتب نحو کا غلط حوالہ

---

[1] یہ عبارت تصرف قدرت کا ثبوت ہے کہ مصنف چوں کہ غلط چال چل رہا تھا اس لئے خدائی قانون قدرت ﴿نُوَلِّهِۦ مَا تَوَلَّىٰ﴾ نے اس پر اپنا اثر ڈالا، چنانچہ اس نے محتاج الی الغیر نہیں ہے کی بجائے **''محتاج الی الغیر''** لکھ دیا۔ (مؤلف)۔

دے کر آگے چل دینا کارخردمنداں نیست، آپ خود ہی بتائیے کہ آخر درود والی آیت کے معنی کیا ہیں؟ ہم تو اپنا فرض ادا کر چکے ہیں، ملاحظہ ہو: چھٹے نمبر کا جواب۔

''دسویں یہ کہ تمام مسلمان جانتے ہیں کہ نبی کریم مومنین سے اس قدر محبت رکھتے تھے کہ جان تک دینے کو ہر وقت تیار رہتے تھے اور اسی طرح مومنین نبی کریم کے لیے آنکھیں بچھاتے تھے پھر نماز میں نبی کریم کا یہ کہنا کہ اے اللہ تو درود بھیج اوپر محمد کے اور آل محمد کے، کہاں تک صحیح اور درست ہے، درود کے لیے آل محمد ہی کیوں مخصوص کئے گئے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم کو یہ حکم دے دیا تھا: ﴿وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ صَلَوٰتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ﴾ [التوبۃ:۱۰۳] ترجمہ (اے نبی درود بھیج اوپر ان کے (مومنین کے) تحقیق درود تیری تسکین ہے واسطے ان کے)'' (ص:۱۹)۔

اہلحدیث:

اس کا جواب پانچویں نمبر میں آچکا ہے کہ آل محمد سے مراد آپ کے اتباع ہیں، جو شخص یہ معنی نہیں مانتا اس سے جا کر پوچھو ہم اس کے ذمہ دار نہیں، مگر یہ تو بتاؤ کہ بار بار وہی بات رٹتے جانا اور اس طرح نمبروں کی تعداد بڑھاتے جانا سوائے اظہار لیاقت کے اس سے فائدہ کیا ہے۔

''گیارہویں یہ کہ درود مروجہ سے ثابت ہے کہ حضرت ابراہیم سلام علیہ اور ان کی اولاد حضرت محمد سلام علیہ سے کہیں بڑھ کر تھے، کیوں کہ ابراہیم سلام علیہ اور ان کی اولاد پر ان کی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے درود بھیج دی اور حضرت محمد سلام علیہ پر اب تک باوجود کروڑہا یاددہانیاں کرنے کے درود نہیں بھیجی، لیکن مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت محمد سلام علیہ سید المرسلین ہیں۔ پس یہ درود شریف مسلمانوں کے سچے رسول محمد سلام علیہ کی توہین ہے اور بس'' (ص:۲۱)۔

اہلحدیث:

معلوم نہیں معترض صاحب کہاں بیٹھے ہوئے یہ کتاب لکھ رہے ہیں اگر آپ برا نہ

مانیں تو ہم یہ کہنے سے نہیں رک سکتے کہ آپ ایسی جگہ بیٹھے ہیں جس کے ارد گرد ایسے پیڑ ہیں جن کی ہوا انسان کے دماغ کو مضر ہوتی ہے ورنہ یہ کیا اعتراض ہے محض بچوں کا کھیل ہے۔

اللّٰھمَّ صلِّ ایک دعا ہے جو ابتدائے امت سے آج تک سب کرتے آئے ہیں اور سب کی قبول ہوتی آئی ہے کس نے آپ کو کہا کہ باجود کروڑھا یا دہانیوں کے اللہ تعالیٰ نے اب تک نبی علیہ السلام پر درود نہیں بھیجا۔ غور سے سنیے ہم قرآن سے ان کی نظیر بتاتے ہیں۔

خدا آپ کو قرآن کا فہم عطا کرے۔

قرآنی دعا جو ہم کو سکھائی گئی ہے جسے مسلمان عموماً نماز کے اندر اور باہر پڑھتے ہیں، جس کے الفاظ یہ ہیں:

﴿رَبَّنَا ٱغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَٰنِنَا ٱلَّذِينَ سَبَقُونَا بِٱلْإِيمَٰنِ﴾ [الحشر:۱۰] اے خدا ہمیں بخش دے اور ہم سے پہلے ایمان داروں کو بھی بخش دے۔

کیا کروڑھا یا دہانیوں اور عدم قبولیت کا الزام آپ اس دعا پر بھی لگائیں گے، خدا سے ڈرو اور محمد سے استہزاء نہ کرو۔

''بارہویں یہ کہ آیت مذکورالصدر میں صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجنے کا حکم تھا، لیکن درود شریف میں آل محمد کا اور اضافہ کر دیا ہے لہذا علماء وہ آیت پیش کریں جس میں آل محمد پر درود بھیجنے کا مخصوص حکم ہو'' (ص:۲۰)۔

اہلحدیث:

اس کا جواب تو خود اسی آیت میں ہے جسے آپ بار بار پیش کرتے ہیں یعنی ﴿هُوَ ٱلَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ﴾ غور کیجیے ''علیکم'' کی مخاطب تمام امت مسلمہ ہے اور

''صلوا علیہ'' کا خطاب بھی سارے مسلمانوں کی طرف ہے، پہلی آیت: ﴿هُوَ ٱلَّذِي﴾ میں درود کا محل افراد امت مسلمہ ہیں اور دوسری آیت: ﴿إِنَّ ٱللَّهَ وَمَلَٰٓئِكَتَهُۥ﴾ [الاحزاب:٥٦] میں خود پیغمبر اسلام علیہ السلام درود کے محل و مورد ہیں، اس لیے ان دونوں آیتوں کو ملا کر اگر ہم نے تعلیم رسالت کے ماتحت یوں کہا کہ ''اللّٰھمَّ صلِّ علی محمَّدٍ وعلی آلِ محمَّدٍ'' تو انصاف سے بتاؤ ہم نے کیا برا کام کیا؟

''تیرہویں یہ کہ آل محمد و آل ابراہیم میں منافق کافر، فاسق، فاجر، مشرک سب ہی بھرے پڑے ہیں، پس اللہ اور ملائکہ اور مسلمانوں کا درود مروجہ کا وظیفہ کر کے ان کو کچھ فائدہ پہنچانا عقل، اسلام سب کے خلاف ہے، ظاہر ہے کہ اللہ اور ملائکہ ایسی خلاف اسلام درود کا وظیفہ ہرگز نہیں کر سکتے، لہٰذا یہ درود ہی غلط ہے'' (ص:٢٠)۔

اہلحدیث:

ہم اس کا جواب پانچویں نمبر میں دے چکے ہیں، تیرہ اعتراض کر کے اہل قرآن نے اپنے دردوں کا اظہار جن لفظوں میں کیا وہ بھی قابل دید و شنید ہے، آپ فرماتے ہیں:

''ناظرین!

یہ تیرہ دلائل ہم نے درود مروجہ کی تنقید پر پیش کئے ہیں، جن سے صاف روشن ہے کہ درود مروجہ کی عبارت واقعی قرآن اور قواعد عربیہ اور مسلمانوں کے عقیدہ کے سراسر خلاف ہے، لیکن افسوس ہے مسلمانوں پر کہ وہ ہماری بات کو سنیں گے بھی نہیں، حالاں کہ ہمارے دل میں ان کا درد ہے، ہم نے یہ کتاب ان کی بھلائی اور خیر خواہی کے واسطے تحریر کی ہے، ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے مسلمان بھائیوں کو لاکھوں راویوں اور ملاؤں کی تابعداری

سے نکال کر صرف اپنے قرآن کی پیروی کرنے کی توفیق عطا کر، ہم چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے علماء اور پڑھے لکھے اشخاص ہماری اس کتاب کو بغور ملاحظہ فرماویں اور اگر ہمارے دلائل پر لبیک نہ کہیں تو کم ازکم ہم دردی ہی ظاہر کریں، حق وباطل، ظلم وانصاف، راہ راست اور گمراہی کا امتیاز کریں، اگر یہ بھی نہ کریں تو ہمارے دلائل کا معقول جواب ہی دیں ورنہ یہ واضح رہے کہ ان کو اپنے مولی رب کریم کے حضور میں ضرور ہی ایک ایک بات کا حساب دینا ہوگا یہ نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالی انہیں یوں ہی بلا حساب کئے ہوئے چھوڑ دے۔ ﴿فَٱعْتَبِرُوا۟ يَـٰٓأُو۟لِى ٱلْأَبْصَـٰرِ﴾ [الحشر:۲] (رسالہ صلاۃ المرسلین، ص:۲۱-۲۰)۔

اہلحدیث:

آپ نے جس دل سوزی کا اظہار مندرجہ بالا الفاظ میں کیا ہے آریوں کے گرو سوامی دیانند نے بقول آریہ قرآن مجید پر ۱۵۹ اعتراض کرکے اس سے زیادہ دل سوزی اور مسلمانوں سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا جس کے جواب میں فارسی کا یہ ایک شعر کافی ہے ؎

بر تملق دشمن خود تکیہ کردن ابلہی است
پائے بوس سیل از پا افگند دیوار را

قسط:۴

صلاۃ سید المؤمنین بجواب رسالہ صلاۃ المرسلین

(۶ ربیع الثانی ۱۳۵۸ھ = ۲۶ مئی ۱۹۳۹ء)

اس سلسلہ کے تین نمبر گذر چکے ہیں، آج چوتھا نمبر درج ہے جس میں ذکر ہے کہ مصنف نے نماز میں بالعموم قرآن خوانی کی اجازت نہیں دی، بلکہ اس مطلب کے لیے چند آیات کو مستثنیٰ قرار دیا ہے، آپ کے الفاظ یہ ہیں:

''اب لیجیے عام قرآن کی تلاوت کو جو مروجہ نماز کے قیام میں الحمد شریف کے بعد فرض سمجھی جاتی ہے، مسلمان کہتے ہیں کہ عام قرآن نماز میں پڑھے جانے کا حکم قرآن ہی میں موجود ہے اس لیے ہم عام قرآن نماز میں پڑھتے ہیں لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ اگر عام قرآن نماز میں پڑھنا صحیح ہے تو ان کے پاس حسب ذیل اعتراضات کا کیا جواب ہے'' (صلاۃ المرسلین ص:۲۱)۔

ہاں صاحب ہم آپ کے اعتراضات سننے کے مشتاق ہیں اور جواب دینے کے لیے بے تاب، بہرحال آپ کا پہلا اعتراض یہ ہے:

''اول یہ کہ مسلمانوں کی ایک ایسی نماز باجماعت جس میں کم از کم چار ہزار آدمی شریک ہوں کس طرح واقعی نماز کہی جاسکتی ہے جب کہ نمازیوں میں نصف آدمی بھی امام کی آواز نہیں سن سکتے''۔

ظاہر ہے کہ ایسی بڑی جماعت کے وقت کل مسلمان شیعہ ہوں یا سنی، خارجی ہوں یا وہابی، چکڑالوی ہوں یا اہل حدیث اپنے اپنے عقیدے کے مطابق ہرگز نماز ادا نہیں کرسکیں گے سوائے اس کے کہ اتنے بڑے گروہ کی دس بیس جماعتیں بنا کر علیحدہ علیحدہ اماموں کی ماتحتی میں دے دی جائیں اور کوئی صورت ہی نہیں جس سے کل مسلمانوں تک تلاوت قرآن کی آواز پہنچائی جاسکے، لیکن

قرآن میں ایسی جماعتیں قائم کرنے کا اور اس طرح علیحدہ اماموں کی ماتحتی میں صلاۃ ادا کرنے کا کوئی حکم نہیں دیا گیا نیز ایسی جماعتیں قائم کرکے علیحدہ علیحدہ نماز ادا کرنا بھی باعث طوالت اور زیادہ وقت صرف ہونے کا موجب ہوگا ، اور وحدت اور اتحاد کا مقصد بھی فنا ہوجائے گا ، اب اگر کوئی صاحب یہ کہیں کہ زمانہ حال میں ریڈیو کے ذریعہ امام کی آواز ہر نمازی سن سکتا ہے تو ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن اور مذہب اسلام کا ہر مسئلہ کسی خاص وقت یا ملک کے لیے مخصوص نہیں ہے اور ریڈیو کی ایجاد زمانہ حال سے تعلق رکھتی ہے ، پس ریڈیو اس مصیبت کا دائمی حل نہیں ہوسکتا اس کا حل تو صرف یہی ہوسکتا ہے کہ قرآن کی مقرر شدہ آیات جن میں حمد، دعا، اور تسبیح ہو صلاۃ میں پڑھی جائیں جن کو ہر مصلی امام کے ساتھ ساتھ امام کے پہنچنے نہ پہنچنے ہر صورت میں پڑھ سکے گا، پھر نہ کسی جماعت کے ٹکڑے کرنے کی ضرورت ہوگی نہ کسی علیحدہ امام کی'' (رسالہ مذکورہ، ص: ۲۲)۔

اہلحدیث:

معلوم نہیں کہ معترض کے دل میں کیا مضمون ہے جو ان کے الفاظ میں ادا نہیں ہوسکا کوئی پوچھے کہ جو کچھ آپ نے کہا ہے اس پر نہ ہمارا عمل ہے، نہ آپ کا، نہ یہ قرآن کا حکم ہے، پھر اعتراض کیا؟ ہاں آپ نے یہ کمال کیا کہ اشکال بھی خود ہی پیدا کیا اور اس کا حل خود ہی تجویز کیا جو قابل مضحکہ ہے۔

سب اعتراضوں کا جواب یہ ہے کہ ہم نماز میں بحالت قیام قرآن مجید پڑھتے ہیں ہمارا امام بھی پڑھتا ہے مگر اس پڑھنے سے کسی کو سنانا اصل مقصود نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ سری نمازوں میں نہ مقتدی لوگ بلند آواز سے پڑھتے ہیں، نہ ان کے امام پھر اعتراض کیا ہوا؟۔

آپ نے حل میں یہ بتایا ہے کہ ہر نمازی حمد و دعا کی آیات امام کے ساتھ ساتھ پڑھتا جائے یہی ہمارا مذہب ہے، بس آپ کا سارا تار پود بکھر گیا آئندہ سوچ سمجھ کر

اعتراض کیا کریں۔آپ کا دوسرا اعتراض یہ ہے:

''دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

(الف) ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَقۡرَبُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَأَنتُمۡ سُكَٰرَىٰ حَتَّىٰ تَعۡلَمُواْ مَا تَقُولُونَ﴾ [النساء:۴۳]

ترجمہ: اے ایمان والو! مت نزدیک جاؤ صلاۃ (نماز) کے جب کہ تم بے ہوشی یا جہالت میں ہو یہاں تک کہ سمجھو جو کچھ تم کہو۔

(ب) ﴿فَوَيۡلٞ لِّلۡمُصَلِّينَ ۝٤ ٱلَّذِينَ هُمۡ عَن صَلَاتِهِمۡ سَاهُونَ ۝٥ ٱلَّذِينَ هُمۡ يُرَآءُونَ﴾ [الماعون:۴-۶]۔

ترجمہ: پس خرابی ہے واسطے ان صلاۃ (نماز) ادا کرنے والوں کے جو اپنی صلاۃ (نماز) سے بے خبر ہیں وہ جو دکھلاوا کرتے ہیں۔

گویا اللہ تعالیٰ کا یہ منشا ہے کہ ہر نمازی اپنی نماز میں کچھ زبان سے بھی کہے اور اس کو سمجھتا بھی جائے ایسا نہ کرے کہ دکھاوے کے طور پر پڑھ لے اور اپنی زبان سے کہے کہ کچھ خبر نہ ہو (رسالہ مذکور: ص ۲۲، ۲۳)۔

اہلحدیث:

ناظرین آپ ہی بتائیے کہ یہ کیا سوال ہے ہم کب کہتے ہیں کہ کوئی نمازی گونگا بہرا ہو کر نماز پڑھے البتہ یہ کہتے ہیں کہ آپ نے آیت مرقومہ ''حتی تعلموا ما تقولون'' الآیہ کا مطلب نہیں سمجھا کیوں کہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ بحالت نشہ نماز پڑھنے کا ارادہ نہ کرو جب تک کہ تم اپنی کہی ہوئی بات کو جان نہ لو کہ کیا کہا ہے، یہ معنی نہیں کہ نماز کے اندر جو الفاظ پڑھتے ہو جب تک ان کا مطلب سمجھ میں نہ آئے نماز نہ پڑھو، أنی هذا من ذاک۔

نوٹ:

ہم تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ سورہ فاتحہ کے علاوہ قرآن مجید ہر جگہ سے نماز میں پڑھ سکتے ہیں کیوں کہ ارشاد خداوندی ہے: ﴿ٱتۡلُ مَآ أُوحِيَ إِلَيۡكَ مِنَ ٱلۡكِتَٰبِ﴾ [العنکبوت:۴۵]، یعنی جو وحی بصورت کتاب (قرآن) تم پر نازل ہوئی ہے اس کو پڑھا کرو، یہ آیت بعمومہا ہدایت کرتی ہے کہ نماز میں تلاوت قرآن ہر جگہ سے کر سکتے ہو یہاں تک کہ دوزخیوں کا باہمہ کلام بھی بحیثیت وحی قرآن پڑھ لیں تو بھی نماز جائز ہے اسی لیے اس آیت کے ساتھ ارشاد ہے: {واقم الصلاۃ} بھی ملحق ہے، ہمارے دعویٰ کی دلیل تو یہ قرآنی آیت موجود ہے، اب معترض صاحب کی سنئے آپ لکھتے ہیں کہ:

''اگر عام قرآن پڑھنا صحیح بھی مان لیا جائے تو حسب ذیل مشکلات کا سامنا ضرور کرنا پڑے گا:

(الف) امام حافظ اور عالم ہوتا کہ جہاں سے جی چاہے قرآن پڑھے اور سمجھے بھی ضرور۔

(ب) نمازی سب عالم ہوں تا کہ قرآن کی عربی زبان سمجھتے جائیں لیکن یہ بات ناممکن ہے کہ دنیا کے چوالیس کروڑ مسلمان عربی داں بن جائیں یہاں تو امام بھی عربی داں نہیں ملتے چہ جائیکہ کل مسلمان عربی کے عالم بن جائیں اب صرف ایک طریقہ رہ جاتا ہے وہ یہ کہ امام صاحب قرآن شریف ہاتھ میں لے کر مع ترجمہ کے سناتے جائیں اور اگر نمازیوں کو کوئی اعتراض یا شک رفع کرنا ہو تو وہ بھی اسی حالت میں رفع کرتے جائیں گویا یہ مسجد نہیں مدرسہ ہے سو اللہ تعالیٰ نے ایسا طریقہ نماز کا نہیں بتلایا'' (رسالہ مذکور،ص: ۲۳، ۲۴)۔

اہلحدیث:

معلوم نہیں کہ ضمن الف میں آپ نے کیا سوال کیا ہے، حافظ ہو یا غیر حافظ، عالم ہو یا جاہل قرآن مجید کہیں سے پڑھ لے بہر حال نماز جائز ہے، باقی ضمن ب میں جو کچھ

آپ نے لکھا ہے یہ سب آپ کی ایجادات ہیں خدا جانے یہ آپ کو کہاں تک پہنچائیں گی، نہ ان کو قرآن کی کسی آیت سے تعلق ہے، نہ ہمارے عمل سے، بلکہ یہ آپ کا ایک ذہنی تصور ہے جو بار بار مختلف صورتوں میں ظہور کر رہا ہے، لطف یہ ہے کہ ایک طرف مصنف رسالہ یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ امام قرآن ہاتھ میں لے کر پڑھتا جائے جو ہمارا عمل نہیں ہے پھر خود ہی اس کو رد بھی کرتے ہیں (بہت اچھا) لیکن خدارا کوئی ہمیں بتائے کہ ہمارے عمل پر اعتراض کیا ہے؟

اس کے آگے تیسرا اعتراض آپ نے آیت: ﴿فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ﴾ [المزمل:۲۰] پر کیا ہے، جس سے ہم نے استدلال نہیں کیا، اس لیے ہم اس کے جواب دہ نہیں ہیں۔

''چوتھے یہ کہ جب عام قرآن پڑھنے ہی کی اجازت ہے تو پھر کوئی مخصوص عبارت مثلاً الحمد شریف سبحان الخ درود وغیرہ نہیں پڑھنا چاہیے، قیام، رکوع سجود، قومہ، جلسہ، سب میں عام قرآن ہی پڑھنا چاہیے'' (صفحہ ۲۵)۔

اہلحدیث:

سورہ الحمد کا تعین خود قرآن سے ثابت ہے چنانچہ ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ ءَاتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْءَانَ الْعَظِيمَ﴾ [الحجر:۸۷] یہ سات آیتیں الحمد شریف کی ہیں جن کو ہم بحکم رسالت نماز میں پڑھتے ہیں اور سُبْحَانَ پڑھنا بھی قرآن سے ثابت ہے کیوں کہ امر کا صیغہ سَبِّحْ قرآن میں آیا ہے اور لغت کی مشہور کتاب (قاموس)[1] میں لکھا ہے کہ ''سَبَّحَ تَسْبِيْحاً، قَالَ: سُبْحَانَ اللهِ''، سبح ماضی کا ترجمہ قال ماضی سے کیا گیا ہے، سَبِّحْ امر کا صیغہ ہے اس کی تعبیر قُلْ سُبْحَانَ اللهِ سے ہوگی جسے ماننے کے لیے ہم مامور ہیں۔

---

① ص: ۲۲۳۔

آگے پانچواں نمبر بہت مزیدار ہے ناظرین اسے پڑھیں اور اہل قرآن کی بے بسی کا اندازہ کریں۔

''پانچویں یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ﴿وَأَنَّ ٱلْمَسَـٰجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا۟ مَعَ ٱللَّهِ أَحَدًا ۝١٨ وَأَنَّهُۥ لَمَّا قَامَ عَبْدُ ٱللَّهِ يَدْعُوهُ﴾ [الجن:۱۸-۱۹] ترجمہ: اور بے شک مسجدیں (یا نمازیں) واسطے اللہ کے ہیں، پس مت پکارو یا دعا کرو سوائے اللہ کے کسی ایک کو (بیچ ان مسجدوں یا نمازوں کے) اور یہ کہ جس وقت قیام کرتا ہے بندہ اللہ کا یعنی محمد تو پکارتا یا دعا کرتا ہے اللہ سے۔

فرمان مندرجہ بالا میں یہ بات قطعی ثابت ہے کہ مسجدوں یا نمازوں میں اللہ کے ساتھ کسی کو بھی نہیں پکارنا چاہیے اور جب رسول کریم ﷺ صلاۃ میں قیام کرتے تھے تو صرف محض اللہ ہی کو پکارتے یا دعا کرتے تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نماز میں عام قرآن پڑھنے والے حضرات جب یہ تلاوت فرماتے ہیں کہ: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلْمُزَّمِّلُ﴾ [المزمل:۱] ترجمہ اے کپڑا اوڑھنے والے یا ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟﴾ ''اے ایمان والو!'' ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلْكَـٰفِرُونَ﴾ [الکافرون:۱] ترجمہ: اے کافرو، يَا إِبْلِيْسُ! ترجمہ: اے شیطان، ''يا أيها المنافقون'' اے منافقو!، تو یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر کو پکارنا ہوا یا نہیں۔ نیز یہ کہ جب قرآن کریم سے یہ بات ثابت ہے کہ رسول پاک جب کبھی قیام میں کھڑے ہوتے تھے تو اللہ سے دعائیں کرتے تھے تو یہ قیام میں عام قرآن پڑھنا کس کی سنت ہے'' (رسالہ مذکور، ص:۲۶)۔

نقض اجمالی:

ناظرین کرام ذرہ غور فرمائیں کہ غیر خدا کو پکارنا جیسا نماز میں ممنوع ہے ایسا ہی نماز سے باہر بھی ممنوع ہے، ملاحظہ ہو آیۃ کریمہ: ﴿وَلَا تَدْعُ مِن دُونِ ٱللَّهِ مَا لَا يَنفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ﴾ [یونس:۱۰۶] اللہ کے سوا کسی کو نہ پکار جو تجھے نہ نفع دے سکے، نہ

نقصان پہنچا سکے۔

اس آیت کے علاوہ دوسری بیسیوں آیات میں خدا کے سوا کسی اور کو پکارنا ہر موقع پر منع کیا گیا ہے، بقول معترض صاحب ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلۡمُزَّمِّلُ﴾، ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلۡكَٰفِرُونَ﴾ وغیرہ آیات نماز میں پڑھنا اس لیے ممنوع ہیں کہ ان کے پڑھنے سے خدا کے سوا دوسروں کو پکارنا لازم آتا ہے، اگر یہی بات ہے تو بیرون نماز میں ان کا پڑھنا ممنوع ہونا چاہیے، کیوں کہ ان کے پڑھنے سے شرک لازم آئے گا، جو کسی جگہ بھی جائز نہیں ہے۔

کیا آپ (اہل قرآن) تلاوت کلام اللہ کرتے ہوئے اس قسم کی آیات کو چھوڑ جاتے ہیں، اگر چھوڑ جاتے ہیں تو یاد رکھئے خدا کی وعید: ﴿ٱلَّذِينَ جَعَلُواْ ٱلۡقُرۡءَانَ عِضِينَ﴾ [الحجر:۹۱] [1]۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی آیات کا پڑھنا آیت مانعہ: ﴿فَلَا تَدۡعُواْ مَعَ ٱللَّهِ أَحَدٗا﴾ کے تحت نہیں آتا کیوں کہ اس سے مراد ایسی دعا ہے جو خدا سے کی جاتی ہے آپ کی ممنوعہ آیات میں ایسا مفہوم نہیں ہے، یہ محض آپ کا تحکم ہے اور بے جا تعصب ہے جس سے آپ کا مافی الضمیر ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو سنت نبوی یا سیرت رسالت سے کہاں تک رنج یا بے تعلقی ہے۔

''چھٹے کہ یہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿قَدۡ أَفۡلَحَ ٱلۡمُؤۡمِنُونَ ۝١ ٱلَّذِينَ هُمۡ فِي صَلَاتِهِمۡ خَٰشِعُونَ﴾ [المومنون:۱-۲] (ترجمہ) نجات پا جائیں گے وہ مومن لوگ جو اپنی صلاۃ میں عاجزی کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ عاجزی بغیر کسی التجا کے پیدا نہیں ہو سکتی اور جس نماز میں التجا نہیں وہ نماز درست نہیں، پس نماز میں عام قرآن پڑھنے پڑھانے والے حضرات نجات کے مستحق نہیں ہو سکتے'' (ص:۲۶-۲۷)۔

[1] افسوس ہے ان لوگوں پر جنھوں نے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ آپ پر صادق آئے گی۔ (مؤلف)۔

اہلحدیث:

اس نمبر کا جواب بھی بجز افسوس کے ہم کیا دیں، ناظرین کرام! ہم علی وجہ البصیرت کہتے ہیں کہ آریہ مصنفوں کو قرآن مجید سے اتنی عداوت اور دشمنی نہیں ہے جتنی کہ ان لوگوں کو حدیث نبوی سے ہے۔

آریہ لوگ قرآن مجید کے معنی از خود گھڑتے ہیں اور پھر اس پر اعتراض جماتے ہیں، یعنی وہ بنائے فاسد علی الفاسد کے اصول پر عمل پیرا ہوتے ہیں، اسی طرح ان لوگوں کی عادت ہے، حدیث نبوی کی تردید کے واسطے گویا ادھار کھائے ہوئے ہیں، بھلا غور فرمایئے کہ {خاشعین} کے لفظ سے جو نتیجہ معترض نے نکالا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے، بحالیکہ {خاشعین} کی تفسیر خود قرآن مجید میں آچکی ہے، چنانچہ ارشاد ہے: ﴿إِلَّا عَلَى ٱلْخَٰشِعِينَ ﴿٤٥﴾ ٱلَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَٰقُوا۟ رَبِّهِمْ﴾ [البقرة:۴۵-۴۶] یعنی خاشعین وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کی ملاقات پر اعتقاد رکھتے ہیں۔

اس تعریف کے لحاظ سے ہر نمازی خاشع ہے چاہے وہ خدا سے التجا کرے یا اس کی تعریف کرے علاوہ اس کے ہماری نماز التجا سے خالی کہاں ہے؟ سورہ فاتحہ خود التجا ہے، التحیات بھی التجا ہے، درود بھی التجا ہے، اس کے بعد کی دعا بھی التجا ہے، بہر حال خاشعین کے معنی کچھ بھی ہوں ہمارے خلاف نہیں، ہاں صحیح معنی وہی ہیں جو خود قرآن مجید نے بتائے ہیں۔ آگے آپ فرماتے ہیں:۔

''ساتویں یہ کہ خداوند کریم احکم الحاکمین کے حضور میں دست بستہ کھڑے ہو کر اور الحمد شریف جیسے تعریف کرنے کے بعد یہ کہنا کہ: ﴿قُلْ هُوَ ٱللَّهُ أَحَدٌ﴾ [الاخلاص:۱] یعنی تو کہہ وہ اللہ ایک ہے، اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ نماز میں عام قرآن پڑھنے والے حضرات خدا کا بھی ایک خدا سمجھتے ہیں، اگر سمجھتے نہیں تو کہتے ضرور ہیں اور نہ سمجھنا تو خرابی لائے گا ہی، لیکن خدا کا خدا بتلانا یہ ڈبل

خرابی کا باعث ہے، نیز یہ کہنا کہ: ﴿إِنَّآ أَعۡطَيۡنَٰكَ ٱلۡكَوۡثَرَ﴾ [کوثر:۱] تحقیق ہم نے دی تجھ کو کوثر، خود بندہ خدا کا محتاج اس پر یہ گستاخی کہ ہم نے دی تجھ کو کوثر، یہ نماز کیوں کر مقبول ہوسکتی ہے، اور اگر کوئی نمازی خدا کے حضور میں یہاں سے قرآن پڑھنا شروع کر دے کہ تجھ کو حلال ہیں تیری بیویاں جن کی مہر تو دے چکا۔

تو یہ کیسا مضحکہ خیز واقعہ ہے کہ سمجھنے والے کو ذلت اور ندامت سے ڈوب مرنا چاہیے، اور نہ سمجھنے والا تو نماز کے پاس ہی نہ جائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہم پیشتر تحریر کر چکے ہیں'' (ص:۲۷)۔

اہلحدیث:

اس کا جواب ہم دے چکے ہیں کہ نماز میں قرآن پڑھنا بطور تلاوت کے ہے، جو ارشاد خدا وندی: ﴿وَٱتۡلُ مَآ أُوحِيَ إِلَيۡكَ مِن كِتَابِ﴾ [الکھف:۲۷] کے ماتحت واجب ہے، قرآنی ارشاد کے مقابلے میں کسی بندے کی ایچا پیچی ہم نہیں سن سکتے ہیں۔

﴿إِنَّآ أَعۡطَيۡنَٰكَ ٱلۡكَوۡثَرَ﴾، ﴿قُلۡ هُوَ ٱللَّهُ أَحَدٌ﴾، ﴿قُلۡ يَٰٓأَيُّهَا ٱلۡكَٰفِرُونَ﴾ جیسی آیات سب ﴿مَآ أُوحِيَ إِلَيۡكَ مِن كِتَابِ﴾ میں داخل ہیں اس لیے ہم ان کی تلاوت کرنے کے لیے مامور ہیں کسی کو مجال نہیں کہ ہم کو روک سکے، غضب ہے کہ ہم اپنے عمل کی تائید میں قرآنی آیات پیش کرتے ہیں اس کے مقابلہ میں ہمیں زبانی جمع خرچ سنایا جاتا ہے۔

ناظرین کرام:

مندرجہ ذیل عبارت میں مصنف اہل قرآن نے شیعوں کی تبرہ بازی کی پوری نقل اتاری ہے، ہمارے قول کی تصدیق اس کی اپنی عبارت میں مل سکتی ہے۔ جو یہ ہے:

''اللہ، اللہ صلاۃ کی کیا درگت بنی ہے، الامان، الحفیظ، یہ خدا کی بتائی ہوئی رسول پاک کی

استعمال کی ہوئی صلاۃ کیسے ہوسکتی ہے کہ اس پر کئے ہوئے اعتراضات کا کوئی جواب ہی بن نہیں پڑتا، نہ معلوم ہمارے مسلمان بھائی کب تک نماز کے بہانے اللہ تعالیٰ کے حضور میں مذاق کرتے رہیں گے، خدا جلد ہدایت دے'' (رسالہ مذکور، ص: ۲۷)۔

اہلحدیث:

اس سے اگلی عبارت بہت دل آزار ہے اس لیے ہم اس کو بادل نخواستہ بھی نقل نہیں کر سکتے، نمونہ کے طور پر منقولہ بالا اقتباس ہی کافی ہے جو ان کے اخلاق وعادات کا آئینہ دار ہے۔ مصنف نے اپنے زعم میں جن اعتراضات کو لاجواب کہا ہے ان کے جواب سے ہم بحولہ وقوتہ فارغ ہو چکے ہیں، اس رسالہ کا پہلا حصہ تو ہماری نماز کے متعلق اعتراضات پر حاوی ہے۔ دوسرے حصے میں مصنف نے اپنی مزعومہ نماز کا اثبات کیا ہے، آئندہ نمبر میں ناظرین اس کا جواب ملاحظہ فرمائیں۔

قسط:۵

صلاۃ سید المؤمنین بجواب رسالہ صلاۃ المرسلین

(۱۳/ربیع الثانی ۱۳۵۸ھ = ۲/جون ۱۹۳۸ء)

اس سلسلہ مضمون کے چار نمبر درج ہو چکے ہیں، آج پانچواں درج کیا جاتا ہے، ہم نے اس رسالہ پر اس لیے توجہ کی ہے کہ جس طرح منکرین اسلام (عیسائی، آریہ وغیرہ) قرآن مجید کی تکذیب میں سرگرم ہیں، اسی طرح منکرین حدیث بھی حدیث شریف کی تردید میں کوشاں رہتے ہیں، جس طرح مسلم اہلحدیث ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم منکرین قرآن کو جواب دیں اسی طرح ہمارا فرض ہے کہ ہم منکرین حدیث کی بھی تسلی کریں۔ ''اخبار اہلحدیث'' اپنے نام کی حیثیت سے ان دونوں ذمہ داریوں کو بخوبی محسوس کرتا ہے اور خدا کے فضل سے ابتدا ہی سے نباہتا آیا ہے اور آئندہ بھی نباہتا رہے گا، ان شاء اللہ۔

رسالہ زیر جواب کے مصنف (منکر حدیث) نے خلاف قاعدہ علم مناظرہ اثبات دعویٰ پر جرح علی الخصم کو مقدم کر دیا ہے مگر وہ اس میں معذور ہے۔ کیوں کہ وہ ان علوم اور قواعد کی پابندی ضروری نہیں جانتے اور شاید جانتے بھی نہ ہوں۔ ورنہ حق یہ تھا کہ مصنف پہلے اپنا دعوی (ثبوت صلاۃ المرسلین) قرآن مجید کے کھلے الفاظ سے ثابت کرتا، پھر قائلین حدیث پر جس طرح چاہتا جرح کرتا، لیکن یہاں تو صورت حال ہی کچھ اور ہے جو اس شعر میں مذکور ہے ؎

بنے کیوں کر کہ ہے سب کار الٹا
ہم الٹے بات الٹی یار الٹا

مصنف کی جرح کے جواب سے ہم فارغ ہو چکے ہیں آج اس کے اثبات دعوی پر غور کرتے ہیں۔

نوٹ!

اگر اشاعت فنڈ میں گنجائش ہوئی تو یہ رسالہ اس فنڈ سے چھاپ کر مفت تقسیم کیا جائے گا، اصحاب کرم اشاعت فنڈ پر توجہ کریں تاکہ توحید وسنت کی اشاعت ہو سکے۔

مصنف مذکور نے اپنی نماز کے اثبات میں جتنی محنت کی ہے اتنی محنت مجنوں نے لیلی عامریہ کے وصال میں بھی نہ کی ہوگی، اس محنت اور تلاش میں مصنف اکیلے نہیں ہیں بلکہ اس سے پہلے مولوی عبداللہ چکڑالوی، مولوی حشمت علی مقیم دہلی، مولوی محمد رمضان ساکن گوجرانوالہ وغیرہ مدعیان کفایت قرآن عمر بھر اس دشت بیاباں میں سرگرداں رہے مگر لیلی عامریہ کو نہ مل سکے آخر کاران کو یہ شعر سننا پڑا ؎

وكُلٌّ يَدَّعي وِصالَ لَيْلى

ولَيْلى لا تُقِرُّ لَهُمْ بِذاكاَ①

حقیقت یہ ہے کہ یہ راستہ نہ صرف دشوار گذار ہے بلکہ خاردار بھی ہے۔ مصنف کتاب نے جو محنت کی ہے وہ قابل داد ہے مگر ان کی ناکامی پر افسوس ہے۔ ناظرین ان کا مضمون ان کے اصل الفاظ میں ملاحظہ فرماتے جائیں۔ لکھتے ہیں:

''صلاۃ قرآنی کے سمجھانے سے پہلے ہمیں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین اسلام صرف حضرت محمد رسول اللہ سلام علیہ سے ہی شروع نہیں ہوا بلکہ اسلام یعنی خدا کی فرمانبرداری کا دین تمام انبیاء سلام علیہ کا دین تھا جو کہ ابتداء سے چلا آتا ہے۔ جملہ نبیوں کا ایک ہی دین اسلام تھا جو بذریعہ وحی ان کو مرحمت فرمایا گیا اور یہ کہ وحی جو کل نبیوں کو دی گی اس میں کسی قسم کا دینی فرق

① ترجمہ: ہر ایک وصل لیلی کا دعوی کرتا ہے اور لیلی کا وصل کسی سے نہیں ہے۔ (مؤلف)۔

نہ تھا، یہ بالکل صحیح ہے کہ صلاۃ بھی سب کی ایک تھی پس اگر ہم قرآن مجید کے اندر سے کسی ایک نبی کا قول یا فعل یا حکم غلطی اور سہو سے پاک منشاء ایزدی کے مطابق پیش کریں تو وہی کل نبیوں کا دین یعنی اسلام ماننا پڑے گا اور اس کا انکار قرآن مجید کا انکار ہوگا'' (صلاۃ المرسلین،ص:۔۱۲۹۳)۔

ناظرین کرام!

یہ اقتباس ہمیں کسی طرح مضر نہیں بلکہ ہمارا بھی اس پر صاد ہے۔آگے چل کر آپ لکھتے ہیں:

''لغت کی کتاب (لسان العرب) میں صلاۃ کے معنی قیام، رکوع، سجود، دعا، تسبیح کا مجموعہ تحریر ہیں اور ایسی ہی صلاۃ قرآن حکیم سے بھی ظاہر ہوتے ہے'' (صلاۃ المرسلین،ص:۳۲)۔

اہلحدیث:

مصنف نے دعوی کیا ہے کہ قرآن شریف میں انبیاء کی جو نمازیں مذکور ہیں وہی اسلامی نماز ہے، مگر ثبوت دیتے ہوئے (لسان العرب)[1] (کتاب لغت) کا حوالہ دیا ہے جس میں قیام، رکوع، سجود، اور تسبیح کے مجموعے کا نام صلاۃ لکھا ہے، مگر اس پر غور نہیں کیا کہ یہ اصطلاح جدید منقول شرعی ہے، حقیقت لغویہ نہیں ہے ورنہ مصنف صاحب مندرجہ ذیل آیات میں بتائیں کہ ان میں صلاۃ کے چار اجزاء (قیام، رکوع، سجود، اور قعدہ) پائے جاتے ہیں یا نہیں؟۔

۱- ﴿ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ ﴾ [النور:۴۱] ''ہر ایک جانوروں کو اپنی صلاۃ اور تسبیح معلوم ہے''۔

کیا ان جانوروں کی صلاۃ میں بھی قیام، رکوع، سجود، وغیرہ داخل ہیں، ذرہ انصاف سے جواب دینا۔

---

① ۱۴/ ۴۶۵۔

۲- ﴿وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِندَ ٱلْبَيْتِ إِلَّا مُكَآءً وَتَصْدِيَةً﴾ [الانفال:۳۵] ''مشرکوں کی صلاۃ بیت اللہ کے پاس سیٹیاں بجانا اور تالیاں مارنا ہے''۔

کیا یہ دو اجزاء بھی آپ کے نزدیک صلاۃ میں داخل ہیں؟

بایں ہمہ یہ اقتباس ہمیں مضر نہیں ہے۔

اس سے آگے چل کر سب سے پہلے آپ نے تعداد رکعات کا بیان کیا ہے یہ بھی قانون تصنیف کے خلاف ہے، سب سے پہلے تکبیر کا ذکر کرنا چاہیے تھا جس کو آپ نے مؤخر کر دیا ہے، تعداد رکعات کے عنوان کے ذیل میں آپ نے صلاۃ خوف کی آیات نقل کی ہیں جو پارہ ۵ رکوع ۱۱ میں مذکور ہیں جن میں یہ ذکر ہے کہ جب تم جنگ میں مصروف ہو تو نصف فوج نماز کے واسطے امام کے ساتھ کھڑی ہو اور دوسری نصف دشمن کے مقابل سینہ سپر رہے، جب پہلی جماعت سجدہ کر چکے تو وہ جنگ میں مشغول ہو جائے اور دوسری جماعت نماز کے لیے آجائے، ان آیات سے آپ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ:

''بحالت خوف حملہ دشمن غازی مومنین اپنی پوری صلاۃ میں سے ایک حصہ قصر یعنی کم کر سکتے ہیں، ... صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ قصر کی ہوئی صلاۃ ایک رکعت کے مقابل پوری صلاۃ دو رکعت بالکل صحیح ہے۔ اور یہ کہ ہر رکعت میں صرف ایک ہی سجدہ کرنا چاہیے کیوں کہ لفظ ﴿سَجَدُوا۟﴾ واحد ہے تثنیہ یا جمع نہیں ہے، نیز دو یا تین سجدوں کا حکم قرآن بھر میں نہیں دیا گیا'' (رسالہ مذکور، ص: ۳۴۔۳۸ ملخصا)۔

نقض اجمالی:

بحیثیت سائل ہمارا حق ہے کہ ہم آپ کی دلیل پر ہر قسم کا سوال کریں، پس سنئے!

صلاۃ خوف کے متعلق یہ بھی آیا ہے۔

﴿فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا﴾ [البقرۃ:۲۳۹] ''اگر تم کو خوف شدید

ہوتو پیادہ یا سوار نماز پڑھ لیا کرو"۔

بتایئے اس حالت میں قیام، رکوع اور سجود کیسے ہوگا؟ تو کیا اس پر قیاس کر کے حالت امن میں بھی ہم رکوع سجود کو حذف کر دیا کریں؟۔

سنیے!

ہمارے نزدیک نماز بلحاظ حالات مختلفہ چار قسم ہے۔۱۔نماز حضر۔۲۔نماز سفر، ۳۔ نماز خوف، ۴۔نماز مرض۔

قسم اول میں قصر کا کوئی بھی قائل نہیں، البتہ دوسری تیسری میں ہم قائل ہیں، مگر قصر کے معنی جو آپ نے کیئے ہیں ہم ان کو صحیح نہیں جانتے، نیز ہم صلاۃ سفر اور صلاۃ خوف کو دو نمازیں الگ الگ سمجھتے ہیں اور دونوں میں قصر جائز جانتے ہیں فرق اتنا ہے کہ نماز سفر میں چار کی جگہ دو رکعتیں ہیں اور نماز خوف میں ایک رکعت، مزید خوف میں جو ہو سکے قصر کا لفظ ان سب صورتوں کو شامل ہے کیوں کہ اس کا معنی کسی خاص حد تک محدود نہیں ہے، قصیدہ بانت سعاد کا شاعر اپنی محبوبہ کے حق میں کہتا ہے۔ ع

لا يشتكي قِصَرٌ مِنها، ولاَ طُولُ

(نہ اس کے قصر قد کی شکایت ہے نہ طول کی)

چار میں سے ایک رکعت ہو یہ بھی قصر ہے، دو کم ہوں یہ بھی قصر ہے، لفظ قصر سب کو شامل ہے، جیسے سو روپئے کی قصر یا تخفیف کئی طرح ہو سکتی ہے آٹھ آنے فی روپیہ دے کر صلح ہو جائے یا چار آنے فی روپیہ ادا کر کے، ہر دو صورتوں میں قصر متحقق ہو سکتا ہے، آپ نے جو صورت قصر کی پیش کی ہے یہ ہمیں بھی مسلم ہے مگر یہ بوقت خوف دشمن ادنی درجے کا قصر ہے، انتہائی خوف میں قیام، رکوع، اور سجود بھی ساقط ہو جاتے ہیں جس کا ثبوت ہم دے چکے ہیں۔

نماز کی چوتھی قسم صلاۃ المریض ہے اس میں بھی ایک لحاظ سے قصر ہے یعنی اس میں تخفیف اجزا ہے مثلاً قیام کی طاقت نہیں رکھتا تو بیٹھ کر پڑھ لے رکوع، سجود پر بھی قدرت نہیں تو صرف اشارہ سے پڑھ سکتا ہے اس کا ثبوت بھی قرآن مجید ہی سے سنیے! ارشاد ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ ٱللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرۃ:۲۸۶] ''خدا کسی انسان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا''۔

ہم نے قصر نماز کی جو صورتیں پیش کی ہیں یہ نماز کی مختلف اصناف کی ہیں جو آپ کی پیش کردہ صورت قصر سے بالکل مختلف ہیں، ان سب کا ذکر نص قرآنی میں نہیں ہے۔

اب ہمارے ذمے یہ بتانا رہ گیا کہ مختلف اوقات میں چار تین اور دو رکعتیں ہم کیوں پڑھتے ہیں، اس کا صحیح جواب یہی ہے کہ ہم اسوہ حسنہ رسولیہ کے اتباع میں پڑھتے ہیں، جس کی بابت خدا نے ہمیں یوں ہدایت فرمائی ہے کہ: ﴿لَّقَدْ كَانَ لَكُمْ فِى رَسُولِ ٱللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ [الاحزاب:۲۱] رسول اللہ کے طریق عمل میں تمہارے لیے نیک نمونہ ہے۔

اس لیے ہم اپنی رائے سے کسی فعل کو مقرر کرنا جس طرح اہل قرآن کرتے ہیں اور کر کے پھر جاتے ہیں اچھا نہیں سمجھتے، بلکہ الٰہی معلم قرآن کی تعلیم کے ماتحت عمل کرتے ہیں، ہاں اس کا ثبوت قرآن مجید سے نصاً یا اشارۃً یا دلالۃً یا اقتضاءً مل جائے تو ہمیں مزید اطمینان حاصل ہو جاتا ہے، مگر حکم کی تعمیل ہم اس پر موقوف نہیں رکھتے، پس یہ ہے ہمارے اور آپ کے اختلافات کا مرکز یا بنیادی پتھر، اس لیے ہم ہر رکعت میں سجدے بھی دو کرتے ہیں کیوں کہ قرآن مجید میں دو لفظ آئے ہیں: ﴿وَٱسْجُدْ وَٱقْتَرِب﴾ سجدہ کر اور قرب خداوندی حاصل کر، خدائی معلم اول کے فعل سے ہم یہ سمجھے ہیں کہ اس

حکم سے مراد دو سجدے ہیں اور ہمارا ایسا سمجھنا بالکل صحیح ہے کیوں کہ ہمارے معلم اول کے حق میں ارشاد خداوندی: ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ ٱلْكِتَٰبَ﴾ وارد ہوا ہے یعنی آپ اپنے اتباع کو قرآنی احکام کی تعمیل کا طریقہ سکھاتے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ آپ اس حصہ کلام میں مدعی ہیں آپ کا دعوی ہے کہ فرض نماز کی صرف دو رکعتیں ہیں اس کا ثبوت آپ نے صلاۃ خوف سے دیا، اس پر ہماری طرف سے مندرجہ ذیل اعتراضات وارد ہوتے ہیں، جن کا جواب دینا آپ کا فرض ہے:

۱- کیا سفر طویل میں آپ قصر صلاۃ کے قائل ہیں یا نہیں؟ اگر قائل ہیں تو اس کا اندازہ کیا ہے، اگر صلاۃ خوف جتنا ہے تو نماز خوف میں مزیت کیا ہوئی؟

۲- صلاۃ خوف میں قیام، رکوع وغیرہ بھی قصر میں داخل ہیں یا نہیں؟

۳- صلاۃ مریض کی بابت آپ کا کیا عقیدہ ہے جو قیام اور رکوع سجود نہیں کر سکتا کیا وہ ان ارکان کو چھوڑ دے یا نماز ہی نہ پڑھے۔

قسط:٦

صلاۃ المؤمنین بجواب رسالہ صلاۃ المرسلین

(٢٠/ربیع الثانی ١٣٥٨ھ=٩/جون ١٩٣٩ء)

گذشتہ نمبر میں بحث تعداد رکعات پر ہوئی ہے، آج اسی کے متعلق مصنف کتاب کا ایک سوال درج ذیل ہے، جسے اس نے اپنے خیال میں لاینحل سمجھا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

''روایات میں تحریر ہے کہ پہلے سفر اور حضر میں دو ہی دو رکعت صلاۃ مقرر تھی بعد میں بڑھائی گئی ،لیکن جب ان روایتی علماء سے دریافت کیا جاتا ہے کہ دو رکعتیں کیوں بڑھائی گئیں، قرآن شریف کے کون سے حکم سے بڑھانا ثابت ہے تو کوئی جواب بن نہیں پڑتا'' (صلاۃ المرسلین، ص: ٣٧)۔

اہلحدیث:

مصنف نے قرآن مجید سے جواب پوچھا ہے، ان لوگوں کی یہ عام عادت ہے کہ خود تو ثبوت دینے کے بجائے محض خیالات اور قیاسات سے کام لیتے ہیں اور ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم اپنے اعمال اور عقائد کا ثبوت صرف قرآن مجید سے دیں، حالاں کہ ہمارے نزدیک شرعی دلیلیں دو ہیں، اولؔ: قرآن، دومؔ: حدیث، پھر ہمیں کیوں مجبور کیا جاتا ہے کہ ہم ایک ہی دلیل سے کام لیں، تاہم ان لوگوں کی ہر ایک بات کا جواب قرآن شریف ہی سے دیتے ہیں، خواہ عبارت النص سے ہو یا اشارت سے، دلالۃ النص ہو یا اقتضاء سے، یہ سب طرق دلالت امت مسلمہ میں مسلم ہیں۔

معترض صاحب ! سنیے قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿مَا نَنسَخْ مِنْ ءَايَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ أَوْ مِثْلِهَآ﴾ [البقرة:١٠٦] [1]، دو رکعتوں کی زیادتی اسی آیت کے ماتحت ہے۔فافهم ولا تكن من القاصرين۔

ناظرین:

مصنف رسالہ کے استدلالات کا ایک عجیب نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے ذرہ غور سے پڑھیں، آپ نماز میں قیام کی حالت میں استغفار کرنے کا ثبوت دینے کو آیت ذیل پیش کرتے ہیں: ﴿قُلْ إِنَّمَآ أَنَا۠ بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰٓ إِلَىَّ أَنَّمَآ إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَٰحِدٌ فَٱسْتَقِيمُوٓا۟ إِلَيْهِ وَٱسْتَغْفِرُوهُ﴾ [فصلت:٦] ''اے نبی کہہ دے تو کہ سوائے اس کے نہیں کہ میں بشر ہوں مثل تمہارے وحی کی جاتی ہے طرف میرے یہ کہ معبود تمہارا معبود اکیلا ہے پس قیام کرو تم اس معبود اپنے کے حضور میں اور دعائے بخشش مانگا کرو''۔ (گناہوں اپنے کی) (صلاۃ المرسلین، ص:۴۱) مصنف مذکور اس آیت سے نتیجہ نکالتے ہیں کہ:

''یہ امر بخوبی روشن ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں جب کبھی قیام کیا جائے تو اپنے گناہوں کی بخشش ضرور مانگی جائے اور جب رکوع کیا جائے تو دعا توبہ یا انابت کی جائے اور یہی طریقہ نبیوں کا بھی رہا ہے'' (رسالہ مذکور، ص:۴۱)۔

ناظرین!

مصنف کی سینہ زوری دیکھئے کہ ﴿اسْتَقِيْمُوْٓا﴾ کے معنی کرتے ہیں کہ قیام کرو، حالاں کہ یہ فعل باب استفعال سے ہے اور اس کے ساتھ الیہ بطور صلہ لگا ہوا ہے اور ﴿وَقُومُوا۟﴾ کے ساتھ حرف لام بطور صلہ کے آتا ہے، جیسے: ﴿وَقُومُوا۟ لِلَّهِ

---

[1] جو حکم ہم منسوخ کر دیں یا بھلا دیں تو اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسا لاتے ہیں۔(مؤلف)۔

﴿قَٰنِتِينَ﴾ ،﴿فَٱسۡتَقِيمُوٓاْ إِلَيۡهِ﴾ کے معنی ہیں ، خدا کی طرف سیدھے چلو، المستقیم جو اسی مصدر (استقامت) سے مشتق ہے اس کو صراط کی صفت بنا کر ہمیں حکم دیا ہے یوں دعا کیا کرو۔

﴿ٱهۡدِنَا ٱلصِّرَٰطَ ٱلۡمُسۡتَقِيمَ﴾ یعنی اے خدا ہمیں سیدھی راہ پر چلا۔

بقول مصنف ﴿اسۡتَقِيۡمُوٓا﴾ کے معنی میں اگر قیام کرنے کا حکم ہے تو مستقیم (اسم فاعل) کے معنی ہوں گے: قیام کرنے والا ، اس لحاظ سے مطلوبہ صراط مستقیم کا مطلب یہ ہوا کہ ''اے خدا ہمیں اس راستے کی ہدایت کر جو تیرے سامنے سیدھا کھڑا ہونے والا ہے'' یہ ترجمہ کیا ہی لطیف ہے جس کے حق میں یہ کہنا بجا ہے ؎

لطف پر لطف ہے املا میں میرے یار کے یار
حائے حطی سے گدح لکھتا ہے ہوز سے حمار

علاوہ اس کے: ﴿وَٱسۡتَغۡفِرُوهُ﴾ کو قیام سے متعلق کرنا بھی خلاف قواعد نحو ہے کیوں کہ یہ جملہ انشائیہ اپنی جگہ پر مستقل ہے اگر آپ کا ترجمہ مقصود ہوتا تو کلام اللہ کے الفاظ یوں ہوتے:

فاستقیموا إلیه مستغفرین أو تستغفرون تاکہ یہ دونو لفظ اسۡتَقِيۡمُوٓا کی ضمیر مرفوع سے حال بن کر آپ کا مطلب ادا کر سکتے ہیں،لیکن حالت موجودہ میں آپ کا بیان اس آیت کے ماتحت ہے:

﴿أَتُنَبِّـُٔونَ ٱللَّهَ بِمَا لَا يَعۡلَمُ فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَلَا فِي ٱلۡأَرۡضِ﴾ [یونس: ۱۸] ''کیا تم خدا کو اس چیز کی خبر دیتے ہو جسے وہ آسمانوں اور زمین میں نہیں جانتا''۔

مصنف مذکور نماز میں ہاتھ باندھنے کا ثبوت قرآن سے دیتے ہیں وہ ثبوت ایسا ہے کہ ناظرین اسے پڑھ کر ہنسیں گے اور اہل قرآن کے علم وانصاف کی داد دیں گے۔

آپ لکھتے ہیں کہ:

’’تکبیر پڑھنے کے بعد ہم کو اذکارِ قیام شروع کرنا چاہیے، جیسا کہ پیشتر واضح ہو چکا ہے، لیکن اذکار قیام کے وقت ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ہر مومن کو اللہ تعالیٰ کے حضور دست بستہ کھڑا ہونا چاہئے جیسا کہ موسی رسول اللہ سلام اللہ سلام علیہ کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی تھی، ملاحظہ ہو آیت ذیل:

﴿ٱسْلُكْ يَدَكَ فِى جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوٓءٍ وَٱضْمُمْ إِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ ٱلرَّهْبِ﴾ [القصص:۳۲]۔

داخل کرتو اے موسی ید یعنی برہان بشارت اپنا پیچ گریباں یعنی سینے اپنے کے نکلے گا وہ سورج مانند ہو کر بغیر کسی غم کے خوشخبری دینے والا اور پنجہ کیساتھ پکڑ لے تو اے موسی ساتھ اپنے ہاتھ اپنا اللہ سے ڈرتا ہوا۔

آیت مندرجہ بالا میں موسی سلام علیہ کا گریباں یعنی سینے میں ہاتھ داخل کرنے سے کسی کو اختلاف نہیں ہے البتہ: ﴿وَٱضْمُمْ إِلَيْكَ جَنَاحَكَ﴾ کے معنی میں اختلاف ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہم ’’اضمم‘‘ کی لغت بیان کر دیں تا کہ ناظرین کو ہمارے معنی میں شک وشبہ پیدا نہ ہو (قاموس) ① میں ہے: ’’الضم: قبض شيء إلى شيء‘‘ اور (منتخب) اور (صراح) اور (منتہی الارب) میں قبض کا ترجمہ اس طرح مذکور ہے قبض گرفتن بہ پنجہ، لہٰذا: ﴿وَٱضْمُمْ إِلَيْكَ جَنَاحَكَ﴾ کا ترجمہ کیا گیا ہے: پنجہ کے ساتھ پکڑ لے تو (اے موسی) ساتھ اپنے ہاتھ اپنا، بدیں وجہ ہر مومن کو قیام میں سینہ پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا چاہیے، اس طرح کہ بایاں ہاتھ اپنے سینے میں داخل کر کے داہنے ہاتھ کے پنجے سے بایاں ہاتھ پکڑ لینا چاہیے، ہوسکتا ہے کہ داہنا ہاتھ اپنے سینے میں داخل کر کے بائیں ہاتھ سے گرفت کی جائے لیکن صحیح گرفت داہنا ہاتھ ہی کرتا ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اہل حدیث کی طرح داہنے ہاتھ سے بائیں ہاتھ کی کلائی پکڑ لی جایا کرے، لیکن اس طرح

---

① ص:۱۱۳۲۔

بایاں ہاتھ پوری طرح سینہ پر نہ آئے گا اور اگر پوری طرح داخل بھی کر لیا گیا تو اس حالت میں کلائی پکڑنے سے داہنے ہاتھ کو تکلیف رہے گی اور قریب کھڑے ہوئے مصلی کو بھی تکلیف ہوگی کیوں کہ داہنے ہاتھ کی کہنی علیحدہ نکلی رہے گی، پس بایاں ہاتھ پوری طرح سینے پر داخل کر کے داہنے سے بائیں ہاتھ کی کہنی کے اوپر پکڑنا چاہیے جس سے کوئی تکلیف نہ ہوگی اور حکم خداوندی کی تعمیل بہ آسانی ہو سکے گی'' (رسالہ مذکور ص: ۴۸-۴۷)۔

ناظرین:

کیا ہی اچھا استدلال ہے، انصاف کیجیے کہ مصنف کا یہ استنباط بہتر اور قابل قبول ہے یا قرآن مجید کے معلم اول کا ارشاد، جنہوں نے نماز میں ہاتھ باندھنے کا حکم صاف الفاظ میں دیا ہے۔ ہم مصنف سے اس کی عبارت ذیل کا مطلب پوچھنا چاہتے ہیں، جس کے الفاظ یہ ہیں کہ:

''بدیں وجہ ہر مومن کو قیام میں سینے پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا چاہیے اس طرح کہ بایاں ہاتھ اپنے سینے میں داخل کر کے داہنے ہاتھ کے نیچے سے بایاں ہاتھ پکڑ لینا چاہیے ہوسکتا ہے کہ داہنا ہاتھ سینے میں داخل کر کے بائیں ہاتھ سے گرفت کی جائے لیکن صحیح گرفت داہنا ہاتھ ہی کرتا ہے'' (صلاۃ المرسلین، ص: ۴۸)۔

بتائیے! آپ نے آیت موصوفہ میں کتنے تصرفات کئے ہیں اور ان تصرفات کے باوجود آپ کا مدعا ثابت نہیں ہوا، اس بات کو ہم ناظرین کے فہم وفراست پر چھوڑتے ہیں مصنف صاحب اتنا تو ضرور بتائیں کہ بایاں ہاتھ اپنے سینے میں داخل کر کے داہنے ہاتھ کے نیچے سے گرفت کرنے کے کیا معنی ہیں اور اس کی کیا صورت ہے؟ آگے چل کر مصنف نے اور گل کھلائے ہیں آپ لکھتے ہیں کہ:

''یہ تو پیشتر ثابت ہو چکا کہ قیام میں دعاء مغفرت مانگنا چاہیے اور جملہ انبیاء سلام علیہم کا بھی یہی

عمل تھا لیکن عقلا ہر گزارش کے ساتھ حاکم کی تعریف وتوصیف بھی ضروری چیز ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بھی حکم صادر فرمایا ہے کہ تم اپنی دعائیں اسماء حسنہ اور حمد کے ساتھ کیا کرو، جیسا کہ آیت ذیل سے ظاہر ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

﴿وَلِلَّهِ ٱلْأَسْمَآءُ ٱلْحُسْنَىٰ فَٱدْعُوهُ بِهَا﴾ [الاعراف:۱۸۰]، ترجمہ: اور موجود ہیں واسطے اللہ کے نام اچھے یعنی نام صفاتی، پس دعا کیا کرو ساتھ ان کے۔

بموجب حکم مندرجہ بالا، ہمیں دعائیں اسماء حسنیٰ کے ساتھ کرنا چاہیے اور یہ اسماء حسنیٰ اللہ تعالیٰ نے پارہ اٹھائیس رکوع (٦) میں مہیا فرما دیئے ہیں، جن کو ہم اس بیان کے آخر میں جملہ آیات قیام کے ہمراہ بغرض آگاہی ناظرین درج کریں گے۔

۲- ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَٱسْتَغْفِرْهُ﴾ [النصر:۳]، ترجمہ: سو تو صلاۃ ادا کیا کر ساتھ حمد رب اپنے کے اور بخشش مانگ اس سے۔

۳- ﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ﴾ [الطور:۴۸] ترجمہ: اور صلاۃ ادا کیا کر ساتھ حمد رب اپنے کے حالاں کہ قیام کرے تو۔

آیات مندرجہ بالا سے واضح ہے کہ قیام میں دعا استغفار کے ساتھ رب کریم کی حمد بھی کرنا چاہیے، اب ہم ایسی آیات پیش کرتے ہیں جو حمد کے لیے سورۃ الحمد شریف کو مخصوص کرتی ہیں۔

﴿هُوَ ٱلْحَىُّ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَٱدْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ ٱلدِّينَ ۗ ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ﴾ [غافر:٦۵]، وہ اللہ ازلی ابدی زندہ ہے، نہیں کوئی معبود یعنی لائق فرماں برداری کے غیر اس اللہ کا، پس دعا کیا کرو تم اس اللہ کے حضور میں خالص کرنے والے ہو کر واسطے اس کے اس کی توحید (ساتھ) ﴿ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ﴾۔

''اس جگہ ''ادْعُوْہ'' کا مفعول ثانی ﴿ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ﴾ جملہ ہے جو محلاً منصوب بہ نزع خافض ہے کیوں کہ ''ادْعُوْہ'' کا مفعول ثانی ساتھ باحرف جار کے آتا

ہے، پس اس فرمان ربی میں سورہ الحمد کی طرف اشارہ ہے، کیوں کہ سورہ الحمد میں حمد بھی ہے اور دعا بھی ہے، لہٰذا بذریعہ الحمد شریف کے دعا کرنے کا حکم ہوا ہے، ایک اور آیت ملاحظہ ہو جس سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے:﴿وَٱسۡتَعِينُواْ بِٱلصَّبۡرِ وَٱلصَّلَوٰةِ﴾[البقرة:۴۵]، ترجمہ: اور استعانت مانگو ساتھ صبر اور صلاۃ کے، قرآن شریف بھر میں لفظ نستعین صرف سورہ الحمد شریف میں آیا ہے، پس لازم ہے کہ سورہ الحمد شریف کے ذریعہ صلاۃ میں دعا استعانت کی جائے جو کہ خوبیوں میں اس قدر افضل ہے کہ قرآن حکیم کے جملہ مضامین کا خلاصہ اس میں موجود ہے اور رب کریم کی حمد بھی اس میں اعلی پیانہ پر کی گئی ہے، اس لیے ہر مومن کا فرض ہے کہ بموجب احکام خداوندی دعاء استغفار کے ساتھ الحمد شریف کی تلاوت بھی کیا کرے'' (صلاۃ المرسلین از ص:۴۸ تا ۵۰)۔

ناظرین کرام!

قطع نظر اس کے کہ مصنف اپنے دعوی میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں، ہمیں خوشی ہے کہ وہ ہمارے ساتھ اس امر میں متفق ہو گیا ہے کہ سورہ الحمد نماز میں بہر حالت ہر نمازی کو پڑھنی چاہیے، حالاں کہ اسی رسالہ کے (ص:۲۵) پر اس نے سورہ الحمد پڑھنے کا ثبوت ہم سے طلب کیا ہے، مگر یہاں آکر خود ہی اس کا ثبوت دے دیا ہے معلوم نہیں کہ یہ ہمارے صبر کا نتیجہ ہے یا خدائی تصرف ہے۔

اب ہم اس کے استدلال پر نظر کرتے ہیں مصنف سَبِّحْ کا ترجمہ نماز پڑھ کرتا ہے حالاں کہ ہم قاموس کے حوالہ سے بتا آئے ہیں کہ سَبِّحْ کے اصل معنی ہیں قل سبحان اللّٰہ یعنی سبحان اللہ کہو۔ ملاحظہ ہو: ((اہلحدیث)) مورخہ ۱۲/ مئی، (ص:۴)۔

بہر حال ناظرین غور فرمائیں کہ یہ لوگ حدیث نبوی کو چھوڑ کر کس مصیبت میں پھنسے ہیں اور اپنے اعمال اور عقائد کو کس سینہ زوری سے کرتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

قسط:۷

صلاۃ المؤمنین بجواب صلاۃ المرسلین

(۲۷/ربیع الثانی ۱۳۵۸ھ=۱۶/جون ۱۹۳۹ء)

اس سلسلہ مضمون کے گذشتہ نمبر میں اہل قرآن کی نماز کے اذکار وغیرہ کا ذکر ہوا ہے آج بھی اسی کا بقیہ درج ہے۔

نوٹ! ان لوگوں کی عادت ہے کہ کوئی آیت کسی محل کی ہو اس کو جہاں چاہتے ہیں اپنے حسب منشا استعمال کر لیتے ہیں چاہے اس کو کسی قسم کا لفظی یا معنوی تعلق ہو یا نہ ہو۔

مصنف کی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ ہو جو نماز میں استغفار کرنے کے متعلق آپ نے لکھی ہے:

''علاوہ اس کے رب کریم کا یہ بھی حکم ہے کہ اپنی بخشش مانگنے کے ساتھ دوسرے مؤمنین اور مؤمنات کی بخشش بھی مانگنا چاہیے، ملاحظہ ہو آیت ذیل:

﴿وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ﴾[محمد:۱۹]اور (اے نبی) بخشش مانگا کر واسطے ناروا کام اپنے کے اور واسطے (ناروا کام) مؤمن مردوں اور مؤمنہ عورتوں کے''(صلاۃ المرسلین،ص:۵۰)۔

اہلحدیث:

کوئی ان بھلے آدمیوں سے پوچھے کہ اس آیت میں نماز کا ذکر کہاں ہے اگر کوئی شخص نماز ختم کر کے ''اللّٰھُمَّ اغْفِرلِي وَلِلْمُؤْمِنِينَ'' وغیرہ پڑھے تو کیا اس حکم پر عمل نہیں ہوگا؟ یا گلی کوچہ میں چلتا پھرتا یہ دعا پڑھے تو کیا اس حکم کی تعمیل نہیں ہوگی؟ یا پاخانہ

سے نکلتے ہوئے (باتباع سنت) ''غُفْرَانَکَ'' کہےتو اس ارشاد کی تعمیل نہ ہوگی؟ یقینا ہوجائے گی پھراس کونماز سے کیا خصوصیت ہے، ہاں ہم نماز میں بھی اس آیت پرعمل کرتے ہیں، آخری قعدہ میں ہم اپنے اور مومنوں کے لیے استغفار کرتے ہیں مگر ہم میں اورتم میں فرق یہ ہے کہ الٰہی معلم علیہ السلام کی تعلیم سے کرتے ہیں اورتم لوگ اپنے ذہنی جلا یا بالفاظ دیگر محض اپنے تخیل سے کرتے ہو، اسی لیے آپ لوگوں میں اذکارنماز کے بارے میں بہت بڑا اختلاف ہے، چوں کہ مرکز رسالت سے تعلق چھوٹ گیا ہے اس لیے جو کچھ کسی کے جی میں آتا ہے کہہ دیتا ہے اور خیالات کا اختلاف لازمہ بشریت ہے، ہم اپنا یہ عذرخدا کے ہاں پیش کرسکتے ہیں کہ ہم نے یہ دعا الٰہی معلم کی تعلیم سے پڑھنی شروع کی تھی جس کے اعمال دینی کوتو نے ہمارے لیے اسوہ حسنہ قرار دیا تھا، لیکن آپ لوگ جواب میں ایسانہیں کہہ سکتے، غالباً یوں کہیں گے کہ ہم نے یہ حکم اپنے نفس سے ایجاد کیا تھا، پس سوچ لیجیے کہ ان دونوں جوابوں میں سے صحیح جواب کون سا ہے۔ رسالہ ہذا کے (ص:۵۲) پرآپ کس مزے سے لکھتے ہیں کہ:

''آیات مذکورہ سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جملہ انبیاء سلام علیہم اور جملہ مومنین اور مومنات رضوان اللہ عنہم کا عمل یہ تھا کہ وہ صلاۃ میں اللہ تعالیٰ کی تعریف وتحمید کرنے کے بعد عاجزی ظاہر کرتے یعنی دعائیں مانگتے تھے'' (ص:۵۳)۔

اہلحدیث:

یہ بالکل صحیح ہے مگر آیت مرقومہ: ﴿ٱلَّذِينَ يَحۡمِلُونَ ٱلۡعَرۡشَ﴾ [غافر:۷] سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مومنین لوگ حضرات انبیاء کی تعلیم سے اور انبیاء علیہم السلام خدا کی مخفی تلقین (وحی خفی) سے ایسا کرتے تھے۔

اذکار صلاۃ کے بعد مصنف نے دو اورعنوان قبل صلاۃ اور تکبیر صلاۃ ذکر کیئے

ہیں آپ لکھتے ہیں کہ:

قبل صلاۃ:

''بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ ﴿رَّبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَل لِّي مِن لَّدُنكَ سُلْطَانًا نَّصِيرًا﴾ [الاسراء:۸۰]۔

تکبیر صلاۃ:

﴿إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيرًا﴾ [النساء:۳۴]''۔

اہلحدیث:

پہلی آیت مکی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کی طرف اشارہ ہے کہ دعا کرو کہ مدینہ شریف میں تمہارا داخلہ باعزت ہو اور مکہ شریف سے خروج حسب منشا ہو (یعنی باوجود شور وشغف مخالفین کے سلامت با کرامت نکل جاؤ اور مدینہ شریف پہنچ کر تم کو نمایاں غلبہ حاصل ہو)۔

بتایئے اس آیت کو نماز میں داخل ہونے سے کیا تعلق ہے اور اس آیت میں ﴿سُلْطَانًا مُّبِينًا﴾ (واضح غلبہ)، کس کے برخلاف چاہا گیا ہے؟ علاوہ اس کے اگر کوئی شخص اپنے یا بیگانے گھر میں داخل ہوتے ہوئے یہ آیت پڑھے تو ہم اس کو منع نہیں کرتے لیکن سیاق عبارت سے ظاہر ہے کہ اس آیت سے یہ مقصود نہیں ہے۔ دوسری آیت جس کو آپ نے تکبیر تحریمہ کے لیے نقل کیا ہے اس کو نماز سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں کیوں کہ اس کے ماقبل اور مابعد مرد وعورت کی خانگی زندگی کے متعلق احکام ہیں، جن کا مختصر مطلب یہ ہے کہ جن عورتوں سے تم شرارت پاؤ پہلے ان کو سمجھاؤ بجھاؤ پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرلیں تو تکلیف دینے کے لیے عذرات ان کے حق میں تلاش نہ کرو، اللہ تعالیٰ بہت بلند شان اور بڑی عزت والا ہے، اس میں یہ اشارہ ہے کہ جس قدر بلندی

شان تم کو عورتوں پر حاصل ہے اس سے زیادہ خدا کو تم پر حاصل ہے۔

تم اگر اپنی معمولی بلندی کے باعث عورتوں پر ظلم کرو گے تو خدا تعالیٰ اپنی حقیقی کبریائی کے ماتحت تم کو سخت سزا دے گا، بتایئے اس آیت کو تکبیر تحریمہ سے کیا تعلق ہے: کیا یہی قرآن فہمی ہے۔

اس سے آگے عنوان ہے ''اذکار قیام صلاۃ''

اس عنوان کے ماتحت مصنف نے اذکار قیام کے لیے سورہ حشر کی آخری آیات: ﴿هُوَ ٱللَّهُ ٱلَّذِى لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ﴾ [الحشر:۲۲] سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی آخری آیات نقل کی ہیں، جن میں سے کسی ایک آیت کو بھی نماز سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے، ان میں نماز کا نہ حکم ہے، نہ ذکر، پھر ان آیات کو پیش کرنا اثبات مدعا (تلاوت در قیام) کے لیے کیوں کر مفید ہو سکتا ہے۔

ناظرین کرام! ان اہل قرآن کی آیات خوانی کی ایک مثال ہم یہاں پیش کرتے ہیں جو آپ لوگوں کو ہمیشہ کام دے گی۔

اگر کوئی ملحد دعوی کرے کہ نماز سے مومن و پرہیز گار جہنم میں جائیں گے تو اس کا ثبوت خود قرآن مجید کے الفاظ میں یوں ہے کہ: ''إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحاتِ''، ''فِي نارِ جَهَنَّمَ خالِدِينَ فِيها''[1]۔ اس آیت کے دونوں حصے قرآن مجید میں موجود ہیں جو اپنے اپنے محل میں بالکل صحیح ہیں اگر کہا جائے کہ اس آیت کے دونوں حصوں کا محل الگ الگ ہے تو ملحد مذکور کہہ سکتا ہے کہ چاہے محل الگ الگ ہے مگر یہ الفاظ تو قرآن مجید ہی کے ہیں، اگر ان کے بے محل ہونے سے میرا استدلال غلط ہے تو آپ کا استدلال کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے؟

① جو لوگ مومن ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

اہل قرآن!

مشکل بہت پڑے گی برابر کی چوٹ ہے
آئینہ دیکھئے گا ذرا دیکھ بھال کر

اذکار رکوع:

مصنف نے اذکار قیام کے بعد اذکار رکوع کا بیان ان لفظوں میں کیا ہے کہ:
''قیام کے بعد ہم کو اذکار رکوع کا بیان پیش کرنا چاہیے لیکن ہم پیشتر ثابت کر چکے ہیں کہ جملہ انبیاء سلام علیہم رکوع میں دعا، توبہ، تلاوت کیا کرتے تھے جو کہ قرآن مجید کے اندر اللہ تعالیٰ نے مہیا فرمادی ہے پس رکوع میں ہم بھی دعا، توبہ ہی مانگنا چاہتے ہیں تاکہ منشارب کریم کی پوری پوری تعمیل ہو سکے'' (صلاۃ المرسلین، ص: ۵۴)۔

اہلحدیث:

رسالہ کے (ص: ۴۰) پر آپ نے حضرت داؤد علیہ السلام کا ایک واقعہ کے سلسلہ میں استغفار اور رجوع الی اللہ کرنا لکھا ہے اس میں بھی نماز کی حالت کا ذکر نہیں ہے، ایک آزمائشی واقعہ مذکور ہے جس میں آپ سمجھتے تھے کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے جس کی تلافی کرنے کو آپ خدا کی طرف متوجہ ہوئے۔

مصنف موصوف نے خود ہی اس آیت کا جو ترجمہ کیا ہے وہ نہایت لطیف اور طلباء کے لیے مضحکہ خیز ہے۔

اختلاف رائے کیا ہم (خدا) نے اس سے، پس دعائے بخشش کی اس نے اپنے رب کے حضور میں اور گر گیا رکوع کی حالت میں۔ الخ (صفحہ: ۴۰)

ناظرین:

ہم نے تو اپنی ساری عمر میں یہ نہیں سنا کہ خدا اپنے کسی بندے کے حق میں یوں کہے

کہ میں نے اس سے اختلاف رائے کیا، اردو محاورہ کے لحاظ سے تو ایسا کہنا خدا کی توہین ہے کیوں کہ اختلاف رائے دو مساوی شخصوں میں ہوتا ہے، کوئی بندہ خدا کے مساوی نہیں، اس کے علاوہ لفظ ''فتنا'' کے یہ معنی کہیں بھی نہیں لکھے، اس لفظ کا ماخذ فتنہ ہے جو اپنی اصلی شکل اسم میں بالفاظ: ﴿وَٱلْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ ٱلْقَتْلِ﴾ [البقرۃ:۱۹۱] قرآن مجید میں آیا ہے، پھر کیا اس آیت کے معنی بقول آپ کے یہ ہوں گے کہ:

''اختلاف رائے قتل سے بھی بڑھ کر گناہ ہے''، کیا ہم اس آیت کے ماتحت کہہ سکتے ہیں کہ اہل قرآن ایسے فعل کا ارتکاب کرتے ہیں جو قتل سے بھی زیادہ سخت ہے کیوں کہ وہ اہلحدیث سے اختلاف رائے کرتے ہیں۔

جو بات کی خدا کی قسم لا جواب کی

سنیے! آیت مذکور میں راکعاً سے مراد مُتَوَجِّهًا إِلَى اللّٰهِ ہے نہ کہ نماز کا اصطلاحی رکوع، اس کا ثبوت قرآن مجید کی اس آیت سے ملتا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ٱرْكَعُوا۟ لَا يَرْكَعُونَ﴾ [المرسلات:۴۸]، جب کبھی انہیں کہا جاتا کہ خدا کی طرف متوجہ ہو جاؤ تو وہ متوجہ نہیں ہوتے۔

کافروں کو یہ کبھی نہیں کہا گیا کہ آؤ میاں نماز کا رکوع کرلو، ہاں یہ ضرور کہا گیا کہ: ﴿وَأَقِيمُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَلَا تَكُونُوا۟ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ﴾ [الروم:۳۱]، نماز پڑھو اور شرک چھوڑ دو۔

پس آیت موصوفہ سے آپ کا مدعا ثابت نہیں ہے اور جو ثابت ہے وہ ہمیں مضر نہیں اور آپ کو مفید نہیں کیوں کہ مطلب اس کا اتنا ہی ہے کہ جب آدمی کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے تو اس سے رجوع کرلے اور خدا کی طرف متوجہ ہو کر بخشش مانگے اور یہ بالکل صحیح ہے۔

❁ ❁ ❁

قسط:۸

صلاۃ المؤمنین بجواب صلاۃ المرسلین

(۴؍جمادی الاولیٰ ۱۳۵۸ھ = ۲۳؍جون ۱۹۳۹ء)

یہ سلسلہ مضمون ۵؍مئی سے شروع ہوا ہے، گذشتہ پرچہ میں اذکار رکوع کا ذکر ہو چکا ہے آج سجدہ کا ذکر کیا جاتا ہے (مدیر)

مصنف نے اذکار سجدہ کے ثبوت میں چند آیات نقل کی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے: ﴿إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِـَٔايَٰتِنَا ٱلَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُواْ بِهَا خَرُّواْ سُجَّدًا وَسَبَّحُواْ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ﴾ [السجدة:۱۵]۔

اس آیت سے مصنف نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ''سجدہ میں گر کر اللہ تعالیٰ کی پاکی اور حمد بیان کریں'' (ص:۵۵)۔

اصل حکم میں ہم بالکل متفق ہیں، ہم بھی سجدہ میں پڑ کر خدا کی حمد کرنے کو سبحان ربی الاعلی کہا کرتے ہیں۔

شکایت یا اظہار واقعہ:

اہل قرآن کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن ایک جامع کتاب ہے، نہایت دل خوش کن اور پاکیزہ خیال ہے، مگر قرآن کے ساتھ ان کا طرز عمل اور ان کی تفسیر قرآن سن کر اور دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ یہ لوگ قرآن مجید کو جامع کتاب کہہ کر اس کو اپنا متبوع نہیں مانتے بلکہ اپنی رائے کے تابع کرتے ہیں، بس ہمارے اور ان کے باہمی اختلاف کی حد فاصل یہی ہے۔

حکایت:

یہ ایک بہت پرانی حکایت ہے کہ کسی موحد نے گیارہویں دینے والے سے کہا کہ تمہارے اس کام کا ثبوت قرآن مجید میں نہیں ہے وہ بولا یقیناً ہے جب سائل نے پوچھا کہاں ہے تو کہنے لگا کہ: ﴿وَالْفَجْرِ ۝ وَلَيَالٍ عَشْرٍ﴾ الآیہ [الفجر:۱-۲]، میں دس راتوں اور ایک فجر کا ذکر ہے اس میں اشارہ ہے کہ دس راتیں گزار کر گیارہویں کی فجر کو گیارہویں دیا کرو۔

آج تک تو ہمارا یہی گمان تھا کہ اہل بدعت اپنی مروجہ بدعات کے ثبوت میں قرآن کو ایسی طرح پیش کرتے ہیں گویا وہ اس کو کلام الرحمان جاننے کے بجائے مضحکہ صبیان سمجھتے ہیں، مگر اہل قرآن کی تحریریں دیکھنے سے ہمیں گمان ہی نہیں بلکہ یقین ہو گیا کہ یہ لوگ قرآن سے مضحکہ کرتے ہیں، آج ہم بادل ناخواستہ اپنے درد دل کا اظہار کرتے ہیں آیت موصوفہ کا صحیح ولفظی ترجمہ یہ ہے کہ ''سوائے اس کے نہیں کہ ہماری آیتوں پر ایمان انہی لوگوں کو ہے جن کو جب ان آیات کے ساتھ نصیحت کی جائے تو وہ خدا کے پختہ مطیع ومنقاد ہو جاتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیحیں پڑھتے ہیں''۔

اس آیت کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے اس کا ثبوت سنیے: کسی مسجد یا مجلس میں کوئی صاحب آیات کلام اللہ پڑھ کر حاضرین کو نصیحت کرتے ہیں کہ ایسے لوگ ﴿إِذَا ذُكِّرُوا﴾ کے ماتحت آتے ہیں، یہ لوگ سجدہ کیسے کریں؟

یا لاہور کی انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں کوئی مولوی صاحب ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں آیات کلام اللہ پڑھ کر وعظ کہتے ہیں، یہ سامعین بھی ﴿إِذَا ذُكِّرُوا﴾ کے ماتحت آتے ہیں، یہ لوگ سجدہ کریں تو کیوں کر؟ یا چند آدمی بازار میں چلے جا رہے ہیں ان میں سے ایک صاحب آیات کلام اللہ سے نصیحت کی کچھ باتیں ان کو سناتے

جاتے ہیں، یہ لوگ بھی آیہ ﴿إِذَا ذُكِّرُواْ﴾ کے ماتحت آتے ہیں، یا مثلاً کسی دعوت کی مجلس میں کھانا آگے رکھا ہے ان میں سے کوئی پڑھا لکھا آدمی کہتا ہے کہ میاں بسم اللہ پڑھ کر کھانا کھاؤ اور کھا کر اللہ کی تعریف کیا کرو اور دلیل میں آیات: ﴿فَكُلُواْ مِمَّا ذُكِرَ ٱسۡمُ ٱللَّهِ عَلَيۡهِ﴾ [الانعام:١١٨]۔۔۔۔ ﴿كُلُواْ مِن طَيِّبَٰتِ مَا رَزَقۡنَٰكُمۡ وَٱشۡكُرُواْ لِلَّهِ﴾ [البقرۃ:١٧٢] پیش کرتا ہے، یہ لوگ بھی آیت موصوفہ کے ماتحت ہیں۔ کسی شخص کو رخصت کرنے کو چند آدمی سواری کے قریب کھڑے ہیں، ایک صاحب علم ہدایت کرتا ہے کہ سواری پر چڑھتے ہوئے آیت: ﴿سُبۡحَٰنَ ٱلَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَٰذَا﴾ [الزخرف:١٣] پڑھنی چاہیے، یہ لوگ بھی اس آیت میں داخل ہیں، علی ہذا القیاس ریل گاڑی، موٹر اور ہوائی جہاز وغیرہ میں بیٹھے ہوئے کلام اللہ سنتے ہیں وہ بھی آیت مذکورہ کے ماتحت بقول آپ کے سجدہ کرنے پر مامور ہیں، یہ بتائیے ان لوگوں کا سجدہ کیسے ہوگا؟

ان سب واقعات کو ملحوظ رکھ کر ہم نے سجدہ کے معنی کئے ہیں خدا کی اطاعت کے لیے مستعد ہو جانا یہی صحیح ہیں اور قرآن مجید میں ایسے سجدے کا ثبوت ملتا ہے جو اطاعت و انقیاد کے معنی میں ہے، غور سے پڑھو آیت کریمہ: ﴿وَلِلَّهِ يَسۡجُدُ مَن فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ طَوۡعٗا وَكَرۡهٗا وَظِلَٰلُهُم بِٱلۡغُدُوِّ وَٱلۡأٓصَالِ﴾ [الرعد:١٥]۔

ناظرین!

اب آیت زیر بحث کا ترجمہ سنیے، جو اہل قرآن نے کیا ہے: ''سوائے اس کے نہیں کہ اظہار خشوع کرتے ہیں ساتھ آیات ہماری کے وہ شخص کہ جس وقت میں ذکر یعنی صلاۃ ادا کرائی جائے ساتھ آیات ہماری وہ گر جائیں سجدہ میں اور پاکی بیان کریں ساتھ حمد رب اپنے کے اور وہ غرور نہ کریں'' (ص:٥٥)۔

کیا ہی لطیف ترجمہ ہے ﴿ ذُكِّرُواْ ﴾ کے معنی کئے ہیں صلاۃ ادا کرائی جائے (بہت خوب) پھر اس آیت کے کیا معنی ہوں گے: ﴿ وَإِذَا ذُكِّرُواْ لَا يَذْكُرُونَ ﴾ [الصافات: ۱۳] اور ساتھ ہی اس کے کیا معنی ہوں: ﴿ وَذَكِّرْهُم بِأَيَّىٰمِ ٱللَّهِ ﴾ [ابراہیم:۵] اور آیت کریمہ: ﴿ فَذَكِّرْ إِنَّمَآ أَنتَ مُذَكِّرٌ ﴾ [الغاشیۃ:۲۱] کے معنی بھی بتایئے، مہربانی کر کے ان سب آیات کو نماز کے ساتھ لگا کر دیکھئے کہ قرآن کی پوری تحریف ہوتی ہے یا نہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ مومنین کی دو آنکھیں ہوتی ہیں ایک قرآن دوسری حدیث، حدیث چھوڑ کر تو ان لوگوں نے ایک آنکھ بند کر ہی لی تھی، قرآن مجید کی تفسیر الٹی پلٹی کر کے قرآن کی آنکھ میں بھی گرم سلائی پھیر رہے ہیں، خدا نہ کرے کہ ان کا انجام: ﴿ وَعَلَىٰٓ أَبْصَـٰرِهِمْ غِشَـٰوَةٌ ﴾ [البقرۃ:۷] تک پہنچ جائے۔

مختصر یہ ہے کہ اس سرخی کے ماتحت مصنف نے جتنی آیات نقل کی ہیں ان سے ان کا مدعا ثابت نہیں ہوتا مگر اصل مقصد (کہ سجدہ میں گر کر اللہ تعالیٰ کی پاکی اور حمد بیان کریں) (ص:۵۵) سے ہم بھی متفق ہیں، ہاں فرق اتنا ہے کہ ہم الٰہی معلم کی تعلیم کے ماتحت پڑھتے ہیں اور یہ لوگ اپنے نفس کی رہنمائی سے ایسا کرتے ہیں۔ ع

بہ ببین تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا

اسی ذیل میں مصنف نے سجدہ میں تلاوت کرنے کے لیے یہ چند آیات پیش کی ہیں:

﴿ سُبْحَـٰنَ رَبِّنَآ إِن كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا ﴾ [الاسراء:۱۰۸]، ﴿ ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ ٱلَّذِى لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَلَمْ يَكُن لَّهُۥ شَرِيكٌ فِى ٱلْمُلْكِ وَلَمْ يَكُن لَّهُۥ وَلِىٌّ مِّنَ ٱلذُّلِّ ﴾ [الاسراء:۱۱۱]، ﴿ رَبَّنَا ٱصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝٦٥

﴿إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا﴾[الفرقان:٦٥-٦٦]، ﴿رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا﴾[الفرقان:٧٤] (صلاۃ المرسلین،ص:٦٥)۔

ناظرین!

ان آیات کو فی نفسہا مع ان کے سیاق سباق کے دیکھئے کہ کسی جگہ بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ ان کو سجدہ نماز میں پڑھا جائے، ہرگز نہیں، بلکہ محض ان کے نفس کی ایجاد ہے جس سے مقصود اس حدیث نبوی کی ممانعت کرنا ہے جس میں ارشاد ہے کہ بحالت سجدہ نماز قرآن شریف نہ پڑھا کرو۔

علاوہ اس کے ہم پوچھتے ہیں کہ ان آیات کے بجائے کوئی شخص سورہ اخلاص پڑھے یا سورہ حشر کی آخری آیات یا آیت الکرسی پڑھے تو کون امر مانع ہے۔ یہ شریعت نہ ہوئی کوئی پنچایت ہوئی کہ جدھر چند آدمی ہو گئے وہی کام کر لیا، صدق اللہ: ﴿أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُم مِّنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَن بِهِ اللَّهُ﴾[الشوریٰ:٢١]۔

اذکار بعد الصلاۃ:

اس سرخی کے ماتحت مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

''نماز کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کا کچھ ذکر کرنا چاہیے'' (ص:٦٦)۔

ہمیں یہ بات مسلم ہے بلکہ یہ کام کرتے بھی ہیں مگر آپ نے اس دعوی پر جو آیات پیش کی ہیں وہ مثبت مدعا نہیں، اس میں ہمیں اختلاف ہے۔

ناظرین کرام!

مصنف موصوف نے بعد صلاۃ اذکار بھی قرآن شریف سے بتائے ہیں جو انہی کے الفاظ میں نقل کئے جاتے ہیں، غور سے پڑھئے اور للہ ہمیں بتایئے کہ ان آیات کو نماز

سے کچھ بھی تعلق ہے یا یہ بھی ﴿وَالْفَجْرِ ۝١ وَلَيَالٍ عَشْرٍ﴾ [الفجر:١-٢]، کی طرح لکھی گئی ہیں، بغور ملاحظہ کیجیے:۔

''﴿رَّبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ ۝٩٧ وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَن يَحْضُرُونِ﴾ [المؤمنین:٩٧-٩٨]، ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝١٩١ رَبَّنَا إِنَّكَ مَن تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ ۖ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ ۝١٩٢ رَّبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا ۚ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ ۝١٩٣ رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدتَّنَا عَلَىٰ رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ﴾ [آل عمران:١٩١-١٩٤]، ﴿وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ ۝١٨١ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ [الصافات:١٨١-١٨٢]، ﴿سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۖ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۖ أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنكُمْ سُوءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِن بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ [الانعام:٥٤] (ص:٨٠)۔

کیوں صاحب اگر کوئی شخص ان آیات کی بجائے یہ آیت پڑھے: ﴿رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ [البقرۃ:٢٠١]۔

یا محرفین کلام اللہ کو ملحوظ رکھ کر حضرت نوح کی یہ دعا پڑھے: ﴿رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا﴾ [نوح:٢٦]، تو کوئی آیت اس کو منع کر سکتی ہے۔

خاتمہ:

رسالہ اہل قرآن کا اصل جواب تو ختم ہو گیا۔ میرا ارادہ ہے کہ اس مضمون کو رسالہ کی شکل میں چھاپ کر مفت شائع کیا جائے، اصحاب کرم میں سے کوئی ایک یا کئی ایک اس

کارِ خیر میں مدد دیں تو ان کے واسطے موجب برکت ہوگا۔

اس کتاب کی تحقیق وتعلیق سے میں جمعہ کی شب ۷/رجب ۱۴۴۲ھ = ۱۸/فروری ۲۰۲۱ءکو فارغ ہوا۔

اللہ تعالی میرے اس عمل کو خالص اللہ کی رضا کی خاطر بنائے اور میرے اور اس میں حصہ لینے والے ہر فرد کے لیے باعث نجات بنائے۔آمین

وصَلّی اللّٰه عَلی نَبِینا مُحَمَّدٍ وعلی آلہِ وصَحبِہِ وسَلم تَسْلِیمًا کَثِیرًا